فوائدِ نافعہ

جلد اول

تالیف

حضرت مولانا محمد نافع مدظلہ

محمدی شریف ضلع جھنگ پنجاب

باسمه تعالی جل شانه

والزمهم کلمة التقوی وکانوا احق بها

واهلها۔ الخ (الفتح: پ۲۶)

و ثابت کرد بر ایشاں سخن پرہیزگاری

و بودند سزاوار باں و اہلِ آں

(فتح الرحمٰن)

فوائدِ نافعہ (حصہ اول)

مولانا محمد نافع مدظلہ

کتاب ہذا میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے دفاع کے لیے مضامین کی نوعیت کے اعتبار سے چند فصل قائم کر دیے ہیں جن میں بعض اہم اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے اور فصل اول کے ابتداء میں قارئین کے فائدہ کے لیے حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ اور جناب عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے مختصر احوال شامل کر دیے ہیں۔ امید ہے قارئین کرام کتاب ملاحظہ فرما کر اطمینان حاصل کر سکیں گے۔

دارُالکتاب

کتاب مارکیٹ، غزنی سٹریٹ

اردو بازار لاہور

ضابطہ

نام کتاب : فوائد نافع حصہ اول

مصنف : حضرت مولانا محمد نافع دامت برکاتہم

ناشر : دارالکتاب، کتاب مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

طابع : زاہد بشیر

اشاعت : فروری 2008ء

قیمت : /



قانونی مشیر ——— باہتمام

مہر عطاء الرحمٰن، ایڈووکیٹ ہائی کورٹ، لاہور — حافظ محمد ندیم

فون: 7241866، 0300-4356144

فہرست

فوائدِ نافعہ (حصہ اول)

فَصلِ اوّل

فَصلِ دُوُم

فَصلِ سَوم

فَصلِ چہارم

(مختلف مطاعن کے جوابات)

فَصْلِ پَنْجَم

(شیعہ...... فلح اکیڈمی کراچی کے اشتہار کا جواب) ۶۴۵

فوائد نافعہ

(حصّہ اوّل)

تالیف

مولانا محمد نافع مدّظلہ

(محمدی شریف، ضلع جھنگ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وکفی والصلوہ والسلام علی سید الوری وعلی الہ الشرفاء واصحابہ النجباء واتباعہ الصلحاء صلوہ دائمہ بدوام السماء والدنیاء اما بعد!

جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے سوانح فضائل و کمالات اور بعض مطاعن کے جوابات قبل ازیں ہماری طرف سے متعدد تالیفات کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔

اب اس کے بعد مزید ایک سلسلہ "فوائدِ نافعہ" کے نام سے مرتب کیا ہے۔ اس میں مختلف مضامین فراہم کیے ہیں اور کئی ضروری سوالات اور اہم اعتراضات کے جوابات ذکر کیے ہیں جن کا پیش کرنا دورِ حاضر کی ضرورت ہے اور ان کا ازالہ ملی تقاضوں کے مطابق ہے۔

کتاب ہذا میں مضامین کی نوعیت سے چند فصل قائم کر دیئے ہیں، ان میں صحابہ کرام سے دفاع کرنا مقصود ہے، کوئی بحث و مباحثہ کا آغاز کرنا منظور نہیں۔

اس طریقہ سے ناظرین کرام کے بہت سے شکوک و شبہات کا ارتفاع ہو سکے گا۔ (بتوفیقہ تعالیٰ)

اہلِ ذوق احباب سے دعا کی درخواست ہے کہ مالک کریم ان مساعی کو قبول فرما کر خاتمہ بالایمان نصیب فرمائے، آمین۔



فصل اول

باسمہ تعالیٰ عزوجل شانہ

سوانح صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ

الحمدللہ وکفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے دین کے احیاء و ابقاء کے لیے ایک مخصوص جماعت کو منتخب فرمایا جن کی ساری زندگی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی معیت میں وقف تھی۔ اعلائے کلمتہ اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے نام کو بلند کرنا مقصودِ حیات سمجھتے تھے۔ نفسانی اغراض یا ذاتی مفاد کو مذہب اسلام کے سامنے ختم کیے ہوئے تھے۔ زندگی کا نصب العین صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی روشنی میں دنیا میں رائج کر کے آخرت کو سنوارنا تھا۔ اس محبوب مقصد کی خاطر اللہ والوں کی اس مختصر جماعت نے اپنی جان و مال، قرابت و اقتدار تک سب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر قربان کر دیا، دینِ اسلام کی کامیابی

کے لیے ہر طرح کی قربانی پیش کر کے آخرت کی سرخروئی حاصل کی۔

اصل بات یہ ہے کہ ان حضرات کا یہ دینی ایثار اور یہ جذبہ اسلامی فطرت کے طور پر قدرت نے ان میں ودیعت کر دیا۔ یہ انتخاب ازلی تھا جو ان فدایانِ اسلام کے لیے مخصوص ہوا چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دل دیکھے تو ان میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دل کو سب سے بہتر پایا اس لیے ان کو چن لیا اور آپ کو پیغمبر بنا کر مبعوث فرمایا، پھر آپ کے دل کے بعد اپنے بندوں کے دل دیکھے تو آپ کے اصحاب کے دل کو سب سے بہتر پایا اس لیے ان کو آپ کا وزیر بنایا اور ان کو ان کے دین کا مددگار و معاون بنایا جو آپ کے دین کے لیے جنگ کرتے ہیں۔ (کنزالعمال جلد ۶ ص ۳۱۱، طبع اول)

ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہے دیتا ہے۔

فی الحال اللہ تعالیٰ کی اس منتخب شدہ جماعت کی افضل ترین شخصیت کے چند مختصر سے حالات و فضائل پیش کرنا مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سعید روحوں کی برکت سے ہماری آخرت بھی درست فرمائے۔ (آمین)

ولادت و نام و نسب

سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی عبداللہ، لقب صدیق و عتیق دونوں ہیں۔ باپ کا نام عثمان جن کی کنیت ابو قحافہ بن عامر ہے اور آٹھویں پشت مرہ بن کعب میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتے ہیں۔ والدہ کا نام سلمہ اور ان کی کنیت ام الخیر ہے۔

سیدنا صدیق کی بیوی کو امِ رومان کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سیدنا ابوبکر کی ولادت عام فیل سے تین سال بعد ۵۷۳ء میں ہوئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ دو سال چند ماہ چھوٹے ہیں۔

قبل از اسلام قوم میں صدیق کا مقام

سیدنا صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلام سے پہلے قبائل و اقارب میں راست گوئی، امانت و دیانت میں مشہور تھے۔ اہلِ مکہ ان کو علم، تجربہ اور حسنِ خلق کے باعث معزز و محترم سمجھتے تھے خصوصاً علم الانساب اور اخبارِ عرب (اس زمانہ کی یہ علمی فوقیت مسلم تھی) کے ماہر تھے۔ قوم میں آپ پر صداقت و حقانیت کی بناء پر بڑا اعتماد تھا۔ قبیلہ بنوتیم میں خون بہا اور تاوان کا فیصلہ صدیق کے ہاتھوں تسلیم کیا جاتا تھا۔ جس چیز پر ابوبکر صدیق اتفاق کر لیتے اس کو تمام قریش مان جاتے، ان کے بغیر کوئی دوسرا اقرار کرتا تو کوئی بھی اس کا ساتھ نہ دیتا۔ آپ طبعاً برائیوں اور کمینہ خصلتوں سے محترز رہتے تھے۔ آپ نے جاہلیت ہی میں شراب اپنے اوپر حرام کر رکھی تھی اور شراب نوشی میں انسانی آبرو کا نقصان کہتے تھے۔ کسی نے آپ سے پوچھا کہ کبھی آپ نے شراب بھی پی ہے؟ آپ نے فرمایا: نعوذ باللہ کبھی نہیں پی۔ اس نے پوچھا کیوں؟ آپ نے فرمایا: میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے بدن سے بو آئے اور مروت زائل ہو۔ یہ بات نبی اکرم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں پہنچی تو آپ نے دو مرتبہ فرمایا کہ ابوبکر سچ کہتے ہیں۔ (کنز العمال جلد ۶ ص ۳۱۳)

اسلام قبول کرنا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو ابتداء ہی سے خاص انس و خلوص تھا اور آپ کے حلقہ احباب میں داخل تھے، چنانچہ تجارت کے سفروں میں بھی ہمراہی کا شرف حاصل ہوتا تھا۔

سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ سلیم الطبع، حق پسند اور حق پرست انسان تھے، یہی وجہ تھی کہ جب ان کو آنحضور ﷺ نے دعوتِ اسلام دی تو آپ نے کچھ پس و پیش نہ کیا فوراً قبول کر کے حلقہ بگوشانِ اسلام میں شامل ہوگئے اور اپنی طرف سے امداد و نصرت کا وعدہ کیا جس کو نہایت خوبی کے ساتھ پورا کیا۔ جس روز ایمان لائے

اس روز ان کے پاس چالیس ہزار درہم تھے، آپ نے وہ سب کے سب آنحضور ﷺ پر صرف کر دیئے۔ اس حسنِ صداقت کی تصدیق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے اس طرح ظاہر ہوتی ہے آپ نے فرمایا کہ بجز ابوبکر کے جس کو میں نے اسلام کی دعوت دی اس نے کچھ نہ کچھ پس و پیش ضرور کیا۔ "اللہ اکبر" صدیقِ اکبر ہی وہ شخصیت ہے جس کو سب سے پہلے آنحضرت سے مل کر نماز پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

گو تقدم فی الاسلام میں محدثین و مورخین کو کلام ہے مگر راجح قول اس طرح ذکر کیا جاتا ہے کہ ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا عورتوں میں، حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ بچوں میں، حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ غلاموں میں اور سیدنا حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ آزاد بالغ مردوں میں سب سے اول مومن ہیں۔

(فتح الباری جلد ۷ ص ۱۳۰ تحت اسلام ابی بکر)

اشاعتِ دین

صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے اسلام لاتے ہی دینِ حنیف کی نشر و اشاعت کی جدوجہد شروع کر دی۔ ان کی کوششوں سے حضرت عثمان بن عفان، زبیر بن عوام، عبدالرحمٰن بن عوف، طلحہ بن عبید اللہ، سعد بن ابی وقاص، ابوعبیدہ، ابوسلمہ، خالد بن سعید، ابن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہم جیسے اکابرِ قوم اسلام میں داخل ہوئے۔ یہ آسمانِ اسلام کے نجومِ تاباں ہیں، ان تمام درخشندہ ستاروں کا مرکزِ شمسی صدیقِ اکبر کی ذاتِ گرامی ہے۔

ادھر کثیر تعداد غلاموں اور لونڈیوں کی تھی جو نورِ اسلام سے منور ہو چکی تھی لیکن اپنے مشرک آقاؤں کے پنجہ استبداد میں گرفتار ہونے کے باعث طرح طرح کی اذیتوں میں مبتلا تھے۔

صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے ان تمام بندگانِ توحید کو ان کے جفاکار مالکوں سے خرید

کر آزاد کرایا، چنانچہ بلال ابن رباح حبشی، عامر بن فہیرہ، نہدیہ، وغیرہ نے صدیقی جود و کرم سے نجات پائی۔

مکی زندگی اور ماحول کی مشکلات

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعثت کے بعد کفار کی ایذا رسانی کے باوجود تیرہ برس تک مکہ میں دینی تبلیغ و اشاعت کا سلسلہ جاری رکھا۔ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ اس مشکل ترین اوقات میں جان، مال، رائے، مشورہ، غرض ہر حیثیت سے پورے متعاون اور کامل دست و بازو رہے۔ چنانچہ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

ولم یمر علینا یوم الا یاتینا فیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طرفی النہار بکرہ وعشیہ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر روز صبح و شام ہمارے گھر تشریف لایا کرتے، ایک دوسرے سے حالات لیے دیئے جاتے، دیر تک یہ ہمدردانہ مجلسِ راز قائم رہتی۔

(بخاری شریف جلد۱ ص۵۵۲)

جب قبائل عرب اور عام مجمعوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ و ہدایت کے لیے تشریف لے جاتے تو صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ بھی ہمرکاب ہوتے اور اپنی نسب دانی اور کثرتِ ملاقات کے باعث لوگوں سے آپ کا تعارف کراتے۔

(کنزالعمال جلد۶ ص۳۱۹، طبع اول)

کفار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ طرح طرح کی دست درازی اور تعدی کرتے تو یہ مخلص جاں نثار ہر موقع پر خود خطرے میں پڑ کر حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوری مدافعت کرتے، چنانچہ ایک روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے قریب نماز پڑھ رہے تھے تو عقبہ بن ابی معیط نے حضورِ انور کے گلے مبارک میں چادر سے پھندا ڈال دیا۔ "فخنقہ خنقا شدید" یعنی زور سے گلا گھونٹ دیا،

ادھر سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پہنچے، انہوں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر دفع کیا اور کہا کہ

اتقتلون رجلا ان یقول ربی اللہ۔
(بخاری شریف جلد اول ص ۵۴۴)

یعنی کیا تم ایسے ذاتِ گرامی کو قتل کرنا چاہتے ہو جس کا فرمان ہے کہ میرا رب صرف اللہ ہے۔

ہجرت کا قصد

غرض جب مشرکین مکہ کے مظالم حد سے بڑھ گئے اور ان کی سختیوں، چیرہ دستیوں کی انتہا نہ رہی تو موحدین کو ہجرت کی اجازت ہوئی۔ سب سے پہلے چند مسلمانوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق حبشہ کی طرف ہجرت کی، اسی سلسلہ میں صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ بھی ان مصائب و آلام سے تنگ آکر ملک حبشہ کی طرف ترکِ وطن کا ارادہ کر کے نکل پڑے۔ برک الغماد کے مقام پر پہنچتے ہیں تو قبیلہ قارہ کے سردار ابن الدغنہ سے ملاقات ہوئی۔ ابن الدغنہ نے کہا کہ کہاں کا قصد ہے؟ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے قوم نے جلاوطن کر دیا ہے، اب کسی دوسری جگہ کا ارادہ ہے کہ آزادی سے وہاں اپنے رب تعالیٰ کی عبادت کر سکوں۔ ابن الدغنہ نے یہ ماجرا سن کر کہا کہ

فان مثلک یا ابابکر لا یخرج ولا یخرج انک تکسب المعدوم۔ تاصل الرحم وتحمل الکل وتقری الضیف، تعین علی نوائب الحق فانا لک جار ارجع۔
(بخاری شریف جلد ا ص ۵۵۲)

ابن الدغنہ کہتا ہے کہ اے ابوبکر! آپ جیسی بزرگ ترین، برگزیدہ اخلاق ہستی اس قابل نہیں کہ اس کو ترکِ وطن پر مجبور کیا جائے۔ آپ کی بلند اخلاقی کا تو یہ عالم ہے کہ جس کے پاس خرچ نہ ہو اس کو کما کر دیتے ہیں اور اپنے رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرتے ہیں اور لوگوں کے بوجھ

(بوقتِ ضرورت) آپ اٹھاتے ہیں، مہمانوں کو آپ مہمانی دیتے ہیں، صحیح معاملات میں آپ لوگوں کی معاونت اور مدد کرتے ہیں لہٰذا میں آپ کو لوگوں کے شر سے پناہ اور امان میں لیتا ہوں، آپ واپس مکہ تشریف لے چلئے۔

صدیقی اخلاق کفار کی زبانی

ابن الدغنہ اور صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ واپس مکہ پہنچے۔ ابن الدغنہ نے رات کو اشرافِ قوم اور سردارانِ قریش سے صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں بات چیت کی کہ ایسا آدمی جلاوطنی کے ہرگز قابل نہیں ہے، کیا تم ایک ایسے شخص کو ملک بدر کرنا چاہتے ہو جس کے ایسے عمدہ عادات و اطوار ہیں کہ یکسب المعدوم ویصل الرحم ویحمل الکل ویقری الضیف یعین علی نوائب الحق۔

(بخاری شریف جلد ۱ ص ۵۵۲)

صدیقی اخلاق کا یہ نمونہ کافر شخص، مخالفِ اسلام کا بیان کردہ ہے، جو شخص صدیق رضی اللہ عنہ سے نہ اسلامی رشتہ رکھنے والا ہے نہ نسبی۔ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی بلند کرداری کی یہ مختصر سی تصویر دیکھ کر اہلِ انصاف اندازہ لگا سکتے ہیں کہ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کا کیا مقام ہے۔ اپنوں سے رابطہ کی خوش اسلوبی، غیروں سے انس موانست کا سلسلہ، غریبوں اور بے نواؤں کی دل داری اور خدمت گزاری، مہمانوں کی مہمان نوازی، ہر حق کے معاملہ میں صاحبِ حق کی حمایت اور دادرسی، غرض تمدن و معاشرت کا کونسا پہلو ہے جو صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا نظر آئے۔

اس کے بعد قریش ابن الدغنہ کی امان اور سفارش کو رد نہ کر سکے اور کہنے لگے: "ابوبکر کو کہہ دو کہ وہ اپنے رب کی عبادت بے شک کرے مگر اتنی بات ضروری

ہے کہ اپنے گھر کی چاردیواری کے اندر اندر ہی نماز اور قرآن مجید پڑھنا ہوگا اور ساتھ یہ ہے کہ "لا یستعلن" یعنی عبادت کے وقت آواز بلند نہیں کرنی ہوگی اس لیے کہ فانا ان ثفتن نساء نا وابناء نا یعنی اپنی عورتوں اور بیٹوں کے متعلق خوف ہے کہ کہیں ان کی نماز دیکھ کر اور قرآن سن کر اثر نہ قبول کرلیں۔"

(بخاری شریف جلد اول ص۵۵۲)

سابقہ گفت و شنید کے بعد ابن الدغنہ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جا کر کہا کہ ان شرائط و ضوابط کے ماتحت آپ صرف اپنے گھر میں عبادت کرسکتے ہیں۔

یہ مشروط سی اجازت ملنے کے بعد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ کیا کہ اپنے گھر کے صحن میں ایک چھوٹی سی مسجد تیار کرلی، اس میں اپنے اوقاتِ معینہ میں عبادت و تلاوت کرنے لگے۔

صدیق رضی اللہ عنہ کی عبادت میں قدرتی تاثیر

کان رجلا بکاء لا یملک بعینیہ۔ یعنی صدیق اکبر بہت رو رو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے شخص تھے، اس وقت ان کے آنسو تھم نہیں سکتے تھے۔

(بخاری شریف جلد اول ص۵۵۳)

حسبِ دستور جب گھر کی مسجد میں عبادت و تلاوت کرنے لگے تو کفار، مشرکین کی عورتیں اور اولادیں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی اس عجیب و غریب روحانی آواز پر جمع ہو جاتیں، اس پُر تاثیر اجتماع اور پُر کیف مجمع کو دیکھ کر سردارانِ قریش سے نہ رہا گیا، گھبرا کر فوراً ابن الدغنہ کو اطلاع دی کہ یہ معاملہ تو ہم سے برداشت نہیں ہو سکتا، ابوبکر کو اس تلاوتِ قرآن اور نماز سے بالکل منع کردو۔ یہ سب کچھ ترک کر دیں اور خاموش ہو جائیں۔ اے ابن الدغنہ! ہم نے تیرے عہد کو توڑنا ناپسند جانا ہے اس لیے تجھے اس کی اطلاع پہلے کردی ہے، اس کا انتظام کیا جائے۔

اس معاملہ کو طے کرنے کے لیے ابن الدغنہ ابوبکر صدیق کے پاس پھر پہنچے اور

کہا کہ ہماری قوم آپ کی عبادت اور قرآن خوانی سے سخت خائف ہے لہٰذا آپ یہ ذکر، یہ عبادت چھوڑ دیجئے یا میں اپنی امان اور پناہ جو میں نے آپ کو قوم سے حفاظت کے لیے دے رکھی ہے واپس لیتا ہوں۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ

انی ارد الیک جوارک وارضی بجوار اللہ۔

اے ابن الدغنہ! میں تیری پناہ و امان کو تجھے واپس کرتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ کی پناہ پسند کرتا ہوں اور اسی کی امان لیتا ہوں۔

(بخاری شریف، جلد اول، ص ۵۵۳)

سبحان اللہ! صدیق کی خشوع اور خضوع سے ہر نماز اثرِ مقناطیسی رکھتی تھی اور پھر اس میں قرآن مجید کی تلاوت اور زیادہ جادو کی تاثیر پیدا کر دیتی تھی اس لیے ان کو اس قسم کی کڑی شرائط ثبت کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کفار مکہ کے یہ اقوال کہ "لا یستعلن بہ وانا نخشی ان یفتن نساءنا وابناءنا" جہاں ان کے خوف و ہراس کو ظاہر کر رہے ہیں وہاں دراصل یہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی حقانی عبادت ہونے کی بین دلیل ہے اور مقبولِ خداوندی ہونے کی ظاہر نشانیاں ہیں۔ کفار اپنے خیال میں تو اپنے مخالف سے بغض و عناد کی بناء پر غیر متاثر ہونے کی تدبیریں کر رہے ہیں اور ساتھ ساتھ ان کی روحانیت اور نورانیت کے برقِ تاثیر ہونے کا پورا پورا ثبوت دے رہے ہیں۔

فللہ در صداقتہ اس موقع پر ناظرین یاد رکھیں کہ یہ پہلی مسجد زمانہ اسلام میں ہے جس کی بنیاد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کے صحن میں ان ہزاروں مشکلات و مصائب کے ہوتے ہوئے ڈالی اور اللہ تعالیٰ کے کلام کی تلاوت کا مرکز بنایا۔ اس پر کفار مکہ بیچارے بہت نالاں تھے۔ بڑے اختلاف و نزاع کھڑے کیے مگر خدا کے رسول کے اس جاں نثار ساتھی اور اس صداقت کے پہاڑ نے بڑے استقلال کے ساتھ یہ کارِ خیر تاہجرت علیٰ رغم انف قریش جاری رکھا۔ رضی اللہ تعالی عنہ وجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

سفرِ ہجرتِ مدینہ

اسی اثناء میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو فرمایا کہ مجھے مقامِ ہجرت دکھایا گیا ہے، وہاں کھجور کے درخت کثرت سے ہیں۔ اس سے مراد مدینہ طیبہ تھا۔ مسلمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے موافق مکہ سے ہجرت کر کے جانا شروع ہوئے اور جو حبشہ وغیرہ میں گئے ہوئے تھے وہ بھی اسی مدینہ کی طرف رجوع کرنے لگے۔ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی مدینہ کی طرف ہجرت کی تیاری کی۔ حضور نبی کریم نے ان کو فرمایا:

علی رسلک فانی ارجو ان یوذن لی۔ — آپ ٹھہر جائیے عجلت نہ کیجئے، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے بھی حکم ہوگا۔

تو صدیقِ اکبر نے نہایت تعجب سے عرض کیا:

ھل ترجوا ذالک بابی انت۔ — میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، کیا آپ کو بھی حکمِ ہجرت ہوگا۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً فرمایا کہ "ہاں۔" عرض کی کہ مجھے بھی ہمراہی کا شرف حاصل ہوگا؟ آپ نے فرمایا: "ہاں تم ساتھ چلو گے۔" اس بشارت کے بعد صدیقِ اکبر نے ارادہ ملتوی کر دیا اور چار ماہ تک منتظر رہے۔ اس انتظارِ حکم کے زمانہ میں صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے دو اونٹ سواری کے لیے مہیا کیے اور ان کی خاص نگرانی سے پرورش کرتے رہے تاکہ وقتِ ضرورت کام آئیں۔

ایک دن صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ گھر بیٹھے ہوئے تھے۔ دن ڈھلے نہایت گرمی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خلافِ معمول تشریف لائے اور فرمایا کہ ہجرت کا اذن ہو چکا ہے، تیار ہو جائیے چلنے کی صورت کی جائے۔ صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: دو سواریاں اسی سفر کی خاطر پہلے سے موجود ہیں، لہٰذا ہماری طرف سے بالکل تیاری ہے۔

عائشہ صدیقہ اور اسماء (دونوں صدیقِ اکبر کی بیٹیاں ہیں۔ اسماء عمر میں صدیقہ سے دس سال بڑی تھیں) نے جلدی سے رختِ سفر درست کیا۔ زادِ راہ جو کچھ میسر ہوسکا اسے تھیلے میں ڈالا، اس جلدی کے موقع میں اسبابِ سفر کے باندھنے کے لیے رسی نہ مل سکی، فوراً اسماء نے ڈوپٹا کو پھاڑ کر رسی کی جگہ پٹکا کو کام میں لائیں۔ اسماء کے اس کمال اخلاص اور چستی کو دیکھ کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ذات النطاقین کا لقب عطا فرمایا اور اس پر اسماء تمام عمر فخر کرتی تھیں۔

غارِ ثور کی صحبت

اس مختصر سے قافلہ کی پہلی منزل غارِ ثور تھی۔ ابوبکر صدیق پہلے غار کے اندر داخل ہوئے اور تمام جگہ درست کی۔ سوراخ وغیرہ بند کیے۔ جب اندر بیٹھنے کی تمام جگہ صفائی کرلی اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی: آپ اندر تشریف لائیے۔ آپ غار میں داخل ہوئے اور صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے زانو پر سرمبارک رکھ کر آرام فرمانے لگے۔

ادھر کفارِ مکہ کی طرف سے بڑی شدت سے تلاش شروع تھی۔ اس قافلہ کی گرفتاری کے صلہ میں بڑے انعام مقرر ہوچکے تھے۔ جستجو اور تلاش کرنے والے چکر لگا رہے تھے کہ کسی طرح کوئی سراغ مل سکے۔

ایک دفعہ کفار کے چند آدمی بالکل غار کے سر پر آپہنچے۔ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ اس وقت گھبرائے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! اگر یہ لوگ پاؤں کی طرف نظر کریں تو ہم صاف نظر آسکتے ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غمزدہ ہونے کی کوئی بات نہیں، ہم صرف دو ہی نہیں بلکہ ایک تیسرا (خداوندِ عالم) ہمارے ساتھ ہے۔ اس وقت حق تعالیٰ نے ایک خاص قسم کی کیفیتِ سکون و اطمینان حضور کے قلبِ اطہر پر اور آپ کی برکت سے صدیقِ رفیق کے قلبِ مبارک پر نازل فرمائی اور فرشتوں کی فوج سے حفاظت و تائید فرمائی۔ یہ اسی تائیدِ غیبی کا کرشمہ تھا کہ مکڑی کا جالا جسے اوھن

البیوت کہا جاتا ہے، بڑے بڑے مضبوط و محکم قلعوں سے بڑھ کر موجبِ تحفظ ہوا اور بچاؤ کا ذریعہ ٹھہرا۔

معیت صدیقی کا قرآن میں ذکر

اس اہم واقعہ کو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا:

اذاخرجه الذين كفروا ثاني اثنين اذ هما في الغار اذ يقول لصاحبه لا تحزن ان الله معنا۔ (التوبہ : ۹)

جس وقت اس رسول کو کافروں نے نکالا تھا کہ وہ دو میں سے دوسرا تھا، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے رفیق سے کہہ رہا تھا کہ غم نہ کھا، بے شک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔

قریباً تین روز یہاں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا، صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ خود ہر ساعت حاضرِ خدمت تھے اور صدیق کے گھر والوں نے بھی اس اہم موقع پر اپنے ذمے جو کام مقرر کر رکھے تھے انہیں بطریق احسن سرانجام دیا۔

قیامِ غار کے اوقات میں اہلِ بیتِ صدیق کی خدمت گزاری

اسماء تو گھر میں جو کھانا میسر ہو سکتا اس کو تیار کرتی تھیں، عبداللہ (صدیق کے بیٹے) تیار شدہ کھانا رات کو چھپ کر غار میں پہنچایا کرتے تھے اور مکہ والوں کی دن بھر کی کارکردگی کی پوری تفصیلات جا کر ذکر کرتے، رات وہیں حضورِ انور اور صدیق کی معیت میں گزار کر صبح سویرے واپس ہوتے تاکہ کوئی دیکھ نہ سکے۔

اور عامر بن فہیرہ (یہ صدیق رضی اللہ عنہ کے غلام تھے) صبح و شام بکریاں غار کے پاس لے جاتے جن کا دودھ حسبِ ضرورت استعمال میں لایا جاتا، نیز ریوڑ کے آنے جانے سے عبداللہ کے آنے جانے کے نشاناتِ قدم مٹ جایا کرتے تاکہ کسی قسم کا شبہ آمدورفت کا نہ ہو سکے۔ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے سارے گھر والے اس طرح آنحضور

صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مصروف رہے۔

غار سے رخصت ہونا اور راستہ میں صدیقِ اکبر کی قدم قدم پر غلامانہ خدمات

آخر سہ روزہ قیام کے بعد چوتھے دن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور ان کا غلام عامر بن فہیرہ اور ایک دلیل راہ (راستہ بتلانے والا) عبد بن اریقط یہ چاروں اللہ کے توکل پر مدینہ کی طرف چل پڑے، چونکہ صدیق اکبر کثیر الاحباب تھے راستہ میں ایسے شناسا ملتے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے واقف نہ تھے اور وہ پوچھتے کہ یہ حضرت کون ہیں تو صدیق اکبر کہہ دیتے کہ

هذا رجل يهديني الطريق۔ یعنی یہ ہمیں راہ بتلانے والے ہیں۔

(بخاری جلد اول ص۵۵۶)

واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہادی عالم ہیں تو اس طرح سے گول مول جواب پر اکتفا فرماتے۔ اس طرح سفر طے ہو رہا تھا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "ایک دن بڑی شدت کی گرمی تھی، دوپہر کے قریب میں نے ایک بڑی چٹان سایہ دار تلاش کی اور اس کے پہلو میں سایہ پر آرام کرنے کے لیے میں نے جگہ ہموار کر کے کھال کا بستر بچھایا اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم وہاں استراحت فرمانے لگے۔ میں ادھر ادھر دیکھ بھال کر رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ناگہاں ایک گڈریا بکریوں کا ریوڑ لے کر ہماری قیام گاہ کی طرف آ رہا ہے۔ میں نے دودھ طلب کیا تو اس نے میری بات کی تعمیل کرتے ہوئے دودھ دوہ کر پیش کیا۔ میں نے دودھ لے کر کچھ پانی ملایا تاکہ اچھی طرح ٹھنڈا ہو جائے اور آنحضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پینے کے لیے حاضر کیا۔

فشرب رسول الله صلى الله عليه وسلم حتى رضيت ثم ارتحلنا۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نوش فرمایا اور میں اس استراحت پر بہت خوش ہوا، پھر ہم چل دیئے۔

(بخاری جلد اول ص۵۵۷)

آگے چلتے ہوئے راستے میں زبیر بن عوام ملتے ہیں، یہ شام کی تجارت سے واپس آ رہے تھے۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، دونوں کو سفید پوشاکیں ہدیتاً پیش کیں۔ ہر دو حضرات نے قبول فرما کر وہ سفید پوشاک پہن لی۔

یہ سفر عام شاہی راستہ (جو مکہ اور مدینہ کے درمیان ہے) سے چونکہ طے نہیں ہو رہا تھا، بلکہ عام راستہ سے بچ کر سمندری طریق سے پھر پھرا کر آپ آ رہے تھے مدینہ تک قریباً آٹھ دن صرف ہوئے۔

مدینہ میں آمد اور معیت صدیقی

مدینہ میں بڑی شدومد سے انتظار ہو رہا تھا، کئی دن سے لوگ چشم براہ تھے۔ مدینہ سے دو میل باہر بنی عمر بن عوف کی مشہور بستی قبا میں چند دن قیام فرمایا، اسی قبا ہی کے دورانِ قیام میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ، مکہ سے اپنا مفوضہ کام پورا کر کے آ ملتے ہیں۔ دس دن سے زائد یہاں قبا میں قیام کر کے پھر مدینہ طیبہ کو روانگی ہوئی۔ سیدنا صدیق و سیدنا علی اور دیگر صحابہ کا ہجوم ساتھ ہے۔ آگے آگے آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری چل رہی تھی، مشتاقانِ نبوت ساتھ ساتھ تھے، استقبال کے لیے سارا مدینہ نکل پڑا۔ ہر انصاری کی خواہش تھی کہ آپ اس کے گھر تشریف لاویں۔ اونٹنی کی مہار تھامنے جو آگے بڑھتا تو آپ فرما دیتے:

دعوها فانها مامورہ۔ دیکھو اسے چھوڑ دو، جہاں اسے حکم ہو گا وہاں خود ٹھہرے گی۔

چلتے چلتے حضرت ابو ایوب انصاری کے گھر کے سامنے آ کر ٹھہر گئی۔ (جہاں اب مسجدِ نبوی ہے) یہیں آپ کا قیام ہوا۔ یہ آس پاس کی جگہ دو یتیم بچوں کی تھی۔ اس جگہ مسجد بنانے کا ارادہ ہوا۔ انہوں نے اور ان کے ورثاء نے عرض کیا کہ ہم اس اہم ضرورت کے لیے مفت ہدیہ پیش کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: "نہیں، اس کا معاوضہ اور قیمت ادا کیے بغیر ہم نہیں قبول کر سکتے۔"

مسجدِ نبوی اور صدیقِ اکبر کی قربانی

علامہ ابن حجر نے ذکر کیا ہے کہ

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم امر ابابکر ان یعطیھما ثمنہ۔

یعنی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زمین والوں کو قیمت ادا کرو۔

سبحان اللہ! مدینہ کی پہلی مسجد میں سب سے پہلے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی کو مال و زر صرف کرنے کی سعادت حاصل ہوئی اور پھر صرف چندہ ہی نہیں پیش کیا بلکہ اس کے تعمیری سلسلہ میں رضاکارانہ طور پر ہاتھوں کی امداد میں بھی پورا حصہ لیا۔

یہ پُرانوار مسافت، یہ بابرکت سفر جو کہ تاریخِ اسلام کے لیے اصل اصول قرار دیا جاتا ہے، اس میں اول سے آخر تک تمام تر معیت صدیق اکبر ہی کے بختِ بلند کے لیے اللہ تعالیٰ نے مخصوص کر دی تھی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صدیق ہی کو رفیق منتخب فرمایا۔ یہ وہ فضل صدیقی ہے جس کی دوسری نظیر نہیں۔

ابنِ عساکر، امام شعبی سے ذکر کرتے ہیں کہ

فان خص اللہ تبارک و تعالی باربع خصال، لم یخص ھذا من الناس، سماہ الصدیق، ولم یسم الصدیق احدا غیرہ، وھو صاحب الغار مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ورفیقہ فی الھجرہ، وامر رسول اللہ بالصلوہ

یعنی صدیق اکبر کو چار ایسی خاص فضیلتیں عطا فرمائیں جو کسی دوسرے کو ان میں شریک نہیں کیا: (۱) اللہ تعالیٰ نے ان کا نام صدیق رکھا پھر کسی دوسرے کو صدیق کا لقب عطا نہیں فرمایا۔ (۲) رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غار میں رہے (لہٰذا ان کو صاحب الغار کہا جاتا ہے) (۳) آپ کے ساتھ ہجرت کے سفر میں شریک ہوئے (لہٰذا

والمسلمون شهود۔
(تاریخ الخلفاء سیوطی ص۵۶)

ان کو رفیق الہجرت کہا جاتا ہے) (۴) باقی تمام مسلمانوں کے ہوتے ہوئے امامت نماز کے متعلق ان کو ارشاد فرمایا (لہٰذا تمام مسلمانوں کے لیے امام المسلمین ہوئے)

"وذالك فضل الله يوتيه من يشاء"

صدیق اکبر کی مدنی زندگی

اہلِ اسلام کے لیے مدنی زندگی کا دور ایک آزادی کا دور تھا۔ مکی مجبوریاں ختم ہوچکی تھیں۔ کافر اقوام کے جبر و قہر کو سطح ارض سے مٹانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کو اجازت ہوچکی تھی، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے کے بعد سے فتح مکہ تک جہاد فی سبیل اللہ کا سلسلہ جاری رہا اور ان سب غزوات میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، ایک مشیر و وزیر باتدبیر کی طرح ہمیشہ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف ہمرکابی سے مشرف رہے۔

امام سیوطی نے لکھا ہے: قال العلماء صحب ابوبكر النبي صلى الله عليه وسلم من حين اسلم الى حين توفى لم يفارقه سفرا ولا حضرا الا فما اذن له صلى الله عليه وسلم في الخروج فيه من حج وغزو وشهد مع الشاهد كلها۔ (تاریخ الخلفاء ص۲۸)

غزوۂ بدر

یہ کفر و اسلام کی فیصلہ کن جنگ تھی۔ صحابہ کرام کی ایک قلیل جماعت اپنے آقائے نامدار کی قیادت میں کفار کے جم غفیر کے مقابلہ میں میدانِ کارزار میں نکلی۔ حق و باطل کا زبردست مقابلہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دربارِ خداوندی میں سربسجود ہو کر گڑگڑا کر دعائیں فرمانے لگے:

"اے خداوندِ کریم! اگر یہ مختصر سی تیرے نام لیواؤں کی جماعت ہلاک ہو گئی تو بسیط ارض پر تیری عبادت نہیں ہوگی۔ اے اللہ! مجھے اکیلا مت چھوڑ، میں تیرے عہد میں وعدے کی ایفاء طلب کرتا ہوں۔"

اس خاص کیفیت میں آنحضرت ﷺ کی چادر مبارک شانہ اقدس سے گر گئی تو فوراً صدیق اکبر نے پہنچ کر وہ کملی تھام لی۔ صاحب فتح الباری یہاں لکھتے ہیں:

فاتاه ابوبكر فاخذ ردائه على منكبه فقال يا نبي الله كفاك منا شدتك۔ ربك سينجز لك ما وعدك فانزل الله اذ تستغيثون ربكم فاستجاب لكم الايه فامده الله بالملائكه۔ (فتح الباری جلد ۷ ص ۲۳۱)

یعنی حضرت صدیق رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں پہنچے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر مبارک جو گر گئی تھی اسے آپ نے درست کیا، تسلی کے کلمات عرض کیے کہ یارسول اللہ ﷺ! آپ کی استدعا درگاہ رب العزت میں کافی ہو چکی ہے، اللہ تعالیٰ اپنا کیا ہوا وعدہ آپ سے ابھی پورا فرمائے گا۔

چنانچہ اذ تستغیثون الخ، آیت اسی وقت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی فرشتوں کی فوج سے امداد فرمائی۔

اسی بدر کے موقع پر صحابہ کرام نے آنحضور ﷺ کی خاطر سایہ حاصل کرنے کے لیے ایک عریش بنایا (جس کا ترجمہ جھونپڑا یا چھانہ کرسکتے ہیں) تاکہ آپ اس میں آرام فرماویں۔

دشمن کی طرف سے سخت خوف کی بناء پر یہاں پہرے کی ضرورت تھی۔ علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اس مشکل وقت میں یہ ضرورت صرف صدیق ہی نے پوری کی اور آنحضرت کی خدمت کا پورا حق ادا کیا۔ چنانچہ مفصل روایت اس طرح ہے---

اخرج البزار فی مسنده من علی رضی الله تعالی عنه قال اخبرونی من اشجع الناس فقالوا انت- فقال انما انی ما بارزت احدا الا انتقمت منه ولکن اخبرونی باشجع الناس قالوا لا نعلم قال انه ابابکر انه لما کان یوم بدر فجعلنا لرسول الله صلی الله علیه وسلم عریشا فقلنا من یکون مع رسول الله لئلا یهدی الیه احد من المشرکین- فوالله ما دانی احدا الا ابابکر، شاهرا بالسیف- الخ،

(تاریخ الخلفاء ص۲۹ فصل فی شجاعتہ)

یعنی سیدنا علی المرتضیٰ نے فرمایا کہ میری تو اتنی بات ہے جس مرد کے مقابلہ میں میدان میں نکلوں تو اس سے انتقام لے سکتا ہوں- مجھے بتاؤ سب سے زیادہ کون آدمی دلیر ہے تو مخاطبین نے عرض کیا: ہمیں معلوم نہیں آپ بیان فرمائیے- آپ نے فرمایا کہ وہ ابوبکر ہیں- بات یہ ہے کہ بدر کے دن ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے آرام گاہ بنائی اور پھر ہم نے کہا کہ "حضور پر نورؐ کی نگرانی اور خدمت کیلئے کون اس آڑے وقت میں تیار ہے تاکہ دشمنوں سے کوئی بھی آپ کی جانب ارادہ نہ کر سکے" پس اللہ کی قسم! ہم میں سے کوئی بھی اس خدمت کی طرف سبقت نہیں کر سکا مگر ابوبکر ننگی تلوار لے کر حضور کے سر کے محافظ کھڑے ہوگئے- جو دشمن آپ کا قصد کرنا چاہتا اسی پر ابوبکر فوراً ٹوٹ پڑتے، پس یہ سب لوگوں سے زیادہ بہادر ہوئے-

غزوۂ احد

یہ غزوہ ۳ھ میں پیش آیا- بدر میں جو کفار کو شکستِ فاش ہوئی تھی اس کا بدلہ لینے کے لیے قریشِ مکہ بڑی آب و تاب کے ساتھ تیاری کر کے آئے تھے- لشکرِ کفار تین ہزار سے زائد بہادروں پر مشتمل تھا اور ابوسفیان ان کا رئیسِ لشکر تھا-

ادھر حضور نبی کریم ﷺ نے فدایانِ اسلام کا ایک لشکر مرتب فرما کر پہاڑ احد پسِ پشت لے کر میدانِ جنگ میں قیام فرمایا۔ اس پہاڑ مذکور میں ایک درہ خالی تھا جو پشت کی طرف واقع تھا۔ اس درہ پر ایک فوجی دستہ عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کی قیادت میں متعین فرمایا تاکہ پسِ پشت خالی پا کر دشمن حملہ نہ کر سکے۔ مجاہدین اور کفار کی جنگ شروع ہوئی، مجاہدینِ اسلام نے اللہ تعالیٰ کی امداد سے لشکرِ کفار کو تھوڑی دیر میں درہم برہم کر ڈالا۔ دشمن بھاگنے لگا، مسلمان غنائم جمع کرنے لگے تو اوپر درہ والے محافظ دستہ نے دیکھا کہ دشمن شکست خوردہ ہو کر پسپا ہو رہا ہے، اب درہ کی حفاظت کی ضرورت ہی نہیں رہی، غنائم جمع کرنے میں حصہ لیا جائے۔ ان کے امیر عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے درہ خالی چھوڑ دینے سے روکا مگر انہوں نے فتح کے فرط شوق میں پروا نہ کی، درہ سے اتر کر میدان میں آگئے، صرف چند آدمی وہاں باقی تھے جو حملہ آوروں کو نہ روک سکے۔ اچانک دشمن نے پلٹ کر پہاڑ کی پشت کی جانب سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا، اس زبردست اچانک حملہ نے مسلمانوں کے قدم ثبات اکھیڑ ڈالے۔ ایک قسم کا ہیجان و اضطراب تمام فوج میں پڑ گیا۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ اس پریشانی کے عالم میں ساتھ ہی دشمن نے یہ مشہور کر دیا کہ خود رسول اللہ ﷺ شہید کر دیئے گئے ہیں۔ مسلمانوں کی فوج بکھر گئی اور بڑا ہراس اور خوف پھیل گیا۔ اس انتہائی نازک مرحلہ میں بھی حضرت صدیق رضی اللہ عنہ آنحضور ﷺ سے جدا نہیں ہوئے اور پوری ثابت قدمی کے ساتھ دشمن کے مقابلہ اور مدافعت میں مصروف رہے۔ اس واقعہ کو مورخین اور مفسرین نے تفصیلاً لکھا ہے۔

ابنِ سعد طبقات جز ثالث میں ذکر کرتے ہیں کہ

كان فى من ثبت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم احد حين ولى الناس۔
(قسم اول ص ۱۲۴)

یعنی احد کے دن جب لوگ میدانِ جنگ میں پریشانی کی حالت میں منتشر ہوئے ہیں تو حضرت صدیق نبی کریم ﷺ کے ساتھ رہے، حضور کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

اسی ابن سعد نے دوسری جگہ اپنے طبقات جلد ثانی (قسم اول) میں اس واقعہ کو ان الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ

وثبت معه عصابه من اصحابه اربعه عشر رجلا سبعه من الانصار الخ،
(ص۲۹ ج۲)

یعنی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کرام کا ایک دستہ چودہ آدمیوں پر مشتمل اس افراتفری کی حالت میں بھی ثابت قدم رہا۔ سات آدمی مہاجرین میں سے تھے، ان میں ایک ابوبکر صدیق ہیں اور سات آدمی انصار میں سے تھے۔

اور معالم التنزیل امام بغوی مشہور محدث و مفسر نے اور صاحبِ خازن نے اپنی تفسیر خازن میں مزید وضاحت سے اس مسئلہ کو ان الذین تولوا منکم یوم التقی الجمعان کے تحت مندرجہ ذیل الفاظ کے ساتھ درج کیا ہے:

كان قد انهزم اكثر المسلمين لم يبق مع النبى صلى الله عليه وسلم الا ثلثه عشر رجلا وقيل الاربعه عشر رجلا من المهاجرين سبعه ومن الانصار سبعه فى المهاجرين ابوبكر، عمر، على، طلحه، عبدالرحمان، والزبير، وسعد بن ابى وقاص رضى الله عنهم۔
(تفسیر خازن جلداول ص۳۲۶ پارہ۴)

مطلب یہ ہے کہ اکثر مسلمانوں کو احد کے موقع پر شکست ہوئی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ۱۳ یا ۱۴ آدمی رہ گئے، سات مہاجر تھے اور سات انصاری تھے۔ سات مہاجر بزرگ یہ تھے: حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت عبدالرحمٰن، حضرت زبیر اور حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

غزوۂ احد کے بعد یہودِ مدینہ منورہ کی جلاوطنی اور دوسرے غزواتِ خندق

وغیرہ میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ برابر شریک جہاد رہے۔ پھر غزوہ ۶ھ میں پیش آیا، اس میں سیدنا ابوبکر صدیق کی شرکت مشہور و مسلم ہے۔

(باب المشروعانی الجہاد والمصالحہ)

واقعہ حدیبیہ

بعدازاں اسی سال ۶ھ میں واقعہ حدیبیہ پیش آیا۔ اس طرح کہ پوشیدہ اطلاع رساں کے ذریعے معلوم ہوا کہ قریشِ مکہ اہلِ اسلام کے ساتھ مقاتلہ و مقابلہ کے لیے تیاری کر رہے ہیں۔ بیت اللہ کی زیارت کرنے سے یقیناً مانع ہوں گے، احکامِ زیارت ادا نہیں کرنے دیں گے۔ تو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو جمع فرما کر مشورہ کیا جس میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی رائے ان الفاظ میں پیش کی:

یا رسول اللہ خرجت عامدا لھذا البیت لا ترید قتل احد ولا حرب فتوجہ لہ فمن صدنا قاتلناہ قال صلی اللہ علیہ وسلم امضوا علی اسم اللہ۔
(بخاری شریف ص۶۰۰ ج۲)

یعنی آپ بیت اللہ کی زیارت کا مقصد لے کر مکہ میں جانا چاہتے ہیں، کسی کو قتل کرنے اور جنگ کرنے کا آپ کا ارادہ نہیں ہے، بے شک آپ اس مبارک ارادہ پر مکہ تشریف لے چلیے۔ جو شخص بھی اس میں مانع ہوگا اس کے ساتھ ہم جنگ کریں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جرأت مندانہ جواب سن کر فرمایا کہ اللہ کا نام لے کر چلو، دیکھا جائے گا۔

حدیبیہ کے مقام میں مسلمان پہنچے تو کفار پیش قدمی کر کے حرم میں ... ہونے سے مانع ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے گو مقصدِ سفر واضح کیا گیا کہ "بیت اللہ کی زیارت ہے اور متعلقہ احکام کی ادائیگی، اور کچھ مقصد نہیں۔ نہ حملہ ہے نہ جنگ کا ارادہ ہے" مگر کفار کے ساتھ جب اصرار سے بات چیت ہوئی تو

ٹھہرا کہ ایک معاہدہ یا صلح نامہ لکھا جائے، اس کو جانبین تسلیم کرلیں۔ صلح نامہ جب لکھا گیا اس میں چند ایسے دفعات مان لیے گئے جو بظاہر مسلمانوں کے مفاد کے خلاف معلوم ہوتے تھے اور ان میں ایک قسم کی مغلوبیت کا پہلو نمایاں نظر آتا تھا۔ ان حالات کو دیکھ کر حضرت عمرؓ فاروق اور دیگر اصحاب نہایت برہم ہوئے کہ باوجودیکہ ہم حق پر ہیں اور دشمن باطل پر، پھر ایسی کڑی شرائط کیسے تسلیم کر رہے ہیں۔ اسی پریشانی کی حالت میں فاروقِ اعظم حضرت ابوبکر صدیق کی خدمت میں تشریف لائے اور عرض کیا کہ "یہ شرائط بظاہر بڑی دشوار اور مسلمانوں کے حق میں مشکلات بڑھانے والی ہوں گی، اس کے متعلق کیا خیال ہے؟؟"

تو حضرت صدیق محرم رازِ نبوت نے عمرؓ فاروق رضی اللہ عنہ کو بڑی تسلّی دلائی، فرمایا کہ

انه لرسول الله وليس يعصى ربه وهو ناصره فاستمسك بغرزه فوالله انه على الحق۔

(بخاری شریف ص۳۸۰، جلد اول، باب شروط فی الجہاد)

یعنی آنحضور چونکہ اللہ کے رسول ہیں، خداوندِ قدوس کے حکم کے ماتحت یہ سب کچھ کر رہے ہیں، یہ خدا کی نافرمانی نہیں کر سکتے۔ خداوندِ تعالیٰ ہی اس کا مددگار ہے۔ حق ہماری طرف ہی ہے کچھ فکر کرنے کی ضرورت نہیں، اس میں ہی مصلحت خداوندی ہے۔

فتح مکّہ

بعدازاں واقعہ خیبر پیش آیا۔ اس میں صدیق رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ فتح خیبر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ اللہ تعالیٰ نے فرمائی۔ پھر ۸ھ فتح مکہ کے موقع پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ تشریف لائے تو اس وقت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے بوڑھے والد ابو قحافہ (عثمان بن عامر) کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر کے

مشرف بہ اسلام کرایا۔ ابو قحافہ پیرانہ سالی کی وجہ سے نابینا ہو چکے تھے۔ جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنے والد کا ہاتھ پکڑ کر ساتھ لا رہے تھے تو آنحضور ﷺ نے ازراہ نوازش فرمایا کہ

هلا تركت الشيخ في بيته حتى آتيه۔ — یعنی ادھر تکلیف دینے کی ضرورت نہیں تھی، یہ شیخ وہیں ٹھہرے ہوتے میں خود ان کے پاس چلا جاتا۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: آپ کی طرف اس کا چل کر آنا اس سے بہتر ہے کہ آپ بہ نفسِ نفیس اس کی طرف تشریف لے جانے کی تکلیف کریں۔ پھر آپ نے ابو قحافہ کے سینہ پر اپنا ہاتھ مبارک پھیر کر نورِ اسلام سے منور فرمایا اور ساتھ ارشاد ہوا کہ اس کے سفید بالوں کو ذرا متغیر کر دو مگر سیاہ نہ کر دینا۔

(اصابہ فی معرفتہ الصحابہ وبہامشہ الاستیعاب ص ۴۵۳، ۴۵۴)

غزوۂ حنین

فتح مکہ سے واپسی پر بنوہوازن سے جنگ کی نوبت پیش آئی جس کو غزوۂ حنین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس غزوہ میں بھی صدیق رضی اللہ عنہ شامل ہیں اور ان ثابت قدم رہنے والے اصحاب میں ہیں جنہوں نے دشمن کے حملہ کے وقت پورا پورا مقابلہ کر کے دشمن کو پسپا کر دیا۔

غزوۂ تبوک

۹ ہجری میں رومیوں کے متعلق مشہور ہوا کہ مسلمانوں پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں۔ ان دنوں مسلمانوں کی نہایت تنگ حالت تھی، مسلسل جنگوں کی بناء پر کافی مشقت اٹھائے ہوئے تھے۔ خرچ اخراجات کی شدید کمی تھی۔ مصارفِ جہاد کے لیے چندہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ آنحضور ﷺ نے فراہمی مال کے متعلق ارشاد فرمایا۔

حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ ذکر کرتے ہیں کہ "اس موقع پر اتفاقاً مجھے کچھ مال ہاتھ لگا تھا، میں نے دل میں کہا کہ آج آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چندہ پیش کر کے ابوبکر صدیق سے سبقت لے جاؤں گا۔" تمام مال میں سے نصف مال گھر چھوڑ کر آئے اور نصف باقی ساتھ لے کر حاضرِ خدمت ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا کچھ چھوڑ آئے ہو بال بچوں کے لیے؟ تو میں نے عرض کی: کل اثاثہ میں سے نصف مال یہاں حاضر کر دیا ہے اور نصف اہل و عیال کے لیے باقی چھوڑا ہے۔ پھر صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنا مال ماحضر حاضر کر دیا۔ ارشاد ہوا: قال ما ابقیت لاھلک قال ابقیت لھم اللہ ورسولہ۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اہل و عیال کے لیے کیا چھوڑ کر آئے؟" صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ "یارسول اللہ! اللہ اور اس کا رسول ان کے لیے چھوڑ آیا ہوں۔"

حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اخلاص کا یہ عالم دیکھ کر کہا کہ "صدیق پر میں کبھی سبقت نہیں لے جا سکتا۔"

(ابوداؤد شریف، کتاب الزکوٰۃ، مجتبائی، جلد اول، ص ۲۴۳)

حج کی امارت ۹ ہجری میں

اسی سال ۹ ہجری میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ادائے حج کے لیے امیرِ حج بنا کر روانہ کیا۔ قریباً تین سو صحابہ ساتھ تھے اور بعد میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو چند ضروری اطلاعات کی تشہیر و تلقین کے لیے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی سیادت و قیادت کے ماتحت روانہ فرمایا۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صرف اعلانات ہی حج کے موقع پر کیے ہیں، باقی خطباتِ حج (جو خاص امیرِ حج کا کام ہوتا ہے) موقعہ بموقعہ سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ نے پڑھے ہیں۔ محقق ابنِ کثیر عماد الدین نے اپنی تفسیر اور اپنی مشہور و مسلم تاریخ البدایہ والنہایہ میں اس مسئلہ کو واضح کر کے تحریر کیا ہے۔ البدایہ کے چند الفاظ درج ذیل ہیں:

فخرج علی ابن ابی طالب علی ناقه رسول الله صلی الله علیه وسلم العضباء حتی ادرک ابابکر الصدیق فلما راه ابوبکر قال امیر او مامور؟ فقال بل مامور مضیا فاقام ابوبکر للناس الحج۔
(البدایہ والنہایہ ج۵ خامس ص۳۷)

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی عضباء نامی پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سوار ہو کر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پیچھے سے آملے۔ جب صدیق نے دیکھا کہ حضرت علی آپہنچے تو دریافت کیا کہ امیرِ حج تجویز ہو کر آپ تشریف لائے ہیں؟ یا آپ کسی خاص کام کے لیے مامور ہوئے ہیں؟ تو حضرت علی نے کہا کہ میں ایک خاص کام کے لیے مامور ہو کر پہنچا ہوں۔ پھر دونوں حضرات مل کر مکہ تشریف لے گئے اور ابوبکر کی قیادت میں لوگوں نے حج ادا کیا۔

حجتہ الوداع ۱۰ ہجری میں ہوا ہے۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب تھے اور تمام سفر میں، جلوت و خلوت میں، شریکِ حال رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس آخری حج کے بعد ماہ محرم سالم گزرا اور صفر ۱۱ ہجری کے اواخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت ناساز ہوئی اور یہی مرضِ آخر انتقال کا سبب بنا۔ اس مرض کو مرض الوفات سے تعبیر کرتے ہیں۔ مرض الوفات سے کچھ پہلے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ میں ایک خطبہ ارشاد فرمایا تھا، اس میں ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو دنیا و آخرت میں سے ایک کو پسند کرنے کا اختیار عطا فرمایا ہے پھر اس بندے نے آخرت کو دنیا پر ترجیح دے دی ہے۔ اس ارشاد کے سننے پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فوراً رونے لگے۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے رونے پر تعجب کیا کہ نبی کریم نے ایک بندے کی آخرت کو پسند کرنے کی خوشخبری دی ہے اور یہ رو رہے ہیں۔ دراصل بندہ سے مراد خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور ابوبکر نے ہی سب سے پہلے اپنے کمالِ علم کی وجہ سے اس سفرِ آخرت کی وجہ کو معلوم کیا۔
(بخاری شریف جلد اول)

صدیق کا امام مقرر ہونا بحکمِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم

اس خطبہ کے بعد (جس میں لطیف و باریک اشارات آنحضرت کے وصالِ مبارک کی طرف تھے) جناب رسولِ خدا جلد ہی بیمار ہوئے اور مرض دن بدن بڑھتا ہی گیا۔ حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخری ایام میں حضرت عائشہ صدیقہ کے حجرہ سے مسجد میں تشریف نہ لے جا سکتے تھے، تو نماز کی امامت کے لیے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابہ کرام میں سے صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو منتخب فرمایا۔ جب بلال نے آکر نماز کی اطلاع کی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مروا ابابکر فلیصل بالناس۔ یعنی ابو بکر کو کہا جائے کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔

روایات میں ہے کہ اس وقت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اتفاقاً موجود نہیں تھے۔ بعض اصحاب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کہہ دیا کہ اس وقت آپ نماز پڑھائیں۔ حضرت عمر نماز پڑھانے لگے۔ چونکہ حضرت عمر زوردار آواز والے تھے جناب نبی کریم کو آواز پہنچی تو دریافت فرمایا کہ ابو بکر کہاں ہیں؟

یابی الله ذالک والمسلمون یابی الله ذالک والمسلمون۔ یعنی اللہ تعالیٰ اور مسلمان صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بغیر کسی کی امامت پر راضی نہیں۔

پھر حضرت ابو بکر صدیق کو آدمی بھیج کر بلوایا گیا اور آپ نے آکر نماز پڑھائی۔

(البدایہ والنہایہ ص۲۳۲، ج۵)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک میں دورانِ مرض الوفات آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق صدیقِ اکبر نے بالاختلاف بیس نمازیں اور بالاتفاق علماء محدثین (مورخین) سترہ نمازوں میں تمام مسلمانوں کی امامت فرمائی۔ (البدایہ والنہایہ ابن کثیر ص۲۳۵-۵۲۰، ج۵) یہ امامتِ صغریٰ فضیلت صدیق کا زبردست نشان ہے جس نے

امامتِ کبریٰ (خلافت) کا راستہ صاف کر دیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ موجود تھے جو امامت کی اعلیٰ صلاحیت رکھتے تھے، حضرت عباسؓ سگے چچا موجود تھے۔ عالم، فاضل اور معمر بھی تھے۔ اسی طرح دیگر صحابہ کرامؓ گوناگوں صلاحیتوں کے مالک موجود تھے، بایں ہمہ اسلام کے اس اہم ترین فریضہ کے لیے قرعہ انتخاب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے حق میں ہونا خداوندِ تعالیٰ کے حکم سے معلوم ہوتا ہے۔ اسی واضح نشان کو خلافتِ صدیقی کی حقانیت ثابت کرتے ہوئے خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی پیش کیا ہے جیسا کہ اپنی جگہ اس کا ذکر آ رہا ہے۔

صدیقی خلافت کے شواہد

معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے ساتھ ساتھ ہی دوسرے شواہد بھی صدیقی خلافت کی حقانیت کے لیے روایاتِ صحیحہ میں موجود ہیں، ان میں سے چند ایک یہاں ذکر کیے جاتے ہیں۔

(۱) حضرت انس فرماتے ہیں کہ قبیلہ بنی مصطلق نے مجھے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں اس لیے بھیجا کہ آنحضور ﷺ سے دریافت کیا جائے کہ آپ کے بعد صدقاتِ مال ہم کس کے ہاں پیش کریں؟ تو میں نے حضور کی خدمت میں پیش ہو کر اس امر کو دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا کہ "ابوبکر کے ہاں۔"

(تاریخ الخلفاء سیوطی بحوالہ حاکم)

(۲) اسی طرح دوسرا واقعہ احادیث میں مذکور ہے کہ ایک عورت حضور نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں آپ کے ہاں حاضرِ خدمت ہوئی۔ کوئی چیز طلب کرنا چاہتی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ "پھر کسی وقت آنا۔" تو عورت کہنے لگی: "یاحضرت! اگر میں حاضر ہوں اور آپ موجود نہ ہوں تو؟" (اس کا اشارہ آنحضور ﷺ کے وصال کی طرف تھا) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "اگر تو

آئے اور مجھ کو نہ پائے تو ابوبکر صدیق کے پاس جانا' میرے بعد وہ خلیفہ ہیں۔" (تاریخ الخلفاء سیوطی بروایت ابن عساکر)

(۳) ایک دفعہ قبیلہ عمر بن عوف کے درمیان جھگڑا ہوگیا' حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع ہوئی۔ آپ اس قبیلہ کے درمیان صلح کرانے کی خاطر ظہر کے بعد تشریف لے گئے۔ جاتے وقت بلال موذن کو فرمانے لگے: "اگر نماز کا وقت ہوجائے اور ہم مسجدِ نبوی میں نہ پہنچ سکیں تو ابوبکر کو کہنا کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔" جب نمازِ عصر کا وقت ہوا تو بلال نے حسبِ دستور اذان کہی اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور کے ارشاد کے مطابق نماز پڑھائی۔

(سیوطی بحوالہ ابوداؤد)

(۴) اسی مرض الوفات میں (نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ) ابوبکر کو بلاؤ' ان کے لیے ایک مکتوب لکھ دیا جائے تاکہ کوئی بعد میں ابوبکر کے معاملہ میں اختلاف پیدا نہ کرے اور ہماری تمنا کے خلاف کوئی دوسری خواہش نہ پیدا کرسکے۔ پھر خود ہی یہ کہہ کر ارادہ ملتوی فرما دیا کہ اللہ تعالیٰ اور مومنین ابوبکر کے بغیر دوسرے کسی کو نہیں منظور کریں گے اور نہ ہی کسی پر راضی ہوں گے۔

(تاریخ الخلفاء للسیوطی بحوالہ امام احمد و مسلم' البدایہ والنہایہ ص۲۲۸' ج۵)

(۵) آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی وفات سے صرف پانچ روز پہلے آخری خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور شرافت صحابہ کرام کے سامنے بیان فرمائی:

ان امن الناس علی فی صحبہ ومالہ ابوبکر۔

یعنی تمام لوگوں میں سے مجھ پر ابوبکر نے بہت احسان کیا ہے۔ تمام عمر میری صحبت و سنگت میں گزاری ہے اور اپنا سارا مال اس نے میرے لیے قربان کر ڈالا ہے۔

پھر فرمایا کہ مسجدِ نبوی میں اندر آنے کے لیے جو جو دریچے تم لوگوں نے رکھے ہوئے ہیں وہ سب کے سب بند کر دیئے جائیں مگر صرف ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دریچہ جو مسجد کی جانب ہے وہ کھلا رہے۔ (بخاری شریف و دیگر کتب احادیث)

فیہ اشارہ الی الخلافہ لیخرج منھا الی الصلوہ بالمسلمین۔ (البدایہ والنہایہ ص۲۳۰ ج۵) یعنی اس حدیث میں خلافتِ صدیق کی طرف اشارہ ہے کہ مسلمانوں کو نماز پڑھانے کے لیے اس دروازہ سے مسجدِ نبوی میں تشریف لایا کریں گے۔ یہاں علامہ ابنِ کثیر صاحب البدایہ نے ایک باریک بات ذکر کی ہے جو نہایت قرینِ قیاس ہے، وہ یہ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر صدیق کے لیے ایک مکتوب تحریر فرمانے کا ارادہ ظاہر فرمایا لیکن اس کو ملتوی کر دیا اور مذکورہ الفاظ فرما دینے کے بعد میں یہ آخری خطبہ یوم الخمیس کو ارشاد فرمایا جس میں فضیلت صدیقی کا نہایت واضح بیان ہے۔ علامہ موصوف فرماتے ہیں کہ

لعلت خطبہ ھذہ کانت عوضا عما اراد ان یکتبہ فی الکتاب۔	آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مکتوب صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے حق میں تحریر فرمانا چاہتے تھے، اس کے قائم مقام یہی خطبہ ارشاد فرمایا۔

گویا یہ علیٰ رؤس الاشہاد حقیقت واضح کر دی گئی کہ نیابتِ نبوت کی اولین مستحق یہی کامل ترین ہستی ہے۔

پھر آخری دوشنبہ کے روز جس دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوتی ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو صبح کی نماز پڑھا کر حضور کی عیادت کے لیے عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ہاں گئے۔ اس دن شدتِ مرض اور درد سے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ افاقہ تھا اور اسی روز آپ نے صبح کی نماز کے وقت اپنے حجرۂ مبارک کے دریچہ کا پردہ اٹھا کر جو اس وقت جماعت ہو رہی تھی اس کو ملاحظہ فرمایا۔ لوگوں نے خیال کیا کہ حضور شاید مسجد میں تشریف لانا چاہتے ہیں۔ ابوبکر صدیق امام تھے، وہ بھی اپنی جگہ سے پیچھے سرکنے لگے مگر سب کو رسول کریم نے اشارہ سے اپنی

ہی جگہ رہنے کا حکم فرمایا۔ حضرت ابوبکر صدیق اس عیادت کے بعد مدینہ کے باہر سخ کے مقام میں، جہاں ان کی ایک بیوی حبیبہ بنت خارجہ رہتی تھیں اور اس دن ان کی باری تھی، سواری پر سوار ہو کر چلے گئے۔ ان کے بعد نبی کریم کا ضحیٰ کے وقت وصال ہوگیا۔ ایک قیامت برپا ہوگئی۔ حیرانی و دہشت کا عالم سب پر طاری تھا۔ بعض لوگ کہنے لگے کہ حضور کا وصال ہوگیا ہے اور بعض لوگوں کو وفات کا یقین نہیں آیا۔ اس پریشانی کے عالم میں ایک شخص سالم بن حبیبہ کو سخ کے مقام میں حضرت صدیق کی طرف دوڑایا گیا تاکہ اس حادثہ کی اطلاع کرے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ اس ہوشربا خبر ملنے پر فوراً وہاں سے مسجد نبوی پہنچے۔ دیکھتے ہیں کہ تمام لوگ مضطرب و متحیر ہیں اور حضرت عمر فرط حیرت و دہشت کی وجہ سے حضور کی وفات کی خبر سننا برداشت ہی نہیں کر رہے تھے۔ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ بڑے تحمل سے آگے بڑھ کر پہلے حجرۂ شریف میں داخل ہوتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر چادر ڈال کر ڈھانپ دیا گیا ہے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ رُخِ انور سے چادر الگ کر کے چہرہ کا مشاہدہ کرتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوچکا تھا۔ رو پڑے اور جبینِ مبارک پر بوسہ دیا۔

واسفاہ یارسول اللہ...... پھر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ حجرہ سے باہر مسجدِ نبوی میں صحابہ کرام کے پاس تشریف لے گئے۔ وہاں بڑے استقلال و ثبات کے ساتھ لوگوں کو افہام و تفہیم شروع کی۔ پہلے حمد و ثنا کی پھر فرمایا:

وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل، الخ۔ (پارہ ۴)

کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزرے ہیں۔ اگر یہ رسول فوت ہو جائیں یا قتل کیے جائیں کیا تم لوگ دین سے پھر جاؤ گے۔

اور فرمایا: جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ زندہ ہے اس پر موت نہیں آ سکتی اور جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا پس وہ بے شک فوت ہوچکے ہیں۔ اسی طرح حضرت صدیق کی افہام و تفہیم پر لوگوں کو یقین ہوگیا کہ حضرت کا وصال ہوگیا

ہے۔ اس کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کی طرف سے مجمع ہوا۔ خلیفہ کون ہونا چاہیے؟ اس پر بحث بڑی طول پکڑ گئی۔ حضرت صدیق اور فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو اس کا علم ہوا کہ مسئلہ بڑی اہمیت پکڑ رہا ہے، اس کا فیصلہ بہرکیف ہونا چاہیے ورنہ مسلمانوں کے مابین افتراق و انتشار کا سخت اندیشہ ہے۔ دونوں حضرات مصلحت وقت اور اہمیت مسئلہ کو دیکھتے ہوئے فوراً مسئلہ خلافت طے کرنے کی خاطر اس مجمع انصار میں برموقع تشریف لے گئے۔ مہاجرین و انصار کی اس مسئلہ پر بڑی زوردار بحث ہوئی، آخرکار حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر تمام راضی ہوگئے۔ سب سے فضیلت والے معمر بزرگ یہی ہیں۔ حضور کے آخری برتاؤ اور سلوک، ان سب کا تقاضا یہی ہے کہ اس اہم کام کے یہی اہل ہیں۔ مہاجرین و انصار نے ایک دوسرے سے سبقت کر کے موقع ہی پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت خلافت کر دی۔ تقاضائے وقت کے نازک ترین مسئلہ کو طے کرنے کے بعد پھر صحابہ کرام آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں مشغول ہوئے۔ یہاں یہ بھی ساتھ ساتھ معلوم ہونا چاہیے کہ اگر یہ مسئلہ عمومی امامت اور خلافت کا سب چیزوں سے پہلے طے نہ کیا جاتا تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین جیسے عظیم الشان کام کا بغیر کسی خلیفہ کی سرکردگی کے انجام پانا ہزاروں خرابیوں کا موجب بنتا۔ مثلاً آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کے متعلق رائے مختلف ہو جاتی کہ کہاں نہلایا جائے اور کس طرح نہلایا جائے۔ پھر نمازِ جنازہ کے متعلق اختلاف ہوتا، کچھ لوگ حجرہ شریف سے باہر لا کر جنازہ پڑھنا چاہتے، بعض کہتے کہ وہیں ہو اور کون جنازہ پڑھائے وغیرہ وغیرہ۔ نیز مقامِ دفن کہاں ہو؟ یا جنت البقیع میں ہو؟ جو عام مومنین کی جائے دفن ہے۔ یہ تمام مراحل اختلاف کی گنجائش رکھتے تھے اور اس وقت کسی قولِ فیصل کے بغیر ان کا سرانجام دینا نہایت ہی مشکل تھا۔ جب ایک امیرِ اسلام اور امامِ وقت طے کر لیا گیا، اب اس کے ارشاد کو آخری فیصلہ قرار دے کر تمام امورِ مذکورہ باحسن الوجوہ اور سہل طریقہ سے طے ہوتے گئے۔ جہاں کچھ مسلمانوں کو کسی بات میں اشکال پیش آیا، خلیفہ وقت نے اس کو بہت

عمدہ طریقہ سے سلجھا دیا۔ اس طرح تمام تجہیز و تکفین، جنازہ اور دفن وغیرہ میں کوئی قابلِ ذکر اختلاف واقع نہیں ہوا۔ الحمدللہ علی ذالک۔

صدیقی خلافت کا ابتدائی خطبہ

اس اہم فریضہ یعنی تجہیز و تدفین سے فارغ ہونے کے دوسرے روز مسجدِ نبوی میں صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت عام ہوئی۔ یہ سب لوگ شریکِ بیعت ہوئے اور حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کے امیرِ وقت ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کے سامنے ایک شاندار خطبہ ارشاد فرمایا جو کہ اپنی جگہ نہایت عظیم الشان ہے۔

"فحمد الله واثنى عليه بما هو اهله ثم قال اما بعد ايها الناس فانى قد وليت عليكم ولست بخيركم فان احسنت فعينونى وان اسات فقومونى- الصدق امانت والكذب خيانه والضعيف منكم قوى عندى......الخ"

(ترجمہ:) حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ لوگو! آپ لوگوں پر میں ولی منتخب کیا گیا ہوں حالانکہ میں تم میں سے بہترین نہیں ہوں۔ اگر میں اچھی بات کروں تو آپ میری اس میں امداد کریں۔ اگر خطا کروں تو میری غلطی درست کروا دیں۔ سچائی ایک امانت ہے اور جھوٹ خیانت۔ تمہارا ضعیف میرے نزدیک قوی ہے انشاء اللہ حتیٰ کہ میں اس کے لیے اس کا حق اس پر واپس کرا دوں اور تم میں سے قوی میرے ہاں کمزور ہے یہاں تک کہ میں اس سے دوسروں کا حق پورا کر لوں۔ جو قوم بھی اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ترک کر دیتی ہے اس پر اللہ تعالیٰ ذلت اور رسوائی ڈالتا ہے اور جو قوم بھی علی الاعلان برائی پھیلانے لگ جاتی ہے اللہ تعالیٰ ان کے لیے مصائب اور بُرائیاں عام کر دیتا ہے۔ جب تک میں اللہ اور اس کے رسول

صلی اللہ علیہ وسلم کی تابع داری کروں تو تم بھی میری تابع داری کرو اور جب میں خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت آپ لوگوں کے لیے کوئی واجب نہیں۔ اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائیں نماز کا وقت ہوگیا ہے اب نماز کے لیے اٹھو۔

(البدایہ والنہایہ لابن کثیر ص۲۴۸ ج۵، طبقات لابن سعد ص۱۲۹ ج۳ ق۱)

کتنا پُر مغز اور پُر معنی خطبہ ہے۔ ایک ایک جملہ میں صداقت و امانت کے دریا بہا دیئے ہیں۔

حضرت علی اور دیگر اکابرین کا خلافتِ صدیقی کے ساتھ اتفاق واتحاد

اس مقام پر ایک مستقل بحث اسلامی تاریخ میں پیدا ہوگئی ہے جس میں لوگوں کی طرف سے نہایت بے احتیاطی سے افراط و تفریط کر دی گئی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ حضرات بنوہاشم حضرت علی و حضرت عباس وغیرہما نے دوسرے مسلمانوں کے منتخب خلیفہ کو اپنا خلیفہ تسلیم کیا ہے یا نہیں؟ اگر کیا ہے تو کس نوعیت کا تھا۔ اور پھر کس طرح اس اختلاف کو ختم کر کے جمہورِ اہلِ اسلام کے موافق متفقہ خلیفہ کو خلیفہ تسلیم کر لیا گیا؟؟

بے شک اس مقام پر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے متعلق مختلف روایات مذکور ہیں۔ بعض میں ذکر کیا گیا ہے کہ ان حضرات نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر چھ ماہ کے بعد بیعت کی ہے اور پھر اس تاخیر کی مستقل وجوہ ذکر کی جاتی ہیں اور بعض روایات میں تین دن کے اندر اندر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیعت کرنا ذکر کیا گیا ہے اور محققین علماء نے جو کچھ ذکر کیا ہے وہ بہترین تحقیق و تطبیق ہے جس میں نہ افراط ہے نہ تفریط اور وہ حقیقت کے اعتبار سے بشرط انصاف قابلِ قبول ہے۔

پہلی روایت طبقات ابن سعد کی ہے۔

(۱) جزء ثالث قسم اول میں فرماتے ہیں:

قال علی لما قبض النبی صلی الله علیه وسلم نظرنا فی امرنا فوجدنا النبی صلی الله علیه وسلم قد قدم ابابکر فی الصلوه فرضینا لدنیا نامن رضی النبی صلی الله علیه وسلم لدیننا فقدمنا ابابکر۔

(طبقات ابن سعد ج ۳، ص ۱۳۰، ق ۱)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو ہم نے اس معاملہ میں (نیابت رسول یا خلافت میں) غور و فکر کیا۔ ہم نے دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ہمارا پیشِ نماز بنایا ہے۔ پس ہم دنیاوی معاملے میں بھی اس شخص پر راضی ہوگئے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے دین کے لیے پسند فرمایا تھا۔ تو ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ہم نے مقدم کردیا۔

(۲) عن قیس بن عباده قال قال لی علی بن ابی طالب ان رسول الله صلی الله علیه وسلم مرض لیالی وایاما ینادی بالصلوه فیقول- مروا ابابکر یصلی بالناس فلما قبض رسول الله صلی الله علیه وسلم نظرت فانا الصلوه علم الاسلام وقوام الدین فرضینا لدنیانا من رضه رسول الله صلی الله علیه وسلم فبایعنا ابابکر۔

قیس بن عبادہ کہتے ہیں: مجھے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چند دن بیمار رہے۔ جب آپ کو نماز کی تیاری کی اطلاع کی جاتی تو آپ فرمادیتے کہ ابو بکر سے کہو لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ جب نبی کریم کا انتقال ہوگیا تو میں نے سوچا کہ نماز شعائرِ اسلام ہے اور اس پر دین کا دارومدار ہے، جب اصل دین کے لیے جس ذات کو نبی کریم نے ہمارے لیے پسند فرمایا ہے تو ہم دنیاوی امور کے لیے اسی ذات کو قبول کریں۔ پس ہم نے ابو بکر رضی اللہ عنہ سے بیعت کرلی۔

(الاستیعاب لابن عبدالبر جز ثانی ص ۲۴۲، علی ہامش الاصابہ، مصری)

پس طبقات والاستیعاب کی ہر دو روایات سے ظاہر ہے کہ حضرت علی المرتضٰی

رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم ﷺ کے اس آخری فرمان کو جو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں بار بار ہوتا ہے، قابلِ استدلال و لائقِ استشہاد قرار دیا ہے۔ اسی کے موافق جمہور اہلِ اسلام کے ساتھ موافقت فرما کر برضا و رغبت حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ اسلام تسلیم کیا ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسی ایک خلیفہ کے پیچھے نمازیں ادا کرتے رہے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ اس وقت مسئلہ خلافت پر اختلاف ہوا ہے۔ انصار کا خیال تھا کہ استحقاق میں ہم فائق ہیں، مہاجرین نے اُن سے بحث میں دوسری رائے دی ہے۔ حضرت علی اور حضرت زبیر بن عوام نے جو اظہار کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس انتخاب کو ہم منظور کرتے ہیں۔ یہ خلافت کے قابل ہیں (مگر ہمیں اس معاملے میں اولین مشورے کے لیے نہیں بلایا گیا) اس وجہ سے ہم کو افسوس ہوا ہے۔ علامہ ابنِ کثیر نے اس بحث کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

قال علی و زبیر ما غضبنا الا انا اخرنا عن المشوره وانا نری ان ابابکر احق الناس بها انه لصاحب الغار وانا لنعرف شرفه وخیره ولقد امره رسول الله صلی الله علیه وسلم ان یصلی بالناس وهو حی- (البدایہ والنہایہ ج ۵ ص ۲۵۰)	حضرت علی رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم ناراض نہیں ہوئے مگر اس وجہ سے کہ مشورہ کے وقت ہم پیچھے رہ گئے تھے۔ اس معاملہ کے متعلق ابو بکر کو ہم زیادہ حق دار سمجھتے ہیں۔ وہ صاحبِ غار ہیں، ہم آپ کی شرافت اور خیر و برکت کی قدر کرتے ہیں اور حضور ﷺ نے اپنی زندگی میں ان کو لوگوں کا امام بنایا۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ ان بزرگوں نے اپنی شکر رنجی اور شکایت کا اظہار برموقع کیا مگر ایک شریفانہ طریقہ سے کیا ہے جو ان بزرگوں کے شایانِ شان تھا۔ تمام اہلِ اسلام کے مفاد اور بہتری کو ہر قیمت پر انہوں نے مقدم رکھا اور نبی کریم ﷺ کے اشارات و ارشادات کو صحیح طور پر انہوں نے عملی جامہ پہنایا ہے۔

البتہ یہاں ایک چیز باقی رہ گئی ہے، وہ یہ کہ بعض روایات میں یہ مذکور ہے کہ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ کی وفات کے بعد جا کر ابوبکر سے بیعت کی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چھ ماہ (علیٰ اختلاف الروایات) گزرنے کے بعد ہوئی۔ اس کے متعلق جو کچھ محققین علماء نے ذکر کیا ہے ان سے یہاں صرف دو حوالے ذکر کیے جاتے ہیں جس سے اصل مسئلہ کی بالکل وضاحت ہو جاتی ہے اور ایک انصاف پسند طبیعت کے لیے یقیناً تسلی و تسکین ہو سکتی ہے۔

(ا) علامہ ابنِ کثیر محقق نے البدایہ والنہایہ میں ذکر کیا ہے:

فھذه البیعه التی وقعت من علی لابن بکر الصدیق بعد وفات فاطمه بیعه موکده للصلح الذی وقع بینھما وھی ثانیا للبیعه التی ذکرناھا اولا یوم اسقیفه کما رواه ابن خزیمه وصححه مسلم بن الحجاج ولم یکن علی مجانبا لابی بکر ھذه السته الاشھر ھل کان یصلی وراء ہ ویحضره عنده للمشوره ورکب معه الی ذی القصه۔

(البدایہ لابنِ کثیر ص۲۸۶، جلد خامس)

حضرت فاطمہ کی وفات کے بعد علی المرتضیٰ کا صدیقِ اکبر کے ساتھ اس بیعت کرنے کا جو ذکر آتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بیعت جو ان دونوں کے درمیان واقع ہوئی تھی اس کو مزید پختہ کرنے کی خاطر ہوئی تھی اور یہ بیعت ثانیہ یعنی دوسری بیعت ہے۔ پہلی وہ تھی جو سقیفہ کے دن ہوئی۔ محدث ابنِ خزیمہ نے اس کو ذکر کیا ہے اور مسلم بن حجاج نے صحیح قرار دیا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ان چھ ماہ میں صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ سے بالکل علیحدہ نہیں ہوئے بلکہ ان کے پیچھے ہمیشہ نمازیں پڑھتے رہتے اور صلاح و مشورہ کی خاطر صدیقِ اکبر کے پاس تشریف لایا کرتے تھے اور جیش و فوج میں ضرورت کے وقت ساتھ جایا کرتے تھے۔

(۲) دوسری تحقیق اس کے موافق علامہ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں ذکر کی ہے جو مندرجہ ذیل ہے:

وقد صحح ابن حبان وغیرہ من سعید الخدری وغیرہ ان علیا بایع ابابکر بانہ بایعہ بیعہ ثانیہ موکد- (فتح الباری لابن حجر العسقلانی ج ۷، ص ۳۹۹)

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ابتداء میں بیعت کر لی تھی اور جو بعد کچھ مدت کے بیعت کا ذکر آتا ہے اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ حضرت علی نے صدیقِ اکبر کے ساتھ دوسری بیعت پہلی بیعت کو اور پختہ کرنے کے لیے اور شبہات زائل کرنے کی خاطر کی تھی۔

اور امام قرطبی نے جو بات اس موقع پر ذکر کی ہے وہ لائقِ صد توجہ ہے۔ فرماتے ہیں:

"حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان جو شکر رنجی اور پھر ایک دوسرے سے عذر معذرت ہوئی ہے اگر اس کو منصفانہ نظر سے دیکھا جائے تو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہر ایک بزرگ دوسرے کی بزرگی کا مقر اور تسلیم کرنے والا تھا اور ان کے قلوب آپس میں احترام و محبت پر متفق تھے۔ اگرچہ طبیعت بشری بعض اوقات انسان پر غالب آتی ہے لیکن ان کی دین داری اس کو رد کر دیتی ہے۔"

(تفسیر القرطبی ج ۷ ص ۲۵۹)

ان بزرگوں کے درمیان اس موقع پر جو کچھ بھی کم و بیش اختلاف ہوا ہے وہ للہیت کی بناء پر تھا اور انہوں نے اس کو خود ہی اپنے عمل سے ختم کر ڈالا تاکہ آئندہ امت میں تفریق کی کوئی راہ پیدا نہ ہوسکے۔ ان حضرات کے علوشان کے یہ عین موافق تھا۔ یہ پاک ہستیاں کینہ پرور نہ تھیں، طماع اور لالچی نہ تھے۔ ان تمام کم اخلاقیوں اور اندرونی عداوتوں سے ان کا مقامِ دیانت بالکل بلند تھا۔ اسی وجہ سے یہ

زمانہ خلافتِ راشدہ کے نام سے اسلام میں موسوم ہے یعنی رُشد و ہدایت کا زمانہ۔ واقعی پچھلی امت کے لیے ان لوگوں کی صداقت و دیانت نے مشعل راہ کا کام دیا۔

صدیقی دورِ خلافت کا ایک مسئلہ اور اس کا تصفیہ

اس خلافت اور بیعت خلافت کی بحث کے بعد حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے سامنے جہاں اور اہم مسائل اصلاحِ امت کے متعلق وقتاً فوقتاً پیش آئے ان میں سے ایک مسئلہ قرابت دارانِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت نبوی کا معاملہ ہے یعنی حضرت فاطمہ الزہراءؓ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذریعہ یا بلاواسطہ حقِ وراثت طلب کیا۔ خلیفہ اول کے سامنے اس بات کا پورا خیال تھا کہ حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت حتی الامکان پوری طرح ادا ہو، اس میں کسی قسم کی ناجائز کمی بیشی نہ ہونے پائے۔ ادھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت داری کا لحاظ اور جائز رعایت صحیح طور پر کی جائے گو اس مطالبۂ وراثت کے موقع پر بھی بعض حلقوں نے بلاوجہ بڑی شدومد سے حضرت فاطمۃ الزہراء کی لمبی کشیدگی اور فطری انقباض کو ایسے رنگ میں پیش کیا ہے گویا دنیائے اسلام میں اس سے بڑھ کر کوئی قابلِ اختلاف چیز ہی نہیں اور مابہ الاتحاد اور مابہ الاتفاق کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی حالانکہ ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے متعلق یہ باتیں ہیں کہ

اولاً : حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت زہراءؓ کے مطالبہ کے جواب میں جو رویہ اختیار کیا، کیا وہ جواب معاندانہ ہے جو صدیق نے عرض کیا؟ یا ایسا جواب ذکر کیا جس کو جمہور مسلمین یعنی جمہور صحابہ کرام بمع بنوہاشم نے قبول کیا ہو یا ذاتی اغراض و مقاصد کے تحت انہیں ٹال دیا گیا یا کونسی راہ انہوں نے اختیار کی جس کی وجہ سے وہ موردِ الزام قرار دیئے جاسکتے ہیں۔

اول چیز کے متعلق معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت زہراءؓ کے مطالبہ کے جواب میں صدیقِ اکبر نے یہ ذکر کیا کہ جناب کے والد ماجد کا فرمان عالی شان اس طرح سے

ہے کہ

لا نورث ما ترکناہ صدقہ۔	ہم انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا، ہم جو مال متاع چھوڑ جائیں فی سبیل اللہ صدقہ ہوتا ہے۔

اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے ساتھ ساتھ ذکر کیا، مودت قربی کی پاس خاطر بہرحال منظور ہے۔ فرمایا کہ

والذی نفسی بیدہ القرابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احب ان اصل من قرابتی۔ (البدایہ ص۲۸۶، ج۵)	یعنی قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رشتہ داری اور قرابت میرے نزدیک اپنی برادری و قرابت سے بہت زیادہ محبوب ہے۔

لیکن ساتھ ہی اپنی ذمہ داری (نائبِ رسول ہونے کی عہدہ داری کے پیشِ نظر اور اپنے منصب قائم مقامِ نبوت) کے اعتبار سے صاف طور پر عرض کر دیا کہ

لم اترک امرا صنعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا صنعتہ۔	یعنی جو جو کام خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح ادا فرماتے تھے، وہ اسی طرح سرانجام دیا کروں گا۔
انما یاکل آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم من ھذا المال۔ (البدایہ ص۲۸۶، ج۵)	یعنی حضور کی آل و اولاد اس مال (فی، خمس و فدک وغیرہ) سے بے شک حسبِ دستورِ سابق کھاتی رہے گی اور منتفع ہوتی رہے گی۔

نیز یاد رکھنا چاہیے کہ یہ حدیث جو صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے جواب میں ذکر کی ہے، یہ صرف صدیق کا قول ہی نہیں بلکہ اس کے قولِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہونے پر دس صحابہ کرام حضرت علی المرتضیٰ، حضرت عباس، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت عمر،

حضرت عثمان غنی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم' یہ سب حضرات صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے مؤید (تصدیق کنندہ) ہیں- ایسے مشہور فرمانِ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے ترک کیا جا سکتا ہے- حضرت صدیقِ اکبر اس فرمان پر عملدرآمد کرنے میں بالکل حق بجانب ہیں اور صدیقِ اکبر کی اس صداقت و دیانت داری پر بعد کے خلفاء نے مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے- حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں ان امور یعنی فدک وغیرہ و اموالِ بنی نضیر وغیرہ میں وہی دستور جاری رکھا جو کہ خلیفہ اول نے روا رکھا تھا- اس صدیقی طرزِ طریق کے خلاف سرِ مُو اختلاف نہیں کیا حالانکہ حق داروں کے حقوق ہمارے عقیدے کے موافق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زمانہ خلافت میں صحیح طور پر دلوائے ہیں اور پورا پورا انصاف' انصاف خواہوں کے حق میں کیا ہے- مرتضوی خلافت میں ہمارے نزدیک ہر ایک کے ساتھ برابر انصاف و عدل ہوتا رہا ہے' تو اہلِ بیتِ نبوی اور آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عدل و انصاف تو یقیناً ہونا لازمی تھا اور ہوا اور ضرور ہوا-

پھر دوسری تائید کہ خلافتِ صدیقی کا فیصلہ رشتہ دارانِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں عین انصاف تھا' یہ ہے کہ سیدنا امام حسن نے اپنی ششماہی خلافت میں بھی قرابت دارانِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وہی سلوک روا رکھا جس طرح صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے روا رکھا تھا اور اجتماعی فریقین کی شہادتیں جن کو کبھی بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا خود بنوہاشمی خلفاء کا عمل صدیق کے فیصلہ کے حرف حرف کی تصدیق کر رہا ہے تو خلیفہ اول کیوں موردِ مطاعن ٹھہرے- ع در خانہ کس است ہمیں گفتہ بس ست-

دوسری چیز زہراءؓ کی ناراضگی کا معاملہ ہے تو اس کے متعلق عرض ہے کہ بے شک روایات میں حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کی ناراضگی کا ذکر آیا ہے- انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ جب کوئی بات خلافِ امید و توقع پیش آ جاتی ہے تو ضرور انسان فطرتاً پریشان ہوتا ہے' جائے توقع پر ناراض ہوتا ہے- کئی دفعہ فریقین کی کتابوں میں

حضرت علیؓ و حضرت فاطمہؓ کی کشیدگی کا ذکر آیا ہے مگر یہی کہا جاتا ہے بعد میں صلح و رضامندی ہر دو کے درمیان ہوگئی۔ یہاں بھی صدیق اکبرؓ اور حضرت زہراؓ کی صلح و رضامندی کا ذکر احادیث کی کتب میں موجود ہے، ملاحظہ فرمالیا جائے تاکہ آپ کو تسلی ہو جائے۔ ان دو حضرات کے درمیان کشیدگی ختم ہوگئی تھی۔ وہ بزرگ تو آپس میں راضی ہوگئے، ہم آپس میں بلاوجہ ناراض ہیں۔ الٹی ذہنیت کا کیا علاج ہو؟

ذیل میں محقق علمائے اہلِ سُنّت کی تحقیق درج کی جاتی ہے۔ ایک منصف مزاج آدمی کے لیے یہ کافی ہے۔ بات یہ ہے کہ جہاں روایات میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت زہراءؓ کی کشیدگی کا ذکر آیا ہے وہاں اس کے بعد صلح و رضامندی کا ذکر بھی موجود ہے۔

اول ... عن الشعبی قال لما مرضت فاطمه اتاها ابوبکر الصدیق فاذن علیها فقال علی یافاطمه هذا ابوبکر یستاذن علیک فقالت اتحب ان اذن له قال نعم فاذنت له فدخل علیها فیرضاها... فقال والله ما ترکت الدار والمال والاهل والعشیره الا ابتغاء مرضاه الله مرضاه رسوله ومرضاتکم اهل البیت ثم ترضاها حتی رضیت۔

(البدایہ ص۲۸۹، جلد پنجم، طبع اول)

○ اول: یعنی جب حضرت فاطمہ بیمار ہوئیں، ابوبکر صدیق ان کے پاس آئے۔ اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ حضرت علی نے کہا: یہ ابوبکر ہیں اجازت مانگتے ہیں۔ زہرا نے کہا کہ اے علی! آپ کو منظور ہو تو اندر آ جائیں۔ حضرت علی نے کہا: ہاں! ابوبکر آئے اور حضرت فاطمہ کو راضی کرنے لگے اور کہا کہ اللہ کی قسم! میں نے اپنی اولاد، مال، قبیلہ سب کے سب کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی کے لیے اور آپ لوگوں کی خوشنودی کی خاطر ترک کردیا...... حضرت صدیق اکبر راضی کرتے رہے حتیٰ کہ حضرت زہرا راضی و خوش ہوگئیں۔

○ دوم: یہی روایت علامہ بدر الدین العینی شارح بخاری نے ص۲۳۰ جلد ۱۵ شرح عینی بخاری میں ذکر کی ہے۔

○ سوم: علامہ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری شرح بخاری ص۱۵۱ ج۶ میں ذکر کیا ہے کہ ان ابابکر عاد فاطمہ فقال علی ھذا ابوبکر یستاذن علیک فان اتحب ان اذن لہ قال نعم فاذنت لہ و دخل علیھا فترضاھا۔

(فتح الباری ص۱۵۱ ج۶)

صدیقی معیشت آخری ایام میں

حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ابتدائے خلافت میں سخ[1] کے مقام سے مدینہ میں تشریف لایا کرتے تھے۔ کبھی سوار ہو کر اور کبھی کبھی پیدل بھی مسجدِ نبوی پہنچتے، لوگوں کو نماز پڑھاتے۔ جب عشاء پڑھ لیتے اپنے اہل و عیال میں سخ واپس چلے جاتے۔ بعض اوقات اگر خود نہ پہنچ سکتے تو حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ ان کے قائم مقام مسلمانوں کو نماز پڑھاتے۔ قریباً چھ ماہ کے بعد جناب نے مدینہ میں ہی اقامت اختیار کر لی۔ جناب کی معیشت (گزران) تجارت کے ذریعہ پوری ہوتی۔ صبح کو خود بازار میں چلے جاتے اور حسبِ دستور ضرورت کے موافق تجارت کر لیتے۔ آپ کی چند بکریاں بھی تھیں، گاہے بگاہے ان کو چرانے کے لیے خود چلے جاتے، خود دودھ دوہ لیتے، اپنے پڑوس والوں کو دوہ کر دیتے۔ جب آپ خلیفہ منتخب ہوئے تو پاس والے قبیلہ کی عورتوں نے عرض کیا کہ اب آپ ہماری بکریاں دوہنے کی تکلیف نہ کیا کریں۔ تو آپ نے قسم اٹھا کر فرمایا کہ میں اب بھی دوہا کروں گا، جو کام میں پہلے سرانجام دیتا تھا میں امید کرتا ہوں اس میں فرق نہیں آئے گا۔ جب آپ کا قیام صرف مدینہ میں ہو گیا اور ادھر امورِ خلافت میں مشغولیت بڑھ گئی تو آپ نے فرمایا: اب تجارت کرنا مشکل ہو گیا ہے، اب صرف مسلمانوں کے معاملات میں ہی وقت

[1] جو مدینہ سے باہر تھا اور وہاں ان کی بیوی حبیبہ بنت خارجہ رہتی تھیں۔

صرف ہوگا۔ ان حالات میں مسلمانوں نے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے اخراجات کے لیے اڑھائی ہزار درہم سالانہ مقرر کیا۔ بعض روایات میں اس سے کچھ زائد ذکر کیا ہے، بہرحال خالی خرچہ خوراک اہل و عیال بیت المال سے لیا کرتے اور خرچہ سے زائد واپس فرما دیتے۔ چنانچہ اس کے بعد جب حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کا زمانہ قریب ہوا تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا جو کچھ ہمارے پاس اس وقت بچا ہوا موجود ہے اس کو بیت المال میں واپس کر دو اور میں اپنی فلاں فلاں زمین بیت المال کے لیے وقف کرتا ہوں۔ ان کا بچا ہوا مال (جو بیت المال کے ذریعہ ان کو حاصل تھا) ایک اونٹنی، ایک غلام اور ایک چادر جو پانچ درہم کے برابر تھی، حضرت فاروق رضی اللہ عنہ خلیفہ ثانی کے حوالہ کی گئی تو حضرت عمرؓ فاروق رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے نائب کے لیے بڑا مشکل نمونہ چھوڑا۔ (طبقات ابن سعد ص۱۳۲، ج ۳، ق ۱)

(۲) جب حضرت صدیق رضی اللہ عنہ وفات کے قریب پہنچے تو آپ پر بیت المال کی طرف سے جو خرچ ہوا تھا وہ چھ ہزار درہم کے قریب پہنچ چکا تھا۔ فرمانے لگے: اچھا اس خرچ کو پورا کرنے کے لیے میرا فلاں باغ فروخت کر کے بیت المال کی رقم ادا کر دی جائے مگر بعد از وفات حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اب میں والی ہوں لہٰذا میں تم کو یہ رقم واپس کرتا ہوں۔ (صدیق رضی اللہ عنہ کے وارثوں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ خرچہ واپس نہ لیا ورنہ وہ حسبِ ہدایت ادا کرنا چاہتے تھے) (طبقات ص ۱۳۷، ج ۳)

(۳) آپ کی وفات کے بعد صحابہ کرام حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم بیت المال کی دیکھ بھال کے لیے تشریف لے گئے۔ بیتِ المال میں کوئی درہم و دینار موجود نہیں تھا۔ تھیلیاں جھاڑی گئیں صرف ایک درہم اتفاق سے نکلا۔

(۴) حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت دو برس تین ماہ نو دن رہی۔ جمادی الاخریٰ ۱۳ھ کی سترہ تاریخ کو رات کے وقت جناب کی وفات ہوئی اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوارِ رحمت روضہ مقدسہ میں دفن ہوئے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی مزار حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کی مزار سے پیچھے ہٹ کر بنی ہوئی ہے، تاقیامت انوارِ رحمت میں شریک ہیں۔ آپ کے بعد آپ کے دو لڑکے عبدالرحمٰن و محمد اور دو لڑکیاں حضرت صدیقہ اور اسماء (عبداللہ بن زبیر کی والدہ) تیسری لڑکی صدیق کی وفات کے بعد پیدا ہوئیں ان کا نام امِ کلثوم رکھا گیا۔ رضی اللہ عنہم۔

اولیاتِ صدیقی

وہ امور جن میں اللہ تعالیٰ نے صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو تمام صحابہ کرام میں سب سے اول درجہ پر فضیلت نصیب فرمائی ہے:

(۱) صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ آزاد مردوں میں سب سے اول مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں اور کسی دوست کے ساتھ بغیر مشورہ اور صلاح کے ایمان لائے ہیں۔

(۲) پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی دار (حویلی) کے صحن میں مسجد[۱] بنائی اور اس میں نماز پڑھنے اور قرآن مجید کی تلاوت کرنے کی ابتداء کی۔

(۳) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر جماعت کی صورت میں سب صحابہ سے پہلے نماز پڑھنے کی سعادت حاصل کرنے والے صدیقِ اکبر ہیں۔

(تاریخ الخلفاء سیوطی ص۳۱، طبع لاہور)

(۴) صدیقِ اکبر وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مسجدِ نبوی کی بنیاد سب سے پہلے رقم خرچ کر کے ڈالی اور اپنی طرف سے رقم خرچ کر کے سب اصحاب سے سبقت حاصل کی۔ (یہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ہوا)

(۵) حضرت علی رضی اللہ عنہ ذکر کرتے ہیں کہ اللہ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ پر رحمت فرمائے، وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے قرآن مجید کو دو تختیوں کے درمیان جمع کیا۔

---

[۱] بخاری شریف جلد اول کی شرح میں عینی کے حوالہ سے درج ہے کہ یہ پہلی مسجد ہے جو اسلام میں بنائی گئی۔

(۶) پہلا حج جو اسلام میں ہوا ہے اس میں حضور نبی کریم ﷺ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پہلا امیرِ حج بنا کر روانہ فرمایا پھر آئندہ سال حضور ﷺ حج کو خود تشریف لے گئے۔ (طبقات ابن سعد ص۱۳۵، ج۳، ق اول)

(۷) آنحضور ﷺ کے اس عالم سے رخصت ہونے کے اختیار کی اطلاع پانے پر سب سے اول صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے آنسو جاری ہوئے حالانکہ باقی سب صحابہ ان کی اس حالت پر متعجب تھے کہ نبی کریم ﷺ ایک آدمی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انتقال کے اختیار ملنے کی اطلاع دے رہے ہیں اور صدیق رو رہے ہیں۔ (بخاری شریف ص۵۱۶، جلد اول)

(۸) حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں پہلا شخص ہوں گا (فنا کے بعد قیامت میں) جو زمین سے اٹھوں گا، پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ اٹھیں گے۔

(مشکوٰۃ شریف ص۵۵۶ بحوالہ ترمذی)

(۹) نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ضرور تو وہ پہلا شخص ہوگا جو میری امت میں سے جنت میں داخل ہوگا۔ (مشکوٰۃ شریف ص۵۵۶ بحوالہ ابی داؤد)

(۱۰) صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ، وہ پہلی عظیم شخصیت ہیں کہ اسلام میں خلیفہ رسول اور خلیفۃ المسلمین کے نام سے موسوم ہوئی۔ (تاریخ الخلفاء سیوطی ص۷۴)

خصوصیاتِ صدیقی

یعنی وہ امورِ فضیلت جو خصوصی طور پر حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو ہی حاصل ہیں:

(۱) تمام صحابہ کرام میں سے صرف صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ ہیں جن کی چار پشتیں صحابی ہیں: ابوعتیق محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی بکر الصدیق بن ابی قحافہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ (ازالۃ الخفاء فارسی، مقصد دوم، ص۱۹)

(۲) واقعہ ہجرت جو اسلام میں بہت بڑی فضیلت اور اہمیت رکھتا ہے اس میں

ابتدائے ہجرت سے آخری اوقات تک حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت اور رفاقت میں رہے ہیں۔

(الاصابہ ص ۳۳۵، ج ۲، استیعاب ص ۲۳۴، ج ۲)

(۳) قیامِ غارِ ثور کا شرفِ معیت اور حاضری صدیق کو ہی حاصل ہوئی ہے جس کا ذکر قرآنِ مجید نے ثانی اثنین اذھما فی الغار میں فرمایا ہے۔

(۴) وافقہ فی المشاھد کلھا الی ان مات (اصابہ مع استیعاب ص ۳۳۳، ج ۲) یعنی صدیقِ اکبر سردارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حاضری کے تمام ضروری مواقع میں سب جگہ حاضر رہے ہیں۔ (سفر میں حضر میں) سبحان اللہ علی حسن رفاقتہ۔

(۵) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صحبت اور سنگت کے اعتبار سے اور مال و دولت صرف کرنے کے اعتبار سے تمام لوگوں میں مجھ پر زیادہ احسان کرنے والے ابوبکر ہیں۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سب سے زیادہ محسن ابوبکر ہیں۔

(بخاری ص ۵۱۶، ج ۱)

(۶) "عتیق" (آگ سے آزاد شدہ) کا لقب خصوصی حضرت صدیق کو ہی حاصل ہے۔ حدیث میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جس شخص کو پسند ہے کہ آگ سے آزاد شدہ انسان کو دیکھے وہ ابوبکر کی طرف نظر کرے۔"

(اصابہ ص ۳۳۴، ج ۲، استیعاب ص ۲۳۵، ج ۲)

(۷) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مرض الوفات کے دوران میں آپ نے مسلمانوں کی نماز کے لیے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہی امام بنایا۔ حضور کے حکم سے حضور کے مصلیٰ پر حضور کی حیات میں صدیق ہی امام قرار دیئے گئے ہیں۔

(طبقات ابنِ سعد ص ۱۲۶، جلد ۳، ق اول)

(۸) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات جیسے ہوش رُبا حادثہ اور قیامت خیز واقعہ کے وقت بھی باہوش اور بااستقلال رہنے والے صرف صدیقِ اکبر ہیں جنھوں نے سب کو

صبر کی تلقین کر کے سنبھالا۔

(۹) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک کا بوسہ لینا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہی نصیب ہوا ہے۔ (یعنی بعد از وفاتِ نبوی)

(۱۰) حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری آرام گاہ (قبر شریف) کے بالکل متصل آرام گاہ تاقیامت صدیقِ اکبر کو ہی حاصل ہے۔ مختصر یہ کہ صدیق کا جتنا قرب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس عالم میں تھا اتنا ہی عالمِ برزخ میں ہے، اتنا ہی قیامت میں ہوگا، اتنا ہی بہشت میں بھی۔ (سبحان اللہ)



سیرتِ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

اسمِ شریف

اسمِ گرامی عائشہ ہے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی لختِ جگر ہیں۔ والدہ محترمہ کا نامِ نامی امِ رومان بنت عامر بن عویمر الکنانیہ ہے۔ لقب "صدیقہ" ہے اور کنیت امِ عبداللہ۔ یہ کنیت خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اذن سے اپنے خواہرزادہ عبداللہ بن زبیر کی جانب منسوب ہے۔

(الاستیعاب لابن عبدالبر ص۳۴۸ مع اصابہ لابن حجر، البدایہ والنہایہ لابن کثیر ص۹۱، ج۵)

ولادتِ باسعادت

جناب صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی تاریخِ ولادت ذکر کرنے سے معتبر تواریخ خاموش ہیں البتہ یہ چیز عام تذکرہ نویس ذکر کرتے ہیں اور خود حضرت صدیقہ سے بھی اسی طرح مروی ہے کہ ہجرت سے تین سال قبل چھ برس کی عمر میں ان کی تزویج حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوئی ہے اور ان کی رخصتی نو برس کی عمر میں کی گئی ہے اور حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا وصال جس وقت ہوا اس وقت ان کی زندگی کا اٹھارہواں سال تمام ہو رہا تھا۔

(طبقات ابن سعد ص۴۰-۴۱، جلد ہشتم و استیعاب ص۲۴۸-۲۴۷، کتاب المحبر لابی جعفر بغدادی طبع دکن ص۸۰-۸۱)

ساتھ یہ بھی مسلم ہے کہ حضور علیہ السلام کی بعد از بعثت تیرہ سال مکی زندگی

ہے اور تیرہویں سال ہجرت ہوئی، پھر مدنی زندگی دس سال ہے۔ ان مسلمات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اندازہ یہی ہے کہ حضرت صدیقہ کی ولادت بعثت نبوی کے بعد پانچویں سال ہوئی ہے۔

اہلِ بیتِ نبوت ہونے کا شرف

حضرت ام المومنین خدیجتہ الکبریٰ کے وصال کے قریباً تین سال بعد حضرت عائشہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ شرفِ زوجیت حاصل ہوا ہے۔ ہجرتِ مدینہ سے تین سال قبل خدیجتہ الکبریٰ فوت ہو چکی تھیں۔ ان کے بعد اس مبارک رشتہ کی حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر سلسلہ جنبانی کی گئی۔ حضرت صدیقہ کا اپنا بیان ہے فرماتی ہیں کہ میری تقریبِ نکاح بھی مکہ میں ماہ شوال میں عمل میں لائی گئی اور میری رخصتی بھی جو ہجرت کے ایک سال بعد ہوئی تھی وہ بھی مہینہ شوال میں ہوئی، اسی وجہ سے حضرت عائشہ شوال کے مہینہ کو تقریباتِ نکاح کے لیے پسند فرماتی تھیں۔ (طبقات ابن سعد ص۴۱، ج۸ و استیعاب لابن عبدالبر ص۷۴۴ ج۴)

فضائلِ صدیقہ رضی اللہ عنہا

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ازواجِ مطہرات میں سب سے زیادہ کم سن اور بکر و کنواری بیوی یہی ہیں۔ کل مدۃ العمر سڑسٹھ سال میں صرف ۹ سال آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ عالیہ میں شرفِ باریابی حاصل ہوا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو فطری طور پر وہ عقل و کمال عطا فرمایا تھا کہ بڑے بڑے صحابہ ان کی فضیلت پر رشک کرتے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان فیض ترجمان سے فرمایا کہ عائشہ کو فضیلت دوسری عورتوں پر ایسی حاصل ہے جیسے باقی خوردنی چیزوں پر ثرید کو فضیلت ہے۔

(بخاری شریف ص۵۳۲، ج۱ و مسلم شریف ص۲۸۷، ج۲)

(۲) ام المومنین صدیقہ رضی اللہ عنہا کے فضل و شرف کے واقعات بے شمار

ہیں، ان میں سے چند ایک تحریر کیے جاتے ہیں:

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ حضور نبی کریم ﷺ تشریف فرما تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

هذا جبرئيل يقرئك السلام فقلت وعليه السلام ورحمه الله وبركاته ترى ما لا ارى۔

اے عائشہ! یہ جبرئیل موجود ہیں، تم پر سلام کہتے ہیں۔ میں نے وعلیکم السلام و رحمتہ اللہ کہا۔ یارسول اللہ! آپ تو ان کو دیکھ رہے ہیں مجھے نظر نہیں آ رہے ہیں۔

(بخاری شریف ص۵۳۲، ج۱ و مسلم شریف ص۲۸۷، ج۲ و حلیتہ الاولیاء اصفہانی ص۴۶، ج۲ و طبقات ابن سعد ص۴۶، ج۸)

نو خصال

حضرت صدیقہ چند خصائلِ حمیدہ میں منفرد ہیں، چنانچہ خود بیان فرماتی ہیں:

ولم ينكح بكرا غيرى ولا امراه ابواها مهاجران غيرى وانزل الله براتى من السماء وكان ينزل عليه الوحى وهو معى وكنت اغتسل انا وهو من اناء واحد وكان يصلى وانا معترضه بين يديه وقبض بين سحرى ونحرى وفى ليلتى ودفن فى بيتى۔ (الاصابہ فی معرفتہ الصحابہ ص۳۵۰، ج۴ و طبقات ابن سعد ص۴۳، ج۸، طبع لیڈن)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: نبی کریم ﷺ کے نکاح میں کوئی باکرہ (کنواری) عورت میرے بغیر نہیں آئی اور ایسی بھی کوئی عورت میرے بغیر حضور ﷺ نکاح میں نہیں لائے جس کے ماں باپ مہاجر ہوں اور جب بعض لوگوں یعنی منافقین نے میرے متعلق بہتان تراشی کی تو اللہ تعالیٰ نے میری برأت اور پاک دامنی کا ثبوت آسمان سے نازل فرمایا اور حضور ﷺ پر میرے ساتھ ہونے کی حالت میں بھی وحی آسمانی نازل ہوتی تھی۔ میں اور نبی کریم ﷺ پانی

کے ایک ہی برتن سے غسل کرلیا کرتے تھے۔
میں حضور ﷺ کی نماز ادا فرمانے کی حالت
میں بستر پر سامنے قد دراز رہتی اور آنحضور
ﷺ کا اس عالم سے انتقال اس حالت میں
ہوا ہے کہ میرے پہلو اور صدر کے درمیان
تکیہ لگائے ہوئے تھے۔ حضور نبی کریم ﷺ
کا انتقال بھی میری ہی باری کے اوقات میں
واقع ہوا ہے اور میرے ہی گھر میں حضور علیہ
السلام مدفون ہیں۔

اہلِ علم حضرات خوب جانتے ہیں کہ مذکورہ خصائل ایک ایک کی تائید دوسری متعدد روایات سے ہوسکتی ہے خصوصاً واقعہ افک میں بڑی تفصیلات ہیں۔ حضرت ام المومنین کی خاطر اللہ کریم نے پوری دس آیاتِ قرآن مجید پارہ اٹھارہ سورۂ نور میں عرش سے فرش پر نازل فرما کر اس منزہ و مطہرہ خاتون کی عزت افزائی فرمائی ہے تاکہ اس کی عفت اور پاکیزگی کے تذکرے صبح و شام، روز و شب تمام عالم میں تاقیامت جاری رہیں۔

نیک طینت انسان کے لیے ایک ہی حمیدہ خصلت ام المومنین کی ان کے ساتھ حسنِ عقیدت قائم رکھنے کے لیے کافی وافی ہے اور کج فطرت افراد کے لیے نہ روایاتِ نبوی مفید ہوسکتی ہیں اور نہ آیاتِ قرآنی فائدہ بخش سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اہلِ بیتِ نبوی ﷺ کے ساتھ صحیح عقیدت نصیب فرمائے۔

حضرت صدیقہ اور علمی فضیلت

مسروق ایک مشہور تابعی ہیں، حضرت ام المومنین عائشہ سے روایت کرتے ہوئے حدیث بیان کرتے تو یوں کہا کرتے کہ

حدثتنی الصدیقه بنت الصدیق حبیبه حبیب الله المبرات فی کتاب الله۔

یعنی مجھے صدیق کی صاحبزادی صدیقہ نے، جو حبیبِ خدا کی حبیبہ ہے اور اس کی برأت کتاب اللہ میں بیان کی گئی ہے روایت بیان کی ہے۔

(حلیتہ الاولیاء اصفہانی ص ۴۴، ج ۲ و اصابہ ص ۳۴۸، ج ۴ و طبقات ابن سعد ص ۴۵، ج ۸)

اور یہی مسروق بیان کرتے ہیں: میں نے بڑے بڑے اکابر صحابہ رسول خدا کو دیکھا ہے کہ میراث و فرائض کے مسائل میں حضرت عائشہ کی طرف رجوع کرتے اور ان سے دریافت کرتے تھے۔

(ہدایہ لابن کثیر ص ۹۲، ج ۸ و طبقات ابن سعد ص ۴۵، ج ۵)

علامہ ابن کثیر ام المومنین کے فضائل ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

ومن خصائصها انها اعلم نساء النبی صلی الله علیه وسلم بل هی اعلم النساء علی الاطلاق قال الزهری لو جمع علم عائشه الی علم جمیع ازواجه وعلم جمیع النساء لکان علم عائشه افضل وقال عطا بن ابی رباح کانت عائشه افقه الناس واعلم الناس واحسن الناس رایا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے خصائص میں یہ شمار کیا جاتا ہے کہ آپ ازواج النبی رضی اللہ تعالیٰ عنہن بلکہ تمام عورتوں سے زیادہ علمِ دین رکھتی تھیں۔ زہری کہتے ہیں کہ تمام ازواجِ مطہرات اور تمام عورتوں کے علم کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے علم کا توازن کیا جائے تو عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا علم بڑھ جائے گا۔

قال عروه ما رایت احدا اعلم بفقه ولا بطب ولا بشعر

عطا بن ابی رباح لکھتے ہیں کہ حضرت صدیقہ اپنے زمانہ کے لوگوں سے زیادہ فقیہ

من عائشه۔
(البدایہ والنہایہ، ص۹۲، ج۸)

اور سمجھ دار تھیں اور سب لوگوں سے عمدہ رائے رکھتی تھیں اور عروہ (جو ان کا خواہرزادہ ہے) وہ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ سے بڑھ کر علمِ دین اور طب اور فنِ شعر سے زیادہ واقف میں نے نہیں دیکھا۔

اسی طرح حضرت ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ

ما اشکل علینا اصحاب محمد حدیث قط فسالناه عائشه الا وجدنا عندها منه علما

"ہمیں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابہ کو جب کسی مسئلہ حدیث کے متعلق اشکال پیش آیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے سوال کرنے پر اس کا حل ضرور نکل آیا۔"

ابونعیم اصفہانی نے حضرت عائشہ صدیقہ کے علمی فضائل و کمال بیان کرتے ہوئے ان کے خواہرزادہ عروہ بن زبیر کا قول بسند ذکر کیا ہے۔

ما رایت احدا من الناس اعلم بالقرآن ولا بفریضه ولا بحلال ولا بحرام ولا بشعر ولا بحدیث العرب ولا بنسب من عائشه رضی الله تعالی عنها۔

یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے زیادہ عالم کوئی ایک میں نے نہیں دیکھا جو قرآنِ مجید، فریضہ، حلال، حرام اور شعرو عرب کی روایات اور انسان میں زیادہ ماہر ہو۔

(حلیتہ الاولیاء اصفہانی، ص۴۹، ج۲)

حضرتِ صدیقہ کے تلامذہ

حضرت عائشہ صدیقہ کے علمی تبحر کا اس سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صحابہ کرام کی ایک کثیر تعداد احادیث کو ان سے روایت کرتی ہے۔ چنانچہ علامہ ابنِ

حجر عسقلانی اصابہ فی معرفتہ الصحابہ میں ذکر کرتے ہیں کہ مندرجہ ذیل صحابہ نے ان سے حدیث نقل کی ہے:

(۱) عمر (۲) عبداللہ بن عمر (۳) ابوہریرہ (۴) ابوموسیٰ (۵) زید بن خالد (۶) عبداللہ بن عباس (۷) ربیعہ بن عمرو الجرشی (۸) السائب بن یزید (۹) صفیہ بنت شیبہ (۱۰) عبداللہ بن عامر بن ربیعہ (۱۱) عبداللہ بن الحارث بن نوفل وغیرہم۔

پھر حافظ ابنِ حجر موصوف نے ان حضرات کی فہرست دی ہے جو حضرت صدیقہ کے قریبی رشتہ داروں میں سے ہیں اور ان سے حدیث روایت کی ہے:

(۱) ان کی بہن امِ کلثوم (۲) ان کا رضاعی بھائی عوف بن الحارث (۳) ان کا برادر زادہ قاسم (۴) عبداللہ بن محمد بن ابی بکر (۵-۶) ان کی بھتیجی حفصہ و اسماء بنت عبدالرحمٰن بن ابی بکر (۷) عبدالرحمٰن کا پوتا عبداللہ بن ابی عتیق محمد بن عبدالرحمٰن (۸-۹) بھانجے عبداللہ و عروۃ ابن الزبیر بن العوام (۱۰-۱۱) ان کی خواہر اسماء کے پوتے عباد و حبیب ابناء عبداللہ بن الزبیر (۱۲) عبداللہ بن زبیر کے پوتے عباد بن حمزہ بن عبداللہ بن زبیر (۱۳) ان کی خواہر امِ کلثوم کی لڑکی عائشہ بنت طلحہ۔

(الاصابہ ص۳۵۰ جلد۴)

اس کے بعد حضرت صدیقہ کے موالی[1] کے اسماء ذکر کیے گئے ہیں جو ان سے روایت حدیث کرتے ہیں، پھر بہت سے تابعین کو شمار کیا ہے جو ان سے روایت کرنے والے ہیں۔ غرضیکہ ان تصریحات کے بعد موافق و مخالف ان کی فضیلت علم تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

(اصابہ مذکورہ ص۳۵۰، ج۴ و زرقانی ص۲۳۴، ج۳، شرح مواہب)

تعداد مرویاتِ صدیقہ رضی اللہ عنہا

تلامذہ کا یہ طویل سلسلہ خود بتلا رہا ہے کہ حضرت ام المومنین کے ہاں کلام

[1] غلام، آزاد شدہ ہوں یا مملوک ہوں۔

نبوت کا بہت بڑا ذخیرہ موجود تھا جس کے حصول کی خاطر یہ تشنگانِ علم اہلِ بیتِ نبوت کے دولت کدہ پر جمع رہتے تھے، چنانچہ محدثین نے جہاں اعداد و شمار روایات کے لگائے ہیں وہاں بتلایا ہے کہ حضرت صدیقہ سے مرویات کی تعداد ہزاروں سے اوپر چلی گئی ہے- دو ہزار دو صد دس حدیثیں انہوں نے سینہ نبوت سے حاصل کر کے امتِ مسلمہ کو پہنچائی ہیں- جزاها الله تعالى احسن الجزاء ورضى الله تعالى عنهما رضا دائما- (زرقانی ص ۲۳۴، جلد ۳، علی مواہب اللدنیہ)

حضرتِ صدیقہ کی سخاوت اور زہد

حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فیضِ نبوت سے پورا پورا استفادہ کیے ہوئے تھیں- ان پر شان فقر درویشی غالب تھی- جو کچھ مولا کریم کی جانب سے میسر ہوجاتا اس کو فی سبیل اللہ تقسیم کر دینا مقصودِ زندگی تصور کرتی تھیں- اپنے ذاتی مفاد کے لیے جمع کر رکھنا بالکل گوارا نہ تھا- چنانچہ ذیل میں چند ایک واقعاتِ زہد ذکر کیے جاتے ہیں جو عبرت آموزی کے لیے فائدہ مند ہیں-

(۱) طبقات ابنِ سعد و حلیہ میں عروۃ سے منقول ہے کہ

لقد رايت عائشه تقسم سبعين الفا وانها لترقع حبيب درعها-

حضرت صدیقہ نے ایک دفعہ ستر ہزار درہم تقسیم کر دیا حالانکہ اپنے قمیص کے گریبان میں پیوند لگائے ہوئے تھیں-

(حلیۃ الاولیاء ص ۴۷، ج ۲ و طبقات ابنِ سعد ص ۴۵، ج ۸)

(۲) ایک موقع پر حضرت امیر معاویہ نے ایک صد ہزار درہم صدیقہ کی خدمت میں ارسال کیے تو انہوں نے غروبِ شمس سے پہلے پہلے سب کا سب ہی تقسیم کر ڈالا- اس روز آپ روزہ دار تھیں مگر شام کو افطاری کے لیے کچھ بچانے کا فکر ہی نہیں دامن گیر ہوا- خادمہ نے عرض کیا: آج ایک درہم کا گوشت ہی منگالیا جاتا تو کیا اچھا ہوتا- حضرت صدیقہ نے فرمایا: اگر تقسیم کے وقت یاد دلا دیتی تو ایسا کر ہی لیا

جاتا۔ (حلیتہ الاولیاء ص۴۷، ج۲ و طبقات ابن سعد ص۴۶، ج۸)

(۳) عبدالرحمٰن بن الزبیر نے ایک مرتبہ ایک کثیر اور خطیر رقم حضرت صدیقہ کی خدمت میں ارسال کی جس کے دو گون بھرے ہوئے تھے، اس کو بھی آپ نے فوراً اللہ کی راہ میں بانٹ ڈالا، ذرہ برابر توقف نہیں فرمایا۔ (حلیہ و طبقات)

(۴) نیز فرمایا کرتی تھیں کہ

ما شبعت بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم من طعام الا ولو شئت ان ابکی لبکیت ما شبع آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم حتی قبض۔ (حلیتہ الاولیاء اصفہانی ص۴۶، جلد۲، طبع مصر)

یعنی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب بھی میں نے سیر ہو کر کھانا کھایا ہے کہ حضور ﷺ کی تنگی معیشت یاد کر کے رونا آجاتا ہے۔ اگر اس طرف دھیان لگاؤں کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں تاحین وفاتِ حضور ﷺ کبھی ہم نے سیر ہو کر نہیں کھایا تھا۔

غرضیکہ حضرت صدیقہ کی پاکیزہ زندگی گوناگوں اوصاف سے مملو ہے۔ علم و زہد و تقویٰ، جُود و سخا ہر پہلو سے جناب کی داستانِ حیات مکمل و اکمل ہے۔ ان چند واقعات کے بعد حضرت صدیقہ کی آخری ساعات کا کچھ ذکرِ خیر کر کے ان معروضات کو ختم کیا جاتا ہے۔

وفاتِ صدیقہ رضی اللہ عنہا

حضرت امیر معاویہ کی خلافت کا آخری زمانہ ہے۔ حضرت صدیقہ کے سفرِ آخرت کی تیاری رمضان شریف کے مبارک ماہ میں ہوئی ہے۔ چند ایام بیمار رہی ہیں، ان ایام میں جو لوگ عیادت کے لیے حاضر ہو کر مزاج پُرسی کرتے تو آپ فرماتیں: صالحہ الحمدللہ۔

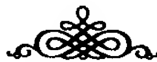
اسی دوران میں عیادت کی خاطر عبداللہ بن عباس نے اجازت طلب کی۔ آپ

نے اجازت دے دی، ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ کسی کی مدح و ثناء کی ضرورت بالکل نہیں ہے۔ ابن عباس نے مزاج پرُسی کے ساتھ ساتھ حضرت عائشہ کے مناقب مختصراً ذکر فرمائے کہ حضور علیہ السلام کے ساتھ اور دوسرے اقرباء کے ساتھ آپ کی عنقریب ملاقات ہونے والی ہے۔ حضور ﷺ کے ازواج میں سے حضور کو محبوب ترین زوجہ آپ تھیں۔ حضور پسندیدہ چیز کو ہی پسند فرمایا کرتے تھے۔ لیلۃ الابواء میں آپ کا ہار گم ہوا اس کی وجہ سے رکنا پڑا۔ لوگوں کے پاس پانی نہیں تھا پس اللہ تعالیٰ نے آپ کی وجہ سے تیمم کا حکم نازل فرما کر آسانی فرما دی اور آپ کی برأت سات آسمانوں کے اوپر سے جبرئیل امین لے کر نازل ہوئے جو مساجد اللہ میں دن رات، صبح شام تلاوت کی جاتی ہے۔ حضرت صدیقہ پر سفرِ آخرت کا فکر غالب آ چکا تھا اس عالم سے دلبرداشتہ ہو چکی تھیں، انہوں نے فرمایا: یا ابن عباس! یہ چیزیں چھوڑیئے، اللہ کی قسم! جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے لوددت کنت نسیا منسیا یعنی اب تو جی چاہتا ہے بالکل نسیاً منسیا ہو جاؤں۔

(طبقات ابنِ سعد ص ۵۲، ج ۸، طبع یورپ)

(نوٹ :) اور بعض دوسری مرویات میں بھی اس قسم کے الفاظ تواضع و انکساری جناب صدیقہ سے مذکور ہیں۔ جناب صدیقہ ۱۷ رمضان شریف ۵۸ھ کو بعد از نمازِ وتر و عشاء اس دارِ فانی سے رخصت ہوتی ہیں۔ نمازِ جنازہ حضرت ابوہریرہ نے پڑھائی اور ان کی وصیت کے موافق اسی شب ان کو جنت البقیع میں دفن کر دیا گیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون O



شعب ابی طالب کے متعلق اعتراض

صحابہ کرام پر طعن کرنے والے لوگ ایک یہ اعتراض حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق تجویز کرتے ہیں کہ

○ عہدِ نبوی کے مکی دور میں مصائب جب شدید تر ہوگئے تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مع دیگر بنی ہاشم کے شعب ابی طالب میں محصور کر دیا گیا۔

○ قومِ قریش کی طرف سے ان شدید مصائب میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے شریکِ حال رہے مگر جناب ابوبکر ان مشکل اوقات میں ساتھ نہ تھے اور رفاقتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ سے قاصر رہے۔

الجواب

مندرجہ بالا اعتراض حقیقت کے برخلاف ہے اور اس موقع کے حالات اس کے موافق نہیں پائے جاتے۔

چنانچہ علماء نے شعب ابی طالب کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذاء رسانی پر قریش مجتمع ہوگئے اور انہوں نے ایک صحیفہ (عہدنامہ) لکھا اور جناب صدیق اس صعب تر وقت میں آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کے شریکِ حال تھے اسی بنا پر اس وقت جناب ابوطالب نے اس واقعہ

کو بصورتِ شعر ذکر کیا ہے، اس میں ابوبکر صدیق کا آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہونا واضح طور پر ثابت ہوتا ہے۔

چنانچہ شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ نے اسی چیز کو بہ عبارت ذیل درج کیا ہے:

...... و ازاں جملہ آنست کہ چوں قریش بر ایذاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جمع شدند و صحیفہ نوشتند۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ دریں مضیق شریک آنحضرت بود۔ لہٰذا دریں واقعہ ابوطالب گفتہ است۔

و هم رجعوا سهل بن بيضاء راضيا
فسر ابوبكر بها و محمد

(ازالۃ الخفاء ص۹۰ ج۲، تحت مآثر صدیق، طبع قدیم، بریلی)

یعنی ابوطالب کہتے ہیں کہ قبیلہ قریش نے سہل بن بیضاء کو راضی کر کے واپس کیا۔ ایک جماعت قریش کی صحیفہ کے نقض اور توڑنے کے لیے کھڑی ہوگئی تھی، ان میں سہل بن بیضاء بھی تھا جو اس وقت مسلمان نہ تھا لیکن بعد میں مسلمان ہوگیا تھا۔

پس اس بات پر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی راضی ہوئے اور ابوبکر صدیق بھی مسرور ہوئے۔

...... مضمون ہذا کو متعدد علماء اور مصنفین نے اپنی تصانیف میں ذکر کیا ہے مثلاً:

(۱) ابن ہشام نے اپنی سیرت میں "حدیث نقض صحیفہ" کے تحت جناب ابوطالب کے وہ اشعار ذکر کیے ہیں جن میں ان لوگوں کی مدح ہے۔ جو اشخاص صحیفہ توڑنے میں پیش پیش تھے ان میں سہل بن بیضاء بھی تھا۔ وہاں یہ شعر مذکور درج ہے۔

(سیرت ابن ہشام ص۳۷۹، جلد اول، تحت حدیث نقض صحیفہ، طبع ثانی، مصر)

(۲) البدایہ لابن کثیر ص۹۸، جلد ثالث، تحت ذکر نقض الصحیفہ، طبع اول، مصر۔

(۳) الاستیعاب لابن عبدالبر ص۹۴، جلد ثانی (مع الاصابہ) تحت ذکر سہل بن بیضاء۔

تائید از شیعہ علماء

شیعہ کے مشاہیر علماء نے بھی واقعہ ہذا کو اپنی تصانیف میں ذکر کیا ہے۔ چنانچہ سردست ہم ایک حوالہ شیعہ کی مشہور تاریخ سے نقل کرتے ہیں:

مرزا محمد تقی لسان الملک (الشیعی) در ناسخ التواریخ گفتہ کہ یکم محرم ۷ بعثت نبوی در شعب ابی طالب رفتہ بودند و سہ(۳) سال در و ماندند۔ ابو طالب اشعار گفتہ کو در آخر او گوید ؎

و هم رجعوا سهل بن بيضاء راضيا

فسر ابوبكر بها و محمد

(ناسخ التواریخ ص ۶۲۲، ج ۵، تحت حالات شعب ابی طالب، طبع قدیم، ایران)

مطلب یہ کہ مرزا تقی لسان الملک اپنی تاریخ میں تحریر کرتے ہیں کہ یکم محرم سات بعثت نبوی میں (جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بمع اپنے ساتھیوں کے) شعب ابی طالب میں گئے اور تین سال تک اس گھاٹی میں محبوس رہے۔ اس موقع پر ابوطالب نے اشعار کہے جن کا آخری یہ شعر ہے ؎

و هم رجعوا سهل بن بيضاء راضيا

فسر ابوبكر بها و محمد

حاصل کلام یہ ہے کہ واقعہ شعب ابی طالب میں جہاں بنی ہاشم حضرت شامل و شریک رہے وہاں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ از خود اس مصیبت میں شریک ہوئے اور شعب ابی طالب میں چلے گئے اور وہیں رہے اور اس واقعہ کے مصائب برداشت کرنے میں ہرگز قاصر نہیں رہے۔

معترض لوگوں نے جو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق عدم شرکتِ واقعہ کا طعن قائم کیا ہے وہ سراسر واقعات کے برخلاف ہے اور سنی و شیعہ علماء دونوں کے بیانات اس اعتراض کی تردید کرتے ہیں۔

لہ الحمد وعلیہ الصلوہ والسلام

آیتِ غار اور صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے خصوصی فضائل

سورۃ توبہ پارہ دہم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حق میں "خصوصی نصرت" کا ذکر فرمایا ہے اور یہ وہ موقع ہے جب کفارِ مکہ کی طرف سے مخالفانہ حالات شدید تر ہوگئے تھے اور آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کرنے کی اجازت ملی تھی۔

اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا فرمان نازل ہوا:

الا تنصروہ O فقد نصرہ اللہ اذ اخرجہ الذین کفروا O ثانی اثنین اذ ھما فی الغار O اذ یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ معنا O فانزل اللہ سکینتہ علیہ وایدہ بجنود لم تروھا O	اگر تم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد نہیں کرو گے (تو کیا حرج ہے، پیغمبر کا کامیاب ہونا تم پر کچھ موقوف نہیں) ایک وقت پہلے ایسا گزر چکا ہے کہ جب کفار نے ان کو ایک دوسرے ساتھی سمیت نکال دیا تھا۔ جب یہ دونوں حضرات غار میں تھے اور پیغمبر اپنے ساتھی کو

وجعل کلمه الذین کفروا السفلی وکلمه الله هی العلیاO والله عزیز حکیمO (التوبہ : پ۱۰)

فرما رہے تھے کہ تو غم نہ کھا بے شک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص اطمینان اس پر اتارا اور اس کو ایسے لشکروں کے ساتھ مدد دی جن کو تم لوگ دیکھ نہیں رہے تھے اور کافروں کی بات کو اللہ تعالیٰ نے فرو کر دیا اور خدا کا سخن ہمیشہ بلند ہے۔ اللہ تعالیٰ زبردست غالب و حکمت والا ہے۔

اس واقعہ کو "واقعہ ہجرت" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کی تفصیلات تفاسیر احادیث اور سیرت کی کتابوں میں مفصل مذکور ہیں۔ ہم یہاں اختصاراً آیت ہذا کے متعلق خلاصہ ذکر کرتے ہیں، اس کے بعد ہم آیت ہذا کی تشریح کے لیے ذیل میں چند ایک فوائد ذکر کرتے ہیں ان کو بغور ملاحظہ فرمائیں۔ ان میں حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے فضائل و کمالات کا ثبوت ہے اور یہاں ان کی نشاندہی کرنا مقصود ہے۔

آیتِ غار سے متعدد فوائد مستنبط ہوتے ہیں، پہلے ان کو ذکر کیا جاتا ہے اس کے بعد دیگر چیزوں کا بیان ہوگا۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)

(۱) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ثانی درجہ میں ہیں اور ثانی اثنین کے لقب سے سرفراز ہیں--- یہ چیز اولین نیابت اور پہلی خلافت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیت کی طرف مشیر ہے۔

(۲) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ زندگی کے سخت ترین مراحل اور نازک ترین لمحات میں جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق اور مصاحب رہے ہیں۔ یہ چیز آں موصوف رضی اللہ عنہ کے خلوص اور اخلاص کے نشانات میں سے ہے اور ان کی ذات پر اعتمادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی علامت ہے کیونکہ اعتماد کے بغیر ایسے وقت میں کسی کو رفیقِ سفر نہیں بنایا جا سکتا۔

(۳) قرآن مجید کی اس نص میں جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے

پیغمبر کا صاحب فرمایا ہے جبکہ کسی دیگر شخص کو صاحبِ نبی نہیں فرمایا اور اس مقام میں "صاحب" کا معنی ہم نشین ہے، پس اس چیز سے آں موصوف رضی اللہ عنہ کی کمال فضیلت کا اظہار ہو رہا ہے۔

(۴) جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رفیق ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تسکینِ خاطر کے لیے لا تحزن کے کلمات فرمائے۔ چونکہ جناب صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کا حُزن و ملال اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تھا اس سے آں موصوف رضی اللہ عنہ کی آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کمال محبت واُلفت کا ثبوت پایا جاتا ہے۔

(۵) جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر الصدیق کو فرمایا: ان اللہ معنا یعنی اللہ تعالیٰ کی معیت (بصورتِ نصرت و حفاظت) ہمارے ساتھ ہے۔

اس میں جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ کی معیت (بصورتِ نصرت و حفاظت) میں اپنے ساتھ شریک کرنا آں موصوف رضی اللہ عنہ کے کمال ایمان کی دلیل ہے کیونکہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے جس طرح کی معیت (بصورتِ نصرت و حفاظت) حاصل ہوئی بالکل وہی معیت جناب صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو بھی حاصل ہوئی۔

مختصر یہ کہ مندرجہ تمام امور صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے حق میں امورِ فضیلت ہیں۔ حق تعالیٰ نے ان کو قرآن مجید میں ذکر فرمایا ہے تاکہ نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کے ذکرِ مبارک کے ساتھ جنابِ صدیق رضی اللہ عنہ کے ذکرِ خیر کی بھی یاد ہمیشہ تازہ رہے۔



"ثانی اثنین" کا لقب صحابہ کرام کی نظروں میں

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام مجید میں "ثانی اثنین" کے لفظ سے ذکر فرمایا ہے اور یہ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے لیے خصوصی فضیلت اور لقب ہے۔

مفسرین حضرات یہاں "ثانی" کے لفظ سے جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات مراد لیتے ہیں۔ یہ اس کلمہ کا ایک مفہوم ہے لیکن ایک دوسرا مفہوم یہ ہے کہ "ثانی اثنین" میں ثانی کا لفظ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے لیے استعمال کیا گیا ہے یعنی دو شخصوں میں سے دوسرے شخص سمیت کافروں نے نکال دیا...... الخ

اس صورت میں "ثانی" سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مراد لینا درست ہے۔ ذیل میں اس پر قرائن پیش کیے جاتے ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اپنے کلام اور تکلم میں حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو "ثانی اثنین" کے لقب سے ذکر کرتے تھے۔ اس کی چند ایک مثالیں پیش کرتے ہیں، ان مقامات سے ظاہر ہوگا کہ "ثانی اثنین" کا لقب صحابہ کرام حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں صحیح تصور کرتے تھے اور آں موصوف رضی اللہ عنہ کو اسی صفت کے ساتھ یاد کرتے اور ان کے لیے اس شرف کا اعتراف کرتے اور اس میں

ان کی نیابت و خلافت کی طرف اشارہ پاتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کلام

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیعت کرنے کے موقع پر ایک کلام کیا تھا، اس میں آں موصوف رضی اللہ عنہ کے صفات شمار کیے اور کہا:

ان ابابکر صاحب رسول الله صلی الله علیه وسلم و ثانی اثنین وانه اولی المسلمین بامورکم فقوموا فبایعوه...الخ۔

یعنی ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحب اور ہم نشین ہیں اور ثانی اثنین ہیں اور تم مسلمانوں کے معاملات کے متعلق سب سے اولیٰ ہیں۔ پس اٹھو اور ان کے ساتھ بیعت کرو...الخ۔

درج ذیل مقامات میں محدثین اور اہلِ سیرت نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خطبہ ہذا کو ذکر کیا ہے، ملاحظہ ہو:

(۱) المصنف لعبد الرزاق ص ۴۳۷-۴۳۸، ج ۵، باب بداء مرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۲) بخاری شریف ص ۱۰۷۲، ج ۲ کتاب الاحکام باب الاستخلاف، طبع نور محمد، دہلی۔

(۳) المصنف لابن ابی شیبہ ص ۵۶۶، ج ۱۴، باب ما جاء فی خلافتہ ابی بکر رضی اللہ عنہ، طبع کراچی۔

(۴) سیرۃ ابنِ ہشام ص ۶۶۱-۶۶۰، جلد ثانی تحت خطبہ عمر رضی اللہ عنہ قبل ابی بکر رضی اللہ عنہ عند البیعت العامہ۔

(۵) الاعتقاد علی مذہب السلف البیہقی ص ۱۷۷، طبع مصر، تحت بحث ہذا۔

(۶) کتاب الثقات لابنِ حبان ص ۱۵۷، ج ۲، تحت استخلاف ابی بکر رضی اللہ عنہ۔

حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کا قول

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بیعت کے معاملہ میں ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو بیعت خلاف قبول کرنے پر آمادہ کرنا چاہا تو حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا:

... اتبا یعنی وفیکم الصدیق وثانی اثنین- یعنی تم میرے ساتھ بیعت کرنا چاہتے ہو؟ حالانکہ تم میں الصدیق اور "ثانی اثنین" موجود ہیں-

(طبقات ابن سعد ص۱۲۸، ج۳، قسم اول تحت تذکرۃ الصدیق، طبع لیڈن، کنز العمال لعلی متقی الہندی ص۱۴۰، ج۳، تحت کتاب الخلافۃ مع الامارۃ طبع اول دکن، بحوالہ ابن سعد وابن جریر)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ دونوں کا قول

فقالا (عمر و ابوعبیدہ) واللہ لا نتولی ھذا الامر علیک فانک افضل المھاجرین و ثانی اثنین انھما فی الغار وخلیفہ رسول اللہ علی الصلوہ- والصلوہ افضل دین المسلمین فمن ذاینبغی لہ ان یتقدمک' الخ-

(تاریخ ابن جریر الطبری، ص۲۰۹، ج۳، باب ذکر الخبر عما جری بین المھاجرین والانصار فی امر الامارۃ فی سقیفہ بنی ساعدۃ)

یعنی جس وقت مہاجرین اور انصار میں خلافت کے معاملہ میں گفتگو ہوئی تھی اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس معاملہ میں اپنی معذرت کرنا چاہی تو اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ دونوں نے فرمایا: اللہ کی قسم! اس معاملے کا آپ کو چھوڑ کر ہم (کسی دوسرے کو) والی نہیں بنانا چاہیے کیونکہ آپ افضل المہاجرین ہیں اور ثانی اثنین ہیں جبکہ دونوں حضرات غار میں تھے اور نماز پر بھی آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ اور قائم مقام ہیں حالانکہ

نماز مسلمانوں کے دین کی افضل چیز ہے، پس کس کے لیے مناسب ہے جو آپ سے مقدم ہو سکے؟؟ یعنی آپ سے مقدم ہونا کسی کے لیے لائق نہیں۔

شیعہ کی طرف سے تائید

اور شیعہ علماء میں سے ابن ابی الحدید نے اپنی کتاب شرح نہج البلاغہ جلد اول، ص۲۸۵، جلد ششم، طبع قدیم، بحث ہذا میں لکھا ہے کہ

... فقال عمر و ابو عبیدہ ما ینبغی لاحد من الناس ان یکون فوقک انت صاحب الغار ثانی اثنین وامرک رسول اللہ بالصلوہ۔ فانت احق الناس بھذا الامر۔

یعنی حضرت عمر اور ابو عبیدہ نے ابو بکر صدیق کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اس وقت کوئی شخص آپ پر فائق نہیں۔ آپ صاحبِ غار ہیں اور ثانی اثنین (دو میں سے دوسرے درجہ میں) ہیں اور خدا کے رسول نے تمہیں نماز پڑھانے کا حکم دیا تھا۔ پس آپ خلافت کے معاملہ میں سب لوگوں سے زیادہ حقدار اور مستحق ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قول

کنز العمال میں بحوالہ خیثمہ بن سلیمان روایت ہے کہ

... عن حمران قال عثمان ابن عفان ان ابابکر الصدیق احق الناس بھا یعنی الخلافہ۔ انہ صدیق و ثانی

یعنی حضرت عثمان فرماتے ہیں کہ تحقیق ابو بکر صدیق خلافت کے معاملہ میں زیادہ حقدار ہیں۔ وہ صدیق ہیں، ثانی اثنین ہیں اور صاحبِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اثنین و صاحب رسول اللہ۔ (ہم نشین) ہیں۔

(کنزالعمال لعلی متقی الہندی، ص۱۴۰، ج۳، بحوالہ خیثمہ فی فضائل الصحابہ روایت نمبر ۲۳۳۱، کتاب الخلافہ، باب الاول (خلافت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ) طبع اول، دکن)

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بن العوام کا قول

جب خلافت و نیابت کے معاملہ میں گفتگو ہوئی تو ان دونوں حضرات نے فرمایا:

... انا نری ان ابابکر احق الناس بہا۔ انہ لصاحب الغار و ثانی اثنین۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی ص۱۵۳، ج۸، الاعتقاد علیٰ مذہب السلف للبیہقی ص۱۷۹، طبع مصر)

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ مسئلہ خلافت کی بحث میں فرماتے ہیں کہ ہم تمام لوگوں میں سے خلافت کا زیادہ حقدار ابوبکر صدیق کو جانتے ہیں کیونکہ وہ صاحبِ غار اور ثانی اثنین ہیں۔

حضرت ربیعہ بن کعب رضی اللہ عنہ کا قول

مسند امام احمد رحمتہ اللہ علیہ میں یہ واقعہ درج ہے کہ ایک بار ربیعہ بن کعب الاسلمی رضی اللہ عنہ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایک نخلہ (کھجور) کے متعلق وقتی طور پر تنازع پیش آیا تھا۔ ربیعہ کے قبیلہ کے لوگ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق کچھ شکوہ شکایت کرنے لگے تو ربیعہ نے ان کو فہمائش کرتے ہوئے کہا کہ

... اتدرون ما ہذا؟ ہذا ابوبکر الصدیق ہذا ثانی اثنین ہذا ذو شیبہ المسلمین....الخ۔

یعنی ربیعہ نے کہا: کیا تم جانتے ہو کہ ان کا کیا مقام ہے؟ یہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، یہ ثانی اثنین (ثانی درجہ میں) ہیں اور یہ مسلمانوں کے شیخ اور بزرگ ہیں...الخ۔

(مسند امام احمد ص۵۹-۵۸، جلد رابع، تحت مسندات ربیعہ بن کعب الاسلمی)

حضرت ربیعہ کا مطلب یہ تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک اعلیٰ و ارفع

مقام و مرتبہ پر فائز ہیں، ان کی شکایت کرنا درست نہیں۔

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا قول

روایات کی کتابوں میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ تو نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی کچھ اشعار کہے ہیں تو کہو تاکہ ہم بھی سن لیں۔ تو حسان رضی اللہ عنہ کہنے لگے:

و ثانی اثنین فی الغار المنیف
وقد طاف العدو به اذ صعد الجبلاء
وکان حب رسول الله قد علموا
من البریه لم یعدل به رجلا

(دیوانِ حسان ص۲۴۰، طبع مصر، ازالہ الخفا لشاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ، ص۹۹، جلد اول، تحت مسند حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ)

ان اشعار کا مفہوم یہ ہے کہ بلند غار میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ دو شخصیتوں میں سے دوسرے شخص تھے اور جب یہ پہاڑ پر چڑھے تو دشمن نے اس غار کا چکر لگایا۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب ہیں اور لوگوں نے یقین کر لیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو ان کے برابر نہیں قرار دیا۔

مختصر یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اپنی گفتگو اور کلام میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو "ثانی اثنین" کے لقب سے ذکر کرتے ہیں یعنی صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ثانی درجہ میں ہیں اور کلمہ ثانی اثنین میں "ثانی" حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ ہی مراد ہیں۔

قاعدہ یہ ہے کہ باب تفسیر میں اقوالِ صحابہ کرام حجت شرعی قرار دیئے جاتے ہیں۔

فلہذا "ثانی اثنین" کے مفہوم کی وضاحت میں صحابہ کرام کے مندرجہ بالا

اقوال حجت شرعی کے درجہ میں ہیں۔

اس لیے یہ بات بالکل درست ہے کہ اس مقام میں "ثانی" سے مراد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ ان کا لقب درست ہے اور یہ ان کی صفت صحیح ہے اور صحابہ کرام اس چیز کا اعتراف کرتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو "ثانی اثنین" کے لقب سے پکارتے تھے اور اس میں صدیقی خلافت کی طرف اشارہ پاتے تھے۔

ایک نحوی ضابطہ

آیت ہذا کی تشریح کے سلسلہ میں یہ بات ذکر کر دینا فائدہ سے خالی نہیں کہ آیت میں ثانی اثنین کی نصب کس بنا پر ہے؟

عام طور پر یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ یہ نصب ثانی اثنین کو حال بنانے کے طور پر ہے لیکن حال بنانے کی توجیہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ثانی اثنین نہیں بنتے بلکہ ثانی حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنتے ہیں حالانکہ صحابہ کرام کے متعدد ارشادات ہم نے پیش کر دیئے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ "ثانی اثنین" ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔

فلہذا

یہاں بہتر توجیہ یہ ہے کہ ثانی اثنین میں "ثانی" منصوب بہ نزع الخافض ہے۔ یعنی جر دینے والے حرف کو یہاں گرا دیا گیا ہے، اس کے گرا دینے کے بعد ثانی منصوب ہے۔

عبارت اس طرح ہوئی:

اذ اخرجہ الذین کفروا بثانی اثنین اور با بمعنی مع مستعمل ہے۔

اس با کے گرا دینے کے بعد ثانی منصوب بہ نزع خافض ہے اور اس کا ترجمہ یوں ہوگا "جس وقت کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کافروں نے ثانی شخص سمیت شہر سے نکال دیا۔"

نوٹ

منصوب بہ نزع الخافض کی مثالیں قرآن مجید میں متعدد مقامات میں پائی جاتی ہیں مثلاً:

(۱) واختار موسی قومه سبعین رجلا لمیقاتنا... (الخ) (پ۹)

اس مقام میں اصل میں من قومه ہے اور من کو گرا کر قومه کو منصوب پڑھا جاتا ہے۔

(۲) واقعدوا لهم کل مرصد۔ (سورۃ توبہ)

یہاں کل مرصد منصوب بہ نزع الخافض ہے۔ اصل میں فی کل مرصد ہے۔ یہاں فی کو گرا کر کل کو منصوب پڑھا جاتا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ اسی طریقہ سے "ثانی اثنین" میں ثانی منصوب بہ نزع الخافض ہے اور نحوی ترکیب کے اعتبار سے صحیح ہے، اس میں کوئی سقم نہیں۔

لفظ "ثانی" اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ

گزشتہ سطور میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے "ثانی فی الغار" کا مسئلہ ذکر کیا گیا ہے، اب ہم اس چیز کی مزید وضاحت پیش کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ثانویت (ثانی ہونے کی) خصوصیت قدرتِ کاملہ کی طرف سے بہت سے دیگر مقامات میں بھی حاصل ہوئی۔ مثلاً:

(۱) ثانی فی الاسلام ...... قبولِ اسلام میں آں موصوف رضی اللہ عنہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بعد دوسرے شخص ہیں۔

(۲) ثانی فی الهجره ...... جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ہجرت کرنے میں آپ رضی اللہ عنہ دوسرے درجہ میں ہیں۔

(۳) ثانی فی عریش بدر ...... مقامِ بدر میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے لیے تیار کیے جانے والے عریش میں آنجناب ﷺ کی معیت میں بیٹھنے والے دوسرے شخص ہیں اور عریش چھاتہ کو کہتے ہیں۔

(۴) ثانی فی الامامه بالصلوه ...... جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق آنجناب ﷺ کی موجودگی میں نماز کی امامت کرنے والے آں موصوف رضی اللہ عنہ، دوسرے درجہ میں ہیں۔

(۵) ثانی فی مقبره النبی ﷺ ...... جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر میں دفن ہونے میں آں موصوف رضی اللہ عنہ، کا دوسرا درجہ ہے۔

(۶) ثانی فی دخول الجنه ...... جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کے مطابق جنت میں داخل ہونے والے آپ رضی اللہ عنہ، دوسرے شخص ہوں گے، وغیرہ وغیرہ۔

سفرِ ہجرت اور آیتِ غار کے متعلق شیعہ اکابر کے بیانات

سابقہ سطور میں ہم نے آیتِ غار کے متعلق چند چیزیں ذکر کی ہیں جن میں حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ، کے فضائل اور کمالات کا ثبوت پایا جاتا ہے۔

اس کے بعد ہم اسی سفرِ ہجرت اور آیتِ غار کے متعلق شیعہ اکابر کے بیانات ذکر کرتے ہیں جن میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، کی جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس مبارک سفر میں معیت اور مصاحبت پائی جاتی ہے اور حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ، کا آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریکِ سفر ہونا ثابت ہوتا ہے اور اسلام میں یہ مبارک سفر بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

اس سلسلہ میں ہم چند ایک حوالہ جات شیعہ کتب سے پیش کرتے ہیں تاکہ اصل واقعہ کی صحت کے ثبوت میں کوئی اشتباہ باقی نہ رہے اور فریقین کے بیانات کے ذریعہ صدیق رضی اللہ عنہ، کی عظمت کا مسئلہ از رُوئے قرآنِ مجید پختہ ہو جائے۔

شیعہ کے مشہور قدیم مفسر شیخ ابوعلی الفضل بن حسن الطبرسی اپنی تفسیر مجمع

البیان میں آیتِ غار کی تفسیر کے تحت بیان کرتے ہیں کہ

الا تنصروه فقد نصره الله- معناه ان لم تنصروا النبی علی القتال قتال العدو فقد فعل الله به النصر اذ اخرجه الذین کفروا من مکه فخرج یرید المدینه ثانی اثنین یعنی انه کان هو وابوبکر اذ هما فی الغار ولیس معهما ثالث ای وهو احد اثنین ومعناه فقد نصره الله منفردا من کل شئی الامن ابی بکر والغار الثقب العظیم فی الجبل واراد به هنا غار ثور وهو جبل بمکه اذ یقول لصاحبه ای یقول الرسول لابی بکر لا تحزن ای لا تخف ان الله معنا یرید ان مطلع علینا عالم بحالنا وهو یحفظنا وینصرنا-

اس کا مطلب یہ ہے کہ دشمن کے قتال پر اگر تم لوگ نبی اقدس ﷺ کی مدد نہ کرو گے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی مدد کر دی جبکہ پیغمبر ﷺ کو کفار نے مکہ سے نکالا اور آپ مدینے کا ارادہ کر کے نکل پڑے- ثانی اثنین یعنی پیغمبر (ﷺ) اور ابوبکر (رضی اللہ عنہ) تھے جبکہ یہ دونوں غار میں تھے اور ان دونوں کے ساتھ تیسرا شخص نہیں تھا- معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی مدد کی در آں حالیکہ وہ سوائے ابوبکر کے سب سے منفرد تھے اور "جبل" میں ایک بڑا شگاف تھا اس سے مراد "غارِ ثور" ہے جو مکّہ کے پہاڑ میں ہے جبکہ پیغمبر (ﷺ) اپنے ساتھی ابوبکر سے کہتے تھے کہ نہ غم کھا نہ خوف کر، اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے- مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے مطلع ہے اور ہمارے حال کا عالم ہے، وہ ہماری حفاظت کرے گا اور ہماری مدد کرے گا-

(تفسیر مجمع البیان الطبرسی الشیعہ ص ۵۰۴، تحت آیتِ غار، پ۱۰، طبع قدیم ایران)

بیانِ بالا سے معلوم ہوا کہ

(الف) اللہ تعالیٰ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرتے وقت اپنے پیغمبر ﷺ

اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خاص مدد اور نصرت فرمائی ہے۔

(ب) غارِ ثور میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی تیسرا شخص نہیں تھا اور آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ غم نہ کھا اور خوف نہ کر اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے' وہ ہمارے حال سے مطلع ہے اور وہی ہماری حفاظت اور مدد فرمائے گا۔

(۱) مختصر یہ ہے کہ اس سفرِ ہجرت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصی معیت اور غار میں رفاقت کا شرف حاصل ہوا جو کسی دیگر شخص کو نصیب نہیں ہوا۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے آں موصوف رضی اللہ عنہ کو "صاحبِ رسول" کے لقب سے سرفراز فرمایا' یعنی ابوبکر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی اور ہم نشین ہیں۔

نیز "ثانی" اور "صاحب" کے الفاظ اس طرف مشیر ہیں کہ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت اور قائم مقامی کی صلاحیت اور ان کی جانشینی کی اہلیت رکھتے ہیں۔

شیعہ کے شیخ الطائفہ ابو جعفر الطوسی اپنی تصنیف "امالی" میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ

قال لما توجه رسول الله ﷺ الى الغار و معه ابوبكر- امر النبى ﷺ عليا عليه السلام ان ينام على فراشه ويتوشح ببردته- (الخ)

یعنی انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) غار (ثور) کی طرف متوجہ ہوئے تو ابوبکر (رضی اللہ عنہ) ان کے ساتھ تھے۔ اس موقع پر نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے علی علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ ان کے بستر پر سو جائیں اور آپ کی چادر کو اوڑھ لیں۔

(امالی للشیخ الطوسی ص۶۱' ج۲' تحت الجزء السادس' ص۹۶ عشر' طبع نجف اشرف)

یہاں سے معلوم ہوا کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

اپنے بستر پر سونے کا حکم فرمایا اور سفرِ غار کی طرف متوجہ ہوئے اور حضرت ابوبکر صدیق آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس سفر میں شریک تھے۔

اسی مسئلہ میں شیخ طوسی واقعہ ہجرت کی تفصیل بیان کرتے ہوئے آگے چل کر لکھتے ہیں کہ

ومضی حتی اتی الی هند و ابی بکر فانهضهما فتهضا معه حتی وصلوا الی الغار- ثم رجع هند الی مکه لما امر به رسول الله (ﷺ) ودخل رسول الله (ﷺ) وابوبکر الغار-	یعنی (جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر تشریف لے گئے) تو ہند[1] اور ابوبکر کے پاس جا پہنچے اور انہیں اٹھایا اور وہ دونوں آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے حتیٰ کہ ہر سہ حضرات غار تک جا پہنچے۔

(امالی الشیخ الطوسی ص۸۱، ج۲، تحت جزء السادس عشر، طبع نجف اشرف)

اس کے بعد ہند (ابن ابی ہالہ) مکہ کی طرف واپس آگیا اس لیے کہ آنجناب ﷺ نے اس کو واپسی کا حکم فرما دیا اور خود جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (دونوں) غار میں داخل ہوئے، الخ۔

امام حسن عسکری کے شاگرد اور کلینی کے استاد شیعہ کے مشہور مفسر شیخ علی بن ابراہیم القمی نے اپنی تفسیر قمی میں آیتِ غار کے تحت امام جعفر صادق کی ایک روایت ذکر کی ہے کہ

قال (ابو عبدالله علیه السلام) لما کان رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم فی	یعنی جب جناب رسول اللہ ﷺ غار میں تشریف فرما تھے تو جناب نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو فرمایا گویا کہ میں جعفر بن ابی طالب

[1] ہند ابن ابی ہالہ، جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب تھے یعنی حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے سابق شوہر کے فرزند تھے۔

الغار قال لابی بکر کانی انظر الی سفینہ جعفر واصحابہ تقوم فی البحر وانظر الی الانصار مختبئین فی افنیتھم فقال ابوبکر تراھم یارسول اللہ! قال: نعم- قال فارنیھم فمسح علی عینیہ فراھم فقال لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انت الصدیق... الخ- (تفسیر قمی تحت آیتِ غار (پ۱۰، سورۃ توبہ) طبع قدیم ایران)

اور اس کے ساتھیوں کی کشتی کو سمندر میں کھڑے دیکھ رہا ہوں اور انصار کی طرف نظر کر رہا ہوں جو اپنے مکانوں کے صحنوں میں چھپے بیٹھے ہیں- اس پر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: یارسول اللہ! آپ ان کو دیکھ رہے ہیں؟ تو آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں! دیکھ رہا ہوں- اس کے بعد ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مجھے بھی یہ منظر آپ دکھائیں، پس آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا، پس ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان کو دیکھ لیا- تو اس وقت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابو بکر! تم صدیق ہو- (تم نبوت کے معجزات کی تصدیق کرنے والے ہو)

روایتِ ہذا سے مندرجہ ذیل چیزیں معلوم ہوئیں کہ

(۱) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو غارِ ثور میں معیت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حاصل ہوئی-

(۲) معجزۂ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے تصدیق کی-

(۳) اس موقع پر ابو بکر رضی اللہ عنہ کو "صدیق" کا لقب زبانِ نبوت سے حاصل ہوا-

تنبیہہ

(۱) ایک بات یہاں قابلِ ذکر ہے کہ تفسیر قمی کی مندرجہ بالا روایت کو تفسیر قمی کی حالیہ طبع (طبع جدید ایران) سے طابعین اور ناشرین نے خارج کر دیا ہے- اس کی وجہ اور کوئی نظر نہیں آتی سوائے اس کے کہ اس میں فضیلت صدیق بطریق اتم ثابت ہوتی تھی اور وہ ان لوگوں کو ناگوار ہے-

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ مذکورہ سفینہ والی روایت جو آیتِ غار کے تحت ان کے ائمہ سے مروی ہے وہ شیعہ کے متعدد مصنفین نے ذکر کی ہے۔ ان میں یہاں صرف دو حوالہ جات پیش کیے جاتے ہیں:

(الف) روضہ کافی ص ۱۲۳، طبع قدیم نو لکشور لکھنؤ۔

(ب) تفسیر صافی لمحمد بن مرتضیٰ ملقب بہ فیض کاشانی سورۃ توبہ تحت آیتِ غار ص ۲۰۷۔ ان مقامات میں حضرت جعفر کی سفینہ والی روایت ان کے ائمہ سے مفصل منقول ہے، جو حضرات تسلی کرنا چاہیں ان مقامات کی طرف رجوع کر لیں۔

فائدہ

ناظرین کے افادہ کے لیے یہ بات ذکر کر دینا مفید ہے کہ اس روایت میں بعد والے شیعہ لوگوں نے پوری روایت ذکر کرنے کے بعد آخر میں ایک جملہ بڑھا دیا ہے کہ

فاضمر تلك الساعه انه ساحر۔　یعنی ابوبکر نے اس وقت دل میں یہ بات چھپا رکھی کہ یہ نبی جادوگر ہے، اس نے اپنی جادوگری سے یہ منظر دیکھا اور دکھایا ہے۔

تاکہ تمام روایت بے کار اور بے اعتبار ہو جائے کیونکہ اس روایت سے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور خلافت کی حقانیت نمایاں طور پر ثابت ہوتی تھی اور یہ بات ان لوگوں کو کسی طرح منظور نہیں تھی۔

ایک غیر جانبدار دانش مند آدمی مذکورہ بالا تمام روایت پر نظر کرنے سے خوب سمجھتا ہے کہ یہ جملہ اپنی طرف سے روایت کو بے کار کرنے کے لیے اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت بخشے۔

غور فرمایئے!!

کہ معاذ اللہ اگر نبی جادوگر تھا تو ابوبکر (رضی اللہ عنہ) اس نبی کے ساتھ اس قدر شدائد و مصائب برداشت کر کے شریکِ سفر کیوں ہوئے؟؟ آرام سے گھر بیٹھے رہتے، قومِ قریش کی مخالفت و عداوت نہ مول لیتے۔

دیگر یہ چیز قابلِ توجہ ہے کہ پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایسے شخص کو رفاقت و مصاحبت کے لیے منتخب کر کے کیوں ساتھ لیا جو ان کو ساحر اور جادوگر خیال کرتا ہے۔

نیز اللہ نے اپنے پیغمبر کو اطلاع نہ کردی کہ یہ آپ کا صاحب (ساتھی) تو آپ کو ساحر قرار دیتا ہے، ایسے بدباطن اور بداندیش شخص کو رفاقت میں نہ لیں۔

آخر کلام

مذکورہ آیتِ غار کے مفہوم اور معنی کو اہلِ سُنّت و شیعہ صاحبان کے بیانات کی روشنی میں ہم نے مختصراً بیان کیا ہے۔

اس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کمال فضیلت پائی جاتی ہے اور ان کی دینی عظمت کا عمدہ ثبوت ہے اور ان کی حقانیت خلافت کی طرف نشاندہی ہوتی ہے۔

جناب سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے سفرِ ہذا کی تمام خدمات اخلاص کے ساتھ سرانجام دیں اور حقِ رفاقت بطریقِ احسن ادا کیا۔

اس سے بڑی فضیلت اور کیا ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکرِ خیر اپنے کلامِ مجید میں نازل فرمایا جو ہمیشہ ہمیشہ سے تلاوت کیا جاتا ہے اور تلاوت کیا جاتا رہے گا۔



عدم شرکتِ جہاد کا اعتراض

بعض لوگوں کی طرف سے حضرات شیخین رضی اللہ عنہما پر یہ اعتراض وارد کیا جاتا ہے کہ دورِ نبوت میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کسی جیش کے امیر نہیں بنائے گئے اور نہ ہی انہوں نے کوئی قتال کیا اور نہ ہی جہاد میں مجروح و مضروب ہو کر اجر و ثواب کے مستحق ہوئے اور غزوات میں ان کو امیرِ جیش کے منصب پر فائز نہ کرنا ان کی نااہلی اور عدم لیاقت کی دلیل ہے۔

الجواب

اعتراض کرنے والوں نے مذکورہ بالا جو اعتراض قائم کیے ہیں یہ محض عناد اور عداوت کی بناء پر تجویز کیے ہیں اور خلافِ واقعہ ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مقدس میں متعدد بار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اسلامی جیوش اور لشکروں کے امیر بنائے گئے اور جہاد کیا اور بعض مواقع پر مجروح و مضروب بھی ہوئے۔

چنانچہ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل چند واقعات پیش کیے جاتے ہیں جن میں یہ مسئلہ واضح طور پر منقول ہے۔

حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلقات

ایک مشہور صحابی سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ ذکر کرتے ہیں کہ ہم نے قبیلہ بنی فزارة

کی طرف جہاد کیا اور جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم پر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر فرمایا۔ جب ہم ایک تالاب پر پہنچے تو جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہمیں رات کے قیام کا حکم دیا۔ ہم رات کو ٹھہر گئے۔ اس کے بعد صبح کو ہم نے مختلف اطراف سے اس قبیلہ پر حملہ کر دیا۔ وہاں تالاب کے نزدیک جو لوگ تھے انہیں قتل کیا اور کچھ افراد کو قید کر لیا...... سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ہم اس واقعہ میں جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے اور آں موصوف رضی اللہ عنہ کے زیر کمان جہاد میں مصروف تھے۔

مسند امام احمد رحمتہ اللہ علیہ میں ہے کہ

قال (سلمه بن اكوع) بعث رسول الله صلى الله عليه وسلم ابابكر الى فزاره وخرجت معه حتى اذا دنونا من الماء عرس ابوبكر حتى اذا صلينا الصبح امرنا فشننا الغاره- فوردنا الماء فقتل ابوبكر من قتل ونحن معه' الخ-

(۱) مسند امام احمد ص۵۱، ج۴، تحت بقیۃ حدیث ابن الاکوع، ص۴۶، ج۴، تحت

---

(۲) مسلم شریف ص۸۹، جلد ثانی، کتاب الجہاد، باب التنفیل وفداء المسلمین بالاساری، طبع نور محمدی، دہلی۔

روایت ہذا سے یہ بات واضح ہوئی کہ

- جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اسلامی لشکر کا امیرِ جیش مقرر فرمایا گیا۔
- نیز یہ بات بھی یہاں واضح طور پر مذکور ہے کہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے خود بھی بعض کفار کو قتل کیا اور ان کے حکم سے کئی کفار مقتول ہوئے اور قیدی بنائے گئے۔

نیز سلمہ بن اکوع کی ایک روایت محدثین نے اس طرح بھی ذکر کی ہے کہ

"سلمہ کہتے ہیں کہ میں نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں سات عدد غزوات میں جہاد کیا اور ان کے علاوہ جو اسلامی لشکر سرایا کے لیے روانہ کیے جاتے تھے ان میں سے نو عدد سرایا میں شمولیت کی۔ ان میں سے بعض غزوات و سرایا میں جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہم پر امیرِ جیش تھے اور بعض دیگر غزوات میں اسامہ بن زید امیر تھے۔"

چنانچہ اس چیز کو امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ اور امام مسلم رحمتہ اللہ علیہ دونوں محدثین حضرات نے ذکر کیا ہے:

یقول (سلمہ بن اکوع) غزوت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سبع غزوات۔ وخرجت فیما یبعث من البعوث تسع غزوات مرہ علینا ابوبکر و مرہ علینا اسامہ بن زید۔

(۱) مسلم شریف ص ۱۱۸ ج ۲ کتاب الجہاد، باب عدد غزوات النبی صلی اللہ علیہ وسلم، طبع نور محمدی، دہلی۔

(۲) صحیح بخاری ص ۶۱۲ ج ۲، کتاب المغازی، باب بعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم، اسامہ بن زید الی الحرقات من جہینہ۔

اور مشہور مورخ حافظ ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ نے یہ بات ذکر کی ہے کہ غزوہ دومتہ الجندل میں جو اسلامی لشکر پہنچا اس میں مہاجرین کے حصہ پر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ امیرِ جیش تھے اور جو اعراب (بادیہ نشین) شاملِ جہاد ہوئے تھے ان پر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ امیرِ لشکر تھے۔

ان ابابکر الصدیق کان علی المھاجرین فی غزوہ دومہ الجندل وخالد بن ولید علی الاعراب فی غزوہ دومہ الجندل۔

(البدایہ والنہایہ لابن کثیر ص ۹۸ ج ۵، تحت عنوان بعثہ علیہ السلام خالد بن ولید

الی اکیدر دومتہ الجندل، تحت حالات غزوۂ تبوک، طبع مصر)

شیعہ کی طرف سے اس مسئلہ کی تائید

ابن ابی الحدید الشیعہ نے اپنی شرح نہج البلاغہ میں مندرجہ ذیل چیز ذکر کی ہے کہ

انہ امر ابابکر فی شعبان من سنہ سبع علی سریہ بعثھا الی نجد فلقوا جمیعا من ھوازن فبیتوھم فروی بیاس بن سلمہ من ابیہ قال کنت فی ذاک البعث فقتلت بیدی سبعہ منھم وکان شعارنا امت امت وقتل من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قوم و جرح ابوبکر وارتث وعاد الی المدینہ- (شرح نہج البلاغہ لابن ابی الحدید الشیعہ، ص۲۵۰، ج۴، تحت طعن خامس (صدیقی) طبع قدیم، بیروت)

ماہ شعبان ۷ ہجری میں جناب نبی کریم ﷺ نے ابوبکر صدیق کو ایک سریہ (حصہ لشکر) پر امیر بنایا اور انہیں نجد کی طرف بھیجا پس یہ لوگ قبیلہ ہوازن کے پاس گئے اور رات کو ان پر حملہ کیا- ایاس اپنے والد سلمہ سے نقل کرتے ہیں، وہ کہتے تھے کہ میں اس جیش میں موجود تھا پس میں نے کفار کے سات آدمیوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا اور ہم نے اپنا نشان اس وقت یہ الفاظ بنائے ہوئے تھے: امت امت، مار ڈالو، مار ڈالو- اس موقع پر نبی کریم ﷺ کے اصحاب میں سے ایک قوم مقتول (شہید) ہوئی اور خود ابوبکر صدیق اس قتال میں مجروح ہوئے اور انہوں نے وہاں چند ایام آرام کیا اور کچھ بہتر حالت ہونے کے بعد وہ مدینہ شریف کی طرف لوٹے۔

نیز شیعہ مورخین میں سے المسعودی الشیعہ نے اپنی تصنیف "التنبیہ والاشراف" میں بعض سرایا (اسلامی جیوش) کا ذکر کیا ہے۔

وہاں لکھا ہے کہ شعبان ۷ ہجری میں حضرت ابوبکر صدیق ایک اسلامی لشکر لے کر قبیلہ بنی کلاب بن ربیعہ کی طرف گئے تھے۔ (اور اس کو سریہ ابوبکر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے)

ثم سریہ ابی بکر فی ھذا الشھر (شعبان ۷ ہجری) الی بنی کلاب بن ربیعہ بن عامر... بناحیہ ضریہ۔

(التنبیہ والاشراف للمسعودی الشیعہ المتوفی ۳۴۵ھ، ص ۲۲۷، طبع جدید، مصر)

مندرجہ بالا (سنی و شیعہ) حوالہ جات سے یہ بات ثابت ہوئی کہ

- حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے متعدد بار جہاد فی سبیل اللہ کیا۔
- اور کئی مرتبہ اسلامی لشکر کے امیرِ جیش کے منصب پر فائز ہوئے۔
- اور جہاد میں مجروح و مضروب ہو کر اجر و ثواب کے مستحق ہوئے۔

حضرت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے متعلقات

اور حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق اہلِ سیر والتراجم اور مورخین نے مفصل طور پر ذکر کیا ہے کہ جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ جہاد فی سبیل اللہ میں متعدد بار شریک ہوئے اور اہم غزوات میں ان کے کارنامے واضح طور پر ثابت ہیں جن کی تفصیلات پیش کرنا باعثِ تطویل ہے تاہم ذیل میں چند ایک حوالہ جات اثباتِ مسئلہ کے لیے پیش کیے جاتے ہیں، ان کو بغور ملاحظہ فرمائیں۔

علمائے تراجم ذکر کرتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر، غزوۂ احد اور غزوۂ خندق میں شریک ہوئے۔ علاوہ ازیں دیگر غزوات میں بھی جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں حضرت عمر فاروق شریک رہے اور متعدد سرایا میں ان کو امیرِ جیش بنایا گیا۔

قالوا شھد عمر بن الخطاب بدرا واحدا والخندق والمشاھد کلھا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

وخرج فی عدہ سرایا وکان امیرا بعضھا۔

(طبقات لابن سعد ص۱۹۵ ج۳ تحت ذکر ہجرۃ عمر بن الخطاب، طبع لیڈن)

اور اہلِ تراجم نے لکھا ہے کہ

عن عبداللہ بن بریدہ عن ابیہ بریدہ الاسلمی قال لما کان حیث نزل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحضرہ اھل الخیبر اعطی رسول اللہ اللواء عمر بن الخطاب... الخ۔

مشہور صحابی بریدۃ الاسلمی ذکر کرتے ہیں کہ جب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کے مقام میں فروکش ہوئے تو اس موقع میں ایک دفعہ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو اسلامی پرچم عنایت فرمایا...الخ۔

(طبقات لابن سعد ص۱۹۵ ج۳، تحت ذکر ہجرۃ عمر بن الخطاب، طبع لیڈن)

حافظ ابنِ کثیر نے البدایہ میں البیہقی کے حوالہ سے درج کیا ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت عمر بن الخطاب کو تیس سواروں کے ساتھ بنی ہوازن سے قتال کے لیے روانہ فرمایا اور ایک دلیل جو قبیلہ بنی ہلال سے تھا بطور رہنما ساتھ تھا۔ یہ حضرات رات کو سفر کرتے اور دن کے وقت پوشیدہ رہتے تھے۔ جب یہ حضرات دشمن کے شہروں کے قریب پہنچے تو وہ لوگ وہاں سے فرار ہو گئے۔

اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینہ طیبہ کی طرف واپس ہوئے۔ بعض حضرات نے قبیلہ بنی خثعم سے قتال کا مشورہ دیا تو آپ نے کہا کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بنی ہوازن سے قتال کے لیے روانہ فرمایا تھا۔ (دوسرے قبائل کے ساتھ قتال کے لیے فرمان نہیں دیا)

اور طبقات ابنِ سعد میں ہے کہ یہ واقعہ شعبان ۷ ہجری میں پیش آیا تھا۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعث عمر بن

الخطاب رضی الله عنه فی ثلاثین راکبا ومعه دلیل من بنی هلال وکانوا یسیرون اللیل ویکتمون النهار فلما انتهوا الی بلادهم هربوا منهم وکر عمر راجعا الی المدینه فقیل له هل لک فی قتل خثعم؟ فقال ان رسول الله صلی الله علیه وسلم لم یامرنی الا بقتال هوازن فی ارضهم-

(۱) البدایہ والنہایہ لابن کثیر ص۲۲۱ ج۴، تحت سریہ عمر بن الخطاب، طبع اول، مصری-

(۲) طبقات لابن سعد ص۹۵ ج۳، تحت ہجرۃ عمر بن الخطاب، طبع لیڈن-

تائید مسئلہ از شیعہ

مشہور مورخ المسعودی الشیعی نے اپنی تصنیف "التنبیہ والاشراف" میں حضرت عمر بن الخطاب کا یہ سریہ شعبان ۷ھ میں ذکر کیا ہے- واقعہ ہذا ذیل عبارت میں مذکور ہے:

ثم سریه عمر بن الخطاب فی شعبان (۷ھ) الی الموضع المعروف بتربه وتربه ناجیه العبلاء علی اربع لیال من مکه وقیل خمس طریق صنعا ونجران الیمن-

(التنبیہ والاشراف للمسعودی الشیعی ص۲۲۷، طبع جدید مصر القاہرہ، للعلامہ المورخ ابی الحسن علی بن الحسین الشیعہ المتوفی ۳۴۵ھ)

مندرجہ بالا (سنی و شیعہ کے حوالہ جات) سے واضح ہوا کہ

- حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، اسلام کے مشاہیر غزوات میں شریک و شامل ہوئے-
- آں موصوف رضی اللہ عنہ، کئی سرایا اور غزوات میں امیر جیش بھی مقرر کیے گئے-

فلہذا مخالفین حضرات کا یہ طعن بالکل بے بنیاد ہے کہ حضرات شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اسلامی جہاد میں کوئی حصہ نہیں لیا اور نہ ہی کسی جیش کے امیر بنائے گئے۔



محاذِ جنگ سے فرار کا جواب

غزوۂ احد

صحابہ کرام پر طعن کرنے والے لوگوں نے یہ ایک مستقل اعتراض قائم کیا ہے کہ اکابر صحابہ جنگِ احد میں ثابت قدم نہ رہے اور جنگ سے فرار ہو گئے۔

اس کے جواب کے لیے چند ایک چیزیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں جن سے اس طعن کا ازالہ پوری طرح ہو جاتا ہے۔

○ پہلی بات تو یہ ہے کہ غزوۂ احد میں جن حضرات سے لغزش ہوئی وہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فرمان کی تعمیل میں فروگزاشت ہو جانے کی وجہ سے ہوئی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کی اس لغزش کو معاف فرما دیا اور قرآنِ مجید میں اس معافی کا فرمان نازل فرمایا:

ان الذین تولوا منکم یوم التقی الجمعان انما استزلھم الشیطن ببعض ما کسبوا ولقد عفا اللہ عنھم ان اللہ غفور حلیم۔	یعنی تم میں سے جو لوگ رُوگرداں ہوئے جس دن لڑیں دو فوجیں، سو ان کو بہکا دیا شیطان نے ان کے گناہ کی شامت سے اور ان کو بخش چکا اللہ۔ اللہ بخشنے والا تحمل کرنے والا ہے۔

(آل عمران: ۱۵۵، پارہ ۴)

○ نیز علماء مفسرین و محدثین نے اس مقام میں تشریح کی ہے کہ اس موقع پر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تقریباً چودہ آدمی ثابت قدم رہے تھے جن میں سات

عدد مہاجرین اور سات عدد انصار میں سے تھے اور مہاجرین میں سے جو حضرات ثابت قدم رہے ان کے اسماء تصریحاً ذکر کیے ہیں وہ حضرات جناب ابوبکر، عمر، علی، طلحہ، عبیداللہ، عبدالرحمٰن بن عوف، الزبیر اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہم تھے۔ چنانچہ تفسیر خازن میں مذکور ہے کہ

ولم يبق مع النبی صلی الله عليه وسلم الا ثلاثه او اربعه عشر رجلا من المهاجرين ومن الانصار سبعه- فمن المهاجرين ابوبكر و عمر و علی و طلحه بن عبيد الله و عبدالرحمان بن عوف الزبير وسعد بن ابی وقاص رضی الله عنهم-

(تفسیر خازن ص ۴۳۷، ج۱، تحت آیہ مذکور مع معالم التنزیل)

یہی مضمون معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ بخاری شریف کی مشہور شرح فتح الباری میں حافظ ابنِ حجر نے ذکر کیا ہے۔

(فتح الباری شرح بخاری ص۲۸۹، ج۷، تحت حدیث غزوۂ احد)

مختصر یہ ہے کہ دیگر علمائے سیرت و تاریخ نے بھی اس چیز کو وضاحت سے ذکر کیا ہے کہ غزوۂ احد میں شیخین حضرات بمع دیگر اکابر کے آنجناب کی رفاقت میں ثابت قدم رہنے والوں میں شامل ہیں اور فرار کی لغزش کے مرتکب حضرات میں ان کا شمار نہیں۔

فلہٰذا شیخین حضرات پر فرار کا طعن وارد کرنا ہرگز صحیح نہیں اور جن دیگر حضرات سے فرار کی لغزش سرزد ہوئی ان کو اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا ہے۔ بنابریں وہ حضرات بھی موردِ طعن نہیں۔

غزوۂ حنین

اس کے بعد صحابہ کرام پر غزوۂ حنین میں فرار ہونے کا اعتراض قائم کیا جاتا

ہے، اس کے متعلق ذیل میں چند چیزیں ذکر کی جاتی ہیں جن سے طعن ہذا کا ازالہ ہو جائے گا۔

○ غزوۂ حنین میں دراصل صحابہ کرام نے فرار اختیار نہیں کیا بلکہ وہاں تدبیر میں کوتاہی ہوئی۔ اس وقت کفار کمین گاہوں میں دائیں بائیں چھپے ہوئے تھے، گزرگاہ تنگ تھی اور جب اسلامی فوج وہاں سے گزر رہی تھی تو بنی ہوازن کے کفار نے شدید تیراندازی شروع کر دی اور گھات سے نکل کر حملہ کر دیا۔ جب ہر طرف سے تیر برسنے لگے تو مسلمانوں کا وہاں ثابت قدم رہنا مشکل ہوگیا اور اس شدید اضطراب کی وجہ سے اہلِ اسلام کے قدم اکھڑ گئے، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص نصرت اور سکینہ اپنے پیغمبر اور مومنوں پر نازل کی اور فرشتوں کے ذریعے غیبی امداد فرمائی جسے لوگ نہیں دیکھ رہے تھے اور اس طرح اہلِ اسلام کو ایک عظیم پریشانی لاحق ہونے کے بعد فتح نصیب ہوئی، جیسا کہ قرآنِ مجید میں مسئلہ ہذا کو ذکر فرمایا ہے:

ثم انزل الله سكينته على رسوله وعلى المومنين وانزل جنودالم تروها وعذب الذين كفروا...الخ

(پارہ ۱۰ سورہ توبہ)

یہاں سے معلوم ہوا کہ

○ سخت اضطرابی حالت میں ثبات قدمی نہیں رہی تھی لیکن بعد میں اللہ کریم نے اپنی خاص نصرت فرما کر محاذِ جنگ کی کیفیت بدل دی اور غیبی امداد فرما کر ان کو فتح نصیب فرمائی۔

○ اور کبائر علماء نے اس موقع پر یہ بات تحریر کی ہے کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان رُوگردانی کرنے والوں پر اس موقع پر کوئی عتاب نہیں فرمایا اور سرزنش نہیں کی اس لیے کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا عذر اور مجبوری معلوم تھی۔ پس دیگر لوگوں کے لیے بھی ان حضرات پر طعن قائم کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

"ونیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسے را برایں امر عتاب نہ فرمود زیرانکہ عذر معلوم داشت پس دیگرانرا ہم جائے عتاب و طعن نماند... الخ"

(تحفہ اثنا عشریہ از شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ محدث دہلوی ص۳۳۸، تحت مطاعن اصحاب کرام عموماً بے تخصیص زیر طعن اول، طبع سہیل اکیڈمی، لاہور)

اس جواب کے آخر میں یہ چیز ہم ذکر کرنا مفید سمجھتے ہیں کہ غزوۂ حنین میں جو حضرات آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ثابت قدم رہے، علماء کرام نے ان کے اسماء ذکر کر دیئے ہیں۔

وھو ما رواہ عن جابر قال ثبت معہ ابوبکر وعمر وعلی والعباس... الخ۔

(الزرقانی شرح مواہب اللدنیہ ص۱۹، ج۳، تحت غزوۂ حنین، طبع مصر قدیم)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مندرجات بالا کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوئی کہ جنگِ حنین میں جن حضرات نے رُوگردانی کی تھی وہ اضطرابی کیفیت اور مجبوری کی بناء پر ہوئی تھی جو بعد میں فتح و نصرت میں بدل دی گئی۔

نیز یہ چیز علماء نے بالتصریح ذکر کر دی ہے کہ غزوۂ حنین میں پسپا ہونے والوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ شامل نہیں تھے۔ فلہذا ان پر جنگ سے فرار کا طعن قائم کرنا ہرگز درست نہیں۔



خلیفہ رسول ﷺ ہونے سے انکار کا طعن

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر اعتراضات وارد کرنے والوں کی طرف سے ایک یہ طعن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق ذکر کیا جاتا ہے کہ

ایک شخص اعرابی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور آ کر دریافت کیا کہ کیا آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ ہیں؟

تو ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ نہیں۔ تو اس نے کہا تو پھر آپ کیا ہیں؟

فقال: لا (نہیں) فما انت؟ قال انا الخالفہ بعدہ یعنی میں ان کے بعد آنے والا ہوں۔

بقول معترض خالفہ اس کو کہتے ہیں "جس پر اکتفا نہ ہو سکے اور اس میں خیرو برکت نہ ہو بلکہ اکثر اس کے مخالف ہو جس کا خلیفہ بنا ہوا ہے۔" بالفاظ دیگر خالفہ اس شخص کو کہتے ہیں جس میں کچھ بھلائی اور تونگری نہ ہو۔

معترض کے زعم کے مطابق یہاں سے معلوم ہوا کہ صدیق اکبر اپنے خلیفہ رسول ہونے سے انکاری تھے۔ اور وہ اپنے آپ کو خالفہ کے درجہ میں سمجھتے تھے۔ پس ایسے شخص کو خلیفہ رسول کہنا درست نہیں۔

الجواب

- یہ اعرابی والی روایت جو مخالفین نے ذکر کی ہے یہ محدثین کے نزدیک کس

درجہ کی ہے؟ یہ بات واضح نہیں ہو سکتی۔ یہ روایت بخاری یا مسلم کی روایت نہیں جس کو بلا چون و چرا تسلیم کر لیا جائے۔ لغت حدیث کی جن کتابوں میں یہ روایت مروی ہے، ان حضرات نے اس کا معنی اور محمل اس طرح ذکر کیا ہے کہ

فانما قال ذالک تواضعا وھضما من نفسه حين قال انت خليفه رسول الله۔

(النہایہ لمحمد بن محمد المعروف ابن الاثیر الجزری ص۳۱۵، ج۹، مجمع البحار، تحت لفظ خلف)

مطلب یہ ہے کہ اگر اس روایت کو درست تسلیم کر لیا جائے تو علماء حدیث اس کا مفہوم یہ بیان کرتے ہیں کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے سائل کے جواب میں بطور تواضع اور کسر نفسی کے یہ کلمات فرمائے تھے لیکن حقیقتاً اپنے خلیفہ رسول ہونے سے انکار نہیں کیا تھا۔

مذکورہ بالا جواب طعن والی روایت کے تحت صاحب تصنیف الجزری نے خود ذکر کیا ہے۔

○ اس کے علاوہ ایک دوسری روایت محدثین نے ذکر کی ہے جس میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ ہونے پر رضامندی کا اظہار کیا ہے اور اپنے آپ کو خلیفہ رسول تسلیم کیا ہے۔

عن ابی ابن ملیکه قال قال رجل لابی بکر یاخلیفه الله قال لست بخلیفه ولکنی خلیفه رسول الله۔ انا راض بذالک۔

یعنی ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے ابوبکر صدیق کو یاخلیفہ اللہ کہا تو ابوبکر صدیق نے فرمایا کہ میں اللہ کا خلیفہ نہیں ہوں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ ہوں اور میں اس بات پر راضی ہوں۔

(مجمع الزوائد للہیثمی ص۱۸۴، ج۵، باب الخلفاء الاربعہ، مجمع الزوائد للہیثمی ص۱۹۸، ج۵، باب کیف یدعی الامام)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خلیفہ ہونے پر رضامند تھے۔ فلہذا انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خلیفہ ہونے سے انکار نہیں کیا اور اگر بالفرض ان سے کسی مقام میں خلیفہ رسول اللہ ہونے سے انکار کے الفاظ پائے گئے ہیں تو وہ کسر نفسی اور تواضع پر محمول ہوں گے۔ جیسا کہ علماء نے لغت حدیث میں تشریح کرتے ہوئے اسی مفہوم و معنی کا ذکر کیا ہے۔

○ اور دیگر بات یہ ہے کہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ذکر کیا ہے کہ

"ہم ایک بار جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں بیٹھے ہوئے تھے تو آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے معلوم نہیں کہ مزید کتنا عرصہ میں آپ لوگوں کے درمیان رہوں گا۔ پس میرے بعد ان دونوں شخصوں کی اقتدا کرنا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ فرمایا اور فرمایا کہ عمار رضی اللہ عنہ کے طریقے کے ساتھ راہ پکڑو اور جو چیز ابن مسعود رضی اللہ عنہ تم کو بیان کریں، اس کی تصدیق کرو۔"

المصنف لابن ابی شیبہ میں ہے کہ

عن حذیفہ قال کنا جلوسا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال لا ادری ما قدر بقائی فیکم۔ فاقتدوا بالذین من بعدی واشار الی ابی بکر وعمر واھتدوا بھدی عمار۔ وما حدثکم ابن مسعود من شیئی فصدقوہ۔

(المصنف لابن ابی شیبہ ص۵۶۸-۵۶۹، ج۱۴ تحت کتاب المغازی، طبع کراچی)

اس فرمان نبوت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ایسی شخصیات ہیں جو قابل اقتداء ہیں اور ان کی اقتداء کرنے میں ہدایت اور خیر ہے۔

نیز یہ بھی واضح ہوگیا کہ جناب ابوبکر صدیق خلیفہ رسول اللہ ہونے کے لائق ہیں اور منصب خلافت کے صحیح اہل ہیں اور انہیں جناب نبی اقدس ﷺ نے اپنے خلیفہ ہونے کی بشارت دی ہے۔

الزامی جواب

اب ہم ایک دوسرے طریقے سے مخالفین صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو جواب پیش کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ اگر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بالفرض کسی موقع پر اپنے خلیفہ رسول ہونے کی نفی کی ہے تو اسی طرح حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اپنے خلیفہ بننے اور بیعت خلافت لینے سے اعراض کیا اور انکار فرمایا تھا حالانکہ وہ اس وقت منصب خلافت کے لیے صحیح طور پر اہل اور حقدار تھے۔

چنانچہ نہج البلاغہ میں مذکور ہے کہ جب شہادت حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد لوگ بیعت خلافت کے ارادہ سے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آں جناب نے فرمایا:

دعونی فالتمسوا غیری--- وانا لکم وزیرا خیر لکم منی امیرا۔

یعنی (بیعت کے معاملہ میں) مجھے تم چھوڑ دو اور میرے سوا کسی اور کو (منصب خلافت کے لیے) تلاش کرو--- اور میرا تمہارے لیے وزیر رہنا امیر (خلیفہ) بننے سے زیادہ بہتر ہے۔

(نہج البلاغہ لشریف رضی ص۱۸۱، طبع مصر، تحت من خطبہ لہ علیہ السلام، لما ارید علی البیعت بعد قتل عثمان)

فلہذا جس طرح جناب علی المرتضیٰؓ کے اپنے خلیفہ بننے سے انکار کی بنا پر ان کے منصب خلافت کی نفی نہیں کی جا سکتی بالکل اسی طرح جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

کے انکار سے ان کے منصب خلافت کی نفی نہیں کی جا سکتی، بلکہ ان سے نفی خلیفہ کا مفہوم و محل وہی ہے جو سابقاً درج کیا گیا ہے۔



جنازۂ نبوی ﷺ میں شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی عدم شمولیت

غسل و کفن دفن کے موقع پر غیر حاضری کا طعن

مخالفین صحابہ کی طرف سے اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خصوصاً شیخین (حضرت ابوبکر صدیق و حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہم) پر یہ طعن کیا جاتا ہے کہ یہ حضرات جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ و سلم کے غسل و جنازہ میں اور کفن دفن میں شریک نہ ہوئے اور اس فضیلت سے محروم رہے اور خلافت اجتماعی کے قضیہ میں پڑے رہے اور سقیفہ بنی ساعدہ میں جا کر جھگڑتے رہے۔ یہ تمام کام غسل، جنازہ اور کفن دفن حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سرانجام دیئے۔

طعن ہذا کے اثبات کے لیے درج ذیل روایت پیش کی جاتی ہے:

عن عروہ ان ابابکر وعمر لم یشھدا دفن النبی صلی اللہ علیہ وسلم وکانا فی الانصار ودفن قبل ان یرجعا۔

اور اعتراض ہذا کو مزید رنگین بنانے کے لیے معترض لوگ اس موقع پر یہ شعر بھی تالیف کر کے پڑھا کرتے ہیں ؎

چوں صحابہ حب دنیا داشتند
مصطفیٰ را بے کفن بگذاشتند

حالانکہ یہ چیز حقیقت واقعہ کے بالکل برعکس اور برخلاف ہے جیسا کہ ہم

آئندہ سطور میں اسے ذکر کر رہے ہیں۔

الجواب

جس روایت سے یہ طعن پیدا کیا جاتا ہے وہ صحاح ستہ سے نہیں بلکہ وہ ان کتب میں پائی جاتی ہے جن میں روایت کی صحت کا التزام نہیں کیا گیا اور ان کتابوں میں رطب و یابس صحیح و سقیم، ضعیف و قوی ہر نوع کی روایات جمع کر دی گئی ہیں اور ان میں ہر طرح کا مواد فراہم کر دیا گیا ہے۔

اس چیز کو شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ نے "تحفہ اثنا عشریہ" کید بست و دوم میں بیان کیا ہے:

"وکتاب کہ ازاں فرقہ شیعہ برائے الزام اہل سنت نقل مے کنند ہمہ ازیں قبیل است کہ نادر الوجود و کمیاب می باشد وعلی تقدیر الوجدان مصنفین آں کتب التزام صحت جمع مافیہا نکردہ اند بلکہ بطریق بیاض رطب و یابس در آں جمع نمودہ محتاج نظر ثانی گزاشتہ اند۔"

یعنی وہ کتابیں جن سے شیعہ لوگ اہل سنت پر الزام اور مطاعن نقل کرتے ہیں، پہلے تو وہ کمیاب اور نادر الوجود ہیں اور ان کے مصنفین نے ان کتب کے جمیع مواد میں صحت کا التزام نہیں کیا بلکہ ایک بیاض کے طور پر ان میں رطب و یابس اور صحیح و سقیم مواد جمع کر دیا اور نظر ثانی کا محتاج چھوڑا---الخ۔

(تحفہ اثنا عشریہ از شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ، ص۴۱، تحت کید بست دوم--- طبع سہیل اکیڈمی، لاہور)

نیز مسئلہ ہذا کی مزید وضاحت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے "عجالہ نافعہ" میں کی ہے کہ محدثین کے نزدیک طبقات حدیث میں سے "طبقہ ثالثہ" میں ان کتابوں کا شمار کیا گیا ہے اور مذکورہ بالا روایت بھی انہی کتب سے نقل کی گئی ہے اور اسی قبیل یعنی "طبقہ ثالثہ" کی کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ ان میں ہر نوع کی روایات مدون ہیں اور

صحت روایت کا یہاں التزام نہیں کیا گیا۔

اس کے بعد یہ چیز پیش کی جاتی ہے کہ معترض کی پیش کردہ مذکورہ بالا روایت ابن ابی شیبہ کی ہے جو سنداً منقطع ہے اور متناً "شاذ" ہے۔

اب ہم ذیل میں پہلے روایت کے انقطاع سند پر کلام پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد روایت کے متن کے "شاذ" ہونے پر بحث کی جائے گی اور ثابت کیا جائے گا کہ یہ روایت اس موقعہ کے اصل واقعات کے برخلاف ہے اور قابل قبول نہیں ہے۔ (بعونہ تعالی)

وجہ انقطاع

وہ اس طرح ہے کہ یہ روایت "عروہ بن زبیر تابعی" سے منقول ہے اور عروہ بن زبیر جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وصال مبارک کے موقع پر مولود ہی نہیں تھے۔۔۔ بلکہ علماء تراجم نے لکھا ہے کہ عروہ بن زبیر کی ولادت خلافت فاروق کے اواخر یا خلافت عثمانی کے اوائل میں ہوئی۔ ملاحظہ ہو:

(۱) تذکرۃ الحفاظ للذہبی ص ۶۲، ج اول، تحت عروہ بن زبیر، طبع بیروت۔

(۲) تہذیب التہذیب لابن حجر ص ۱۸۳-۱۸۴، ج ۷، تحت عروہ بن زبیر، طبع دکن۔

فلہذا اس روایت کے راوی کا اس واقعہ میں غیر موجود ہونا یقینی ہوا اور معلوم ہوا کہ عروہ مذکور کو کسی دیگر شخص نے ایک مدت (کم و بیش بارہ برس) کے بعد یہ واقعہ بیان کیا۔ پس یہاں واضح طور پر "انقطاع" پایا گیا۔

وجہ شذوذ

روایت مذکورہ کے "شاذ" ہونے کی وجہ یہ ہے کہ روایت ہذا کے بالمقابل اس موقعہ کی دیگر معروف روایات موجود ہیں جو متصل السند ہیں اور عند المحدثین "صحیح" اور "مقبول" ہیں اور ان معروف روایات میں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر

فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا انتقال نبوی کے موقع پر موجود ہونا اور حاضر رہنا بالتصریح پایا جاتا ہے۔

چنانچہ ذیل میں ایک ترتیب کے ساتھ احادیث کی کتب سے اس موقع کی چند معروف روایات پیش کی جاتی ہیں جو اپنے مضمون میں واضح ہیں۔

حدیث کی روایات

امام ترمذیؒ نے سالم بن عبید الاشجعی صحابی سے درج ذیل روایت نقل کی ہے:

عن سالم بن عبيد (الأشجعي) وكانت له صحبه قال- (یہاں انتقال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال و واقعات سالم نے ذکر کیے ہیں اور وصال نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطلاع حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو دی ہے)...

فقال (الصديق) لي انطلق فانطلقت معه فجاء هو والناس قد دخلوا على رسول الله صلى الله عليه وسلم- فقال (الصديق) ياايها الناس افرجوا لي فافرجوا له فجاء حتى اكب عليه ومسه فقال انك ميت وانهم ميتون ○ ثم قالوا ياصاحب رسول الله صلى الله عليه وسلم اقبض رسول الله صلى الله عليه وسلم؟ قال نعم- فعلموا ان قد صدق-

○ قالوا ياصاحب رسول الله صلى الله عليه وسلم انصلى على رسول الله صلى الله عليه وسلم؟ قال نعم!

○ وقالوا وكيف؟ قال يدخل قوم فيكبرون ويدعون ويصلون ثم يخرجون ثم يدخل قوم فيكبرون ويصلون ثم يخرجون حتى يدخل الناس-

○ قالوا ياصاحب رسول الله صلى الله عليه وسلم

ایدفن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ قال نعم-

O قالوا این؟ قال فی المکان الذی قبض اللہ فیہ روحہ فان اللہ لم یقبض روحہ الا فی مکان طیب فعلموا انہ صدق O ثم امرھم ان یغسلہ بنوابیہ-

(شمائل ترمذی ص۶۰۰-۶۰۱، طبع لکھنؤ ص۲۸-۲۹، طبع مجتبائی دہلی، **باب** ما جاء فی وفاہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، السنن الکبریٰ للبیہقی ص۳۹۵، ج۳، کتاب الجنائز، **باب** من یکون اولی بغسل المیت، السنن الکبریٰ للبیہقی ص۳۰، ج۴ کتاب الجنائز، **باب** الجماعہ یصلون علی الجنازہ افذانا، السنن الکبریٰ للبیہقی ص۱۴۵، ج۸، تحت **باب** لا یصلح امامان فی عصر واحد)

اور اسی واقعہ کو مشہور محدث نور الدین الہیثمی نے ابن ماجہ اور طبرانی کے حوالہ سے یہ عبارت ذیل نقل کیا ہے:

وعن سالم عن عبیدو کان من اصحاب الصفہ--- فقال (الصدیق رضی اللہ عنہ) اوسعوا فاوسعوا لہ فاکب علیہ ومسہ قال (الصدیق رضی اللہ عنہ) انک میت وانھم میتون-

O قالوا یاصاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ قال نعم- فعلموا انہ کما قال-

O قالوا یاصاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصلی علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ قال یدخل قوم فیکبرون ویدعون ویصلون ثم ینصر فون و یجی اخرون حتی یفرغوا-

O قالوا یاصاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایدفن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ قال نعم-

○ قالوا واین یدفن؟ قال حیث قبض فان اللہ تبارک و تعالی لم یقبضہ الا فی بقعہ طیبہ فعلموا انہ کما قال۔

○ ثم قام فقال عندکم صاحبکم فامرھم یغسلونہ۔۔۔ الخ

(مجمع الزوائد للہیثمی ص۱۸۲-۱۸۳ جلد خامس تحت کتاب الخلافہ، بحوالہ ابن ماجہ و طبرانیؒ و رجالہ ثقات)

وصال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال و واقعات بیان کرتے ہوئے سالم بن عبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو اصحاب صفہ میں سے تھے، ان سے مروی ہر دو مذکورہ بالا روایات کا مختصراً مفہوم یہ ہے کہ

سالم بن عبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب میں نے انتقال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطلاع کی تو آپ فوراً میرے ساتھ چل پڑے اور میں آپ کے ساتھ ہولیا اور آں موصوف جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس داخل ہوئے۔ لوگوں کا بڑا ہجوم تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قریب آکر فرمایا لوگو! کھلے اور کشادہ ہو جاؤ پس وہ لوگ کھلے ہوگئے اور انہوں نے جناب صدیق رضی اللہ عنہ کو نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب تر ہونے کا موقع دیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف متوجہ ہوئے اور خم ہو کر آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک کی تقبیل کی اور بوسہ دیا۔

○ حاضرین نے بطور تصدیق کے لیے عرض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واقعی انتقال ہو چکا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ ہاں انتقال ہوگیا ہے۔ پس انہوں نے یقین کر لیا کہ صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحیح فرما رہے ہیں (جبکہ اس سے قبل وصال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں لوگ متردد اور متحیر تھے اور اضطراب میں مبتلا تھے)

○ پھر لوگوں نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی؟ تو آپ نے فرمایا کہ ہاں پڑھی جائے گی۔

○ پھر انہوں نے عرض کی کہ صلوٰۃ جنازہ کی کیفیت کیا ہوگی؟

تو آپ نے اس کی تشریح فرمائی کہ جنازہ کے موقع پر ایک گروہ آنجناب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہاں داخل ہوگا۔ وہ تکبیر کہیں گے۔ درود و دعا پڑھیں گے اور اس مقام سے باہر آ جائیں گے پھر دوسری جماعت داخل ہوگی اور وہ بھی تکبیر اور درود و دعا پڑھنے کے بعد واپس آ جائے گی حتیٰ کہ اسی طرح تمام لوگ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ جنازہ ادا کریں گے۔

○ اس کے بعد حاضرین نے عرض کیا کہ اے صحابی رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دفن کیا جائے گا؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں، دفن کیے جائیں گے۔

○ تو پھر انہوں نے عرض کیا کہ مقام دفن کہاں ہوگا؟

تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم) کی روح کو جس مقام پر قبض کیا ہے وہ بہترین مقام ہے۔ اسی مقام میں دفن کیے جائیں گے۔ اس پر لوگوں نے یقین کیا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سچ فرما رہے ہیں۔

پھر لوگوں کی طرف سے سوال پیش ہوا کہ کیا آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو غسل دیا جائے گا؟ تو آپ نے فرمایا کہ ہاں غسل دیا جائے گا اور جو اقرباء اور قریبی رشتہ دار ہیں، وہی غسل دیں گے۔ (ان حضرات میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ شامل تھے)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی روایت

جس طرح سابقہ روایت سالم بن عبید الاشجعی رضی اللہ عنہ صحابی سے مروی ہے اسی طرح ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی اس موقع کے متعلق مختصر سا بیان منقول ہے کہ

عن عائشہ قالت لما قبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اختلفوا فی دفنہ- فقال ابوبکر سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ما قبض اللہ نبیا الا فی الموضع الذی یحب ان یدفن فیہ ادفنوہ فی موضع فراشہ' رواہ الترمذی-

(ترمذی شریف' ص۱۲۱' جلد اول کتاب ابواب الجنائز' مسند ابی یعلی الموصلی ص۵۳' ج۹' روایت نمبر۴۱' تحت مسندات عائشہ صدیقہ' مشکوۃ شریف ص۵۴۷' تحت وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم بحوالہ ترمذی)

روایت مندرجہ بالا کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ جب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال مبارک ہوا تو آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کے دفن کے بارے میں اختلاف رونما ہوا تو اس کا فیصلہ جناب ابوبکر صدیق نے اس طرح فرمایا کہ میں نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جس مقام میں اپنے نبی کے دفن کو پسند فرماتا ہے' اسی مقام میں اس کی روح کو قبض فرماتا ہے۔

فلہذا جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے فراش اور بستر مبارک کے مقام میں ہی دفن کیے جائیں گے۔ (چنانچہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فراش مبارک کے مقام پر ہی دفن کیا گیا)

ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے مروی روایت

سابقہ سطور میں سالم بن عبید اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایات ذکر کی گئی ہیں:

اس کے بعد اس موقعہ کی جو روایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اسے محدث ابن ماجہ نے اپنے مقام میں بہ عبارت ذیل درج کیا ہے۔

عن ابن عباس قال لما ارادوان یحفروا لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعثوا الی ابی عبیدہ بن الجراح --- لقد اختلف المسلمون فی المکان الذی یحفرلہ فقال قائلون یدفن فی مسجدہ قال قائلون یدفن مع اصحابہ فقال ابوبکر انی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما قبض نبی الا دفن حیث یقبض --- الخ۔

(السنن لابن ماجہ ص۱۱۸، باب ذکر وفاتہ و دفنہ صلی اللہ علیہ وسلم، طبع اول)

مندرجہ بالا روایت کا حاصل یہ ہے کہ دفن کے موقع پر مسلمانوں میں مقام دفن کے متعلق اختلاف واقع ہوا بعض حضرات کہتے تھے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد نبوی (کے ایک کونہ) میں دفن کیا جائے اور بعض حضرات کہتے تھے کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے صحابہ کے ساتھ (جنت البقیع میں) دفن کیا جائے تو اس موقعہ پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنا ہے کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جہاں نبی کا انتقال ہوتا ہے، ان کو اسی مقام پر دفن کیا جاتا ہے---الخ۔

کیفیت صلوٰۃ جنازہ

مذکورہ بالا روایت کے علاوہ جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے جو روایت صلوٰۃ جنازہ کی کیفیت میں منقول ہے وہ محدث ابی یعلیٰ الموصلی نے بہ عبارت ذیل

تحریر کی ہے:

ثم ادخل الناس علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلون علیہ ارسالا- ادخل الرجال حتی اذا فرغ منہم ادخل النساء حتی اذا فرغ من النساء ادخل الصبیان- ولم یوم الناس علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احد- فدفن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اوسط اللیل لیلہ الاربعاء-

(مسند ابی یعلی الموصلی ص۴۵-۴۶، جلد اول، تحت مسندات ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ، طبع بیروت)

روایت بالا کا خلاصہ یہ ہے کہ--- پھر لوگ گروہ در گروہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں داخل ہو کر صلوٰۃ جنازہ ادا کرنے لگے- پہلے مردوں نے داخل ہو کر نماز جنازہ ادا کی اور جب وہ فارغ ہوئے تو ان کے بعد خواتین نے داخل ہو کر نماز ادا کی اور جب وہ فارغ ہو چکیں تو ان کے بعد لڑکے داخل ہوئے اور آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ جنازہ کے لیے کسی شخص نے امامت نہیں کی اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چہار شنبہ کی نصب شب کے قریب دفن کیا گیا--- الخ-

تائیدات

امام مالکؒ کی روایت

گزشتہ صفحات میں ہم نے جناب اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال کے موقع کی محدثین سے منقول چند روایات ذکر کی ہیں-

اب اسی مضمون کی تائید میں امام مالکؒ کا بیان ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں جس

میں اس موقع کے متعدد امور کی تصریح کی گئی ہے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا اس موقع میں موجود ہونا اور حاضر رہنا واضح طور پر ثابت ہوتا ہے' چنانچہ امام مالک" فرماتے ہیں کہ

مالك انه بلغ ان رسول الله صلى الله عليه وسلم توفى يوم الاثنين ودفن يوم الثلثاء وصلى عليه الناس افذانا- لايومهم احد فقال ناس يدفن عندالمنبر وقال آخرون يدفن بالبقيع فجاء ابوبكر صديق فقال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول ما دفن نبى قط الا فى مكانه الذى توفى فيه فحفرله فيه- فلما كان عند غسله ارادوا نزع قميصه- سمعوا صوتا يقول لاتنزعوا القميص فلم ينزع القميص وغسل وهو عليه صلى الله عليه وسلم-

(موطاء امام مالک" ص ۲۱۲ تحت ما جاء فی دفن المیت، طبع کراچی)

مندرجہ بالا روایت کا مطلب یہ ہے کہ امام مالک رحمتہ اللہ فرماتے ہیں کہ سرور دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال دو شنبہ (سوموار) کو ہوا اور آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کا دفن سہ شنبہ (منگل کے بعد) کو ہوا- اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ جنازہ بغیر جماعت کے پڑھی گئی- کسی شخص نے ان کی امامت نہیں کی--- اس موقع پر بعض لوگوں نے کہا کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کا دفن منبر نبوی کے پاس ہونا چاہئے اور بعض دیگر لوگوں نے کہا جنت البقیع میں دفن کیا جائے تو جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور انہوں نے ذکر کیا کہ میں نے نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نبی کی جس مقام میں وفات ہو' اسی میں ان کو دفن کیا جاتا ہے- چنانچہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فراش (بستر مبارک) کے مقام پر قبر مبارک کھودی گئی- اور جب

غسل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا موقع آیا تو لوگوں نے آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قمیص مبارک کو اتارنے کا قصد کیا تو انہوں نے ایک غیبی آواز سنی جس میں کہا گیا کہ قمیص کو مت اتارو چنانچہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا قمیص مبارک نہیں اتارا گیا اور آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اسی حالت میں غسل دیا گیا۔

اہل سیرت وطبقات اور اہل تراجم و تاریخ کی روایات

اس مسئلہ میں محدثین کی روایات اور ان کے بیانات قارئین کرام نے ملاحظہ فرما لیے اب اس کے بعد اہل سیرت و طبقات اور اہل تراجم و تاریخ کی روایات ذکر کی جاتی ہیں تاکہ ناظرین کرام ان کے فرمودات ملاحظہ فرما کر مسئلہ ہٰذا کے متعلق مطمئن ہو سکیں۔ اتنی چیز ذہن نشین رہے کہ مندرجہ ذیل حوالہ جات مسئلہ مذکورہ کو مدلل کرنے کی خاطر بطورِ تائید نقل کیے جا رہے ہیں۔

ابنِ ہشام اور ابنِ جریر الطبری کی روایت

ابو محمد عبدالملک بن ہشام المعافری (متوفی ۲۱۸-۲۱۳ھ) نے اپنی مشہور سیرت ابنِ ہشام میں انتقال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے موقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

وقد کان المسلمون اختلفوا فی دفنہ وقال قائل ندفنہ فی مسجدہ (عند المنبر) وقال قائل ندفنہ مع اصحابہ (بالبقیع) وقال ابوبکرانی سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ماقبض نبی الادفن

یعنی مسلمانوں نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دفن میں اختلاف کیا۔ بعض حضرات کہتے تھے کہ مسجد نبوی میں دفن کرنا چاہیے جبکہ بعض دوسرے اصحاب کہتے تھے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اپنے دیگر اصحاب کے ساتھ (جنت البقیع) میں دفن کرنا

حیث یقبض- فرفع فراش رسول اللہ ﷺ الذی توفی علیہ فحفرلہ تحتہ ثم دخل الناس علی رسول اللہ ﷺ یصلون علیہ ارسالا دخل الرجال حتی اذا فرغوا دخل النساء حتی اذا فرغ النساء ادخل الصبیان ولم یوم الناس علی رسول اللہ ﷺ احد-

چاہیے--- تو اس وقت جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ نبی جہاں مقبوض ہوتا ہے اسی مقام میں ان کو دفن کیا جاتا ہے---

(سیرت ابن ہشام ص ۶۶۳، جلد ثانی، باب جنازہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و دفنہ، تاریخ ابن جریر الطبری ص۲۰۵، جلد ثالث، تحت حدیث سقیفہ، طبع مصر قدیم)

اس کے بعد جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فراش مبارک کو اٹھایا گیا اور وہاں پر قبر مبارک تیار کی گئی--- پھر جنازہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت اس طرح درج کی ہے کہ پہلے مرد جنازہ کے لیے (جماعت کے بعد جماعت) اندر داخل ہوئے اور جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ جنازہ کی امامت کسی شخص نے نہیں کی- (بغیر امام کے نماز پڑھی گئی)

ابن سعد اور بلاذری وغیرہما کی روایت کیفیت جنازہ کے متعلق

اس مقام کی ابن سعد اور بلاذری وغیرہم کی روایات میں مسئلہ ہذا مندرجہ ذیل عبارت میں منقول ہے-

لما کفن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ووضع علی سریرہ دخل ابوبکر وعمر فقالا السلام علیک ایہا النبی ورحمہ اللہ وبرکاتہ ومعہما نفر من المہاجرین قدر ما

يسع البيت فسلموا كما سلم ابوبكر وعمر وصفوا صفوفا لا يومهم عليه احد فقال ابوبكر وعمر وهما فى الصف الاول حيال رسول الله صلى الله عليه وسلم اللهم انا نشهد ان قد بلغ ما انزل عليه ونصح لامته وجاهد فى سبيل الله حتى اعز الله دينه-

فيقول الناس آمين آمين ثم يخرجون ويدخل اخرون حتى صلوا عليه الرجال ثم النساء ثم الصبيان فلما فرغوا من الصلوه تكلموا فى موضع قبره---الخ-

(طبقات الکبیر لمحمد بن سعد طبع لیڈن ص۶۹ جلد ثانی القسم الثانی تحت ذکر صلوٰۃ علی رسول اللہ علیہ وآلہ وسلم، کتاب انساب الاشراف البلاذری، ص۵۷۴، ج اول، تحت حالات جنازۂ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، کتاب انساب الاشراف ص۱۷، ج ثانی القسم الثانی تحت موضع قبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، البدایہ والنہایہ لابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ ص۲۶۵، ج۵، باب کیفیت الصلوۃ علیہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سیرۃ حلبیہ لعلی بن ابراہیم الحلبی ص۳۹۴، ج۳، تحت حالات انتقال نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

مندرجہ بالا ابن سعد و بلاذری کی روایت کا مفہوم یہ ہے کہ---جب سردار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کو کفن دے دیا گیا اور سریر (چارپائی) پر رکھے گئے تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ (حجرۂ مبارک میں) داخل ہوئے اور انہوں نے کہا: یارسول اللہ ﷺ آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلام ہو اور رحمتیں اور برکات ہوں اور شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے ساتھ انصار اور مہاجرین کی اتنی تعداد میں جماعت تھی جو اس حجرہ مبارک میں سما سکتی تھی- ان سب حضرات نے بھی شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی طرح سلام پیش کیا- یہ حضرات صفوں میں کھڑے تھے اور شیخین رضی اللہ عنہما جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے صف اول

میں کھڑے تھے اور کسی شخص نے اس نماز جنازہ کی امامت نہیں کرائی۔ (اس موقع پر ان حضرات نے یہ الفاظ ادا کیے)

"اے اللہ! ہم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ جو چیز پیغمبر پر نازل کی گئی، وہ انہوں نے ٹھیک طور پر پہنچائی اور انہوں نے اپنی امت کی خیر خواہی کی اور انہوں نے اللہ کے راستے میں جدوجہد کی حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دین کو قوت دی اور عزت بخشی۔"

پس اس وقت ساتھ والے لوگ آمین آمین کہتے رہے۔ پھر وہ افراد (حجرہ سے) باہر آگئے اور دوسرے داخل ہوئے۔ اسی طرح انہوں نے آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نماز جنازہ پڑھی۔ پہلے مرد داخل ہوتے رہے، پھر ان کے بعد خواتین داخل ہوئیں اور ان کے بعد لڑکے داخل ہوئے--- الخ

اور دیگر اکابر علمائے سیرت و تاریخ نے بھی کیفیت صلوٰۃ جنازہ اسی طرح ذکر کی ہے۔ ان کی عبارات ذکر کرنے سے تطویل ہوتی تھی۔ اس بنا پر صرف حوالہ جات ذکر کر دیئے ہیں۔

خلاصہ روایات

مختصر یہ ہے کہ محدثین کے نزدیک معروف و مقبول روایات اور اہل سیرت والتراجم کی تائیدی روایات سے یہ چیز پایہ ثبوت کو پہنچی کہ

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ انتقال نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موقعہ پر موجود اور حاضر تھے اور انہوں نے اس موقعہ پر متعدد احکامات شرعیہ کی ہدایات ارشاد فرمائیں۔ مثلاً

- جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال مبارک کی تصدیق کی۔
- غسل نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے اقربا کا مستحق ہونا بیان کیا۔
- نماز جنازہ کی کیفیت اور ادائیگی کا طریقہ ارشاد فرمایا۔

○ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے مقام دفن کے متعلق حدیث نبوی کی روشنی میں فیصلہ فرمایا۔

○ چنانچہ مذکورہ بالا تمام امور میں جناب صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشادات کے مطابق عمل درآمد کیا گیا۔

تائید مزید

ہم ناظرین کرام کی خدمت میں یہ چیز ذکر کرنا مفید خیال کرتے ہیں کہ مضمون بالا کی مزید تائید کتب حدیث و روایات سے پیش کی جا سکتی ہے لیکن طوالت سے اعراض کرتے ہوئے بطور اختصار کے مزید صرف ایک تائیدی حوالہ "المصنف لابن ابی شیبہ" سے ناظرین کرام کی خدمت میں نقل کیا جاتا ہے جسے ابن ابی شیبہ نے اپنی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے:

انهم شكو فى قبر النبى (صلى الله عليه وسلم) اين يدفنونه؟ فقال ابوبكر سمعت النبى صلى الله عليه وسلم يقول النبى لا يحول عن مكانه يدفن حيث يموت- فحفروا له موضع فراشه-

(المصنف لابن ابی شیبہ ص ۵۵۴-۵۵۳ جلد رابع عشر تحت باب ما جاء فی وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم، طبع کراچی)

روایت ہذا کا مفہوم یہ ہے کہ (وصال نبوی صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم) کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس مسئلہ میں متردد ہوئے کہ آنجناب صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کو کہاں دفن کیا جائے؟ تو اس موقعہ پر جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے سنا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کا جہاں انتقال ہو، اس مقام سے انہیں تحویل نہ کیا جائے بلکہ وہیں ان کو دفن کیا جائے--- چنانچہ اس کے بعد جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے مقام فراش کو کھود کر

مزار مبارک تیار کیا گیا۔

قابل غور

قابل اعتراض روایت جو معترض دوستوں نے تلاش کر کے پیش کی تھی، وہ بھی اسی مصنف (ابن ابی شیبہ) کی ذکر کردہ ہے اور ان کی اسی تصنیف (المصنف) میں پائی جاتی ہے۔ اور ہم نے مذکورہ روایت "المصنف" سے نقل کی ہے۔ وہ بھی اسی مصنف کی اپنی نقل کردہ ہے۔

لیکن ان دونوں روایات کے مضمون میں بین تضاد پایا جاتا ہے کیونکہ روایت ہذا نے بالکل واضح کر دیا ہے کہ انتقال نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بنفسہ موجود تھے اور مکان دفن کی تعیین اور موضع قبر کے تخصص کا مسئلہ آں موصوف رضی اللہ عنہ کے بیان و فرمان کے مطابق طے ہوا اور اسی پر عمل درآمد کیا گیا۔

پس کفن و دفن نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مواقع میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے غیر موجود ہونے کا اعتراض خود تراشیدہ افسانہ سے زیادہ وزن نہیں رکھتا اور معترض نے جو روایت طعن کے لیے پیش کی ہے، وہ بالکل بے سروپا ہے اور معروف روایات کے معارض ہونے کی وجہ سے "شاذ" کے درجہ میں ہے۔

ایک ضابطہ

محدثین کے نزدیک ایسے مواضع کے لیے ضابطہ یہ ہے کہ

الثقہ اذا شذ لا یقبل ما شذ فیہ۔

یعنی اگر ثقہ راوی بھی معروف روایات کے مقابلہ میں "شاذ" روایت لائے تو وہ قبول نہیں کی جاتی۔ فلہذا محدثین کے اس قاعدہ کی روشنی میں بھی معترض کی طرف سے پیش کردہ روایت "شاذ" ہونے کی وجہ سے قابل قبول نہیں ہوگی، کیونکہ

طعن والی روایات دیگر صحیح اور معروف روایات کے بالمقابل پائی جاتی ہے اور ان کا معارضہ نہیں کر سکتی۔

دیگر ضابطہ

نیز اس مقام میں ایک دیگر قاعدہ بھی قابل توجہ ہے کہ--- انتقال نبوی صلی اللہ علیہ و آلہٖ و سلم کے موقعہ پر موجود (شریک واقعہ) حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالٰی عنہم مثلاً سالم بن عبید الاشجعی رضی اللہ عنہ، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، وغیرہم کی روایات اور بیانات سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ شیخین رضی اللہ عنہم حضرات دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح اس موقعہ پر موجود تھے۔ غسل، جنازہ، کفن دفن وغیرہ امور میں شریک و شامل تھے۔ بلکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، کی ہدایات کے موافق یہ امور سرانجام دیئے گئے جیسا کہ سابقہ صفحات میں ذکر کیا گیا ہے--- اور طعن والی روایات عروۃ تابعی سے منقول ہے۔ وہ عروۃ تابعی کا قول ہے (کہ شیخین حضرات دفن نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر حاضر نہیں تھے)

--- فلہذا شرکاء واقعہ کے اقوال اور تابعی کے قول میں تعارض و تضاد پایا گیا---

ایسی صورت میں بطور ضابطہ کے علماء فرماتے ہیں کہ--- "وقول الصحابی (رضی اللہ عنہ) مقدم علی قول التابعی-"

(البدایہ والنہایہ لابن کثیرؒ ص۲۳۶ جلد خامس تحت ذکر امرہ علیہ السلام ابابکر الصدیق ان یصلی بالصحابہ اجمعین)

حاصل یہ ہے کہ انتقال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ میں شریک صحابہ کرام رضی اللہ عنہ، چشم دید گواہ کی حیثیت میں ہیں جبکہ واقعہ ہذا کے ایام میں غیر موجود تابعی غیر موجود شخص کے درجہ میں ہے اور صرف شنید واقعہ کا قائل ہے۔

فلہذا اس صورت میں ضابطہ مذکورہ بالا کے مطابق شرکاء واقعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کا بیان مقدم اور مسلم ہوگا اور تابعی (عروۃ) کا قول متروک اور غیر مقبول ہوگا۔

پھر یہاں یہ چیز بھی لائق التفات ہے کہ ہماری معلومات کی حد تک عروۃ مذکور کے اس قول کا کوئی متابع نہیں پایا گیا--- اور متابع کا نہ پایا جانا اس امر کے ناقابل قبول ہونے کے لیے کافی دلیل ہے۔

آخر بحث میں ایک تجزیہ

مشہور عالم دین ابو المظفر الاسفرائینی (المتوفی ۴۷۱ھ) نے اپنی تصنیف "التبصیر فی الدین الباب الاول، ص۲۵-۲۶" میں انتقال نبوی کے حالات ذکر کیے ہیں۔

اس موقعہ پر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال، مقام دفن اور آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں جو وقتی و جزوی طور پر اختلافات رونما ہوئے ان کے متعلق فاضل اسفرائینی ذکر کرتے ہیں کہ یہ تمام مسائل جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی برکات سے حل ہوئے۔

چنانچہ اس چیز کو آں موصوف الاسفرائینی نے بہ عبارت ذیل تحریر کیا ہے۔

------ (۱) ------

وصال نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق اس موقعہ پر حاضرین میں اضطراب و اختلاف پیدا ہوا تو--- وارتفع هذا الخلاف ببركات ابی بكر الصديق رضی الله عنه--- الخ

یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی برکت سے یہ اختلاف رفع ہوگیا۔

اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے انتقال و وصال کی تصدیق کی تھی، اس سے اضطراب ختم ہوا۔

------ (۲) ------

اور مقام دفن میں جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اختلاف رائے ہوا تو

فزال هذا الخلاف ببركه الصديق رضي الله عنه--- الخ-	یعنی مقام دفن میں اختلاف رائے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی برکت سے زائل ہوا۔

(انہوں نے مقام دفن کی تعیین کی تھی) اسی طرح جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وصال کے بعد آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی اور قائم مقامی میں جب مہاجرین و انصار کے درمیان اختلاف رائے ہوا تو

------ (۳) ------

واتفقوا على قوله (الصديق) فزال هذا الخلاف ايضا ببركه الصديق---الخ-	یعنی صحابہ کرام نے اس مسئلہ میں جناب صدیق اکبر کے قول پر اتفاق کیا۔ (انہوں نے قول نبوی الائمہ من القریش پیش کیا تھا) پس جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی برکت سے یہ اختلاف بھی زائل ہوگیا۔

حاصل یہ ہے کہ

اس موقع پر جو متنازعہ فیہ امور پیش آئے وہ تمام امور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہدایات و رہنمائی سے طے ہوئے اور آں موصوف رضی اللہ عنہ کی برکات سے ان کا بخیر و خوبی اتمام ہوا۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

قابل غور

دیگر یہ بات نہایت اہم ہے کہ مسئلہ خلافت (و امامت) کا دین میں بڑا مقام ہے اور اس پر دین کی بقا کا مدار ہے اور دین وہ چیز ہے جس کے لیے خاص طور پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، یہ کوئی عام کام نہیں۔

خلافت کے فریضہ کو پورا کرنے کے لیے اگر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ و حضرت فاروق رضی اللہ عنہ بمع دیگر حضرات کے سقیفہ بنی ساعدہ میں تشریف لے گئے تو یہ اسلام کا ہی کام تھا۔

اور ساتھ ہی یہ بات حقیقت واقعہ ہے کہ مسئلہ خلافت طے ہو جانے کے بعد شیخین حضرات تجہیز و تکفین و تدفین وغیرہ کے واقعات میں برابر کے شریک ہوئے جیسا کہ گزشتہ صفحات میں تحریر کر دیا گیا ہے۔ فلہذا اس مقام میں طعن و اعتراض پیدا کرنے کی کچھ گنجائش نہیں۔

الزامی جواب

پیش کردہ طعن کا جواب بحمد للہ اپنی کتابوں سے معروف و صحیح روایات کے ذریعہ درج کر دیا ہے اور فن مناظرہ کا ضابطہ یہی ہے کہ انسان اپنے مسلمات سے اعتراض اور طعن کا جواب دے سکتا ہے۔ لہٰذا ہم نے اس قاعدہ کے مطابق جواب تمام کر دیا ہے۔

اب اس مسئلہ کو مزید پختہ کرنے کے لیے شیعہ احباب کی کتابوں سے الزاماً جواب نقل کیا جاتا ہے کہ شیخین حضرات رضی اللہ عنہما سردار دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جنازہ میں دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح شامل و شریک تھے اور موجود صحابہ کرام میں سے کوئی ایک بھی اس فضیلت سے محروم نہیں رہا۔ سب حضرات شامل ہوئے تھے۔

اس چیز پر شیعہ کی کتابوں میں بہت تفصیلات پائی جاتی ہیں، لیکن بسر دست چہار

عدد حوالہ جات برائے الزام پیش کرنا کافی ہیں۔

مندرجات ذیل سے ثابت ہوگا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ دونوں جنازۂ نبوی رضی اللہ عنہ میں شامل تھے اور دیگر صحابہ بھی اس میں شریک تھے۔

(۱) سلیم بن قیس الہلالی کہتے ہیں کہ

ثم ادخل عشره من المهاجرين وعشره من الانصار فكانوا يدخلون ويدعون ويخرجون حتى لم يبق احد شهد من المهاجرين والانصار الا صلى عليه۔

(کتاب سلیم بن قیس الہلالی ص۷۰، طبع اول، نجف اشرف تحت حالات انتقال نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

(۲) اور امام محمد باقر کہتے ہیں کہ

عن ابی جعفر (محمد باقر) قال لما قبض النبی صلی الله عليه وسلم صلت عليه الملائكه والمهاجرون والانصار فوجا فوجا۔

(اصول کافی ص۲۸۶، طبع قدیم، طبع نول کشور، لکھنؤ، تحت ابواب التاریخ، باب مولد النبی صلی اللہ علیہ وسلم و وفاتہ)

(۳) شیخ طبری از امام محمد باقر روایت کردہ است کہ دہ دہ نفر داخل مے شوند و چنیں برآں حضرت نماز مے کردند بے امام در روز دو شنبہ و شب سہ شنبہ تا صبح و روز سہ شنبہ تا شام۔ تا آنکہ خورد، و بزرگ مرد و زن، از اہل مدنیہ و اہل اطراف مدنیہ بر آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم چنیں نماز کردند۔

(حیات القلوب از ملا باقر مجلسی ص۸۶۶، ج۲، باب ۶۴، طبع قدیم لکھنؤ)

حاصل یہ ہے یعنی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دس دس مہاجرین اور دس دس انصار کو (حجرہ شریفہ) میں داخل کیا جو نماز جنازہ ادا کرتے تھے اور (حجرہ

شریفہ سے) باہر آ جاتے تھے۔ حتیٰ کہ مہاجرین و انصار میں سے ایک بھی فرد باقی نہ رہا جس نے آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم پر نماز ادا نہ کی ہو۔

اور حیات القلوب کی عبارت کا ترجمہ درج ذیل ہے:

یعنی امام محمد باقرؒ فرماتے ہیں: جنازۂ نبوی ﷺ کی صورت یہ کی گئی کہ دس دس افراد نماز جنازہ کے لیے حجرہ میں داخل ہوں اور بغیر امام کے نماز ادا کریں۔ سوموار کے روز اور منگل کی شب صبح تک اور منگل کے روز شام تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ چھوٹے بڑے مرد عورت اہل مدینہ اور اہل اطراف مدینہ تمام لوگوں نے آپ کی اسی طرح نماز جنازہ ادا کی۔

مختصر یہ ہے کہ شیعہ کے ائمہ اور مجتہدین کی معتبر روایات سے واضح ہوتا ہے کہ اس موقع پر حاضر تمام مہاجرین اور تمام انصار اور تمام اہل مدینہ سب کے سب نے جنازہ نبوی ﷺ میں شرکت کی اور اس فضیلت سے کوئی بھی محروم نہیں رہا۔ ان حضرات میں شیخین رضی اللہ عنہما بھی آ گئے اور ان کا جنازہ نبوی میں شمول یقیناً پایا گیا کیونکہ ان حوالہ جات میں شیخین رضی اللہ عنہما کے حق میں کوئی استثناء مذکور نہیں۔

ان حقائق کے باوجود اگر کوئی شخص اپنے تجویز کردہ طعن پر قائم رہتا ہے تو یہ ضد اور عناد ہے، جس کا کوئی علاج نہیں۔

آخری بات

اس چیز کی اطلاع کر دینا مناسب ہے کہ عدم شرکت جنازہ کے طعن کا جواب ہم نے قبل ازیں اپنی تالیف "سیرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ" میں انتقال نبوی ﷺ کے حالات کے تحت ص ۱۴۲ تا ۱۴۷ ذکر کر دیا تھا لیکن یہاں اس مسئلہ میں کچھ زیادہ تفصیل ذکر کر دی ہے تاکہ ناظرین کے لیے باعث اطمینان ہو سکے اور معلومات میں اضافہ ہو۔

کانت بیعہ ابی بکر فلتہ کا طعن

مخالفین صحابہ (شیعہ) کی طرف سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیعت خلافت کے متعلق یہ طعن کیا جاتا ہے کہ آں موصوف رضی اللہ عنہ کی بیعت بے سوچے سمجھے اور اچانک واقع ہوئی اور اس میں مشورہ نہیں کیا گیا اور ان کو بغیر دلیل کے خلیفہ بنا دیا گیا۔

پس ابوبکر کی خلافت مبنی بر حقانیت نہیں اور یہ امام برحق نہیں۔

الجواب

مخالفین صحابہ نے اس طعن کی بنیاد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک قول کانت بیعہ ابی بکر فلتہ وقی اللہ شرھا کو بنایا ہے۔

اس طعن کے متعلق ذیل میں چند چیزیں ذکر کی جاتی ہیں جن کی وضاحت کے بعد اس طعن کا جواب تمام ہو جائے گا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا قول کا مفہوم ابو عبید القاسم بن سلام (المتوفی ۲۲۴ھ) نے اپنی تصنیف "غریب الحدیث" میں عبارت ذیل ذکر کیا ہے:

انما معناہ البغتہ۔ وانما عوجل بھا مبادرہ لانتشار

الامر والشقاق حتی لا یطمع فیھا من لیس لھا بموضع وکانت الفلته ھی التی وقی الله بھا الشر المخوف۔

(غریب الحدیث لابی عبید القاسم الہروی ص۲۳۲-۲۳۱ جلد ثانی، طبع حیدر آباد دکن)

اور ایک دیگر مقام میں اس مضمون کو اس طرح لکھا ہے کہ

اما قوله فلته فان معنی الفلته الفجاه۔ وانما کانت کذالک لانه لم ینتظر بھا العوام انما ابتدرھا اکابر اصحاب محمد صلی الله علیه وسلم من المھاجرین عامته الانصار الی تلک الطیره التی کانت من بعضھم ثم اصفقوا له کلھم لمعرفتھم ان لیس لابی بکر منازع ولا شریک فی الفضل ولم یکن یحتاج فی امره الی نظر ولا مشاوره فلھذا کانت فلته وبھا وقی الله الاسلام واھله شرھا۔

(غریب الحدیث لابی عبید القاسم بن سلام الہروی ص۳۵۷-۳۵۲ ثالث، طبع حیدر آباد، دکن، اسی مفہوم کے قریب الفائق للزمخشری ص۱۳۶، جلد ثانی تحت الفاء مع للام میں مذکور ہے، اور ابن تیمیہ نے منہاج السنہ ص۱۱۸ جلد ثالث میں، نیز الذہبی نے اپنی تصنیف المنتقی میں ص۲۲۸ پر اپنی اپنی عبارات میں یہی مضمون درج کیا ہے)

مندرجہ بالا ہر دو عبارات کا حاصل یہ ہے کہ

لفظ فلته کا معنی بغتته (اچانک ہوتا ہے) اور اس موقعہ پر بیعت کے معاملہ کو انتشار و انشقاق سے بچانے کی خاطر جلدی کی گئی تاکہ اس منصب کے لیے نااہل شخص و ناقابل فرد طمع و امید نہ رکھے۔

اور اس میں عوام کا انتظار نہیں کیا گیا (اس بنا پر اس بیعت کو "فلته" سے تعبیر کیا گیا) اور اکابر مہاجرین و عموماً انصار نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے

ہاتھ پر ہاتھ رکھا- اس بنا پر وہ جانتے تھے کہ آں موصوف رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں کوئی تنازع کرنے والا نہیں اور ان کی فضیلت کے برابر کا کوئی شریک نہیں اور آپ کی شخصیت اس معاملہ میں تفکر اور مشاورت کی محتاج نہیں- اس بنا پر یہ معاملہ جلدی سے طے ہوا اور اسلام اور اہل اسلام کو اللہ تعالیٰ نے اختلاف کے شر سے بچا لیا جس کا خطرہ و خوف ہو سکتا تھا-

اور اسی طرح شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنی تصنیف "تحفہ اثنا عشرہ" تحت طعن نہم- مذکورہ بالا طعن کا جواب مفصل ذکر کیا-

کہ معنی (وقی اللہ المومنین شرھا) ہمیں است کہ خلافت ابی بکر رضی اللہ عنہ ہر چند بعجلت واقع شد در سقیفہ بنی ساعدہ بملاحظہ پرخاش انصار و فرصت مشورہ ہا و مراجعت ہائے طویل نیافتہ لکن آنچہ ازیں عجلت خوف بیباشد کہ بیعت بجائے خود نیفتد و نالائق بر منصب امامت مستولی گردد- بہ عنایت ربانی واقع نشد و حق مرکز قرار گرفت-

وظاہر است کہ مراد عمر رضی اللہ عنہ ایں نیست کہ بیعت ابی بکر رضی اللہ عنہ صحیح نبود و خلافت او درست نشد- زیرا آنکہ عمر رضی اللہ عنہ و ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ ہمیں دو کس اند کہ اول با ابوبکر الصدیق در سقیفہ بیعت نمودہ اند بعد ازاں دیگراں- و ہر دو در آں وقت در حق ابوبکرؓ گفتہ اند کہ انت خیرنا وافضلنا وایں کلمہ ایشاں را جمیع حاضراں از مہاجرین و انصار انکار نکردہ بلکہ مسلم داشتہ- پس خیریت و افضلیت ابوبکر رضی اللہ عنہ نزد جمیع صحابہ رضی اللہ عنہم مسلم الثبوت و قطعی بود-

(تحفہ اثنا عشرہ از شاہ عبدالعزیز دہلویؒ ص ۲۷۱ تحت طعن نہم باب مطاعن ابوبکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، طبع لاہور)

مندرجہ بالا عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ

"کلمہ وقی اللہ المومنین شرھا" کا مفہوم یہ ہے کہ ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت خلافت کا انعقاد سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کے تنازع اور

اختلاف کے پیش نظر جلدی میں واقع ہوا اور مشوروں میں فرصت اور مراجعت طویل نہیں پائی گئی۔ لیکن اس معاملہ میں جلدی کرنے میں جو خطرہ اور خوف تھا کہ بیعت اپنی جگہ پر نہ پائی جائے اور نااہل اس منصب پر مسلط ہو جائے تو عنایت ربانی سے وہ واقع نہ ہوا۔ (اور رفع ہوگیا) اور امر حق اپنے مرکز پر قرار پایا۔

اور ظاہر ہے کہ اس کلمہ مذکورہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ مراد نہیں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی یہ بیعت صحیح نہ تھی اور ان کی خلافت درست نہ تھی۔

وجہ یہ ہے کہ

(۱) سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ اول اول بیعت کرنے والے دو شخص تھے ایک خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ۔ اس کے بعد دیگر حضرات نے بیعت کی تھی۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ اس موقعہ پر (حضرت عمر رضی اللہ عنہ، ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ) دونوں بزرگوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں یہ کلمات استعمال کیے کہ

انت خیرنا وافضلنا۔ یعنی اے صدیق! آپ ہم سب میں سے بہت بہتر اور افضل ہیں۔

اور مہاجرین و انصار جو وہاں موجود تھے، انہوں نے ان کلمات کا انکار نہیں کیا بلکہ انہوں نے اس بات کو تسلیم کیا۔

تو اس صورت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا خیر اور افضل ہونا تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کے نزدیک مسلم اور یقینی ہوا۔

فائدہ

مذکورہ کلمات جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں

فرمائے ہیں۔ یہ بخاری شریف جلد اول باب فضل ابی بکر ص۵۱۸ میں ان الفاظ کے ساتھ مذکور ہیں کہ

بل نبایعک فانت سیدنا وخیرنا واحبا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

خلاصہ الکلام

معترض دوستوں نے جو اس موقعہ کے "جملہ" کو سامنے رکھ کر طعن پیدا کیا، وہ سراسر بے جا اور بے محل ہے۔

کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس کلام سے یہ قصد ہی نہیں تھا کہ بیعت بے موقعہ اور بے سوچ سمجھے ہوئی ہے اور خلیفہ کے نااہل ہونے کے باوجود اس کا فوری انتخاب کر لیا گیا، پس یہ خلیفہ برحق نہیں۔

بلکہ انہوں نے اس موقع کی حقیقت حال کو اس جملہ میں بیان کیا کہ مسئلہ بیعت میں جلدی کی گئی تھی تاکہ مختلف آراء کھڑے ہونے سے اس میں پیچیدگی نہ واقع ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ نے اختلاف کے شر سے اسلام اور اہل اسلام کو بچا لیا اور خلیفہ کا صحیح انتخاب جلد ہو گیا اور منتخب خلیفہ اس منصب کے اہل تھا۔ اس بنا پر جمہور اہل اسلام نے اسے بخوشی قبول کر لیا اور اس موقعہ پر ہنگامہ آرائی نہیں پیش آئی۔ یہی چیزیں انتخاب کے صحیح ہونے کی دلیل ہیں۔

رفع شبہ کے طور پر یہاں یہ ذکر کر دینا مفید ہے کہ اس مقام کی بعض روایات میں صحابہ کا باہم تنازع کرنا اور دست و گریباں ہونا اور تلواریں سونت لینا وغیرہ پایا جاتا ہے--- وہ ہرگز صحیح نہیں۔ ایسی روایات کی حیثیت تاریخی ملغوبات سے زیادہ کچھ نہیں اور وہ روایات اہلِ فن کے نزدیک مجروح و مقدوح ہیں اور ہرگز قابلِ اعتماد نہیں۔

مانعین زکوٰۃ سے جنگ کرنے کا طعن

ایک سوال: حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مخالفین کی طرف سے یہ سوال قائم کیا جاتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مانعین زکوٰۃ (مثلاً ثعلبہ و ثقیف وغیرہ) کو زکوٰۃ چھوڑ دی تھی اور زکوٰۃ نہ دینے پر جنگ نہیں فرمائی اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ کے ساتھ قتال اور جہاد کیا۔ یہ طریقہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول و فعل کے خلاف ہے۔

اس اعتراض کے لیے ذیل روایت پیش کی جاتی ہے۔ مثلاً

عن وھب سالت جابرا عن شان ثقیف اذ بایعت قال اشترطت علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لا صدقہ علیھا ولا جھاد--- (الخ)

(البدایہ لابن کثیر ص۳۰، ج۵، تحت قدوم وفد ثقیف علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فی رمضان من سنہ تسع)

الجواب

سوال ہذا اگر تسلیم کر لیا جائے تو اس کے جواب کے لیے مندرجہ ذیل چیزیں ملاحظہ فرمائیں، ان سے اعتراض مرتفع ہو سکے گا۔

(ا) اصل بات یہ ہے کہ ثقیف کی طرف سے مذکورہ شرط لگانا باہم گفتگو کے ابتدائی مرحلہ کے درجہ میں ہے لیکن یہ ان کی شرط علی الدوام تسلیم نہیں کر لی گئی

تھی- قرینہ یہ ہے کہ خود اسی روایت میں مندرجہ ذیل الفاظ موجود ہیں---

سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول بعد فالکث سیتصدقون ویجاھدون انا اسلموا-

یعنی مطلب یہ ہے کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے وضاحت فرمادی کہ یہ لوگ جب اسلام لے آئیں گے تو صدقات بھی ادا کریں گے اور جہاد بھی کریں گے-

یعنی یہ عارضی طور پر نفی صدقہ اور نفی جہاد کی شرطیں لگا رہے ہیں- اسلام کے راسخ ہونے کے بعد یہ صدقات ادا کریں گے، جہاد میں بھی شامل ہوں گے-

(۲) جب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد قبائل مرتد ہوگئے اور بعض قبائل نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ نماز پڑھیں گے، لیکن زکوٰۃ ادا نہیں کریں گے- ان حالات میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عزمِ مستقیم رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ منعونی عقالا لجاھدتھم-

(۱) البدایہ لابن کثیر ص ۳۱۲ ج ۶ تحت فصل فی تصدیق الصدیق رضی اللہ عنہ لقتال اہل الردۃ-

(۲) مشکوٰۃ شریف ص ۱۵۷ کتاب الزکوٰۃ فصل ثالث-

یعنی جو عہد نبوت میں زکوٰۃ دیتے تھے، اگر وہ مثلاً ایک رسی بھی روک رکھیں گے تو ہم ان کے خلاف جہاد کریں گے-

حضرت صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ اور حاکم وقت تھے- ان کے فرامین کی اطاعت اہل اسلام پر واجب تھی- مانعین زکوٰۃ کے ساتھ قتال کرنا اپنی جگہ صحیح اور درست تھا اور بعض حضرات جو اس وقت اس مسئلہ میں رعایت کرنے کی رائے رکھتے تھے، وہ آخر کار حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے کے ساتھ متفق ہوگئے- (مرقات شرح مشکوٰۃ ص ۱۳۶-۱۳۷، ج ۴، تحت الحدیث) اور مانعین زکوٰۃ کے ساتھ قتال کو درست قرار دیا- یہ مسئلہ اپنے مقام پر واضح طور پر مذکور ہے-

اکابر صحابہ کرام میں سے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی حضرت صدیق کی اس رائے کے ساتھ ہمنوا ہوگئے تھے اور قتال ہذا کرنے کے لیے آمادہ

ہو گئے۔ اسی موقعہ پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جوش میں آکر اپنی سواری منگوائی اور قتال ہذا پر جانے کے لیے خود نکل پڑے اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے پیش قدمی کر کے آنجناب رضی اللہ عنہ کی سواری کی باگ تھام لی اور فرمایا کہ آپ خود تشریف نہ لے جائیں بلکہ اس مہم پر دوسرے لوگوں کو روانہ کر دیں۔

عن عائشہ قالت خرج ابی شاھر اسیفہ راکبا علی راحلتہ الی وادی القصہ فجاء علی بن ابی طالب واخذ بزمام راحلتہ فقال الی این؟ یاخلیفہ رسول اللہ اقول لک ما قال رسول اللہ یوم احد لم سیفک ولا تفجنا بنفسک فواللہ لان اصبنا لک لا یکون للاسلام بعلک نظام ابدا فرجع وامضی الجیش۔

(البدایہ لابن کثیر ص۳۱۵، ج۶ تحت خروجہ الی ذی القصہ)

مختصر یہ ہے یعنی حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سمیت باقی اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس مسئلہ پر متفق ہو گئے تھے کہ مانعین زکوٰۃ کے ساتھ قتال کیا جائے تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا عملی اقدام صحیح ہوا۔

سُنّت نبوی اور فرمانِ نبوی کے خلاف نہیں تھا فلہذا معترض کا اعتراض بے جا ہے۔

"جوامع السیرہ لابن حزم الظاھری" میں ایک قول لکھا ہے، وہ بھی اس موقعہ پر پیش نظر رہے۔

وقد قال قوم ان ثعبلہ بن حاطب منع الزکوہ فنزلت فیہ (ومنھم من عاھد اللہ لئن اتانا من فضلہ لنصدقن) (الایات) وھذا باطل- لان شھودہ بدرا یبطل نالک بلاشک۔

(جوامع السیرۃ لامام ابن حزم الظاہری ص۱۲۷ تحت تسمیہ، من شہد بدرا الخ مطبوعہ ادارہ احیاء السنہ گھرجاکھ ضلع گوجرانوالہ)

روایت مذکورہ بالا کا مفہوم یہ ہے کہ

ایک قوم نے کہا کہ جب ثعلبہ بن حاطب نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا تو اس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی (ومنهم من عاهد--- الخ یعنی وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد کیا کہ اگر وہ ہمیں اپنے فضل سے عطا کرے گا تو ہم ضرور صدقہ دیں گے)

یہ چیز باطل ہے کیونکہ ثعلبہ بن حاطب کا بدری صحابہ میں سے ہونا بلاشک اس چیز کو باطل کرتا ہے۔



جیش اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے متعلق طعن

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر طعن کرنے والوں نے یہ طعن قائم کیا ہے کہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ماہ صفر الھ میں رومیوں کے خلاف اہلِ اسلام کا ایک لشکر مرتب فرمایا اور اس لشکر اسلامی کو اسامہ بن زید کی سربراہی میں روانہ کرنے کا حکم فرمایا۔

بقول ابنِ مطہر حلی شیعہ آنجناب نے ارشاد فرمایا کہ

انفذوا جیش اسامہ۔ لعن اللہ المتخلف عن جیش اسامہ و کانت الثلاثہ معہ۔ ومنع ابوبکر عمر من ذالک۔

یعنی اسامہ بن زید کے لشکر کو نافذ اور جاری کرو اور جو شخص جیش اسامہ میں شمولیت سے پیچھے رہ جائے گا اس پر اللہ کی لعنت ہوگی اور اس جیش میں تینوں حضرات (ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم) ساتھ تھے، پھر ابوبکر نے عمر رضی اللہ عنہ کو اس جیش کے ساتھ جانے سے منع کر دیا۔

مخالفین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے اعتراض یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوگیا تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے لشکر ہذا کو روانہ کرنے میں کوتاہی کی۔ خود بھی نہ گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی روک لیا۔ یہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے تاکیدی فرمان کی صریح خلاف ورزی اور مخالفت کی۔

الجواب

اس اعتراض کے جواب میں چند چیزیں پیش کی جاتی ہیں' ان سے طعن ہذا مرتفع ہوسکے گا۔

روایت ہذا میں جو یہ کلمات پائے جاتے ہیں کہ: لعن اللہ من یتخلف عنھا۔ علماء فرماتے ہیں کہ یہ کلمات صحیح نہیں اور روایت میں کسی کی طرف سے یہ کلمات اضافہ شدہ ہیں۔

اگر ان کلمات کو درست تسلیم کرلیا جائے تو اس سے کئی قسم کی خرابیاں لازم آتی ہیں۔

مثلاً حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ بھی جیش اسامہ میں شامل نہیں ہو سکے۔ فلہذا ان کے حق میں مذکورہ کلمات کس طرح درست ہوئے؟

نیز یہ بات قابل توجہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری اوقات میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو نماز کی امامت کے لیے حکم فرمایا اور انہوں نے حکم کی تعمیل میں نماز کی امامت کرائی اور بعد از انتقال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم منصب خلافت کے لیے صحابہ کی طرف سے منتخب ہوئے۔ اندریں حالات آنموصوف رضی اللہ عنہ جیش اسامہ میں کس طرح شامل ہوسکتے تھے؟

ان قرائن کی بنا پر علمائے کرام رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ روایت میں لعنت کے کلمات صحیح نہیں۔

نیز یہ بات بھی درست نہیں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تنفیذ جیش اسامہ کے سلسلہ میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کی خلاف ورزی کی۔

کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جیش اسامہ کو نافذ کیا اور روانہ فرمایا اور یہ چیز متعدد روایات میں منقول ہے۔ ذیل میں صرف ایک روایت پیش کی جاتی ہے:

ان ابابکر لما (صمم) علی تجهیز جیش اسامه قال بعض الانصار لعمر: قل له فلیومر علینا غیر اسامه فذکر له عمر ذالک فیقال: انه اخذ بلحیته وقال ثکلتک امک یاابن الخطاب او مر غیر امیر رسول الله صلی الله علیه وسلم؟ ثم نهض بنفسه الی الجرف فاستعرض جیش اسامه وامر بالمسیر وسار معهم واسامه راکبا- وعبدالرحمن بن عوف یقود براحله الصدیق- فقال اسامه یاخلیفه رسول الله! اما ان ترکب واما ان انزل- فقال والله! لست بنازل ولست براکب' ثم استطلق الصدیق من اسامه عمر بن الخطاب- وکان مکتتبا فی جیشه فاطلقه له- فلهذا کان عمر لا یلقاه بعد ذالک الاقال السلام علیک ایها الامیر-

(البدایہ والنہایہ لابن کثیرؒ ص ۳۰۵ ج ۶ تحت فصل فی تنفیذ جیش اسامہ بن زید ۱۱ھ)

نوٹ: خلیفہ ابن خیاط نے بھی اپنی تاریخ میں ص ۹۵ ج ۱ پر درج کیا ہے کہ امیرالمومنین حضرت ابوبکر صدیق نے امیر جیش اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے اجازت لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو واپس بلا لیا تھا۔

روایت مندرجہ بالا کا مفہوم یہ ہے کہ

جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جیش اسامہ کی تیاری کا پختہ ارادہ کر لیا تو بعض انصار نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کہیں کہ ہم پر اسامہ کے سوا کسی دوسرے شخص کو امیر بنا دیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ذکر کی--- جواب میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا--- میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقرر کردہ امیر کے بغیر کسی دوسرے شخص کو امیر مقرر نہیں کر سکتا۔ پھر حضرت ابوبکر

صدیق رضی اللہ عنہ خود جرف کے مقام پر جا پہنچے اور جیش اسامہ کے سامنے پہنچ کر اسے روانگی کا امر فرمایا اور خود ان کے ساتھ پاپیادہ چل پڑے جبکہ اسامہ سوار تھے۔ عبدالرحمٰن بن عوف حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی سواری کو کھینچے جا رہے تھے۔ اس وقت اسامہ نے کہا یا خلیفہ رسول اللہ! یا تو آپ سواری پر سوار ہو جائیں یا میں اپنی سواری سے اترتا ہوں۔ تو حضرت صدیق نے فرمایا اللہ! نہ تم سواری سے اترو اور نہ میں سوار ہوتا ہوں۔

اس کے بعد حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے اسامہ رضی اللہ عنہ سے عمر بن الخطاب کو جیش سے واپس مانگ لیا حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام جیش کی فہرست میں درج تھا۔ پس اسامہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو واپسی کی اجازت دے دی۔

اسی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جب بھی اسامہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ملاقات ہوتی تو یوں کہا کرتے:

السلام علیک ایھا الامیر!

مندرجات مذکورہ بالا سے واضح ہوگیا کہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی ہرگز خلاف ورزی نہیں کی بلکہ جیش اسامہ کو لوگوں کے منع کرنے کے باوجود پوری تیاری کے ساتھ روانہ فرمایا اور جیش اسامہ کی روانگی کو ہرگز موقوف نہیں کیا۔۔۔ نیز واضح ہوگیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیش اسامہ سے ازخود متخلف نہیں رہے تھے بلکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جناب اسامہ رضی اللہ عنہ بن زید کی باقاعدہ اجازت سے واپس لے لیا تھا۔ فلہذا معترض لوگوں نے عدم تنفیذ جیش اسامہ رضی اللہ عنہ کے متعلق جو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ پر طعن قائم کیا، وہ غلط ہے اور واقعات کے برخلاف ہے۔



لہ الحمد وعلیہ السلام

مالک بن نویرہ کے قتل کا اعتراض اور اس کی وضاحت

مخالفین صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس مقام میں مالک بن نویرہ کے قتل کا واقعہ نقل کر کے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ دونوں پر اعتراض وارد کیا ہے۔ اعتراض کی یہ شکل قائم کی ہے کہ مالک بن نویرہ مسلمان اور صحابی رسول تھا اور اس کے ساتھی بھی مسلمان تھے۔ ان سب کو خالد بن ولید نے زکوٰۃ نہ دینے کے بہانے سے قتل کر ڈالا اور اس کی بیوی جو کہ حسینہ جمیلہ تھی، اس موقعہ پر عدت گزارنے کے بغیر اس کے ساتھ شب باشی کی۔

جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ کے ہاں یہ واقعہ پیش ہوا تو حضرت ابوبکر نے اس سے نہ قصاص لیا اور نہ اس کے قتل کا بدلہ دلوایا اور نہ اس پر حد شرعی لگائی، حالانکہ قصاص کا لینا اور حد کا جاری کرنا ابوبکر پر شرعاً واجب تھا۔

گویا کہ دونوں حضرات ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پر مخالفین کی طرف سے یہ اعتراض مشترک قائم کیا جاتا ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ طلیحہ بن خویلد اسدی (جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا) کی

مہم سے جب خالد بن ولید واپس لوٹ تو علاقہ "بطاح" کی طرف توجہ کی اور فوجی دستوں کو اس کے اطراف و جوانب میں بھیجا اور شرعی قاعدہ یہ سامنے رکھا کہ "جس قوم میں اذان کی آواز سنائی دے تو ان پر حملہ اور غارت نہ کی جائے اور اگر وہاں اذان کی آواز سنائی نہ دے تو اس مقام کو دارالحرب قرار دے کر ان پر حملہ کر دیا جائے۔

اس موقعہ پر ابوقتادہ الانصاری رضی اللہ عنہ نے گواہی دی کہ میں نے اذان کی آواز سنی ہے جبکہ دیگر اہل سریہ اور جماعت والوں نے اس کے خلاف بیان دیتے ہوئے کہا کہ ہم نے یہاں کوئی اذان کی آواز نہیں سنی۔ دوسری چیز یہاں یہ پائی گئی کہ اس مقام کے گرد و نواح میں رہائش پذیر لوگوں نے خبر دی کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کی جب یہاں خبر پہنچی تو:

"ہنگام استماع خبر قیامت اثر وفات جناب پیغمبر علیہ السلام زنان خانہ ایں مالک بن نویرہ حنا بندی و دف نوازی و دیگر لوازم فرحت و شادی بجا آوردہ شماتت اہلِ اسلام نمودہ بودند۔"

یعنی مالک بن نویرہ کے اہلِ خانہ نے بطور خوشی اور اہلِ اسلام کی شماتت کے حنابندی کی اور دف بجائی اور دوسرے فرحت وانبساط کے لوازم بجالائے۔

(تحفہ اثنا عشریہ ص ۲۶۳ تحت مطاعن صدیقی طعن دوم)

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پیش نظر ان لوگوں کے ارتداد کی مذکورہ علامات بھی تھیں۔

اور اس موقعہ پر مالک بن نویرہ جب خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش ہوا اور ان سے گفتگو کی تو اس وقت مالک بن نویرہ نے جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حق میں یہ الفاظ (قال رجلکم اور صاحبکم کذا) استعمال کیے (یعنی تمہارے آدمی یا تمہارے ساتھی) اس دور میں کفار اور مرتدین کا یہی شیوہ تھا جو اس نے اپنے کلام میں اختیار کیا۔ نیز اس سے قبل یہ بات منقح ہو گئی تھی کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر سن کر وہ صدقات جو مالک بن نویرہ نے

اپنی قوم سے جمع کیے تھے وہ اس نے اپنی قوم کو واپس دے دیئے اور کہا کہ

وگفت بارے از موت ایں شخص خلاص شدید۔ (تحفہ اثنا عشریہ ص ۲۶۳)

یعنی اے قوم! اس شخص کی موت سے تمہاری خلاصی ہوگئی۔

مذکورہ بالا وجوہ اور واقعات کے پیش نظر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مالک بن نویرہ اور اس کی قوم کو قتل کرنے کا حکم دیا۔

اس موقعہ پر ابوقتادہ الانصاری رضی اللہ عنہ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس مسئلہ میں اختلاف کیا اور کہا کہ ان لوگوں کو قتل نہ کیا جائے، مگر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے حکم کی تعمیل کی گئی اور ان لوگوں کو قتل کر دیا گیا۔

اس کے بعد ابوقتادہ الانصاری رضی اللہ عنہ مدینہ شریف میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خالد بن ولید کے خلاف رائے دی کہ مالک بن نویرہ اور اس کے ساتھیوں کو قتل کرنا صحیح نہیں تھا۔

اس پر جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خالد بن ولید کو اپنے ہاں طلب فرمایا اور ان سے تمام پیش آمدہ احوال استفسار کیے۔ جب حقیقت حال معلوم ہوئی تو آپ نے خالد بن ولید کو حق بجانب معلوم کیا۔ اس بنا پر آپ خالد بن ولید کے احوال کے متعلق معترض نہ ہوئے اور ان کو امیر الامراء کے منصب پر بحال رکھا، چنانچہ تحفہ اثنا عشریہ میں ہے کہ

"چوں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خالد را بحضور خود طلبید و ازوی استفسار حال ماجرا من و عن ظاہر شد و حق بجانب خالد دریافتہ معترض حال او نشد و او را باز بہ منصب امیر الامراء بحال فرمود۔"

(تحفہ اثنا عشریہ ص ۲۶۳، تحت مطاعن صدیقی طعن دوم)

اور بعض اکابر علماء اس مقام میں مندرجہ ذیل روایت ذکر کرتے ہیں:

عن سالم عن ابیہ (عبداللہ بن عمر) قال قدم ابوقتادہ علی ابی بکر فاخبرہ بمقتل مالک واصحابہ فجزع من

ذالک جزعا شدیدا فکتب ابوبکر الی خالد فقدم علیہ فقال ابوبکر ھل یزید خالد علی ان یکون تاول فاخطاء ورد ابوبکر خالدا وودی مالک بن نویرہ وردی السبی والمال۔

عن ابن اسحاق قال دخل خالد علی ابی بکر فاخبرہ الخبر فاعتذر الیہ فعذرہ۔

(تاریخ خلیفہ بن خیاط (المتوفی ۲۴۰ھ) ص۷۰، جلد اول، طبع جدید، نجف اشرف عراق، سیر اعلام النبلاء للذہبی جلد اول، ص۲۷۱ تحت خالد بن ولید)

مطلب یہ ہے کہ ابو قتادہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور انہیں مالک اور ان کے ساتھیوں کے قتل کی خبر دی۔ اس خبر کی بنا پر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بہت گھبرائے اور خالد کو مکتوب کے ذریعے طلب کیا۔ پس خالد بن ولید حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پہنچے (اور تمام واقعہ ذکر کیا اور حقیقت حال بیان کی) تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حالات معلوم کر کے یوں فرمایا کہ اس بات سے زیادہ کچھ نہیں کہ خالد نے تاویل کی اور اس سے خطا سرزد ہوئی۔ اس کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے خالد کو ان کے منصب پر واپس کر دیا اور مالک بن نویرہ کی دیت بیت المال سے ادا کر دی اور قید شدہ افراد کو واپس کر دیا اور اخذ کردہ مال لوٹا دیا۔

اور دوسری روایت میں ہے کہ خالد بن ولید جناب ابو بکر صدیق کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تمام واقعات کی خبر دی اور عذر پیش کیا۔ جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کی معذرت قبول کرتے ہوئے معذور قرار دیا۔

اس موقعہ پر کبائر علماء نے یہ بات لکھی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ میں خطاء کر جانے کے متعلق وہی طریقہ اختیار کیا جس طرح جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ایک واقعہ پیش آیا تھا۔ وہ اس طرح ہے کہ

فتح مکہ کے بعد جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو قبیلہ بنی جذیمہ کی طرف روانہ فرمایا کہ ان کو اسلام کی طرف بلائیں اور دعوت دیں اور اس وقت اس قبیلہ والوں نے بجائے اس کے کہ وہ "اسلمنا" (ہم اسلام لائے) کہیں تو وہ کہنے لگے صبائنا صبائنا (یعنی ہم نے دین کو چھوڑا) ان لوگوں کی مراد یہ تھی کہ ہم نے قدیم دین کو چھوڑا اور ہم اسلام لائے--- الخ۔ تو اس وقت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو ان الفاظ کی بنا پر بعض کو قتل اور بعض کو قید کر لیا۔ اس اسلامی جیش میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے اور خالد نے حکم دیا کہ ہر شخص اپنے اپنے قیدی کو قتل کر دے اس پر جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اپنے قیدی کو قتل نہیں کروں گا اور میرے ساتھی بھی قتل نہیں کریں گے، حتیٰ کہ ہم جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں۔

پس ابن عمر رضی اللہ عنہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور سارا ماجرا ذکر کیا تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہاتھ مبارک اٹھائے اور دو بار فرمایا:

اللھم انی ابراء الیک مما صنع خالد مرتین۔ یعنی اے اللہ! میں اس فعل سے بری ہوں جو خالد نے کیا ہے۔

(رواہ البخاری)

(مشکوۃ شریف ص ۳۴۷، تحت باب حکم الاسراء، الفصل الثالث بحوالہ البخاری، طبع نور محمدی، دہلی)

جناب خالد بن ولید سے ان کے کلمہ سمجھنے میں خطا ہوئی تھی اور اس پر انہوں نے قبیلہ خزیمہ کے بعض لوگوں کو قتل کر دیا تھا۔

اس مقام میں شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ

"وبر خالد رضی اللہ عنہ قصاص جاری نہ فرمود و نہ ازو دیت دہانید دیراکہ شبہ کفر

بخاطرش افتاد- پس اگر ابوبکر صدیق نیز بابت خون یک کسے بمثل ایں شبہ بلکہ قوی تر ازاں باخالد رضی اللہ عنہ تعرض نہ نماید چہ بدی کردہ باشد- علی الخصوص کہ ابوبکر دیت مالک ہم از بیت المال دہانید-"

(تحفہ اثنا عشریہ از شاہ عبدالعزیز" ص ۲۹۴ تحت مطاعن صدیقی، طعن دوم، طبع لاہور)

یعنی اگر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسی طرح کے شبہ بلکہ قوی تر شبہ کی بنا پر خالد کے ساتھ تعرض نہیں کیا تو کوئی بری بات نہیں کی- خاص طور پر جبکہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے مالک بن نویرہ کی دیت یعنی خون بہا دلوا دیا تھا-

مطلب یہ ہے کہ جس طرح جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے شبہ کی بنا پر خالد رضی اللہ عنہ سے قصاص نہیں لیا تھا- اسی طرح حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی اسی واقعہ میں خالد سے قصاص نہیں لیا تو صدیق اکبر نے اسوۂ حسنہ نبوی کے موافق عمل کیا-

نیز واضح رہے کہ مسئلہ ہذا کے اس مضمون کو شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے "قرۃ العینین" میں بہ عبارت ذیل ذکر کیا ہے-

بالجملہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ را در درأ قصاص از خالد رضی اللہ عنہ اسوۂ حسنہ است برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم در قصہ صباٴنا صباٴنا و ایں مسئلہ اجتہادیہ است کہ علماء درآں مختلف اند و صدیق بہ حسب اجتہاد خود کار فرمود- وہم چنیں است وظیفہ خلیفہ چوں باجتہاد فقہائے دیگر مخالف شود--- الخ-

("قرۃ العینین" از حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی" ص ۲۳۲ تحت قصاص مالک بن نویرہ، طبع مجتبائی دہلی)

مطلب یہ ہے کہ جس طرح قصہ صباٴنا میں جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے قصاص کو ترک کر دیا تھا اور ساقط کر دیا تھا- اسی اسوۂ حسنہ کے مطابق جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خالد رضی اللہ عنہ سے قصاص کو ختم کر دیا اور بدلہ نہیں لیا-

یہ مسئلہ اپنی جگہ مجتہد فیہ ہے اور اس میں علماء مختلف ہیں لیکن صدیق اکبر

رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہاد کے پیش نظر عمل کیا اور خلیفہ کو حق پہنچتا ہے اور وہ صاحب اجتہاد ہوتا ہے۔

اس مسئلہ میں کبائر علماء نے یہ بات بھی لکھی ہے کہ

اگر بالفرض تسلیم کر لیا جائے کہ مالک بن نوید مرتد نہیں تھا، بے شک اس کے ارتداد کا شبہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ذہن میں جاگزیں تھا اور قاعدہ یہ ہے کہ--- والقصاص تندرئی بالشبہات--- الخ یعنی شبہات کی بنا پر قصاص دفع ہو جاتا ہے۔

اس بنا پر بھی خالد بن ولید اس مسئلہ میں قابل مذمت اور لائق طعن نہیں۔

مسئلہ کی ایک تمثیل

دور نبوت میں خطاء فی الفہم و خطاء فی الاجتہاد کا اسی طرح کا ایک واقعہ پیش آیا تھا جسے اہلِ تراجم نے لکھا ہے کہ

رفاعہ بن زید الجذامی جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اسلام لایا اور اس کا اسلام قبول ہوا۔ اس نے مدینہ طیبہ میں کچھ ایام اقامت اختیار کی اور قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔

پھر اس نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ایک تحریر طلب کی جس سے اپنی قوم کو اسلام کی طرف دعوت دے گا، چنانچہ وہ خط لے کر اپنے قبیلہ میں گیا، انہوں نے اجابت کی اور جلدی کی۔

لیکن ادھر جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان کی قوم کی طرف زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو قبل ازیں بھیجا ہوا تھا۔ زید نے اپنی صوابدید کے مطابق ان پر غارت ڈال دی۔ بعض کو قتل کیا اور بعض کو قیدی بنا لیا۔

جب یہ صورت حال پیش آئی تو رفاعہ بن زید مذکور اپنی قوم کے چند ساتھیوں ابویزید بن عمرو وغیرہ کے ساتھ آنجناب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں واپس آیا اور مذکورہ بالا مکتوب پیش کیا اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے قتل و غارت کا جو معاملہ

اس کی قوم کے ساتھ کیا تھا' اس ماجرا کی خبر دی- تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مقتولین کے بارے میں کیا کیا جائے؟

تو رفاعہ کے ساتھی ابویزید نے عرض کیا کہ ہمارے لوگ جو زندہ قید میں ہیں' ان کو آزاد کر دیا جائے اور جو قتل ہو چکے ہیں' وہ میرے ان دو قدموں کے نیچے ہیں (یعنی ان کا عوضانہ ہم طلب نہیں کرتے)۔۔۔تو جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابویزید نے سچ کہا- اس کے بعد آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی طرف حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو روانہ فرما کر حکم دیا کہ ان کے قیدیوں کو رہا کر دیا جائے اور ان سے اخذ شدہ اموال ان کو واپس کر دیئے جائیں-

فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم صدق ابويزيد فبعث النبى صلى الله عليه وسلم عليا رضى الله عنه الى زيد (بن حارثه) فاطلق لهم من اسره ورد عليهم ما اخذ منهم-

(طبقات ابن سعد ص۱۴۸' ج۷' قسم ثانی تحت رفاعۃ بن زید الجذامی' طبع لیدن)

مختصر یہ ہے کہ جس طرح زید بن حارثہ سے اس واقعہ قتل و غارت میں خطا سرزد ہوئی اور پھر جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو بھیج کر اس کا ازالہ فرمایا-

اسی طرح صدیقی عہد خلافت میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے اسی نوع کی خطا سرزد ہوئی اور اجتہادی غلطی ہوئی تو اس کا ازالہ جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کر دیا-

اس مقام میں زید بن حارثہ قابل طعن و ملامت نہیں تو خالد بن ولید بھی اسی زمرہ میں شمار ہیں-

اعتراض کا آخری مرحلہ

آخر میں یہ بات ذکر کی جاتی ہے کہ معترض لوگ یہ کہتے ہیں کہ خالد بن ولید

نے مالک بن نویرہ کی بیوی کو حق شرعی کے بغیر اپنی تحویل میں لے لیا اور شب باشی کی تو اس طعن کے متعلق ذیل میں چند چیزیں نقل کی جاتی ہیں:

یہ واقعہ اس مقام میں کبائر مورخین نے نہیں ذکر کیا مثلاً خلیفہ ابن خیاط متوفی ۲۴۰ھ نے اس موقعہ کی تاریخ میں مالک بن نویرہ اور اس کے ساتھیوں کے قتل کا واقعہ ذکر کیا ہے لیکن اس کی زوجہ کے تحویل میں لیے جانے کا کچھ ذکر نہیں کیا۔

اسی طرح مشہور محقق مورخ ابن خلدون نے اپنی تاریخ میں خبر البطاع و مالک بن نویرہ کے تحت اس واقعہ کو ذکر کیا ہے، لیکن ان میں مالک بن نویرہ کی اہلیہ کو اخذ کرنے کا ذکر تک نہیں کیا۔

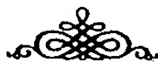
یہاں سے ثابت ہوا کہ اس واقعہ کا یہ حصہ کبائر مورخین کے نزدیک کوئی متفق علیہ امر نہیں۔ پھر جن مورخین نے مالک بن نویرہ کی زوجہ کا ذکر کیا ہے مثلاً ابن جریر طبری وغیرہ نے یہ واقعہ لکھا ہے، لیکن وہیں یہ بات بھی ذکر کی ہے کہ خالد بن ولید نے امِ تمیم کو چھوڑے رکھا تاکہ اس کا طہر منقضی ہو جائے۔

وتزوج خالد ام تميم ابنه المنهال وتركها ينقضي طهرها---الخ۔

(تاریخ لابن جریر الطبری ص ۲۷۸، ج ۳، تحت عنوان ذکر البطاع وغیر، طبع جدید مصری)

اسلام میں جو خواتین قیدی بنا کر لائی جاتی تھیں، ان کے لیے ایک طہر کا گزارنا ضروری ہوتا تھا جسے شرعاً استبراء کہا جاتا ہے اور خالد بن ولید نے اس شرعی قاعدہ پر عمل کرتے ہوئے مالک بن نویرہ کی زوجہ امِ تمیم کو طہر گزارنے کے بعد تزوج میں لیا تھا۔

تنبیہ: تحفہ اثنا عشریہ میں جناب شاہ صاحبؒ نے اس مقام میں طعن ہذا کے جوابات دیگر بھی ذکر کیے ہیں لیکن ہم نے گزشتہ سطور میں مختصر سا جواب ذکر کیا ہے جو ازالہ طعن کے لیے کافی وافی ہے۔



اعترافِ خطاء وذنوب کا طعن

مخالفین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر یہ طعن تجویز کیا جاتا ہے کہ وہ خلافت کے اہل نہیں تھے۔

کیونکہ وہ اپنے خطبات اور دیگر کلام میں اقرار کرتے تھے کہ--- ان لی شیطانا یعترینی--- الخ اور کہتے تھے کہ --- انی لست بخیرکم--- الخ۔

فلہذا اس نوع کے کلام سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے اقرار کے مطابق خلافت کے اہل نہیں تھے۔

ابن مطہر حلی نے منہاج الکرامہ میں اس طعن کو بالفاظ دیگر تحریر کیا ہے:

منها ما ردوه عن ابی بکر انه قال علی المنبران النبی صلی الله علیه وآله کان یعتصم بالوحی' وان لی شیطانا یعترینی فان استقمت فاعینونی وان زغت فقومونی--- الخ۔

وکیف یجوزامامه من یستعین بالرعیه علی تقویم مع ان الرعیه تحتاج الیه۔

روایت مندرجہ بالا کا مفہوم یہ ہے کہ منبر پر بیٹھ کر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے ساتھ (اللہ کی رسی کو) مضبوط پکڑتے اور میرے لیے شیطان ہے جو مجھے عارض ہوتا ہے۔ اگر میں دین میں استقامت اختیار

کروں تو میری مدد کرنا اور اگر میں کج روی اختیار کروں تو مجھے درست اور سیدھا کر دینا---الخ۔

ابن مطہر حلی کہتا ہے کہ جو شخص اپنی تقویم اور درستگی کے لے رعیت کا محتاج ہو حالانکہ رعیت اس کی محتاج ہے، ایسے شخص کی امامت اور خلافت کس طرح جائز ہے؟ خلاصہ یہ ہے کہ غیر معصوم اور مفضول شخص خلیفہ رسول نہیں ہو سکتا اور امامت کا اہل اور خلافت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

الجواب

اگر یہ کلام حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے صادر ہوا ہے اور کسی صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے تو اس کا محمل یہ ہے کہ

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اس بات کا اظہار فرما رہے ہیں کہ میں معصوم نہیں اور غلطی سے مامون نہیں ہوں۔ بلکہ تمہیں بہتر بات اور تقویٰ پر تعاون کرنا چاہیے۔

اگر میں طاعت (کتاب و سُنّت) پر مستقیم رہوں تو میری مدد کرو اور اگر میں طاعت سے چوک جاؤں تو مجھے درست کرو۔

فقال ان استقمت علی الطاعه فاعینونی علیها- وان زغت عنها فقومونی-

("المنتقی للذہبی" ص۳۳۶ تحت مسئلہ ہذا)

اس نوع کا کلام اکابر حضرات سے بعض دفعہ منقول ہے تو اس کا بہتر حل یہ ہے کہ خشیت الٰہی کے کمال غلبہ کی وجہ سے اس طرح کا کلام ان سے صادر ہوتا ہے۔

دیگر بات یہ ہے کہ

اس نوع کا کلام ائمہ حضرات کے کلام میں شیعہ کتابوں میں موجود ہے، پھر

اس کا جو جواب ذکر کیا جاتا ہے، وہی جواب حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے کلام کا بھی ہوگا۔

کتاب الکلینی میں امام جعفر صادق سے صحیح روایات میں موجود ہے کہ

"ہر مومن را شیطانیست کہ قصد اغوا او دارد۔"

(تحفہ اثنا عشریہ ص ۲۷۰ تحت جواب طعن ہشتم (صدیقی)

نیز اس قسم کا کلام جو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے صادر ہوا ہے، اسی نوع کا کلام نہج البلاغہ میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔

لا تکفوا عن مقالہ بحق او مشورہ بعدل فانی لست فی نفسی یفوق ان اخطی ولا آمن ذالک من فعلی۔

یعنی حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، حق بات کہنے میں یا حق بات کا مشورہ دینے میں تم لوگ مجھ سے باز نہ رہو۔ پس میں خطا سے برتر نہیں ہوں اور اپنے فعل میں خطا کر جانے سے میں مطمئن نہیں ہوں۔

(۱) نہج البلاغہ ص۴۳۶ ج اول، من خطبہ لہ علیہ السلام بصفین، طبع مصر۔

(۲) فروغ کافی، جلد سوم، کتاب الروضہ ص۹۵ خطبہ لامیرالمومنین علیہ السلام، قدیم طبع لکھنؤ۔

اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ دعا فرمایا کرتے تھے کہ

اللھم اغفرلی ما تقربت بہ الیک بلسانی ثم خالفہ قلبی اللھم اغفرلی رمزات الالحاظ وسقطات الالفاظ وشھوات الجنان وھفوات اللسان۔ (نہج البلاغہ ص۱۲۷ ج اول، تحت ومن کان یدعو بھا علیہ السلام طبع، مصر)

یعنی اے اللہ! بخش دے مجھے وہ بات جس سے میں نے تیری طرف اپنی زبان سے تقرب حاصل کیا پھر میرے دل نے اس کا خلاف کر دیا۔ اے اللہ! بخش دے میرے لیے آنکھوں کے اشارات اور بے ہودہ اور لغو الفاظ اور دل کی شہوات اور زبان کی لغزشیں۔

اور امام زین العابدین (علی بن حسین رضی اللہ عنہ) دُعا فرمایا کرتے تھے کہ

ھا انا ذا یارب مطروح بین یدیک- انا الذی او قرت الخطایا ظھرہ- وانا الذی افنت الذنوب عمرہ، وانا الذی بجھلہ عصاک ولم تکن اھلا منہ لناک---الخ-

(الصحیفہ کاملہ سجادیہ ص ۸۳ تحت دعاؤہ اذا استقال من ذنوبہ، تختی خورد، طبع طہران)

اور ایک دیگر مقام میں فرمایا کہ

واغفر لی ما تعلم من ذنوبی ان تعذب فانا الظالم المفرط المضیع الاثم المقصر المضجع المغفل--- الخ-

(الصحیفہ کاملہ سجادیہ ص ۱۰۳، تحت دعاؤہ فی التفرع والاستکانۃ، تختی خورد، طہران)

(۱) امام زین العابدین اپنی دعا میں اقرار فرماتے ہیں کہ خطایا اور غلطیوں نے میری پشت کو بوجھل بنا دیا اور میں وہ شخص ہوں جس کی عمر کو گناہوں نے فنا کر دیا- میں وہ شخص ہوں جس نے جہالت کی وجہ سے تیری نافرمانی کی-- الخ

(۲) اور بعض دفعہ فرمایا کرتے تھے کہ

اے اللہ! بخش میرے وہ گناہ جو تو جانتا ہے- اگر تو مجھے عذاب دے گا تو میں ظالم، حد سے بڑھنے والا، عمر کو ضائع کرنے والا، گنہگار ہوں--- الخ-

نیز جناب امام زین العابدین ایک دیگر دعا میں اعتراف فرماتے ہیں کہ

اللھم اجعل ما یلقی الشیطان فی روعی من التمنی والتظنی والحسد ذکرا لعظمتک وتفکرا فی قدرتک وتدبیرا علی عدوک وما اجری علی لسانی من

یعنی اے اللہ! جو کچھ شیطان نے میرے دل میں تمنی، ظنی اور حسد کے متعلق ڈالا ہے اس کو بھی اپنی عظمت کا ذکر بنا دے- اور اپنی قدرت میں تفکر بنا دے--- اور جو کچھ شیطان نے میری زبان پر فحش کلمات، بکواس، کسی کی عزت کو گالی،

لفظته فحش او هجر اوشتم عرض او شهاده باطل او اغتياب مومن غائب اورسب حاضر وما اشبه ذالك نطقا بالحمد لك واغراقا فی الثناء عليك وذهابا فی تمحيك وشكرا نعمتك واعترافا باحسانك واحصا لمننك---الخ-

باطل کی گواہی- غیر حاضر مومن کا گلہ اور حاضر کو برا بھلا کہنا جاری کیا ہے' اس کو اپنے لیے حمد کا کلام اپنی ثنا کے لیے مبالغہ---بنا دے--- الخ- (الصحیفہ کاملہ سجادیہ' ص۱۰۶' تحت دعاؤہ فی مکارم الاخلاق' تختی خورد' طبع طہران)

حاصل کلام یہ ہے کہ

مندرجہ بالا ائمہ معصومین کے کلام میں جو کلمات وارد ہوئے ہیں' ان میں ذنوب کا اقرار اور معاصی کا اعتراف کیا گیا ہے اور شیطان کا قلب کو متاثر کرنا بھی تسلیم کیا گیا ہے جس طرح یہ چیزیں ائمہ معصومین کی صفات میں پائی جائیں اور ان کی امامت میں موجب جرح و قدح نہیں تو اسی طرح اگر یہ چیزیں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یا دیگر اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کلام میں پائی جائیں تو وہ بھی موجب تنقید و اعتراض نہیں ہوں گی-

مختصر یہ ہے کہ اس مسئلہ میں:

ما هو جوابكم فهو جوابنا-



فصل دوم

لہ الحمد وعلیہ الصلوہ والسلام

واقعہ قرطاس اور اس کا پس منظر

جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خصوصاً خلفاء ثلاثہ اور امہات المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین پر طعن قائم کرنا کچھ لوگوں کی زندگانی کا محبوب مشغلہ ہے۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر مطاعن قائم کرنا ہر دور میں ایسے مولفین و مصنفین کا مرغوب شیوہ رہا ہے۔

اہل السنہ علماء کرام بھی ہمیشہ ان کے جوابات اپنے اپنے دور میں پیش کرتے رہے ہیں۔

چنانچہ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر مطاعن کا ایک وسیع سلسلہ قائم کیا گیا ہے۔ موجودہ دور میں بھی "یادِ فاروق" کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا گیا ہے، جس میں دیگر مطاعن کے علاوہ قرطاس کا طعن حسب عادت "بعنوان حضرت فاروق کی اطاعت، خدا و رسول کا قیاس در ضمن شرح حدیث قرطاس" نشر کیا ہے۔

آئندہ صفحات میں طعن ہذا کے ازالہ کے لیے کلام کیا گیا ہے اور صحابہ کرام

رضی اللہ عنہم کی طرف سے صفائی پیش کی گئی ہے۔

ایام مرض الوفات

نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرض الوفات میں کئی اہم واقعات پیش آئے جو محدثین اور اہل سیرت نے اپنے اپنے مقام پر مفصل ذکر کیے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ ان واقعات میں کئی وصایا ہیں جو امت کو فرمائی گئیں اور کئی دیگر فرامین بھی پائے جاتے ہیں جو مختلف ضرورتوں کے لیے آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمائے۔

اور بعض اقوال بعض مخصوص لوگوں کے لیے بھی صادر فرمائے مثلاً اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے حق میں ارشادات اور ازواج مطہرات اور اہلِ بیت کے حق میں بھی کئی فرامین منقول ہیں جن کی تفصیلات مندرجہ ذیل مقامات پر ملاحظہ کی جا سکتی ہیں:

(۱) طبقات ابن سعد ص۱۰ تا ۴۸ جلد ثانی قسم ثانی تحت حالات مرض الوفاۃ طبع لیڈن۔

(۲) دلائل النبوۃ للبیہقی جلد سابع (۷) تحت مرض الوفاۃ۔

(۳) الاحسان بترتیب صحیح ابن حبان ص ۲۰۱ تا ۲۰۵ جلد (۹) طبع مکتبہ اثریہ۔

(۴) البدایہ والنہایہ لابن کثیر جلد خامس تحت حالات وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم۔

اندریں حالات ایک دیگر واقعہ پیش آیا جسے "قرطاس کا واقعہ" کہتے ہیں۔

یہ آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرض الوفات کے دوران بروز پنج شنبہ (یوم الخمیس) عشرہ اوّل ربیع الاول ۱۱ھ کو پیش آیا۔

اور اس کے بعد آنے والے دو شنبہ (سوموار) کو آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رفیق اعلیٰ کے ساتھ واصل ہوئے اور اس جہانِ فانی سے انتقال فرمایا۔

واقعہ قرطاس کا اختصار

واقعہ قرطاس کے متعلق مختلف مرویات میں سے جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ

عنہ کی ایک روایت ذیل میں ناظرین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے جس سے اصل واقعہ قرطاس کا ایک اجمالی (نقشہ) سامنے آتا ہے اور حقیقت واقعہ کی طرف صحیح رہنمائی حاصل ہوتی ہے" اور اس روایت میں افراط و تفریط نہیں پائی گئی۔"

یہ روایت محدث ابی یعلی الموصلی متوفی ۳۰۷ھ نے اپنی تالیف مسند ابی یعلی میں بالفاظ ذیل نقل کی ہے:

سفیان بن عیینہ عن سلیمان الاحول عن سعید بن جبیر عن ابن عباس قال: یوم الخمیس وما یوم الخمیس یوم اشتد برسول الله صلی الله علیہ وسلم وجعہ۔ فقال ایتونی اکتب لکم کتابا لا تضلون بعدہ فتنازعوا۔ ولا ینبغی عندالنبی تنازع قال دعونی فما انا فیہ خیر مما تسئلونی عنہ۔ قال امرھم بثلاث قال اخرجوا المشرکین من جزیرہ العرب واجیز والوفد۔ بنحو ما کنت اجیزھم۔۔۔ الخ۔ (مسند ابی یعلی، ص ۳۲، ج ۳، تحت مسندات ابن عباس رضی اللہ عنہ، روایت نمبر ۲۴۹۵ طبع بیروت)

یعنی حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ، کہتے ہیں کہ خمیس کا دن کیا ہے؟ خمیس کا یوم وہ ہے کہ جس میں جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا درد شدت اختیار کر گیا تو اپنے حاضرین مجلس سے آپ نے ارشاد فرمایا کہ (قرطاس) لاؤ میں تمہیں ایسی چیز لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہیں ہو گے۔ اس پر (حاضرین مجلس میں) اختلاف اور تنازع ہوا جبکہ نبی اقدس کے پاس تنازع مناسب نہیں۔ تو آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مجھے چھوڑیئے، میں جس حالت میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کے متعلق تم مجھ سے سوال کرتے ہو، پھر آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین چیزوں کے متعلق حکم فرمایا کہ جزیرۃ العرب سے مشرکین کو نکال دو اور وفود کے ساتھ بہتر سلوک کرو۔۔۔ الخ۔

چنانچہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فی الوقت تحریر لکھوانے

کے معاملہ کو ملتوی فرما دیا اور کچھ نہیں لکھوایا۔

واقعہ قرطاس کی یہ ابتدائی صورت حال پیش آئی تھی۔

اس کے بعد انہی ایام میں بلکہ اسی یوم الخمیس کو ہی سردار دو جہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ وسلم نے جبکہ طبیعت میں کچھ سکون اور راحت محسوس فرمائی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے ایک اہم خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس خطبہ میں متعدد ضروری امور بیان فرمائے اور ساتھ ہی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے متعلق خاص خاص اہمیت اور فضیلت کے متعلق چیزیں ذکر فرمائیں۔ مثلاً

فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان امن الناس علی فی صحبتہ ومالہ ابوبکر، وفی روایہ ولو کنت متخذا خلیلا من الناس لا تخذت ابابکر، لا یبقی فی المسجد باب الاسد الا باب ابی بکر۔ (الاحسان بترتیب صحیح ابن حبان ص۲۰۰ ج۹ تحت مسئلہ ہذا، البدایہ والنہایہ لابن کثیرؒ ص۲۹۹، ج۵، تحت حالات مرض الوفات)

یعنی جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے فرمایا کہ صحبت و ہم نشینی اور مال کے لحاظ سے سب لوگوں سے زیادہ مجھ پر احسان کرنے والے ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں اور دوسری روایت میں ارشاد فرمایا کہ اگر میں لوگوں میں سے کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنا خلیل قرار دیتا لیکن دین و اسلام کی دوستی ہے۔ نیز ارشاد فرمایا کہ ابوبکر کے دروازہ کے بغیر مسجد میں کھلنے والے تمام دروازے بند کر دیئے جائیں۔

نیز اس موقع پر ابن کثیرؒ نے البدایہ میں ذکر کیا ہے کہ

وفی قولہ علیہ السلام سدواعنی کل خوخہ یعنی ابواب الصغار الی المسجد غیر خوخہ ابی بکر۔ اشارہ الی الخلافہ ای لیخرج منھا الی

یعنی جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ابوبکر کے دریچہ (چھوٹا دروازہ) کے بغیر مسجد میں کھلنے والے تمام چھوٹے چھوٹے دروازے بند کر دیئے جائیں۔ اس میں حضرت ابوبکر

الصلوہ بالمسلمین- (البدایہ والنہایہ لابن کثیرؒ ص۲۳۰، ج۵، تحت حالات مرض الوفات)

صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کی طرف واضح اشارہ پایا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو نماز پڑھانے کے لیے اس دریچہ سے مسجد نبوی میں تشریف لایا کریں گے۔

ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ کی تحقیق

اس موقعہ پر مسئلہ قرطاس کو حل کرنے کے لیے علامہ ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ نے البدایہ میں وضاحت کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ

بعض اہل بدعت شیعہ وغیرہ کو (گزشتہ روایت قرطاس سے) یہ وہم ہوا ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کتاب میں فلاں چیز تحریر کرانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یعنی اس سے مراد انہوں نے اپنے مزعومہ مقالات خلافت مرتضوی وغیرہ لیے ہیں۔

یہ ایک متشابہ چیز کے ساتھ تمسک کرنے اور محکم چیز کو ترک کرنے کا رویہ ہے اور اہل السنہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ محکم چیز کے ساتھ تمسک کرتے ہیں اور متشابہ چیز کو محکم کی طرف لوٹاتے ہیں۔

راسخین فی العلم کا یہی طریقہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس میں اہل ضلالہ کے اقدام نے لغزش کھائی ہے لیکن ہم اہلِ سُنّت کا مذہب حق کی اتباع ہے اور حق جس طرف گھومتا ہے، اہل سنت بھی اس کے ساتھ رہتے ہیں۔

اس موقعہ پر جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روایت قرطاس میں کتابت کرانے کا وہی ارادہ فرمایا تھا جو دیگر احادیث صحیحہ میں بطور تصریح کے بیان کر دیا ہے اور اس کی مراد کو مکشوف اور واضح فرما دیا ہے۔ گویا کہ یہ خطبہ اس تحریر کے عوض میں تھا جو آپ واقعہ قرطاس میں تحریر کرانا چاہتے تھے (یعنی وہ صدیق

خلافت کا مسئلہ تھا) چنانچہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ

وھذا الحدیث مما قد توھم به بعض الاغبیا من اھل البدع من الشیعه وغیرھم کل مدع انه کان یریدان یکتب فی ذالک الکتاب ما یرمون الیه من مقالاتھم وھذا ھوالتمسک بالمتشابه وترک المحکم واھل السنه یاخذون بالمحکم ویردون ما تشابه الیه- وھذه طریقه الراسخین فی العلم کما وصفھم الله عزوجل فی کتابه وھذا المواضع ممازل فیه اقدام کثیر من اھل الضلالات واما اھل السنه فلیس لھم مذھب الا اتباع الحق یدورون معه کیفما دار- وھذا الذی کان یرید علیه الصلوه والسلام ان یکتبه قد جاء فی الاحادیث الصحیحه التصریح بکشف المراد منه-

(البدایہ ص۲۲۸ ج۵، تحت فصل فی الآیات والاحادیث، المنذرۃ بوفاۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم--- الخ)

(۱) بخاری شریف ص۸۳۸ ج۲ باب مرض النبی ﷺ، نور محمد، دہلی)

روایت ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا

پھر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ سابقہ کے بعد ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ آپ اپنے والد ابوبکر اور اپنے بھائی (عبدالرحمٰن) کو بلائیے کہ ابوبکر کے لیے ایک تحریر لکھ دوں تاکہ کوئی اور تمنا کرنے والا متمنی نہ ہو اور کوئی دیگر طمع کرنے والا طمع نہ کرے۔

اس کے بعد آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارادہ مبارک تبدیل ہوا اور ارشاد فرمایا ویابی الله والمومنون الا ابابکر) یعنی اللہ تعالیٰ اور مومنین ابوبکر

رضی اللہ عنہ کے بغیر سب سے انکار کرتے ہیں (کسی دوسرے شخص کو قبول نہیں کرتے گویا کہ اب اس کے لکھوانے کی حاجت نہیں)

عن عائشه قالت قال لی رسول الله صلی الله علیه وسلم فی مرضه ادعی لی ابابکر اباک واخاک حتی اکتب کتابا فانی اخاف ان یتمنی متمن - ویقول قائل انا اولی ویابی الله والمومنون الا ابابکر -

- مسلم شریف ص ۲۷۳ ج ۲ باب من فضائل ابی بکر رضی اللہ عنہ، طبع دہلی۔
- بخاری شریف ص ۸۴۶، ج ۲ باب قول المریض انی وجع --- الخ- طبع دہلی۔
- مشکوٰۃ شریف ص ۵۴۹ باب وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم، الفصل الثالث، طبع دہلی۔
- مسند امام احمد ؒ ص ۱۴۴ ج ۶ تحت مسندات حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا -
- الاحسان بترتیب صحیح ابن حبان ص ۲۰۲ ج ۹ تحت ذکر اشارہ المصطفیٰ الی ما اشاربہ فی ابی بکر رضی اللہ عنہ -
- جزو الحسن عن عرفۃ العبدی (المتوفی ۲۵۷ھ) ص ۴۲ روایت نمبر ۳ عن عائشہ رضی اللہ عنہا -
- علل الحدیث لابن ابی حاتم الرازی ص ۳۸۳ ج ۲ روایت نمبر ۲۶۶۰۔
- البدایہ لابن کثیرؒ ص ۲۲۸ ج ۵، تحت حالات مرض الوفاۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم -

روایت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ

اسی مضمون کی دیگر روایت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، چنانچہ وہ خود ذکر کرتے ہیں کہ ان آخری ایام میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مجھے ارشاد فرمایا کہ دوات اور کتف (قرطاس) لاؤ، میں تمہارے لیے ایک تحریر لکھ دوں تاکہ تم بعد میں ہرگز گمراہ نہ ہوسکو۔ اس کے بعد آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری جانب سے پشت مبارک پھیر لی۔ پھر تھوڑی دیر بعد جناب نبی کریم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہماری طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اور مومنین ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بغیر سب سے انکار کرتے ہیں۔

--- عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ قال رسول اللہ ﷺ ائتنی بدواہ وکتف اکتب لکم کتابا لن تضلوا بعدہ ابدا۔ ثم ولانا قفاہ۔ ثم اقبل علینا فقال یابی اللہ والمومنون الا ابابکر--- قال الذهبی اسنادہ صحیح۔

(المستدرک للحاکم ص۴۷۷، ج۳ تحت مناقب عبدالرحمن بن ابی بکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، طبع دکن)

حاصل یہ ہے کہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قرطاس طلب کرنے کا ابتدائی فرمان جو حاضرین کو دیا تھا وہ گویا اجمالی فرمان تھا اور وہ مقصود میں متشابہ تھا لیکن بعد میں آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو ارشادات فرمائے، وہ واضح اور محکم تھے اور ان فرامین سے مراد مکشوف ہو گئی اور مقصود کی تصریح پائی گئی کہ امامت صلوٰۃ کے حامل اور نیابت نبوی ﷺ کے اہل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں اور اس منصب میں ان کا کوئی شریک نہیں۔ گویا اس طرح سابق اجمال کی تفصیل سامنے آ گئی۔

علامہ بیہقی کی تحقیق

بیہقی نے اس مقام میں سفیان بن عیینہ کا قول ذکر کیا ہے جس سے تبع تابعین کے نظریات مسئلہ ہذا کے متعلق واضح ہوتے ہیں:

--- قال سفیان انما زعموا اراد ان یکتب فیها استخلاف ابی بکر۔	سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ وہ کتاب (جس کے لکھوانے کا حکم ہوا تھا) اس میں ابوبکر کا استخلاف تحریر کرانا مقصد تھا۔

(دلائل النبوۃ للبیہقی ص۱۸۴ ج۷، طبع بیروت باب ما جاء فی همہ بان یکتب لاصحابہ)

نیز علامہ بیہقی نے بھی اس مقام پر یہی چیز ذکر کی ہے کہ

ثم نبہ امتہ علی خلافتہ باستخلافہ ایاہ فی الصلوہ حین عجز عن حضورھا۔

(دلائل النبوۃ للبیہقی ص ۱۸۴ ج ۷، تحت باب ما جاء فی ھمہ بان یکتب لاصحابہ کتابا)

یعنی جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب خود نماز میں پہنچنے سے قاصر ہوگئے تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو نماز میں اپنا قائم مقام بنا کر امت کو اپنی خلافت پر متنبہ کر دیا کہ (یہ میرے نائب مناب ہیں) اور ابتدائے مرض الوفات میں جو فرمان (بصورت قرطاس) جاری فرمانے کا قصد فرمایا تھا اس کی عملاً اس شکل میں تکمیل کر دی۔

توجیہات

اور پھر اس مقام میں محدثین نے واقعہ ہذا کے متعلق دیگر متعدد توجیہات بھی ذکر کی ہیں، چنانچہ علامہ بدر الدین العینی کہتے ہیں کہ

ثم ظہر للنبی صلی اللہ علیہ وسلم ان المصلحہ ترکہ او اوحی الیہ۔

(العینی شرح بخاری شریف ص ۱۷۱ ج ۲ تحت حدیث قرطاس)

یعنی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مصلحت اس بات میں خیال فرمائی کہ تحریر لکھوانے کے معاملہ کو چھوڑ دیا جائے یا پھر آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف اس مسئلہ میں وحی اسی طرح ہوئی۔

اور حافظ ابن حجر نے اسی مسئلہ کو اپنی تصنیف فتح الباری میں بہ عبارت ذیل تحریر کیا ہے:

وعزمہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اما بالوحی واما بالاجتہاد وکذالک ترکہ ان کان بالوحی فبالوحی والا

فبالاجتہاد ایضا۔

(فتح الباری لابن حجر عسقلانی ص۱۰۹ ج۸، تحت قرطاس لابن عباس رضی اللہ عنہ)

یعنی اس واقعہ قرطاس میں تحریر لکھوانے کا جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو ارادہ فرمایا تھا وحی کے ذریعہ تھا یا وہ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد مبارک تھا۔ اسی طرح اس تحریر کو ترک کر دینے کا معاملہ بھی وحی کی بنا پر ہوا یا اپنے اجتہاد سے۔ مختصر یہ ہے کہ سابقہ ارادہ مبارک کو ترک فرما دیا۔ اور تحریر کے مسئلہ کو ملتوی کر دیا گیا۔

تائید من جانب شیعہ

اور شیعہ علماء نے بھی یہ بات تسلیم کی ہے کہ

--- اما سکوته علیه السلام بعد التنازع ما کان من عنده بل کان بوحی کما بین فی مقامه۔ فصار امر الکتابه منسوخا بالوحی۔

(فلک النجاۃ از محمد علی و حکیم امیر دین شیعیانِ جھنگ ص۳۳۹، جلد اول، تحت ایمان عمر بحدیث قرطاس، طبع اول، لاہور)

مطلب یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنے ہاں تنازع کے بعد خاموش ہو جانا اپنی طرف سے نہیں تھا بلکہ وحی کی وجہ سے تھا جیسا کہ اپنے مقام میں بیان کیا گیا ہے۔ پس کتابت کا معاملہ وحی کی وجہ سے منسوخ ٹھہرا۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسئلہ قرطاس کی تحریر جس صورت کے ساتھ بھی ملتوی ہوئی، لیکن وہ نتیجہ خیز ثابت ہوئی اور اس سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں نیابت نبوی کا معاملہ صاف کر دیا گیا اور واقعہ قرطاس کے پس منظر کو واضح کر دیا۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں مخالفین صحابہ کی طرف سے یہ شبہ پیش کیا جاتا ہے کہ "مندرجہ بالا واقعہ قرطاس میں جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت لکھوانے کا قصد فرمایا تھا لیکن بعض صحابہ رضی اللہ عنہ کی مخالفت کی وجہ سے آنجناب صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم یہ تحریر نہ لکھوا سکے۔"

اس اشتباہ کے ازالہ کے لیے امور ذیل پر غور فرمائیں۔

○ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس سلسلہ میں خود ذکر کرتے ہیں کہ مرض الوفاۃ کے دوران ایک مرتبہ جناب نبی کریم ﷺ نے مجھے طبق (قرطاس) لانے کے لیے ارشاد فرمایا تاکہ اس میں وہ بات تحریر کر دیں جس سے امت آپ کے بعد گمراہی میں نہ پڑے۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی طبیعت کی پریشانی دیکھ کر مجھے خوف ہوا کہ کہیں آنجناب صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا (میری عدم موجودگی میں) انتقال نہ ہو جائے تو میں نے عرض کیا کہ جناب (صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم) ارشاد فرمائیں، میں اس فرمان کو محفوظ کر لوں گا اور نگاہ میں رکھوں گا۔ تو جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

قال اوصی بالصلوہ والزکوہ وما ملکت ایمانکم۔	یعنی جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی اور غلاموں اور لونڈیوں کے بارے میں (نیک سلوک کی) وصیت فرمائی۔

مذکورہ بالا روایت کو مندرجہ ذیل علماء کبار نے ذکر کیا ہے:

(۱) مسند امام احمد رحمتہ اللہ علیہ ص۹۰ الجزء الاول، تحت مسندات علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ۔

(۲) الادب المفرد للبخاری ص۲۶، باب حسن الملکہ، طبع مصر۔

(۳) طبقات ابن سعد ص۳۷، ج۲ القسم الثانی تحت ذکر الکتاب الذی ارادہ رسول اللہ ﷺ۔

(۴) البدایہ والنہایہ لابن کثیرؒ ص۲۳۸، ج۵، تحت ذکر احتضارہ و وفاتہ ﷺ۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی نقل فرمودہ روایت بالا نے یہ مسئلہ واضح کر دیا کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے حق میں یہ فرمان اور وصیت تھی جو اس موقع پر ان کے حق میں ارشاد فرمائی گئی اور یہ روایت حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت مراد نہ ہونے میں بطور شاہد کے ہے۔

○ اور اسی طرح ایک دیگر روایت حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ یہ بھی اس بات کا قرینہ ہے کہ اس موقع پر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت تحریر کرانا مقصود نہیں تھا۔

چنانچہ روایات میں ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرض الوفات کے دوران حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میں آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرہ مبارک سے انتقال کے آثار دیکھ رہا ہوں۔ لہٰذا ہمیں آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت کے سلسلہ میں سوال کر لینا چاہیے اگر یہ معاملہ ہمارے حق میں ہے تو ہمیں معلوم ہونا چاہیے اور اگر ہمارے غیر کے حق میں ہے تو جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے حق میں وصیت فرمائیں۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی تجویز کے جواب میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ

فقال علی: انی لا اسالہ ذالک واللہ ان منعناھا لا یعطیناھا الناس بعدہ ابدا۔ (البدایہ لابن کثیرؒ ص۲۵۱، ج۵، تحت حالات مرض الوفاۃ، بحوالہ بخاری شریف، مسند امام احمد ص۲۶۳، جلد اول، تحت مسندات ابن عباس)

یعنی حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، میں اس مسئلہ میں آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بالکل سوال نہیں کروں گا۔ اللہ کی قسم! اگر آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس معاملہ میں ہمیں منع فرمایا تو بعد میں ہمیں لوگ کبھی بھی موقعہ نہیں دیں گے۔

اسی طرح کی متعدد دیگر روایات بھی حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے منقول ہیں جن میں ان کی خصوصی خلافت بلا فصل کی نفی پائی جاتی ہے۔ لیکن فی الوقت یہاں صرف دو عدد روایات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا ہر دو روایات کے ذریعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلافصل کا انتفاء ثابت ہوتا ہے۔

اور واقعہ قرطاس کی دیگر پیش کردہ روایات میں بھی جو مضمون پایا جاتا ہے اس کا تعلق حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی اثبات خلافت بلا فصل سے کچھ نہیں بلکہ ان روایات میں حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کی نیابت اور ان کے قائم مقام ہونے کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں۔

دیگر گزارش

اور اگر تسلیم کر لیا جائے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خاطر خلافت بلافصل لکھوانا چاہتے تھے لیکن اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ یا دیگر صحابہ کرام مانع ہوئے --- الخ۔

تو یہاں قابل توجہ یہ چیز ہے کہ طلب قرطاس کا واقعہ یوم الخمیس کو پیش آیا اور اس کے بعد جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قریباً چار روز بقید حیات تشریف فرما رہے اور آئندہ سوموار کو انتقال فرمایا اس دوران معارضہ کرنے والے لوگ یقیناً الگ ہو چکے تھے اور کئی مواقع تخلیہ کے میسر آئے تھے تو ان اوقات میں وہ ضروری تحریر (خلافت علوی رضی اللہ عنہ) کیوں نہ تحریر کرا دی گئی؟؟ اور اس مسئلہ کو کیوں نہ مکمل کر دیا گیا؟؟

چنانچہ علامہ بیہقی نے اس مقام میں اسی چیز کو بہ عبارت ذیل ذکر کیا ہے:

ولو کان مایرید النبی صلی الله علیه وسلم ان یکتب	یعنی اگر نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کسی واجب امر جس سے استغناء نہ

لهم شيا مفروضا لا يستغنون عنه- لم يتركه باختلافهم ولغطهم لقول الله عزوجل بلغ ما انزل اليك من ربك- كما لم يترك تبلغ غيره بمخالفه من خالفه و معاداه من اداه-

ہو سکے، کے لکھوانے کا ارادہ ہوتا تو آنجناب ﷺ لوگوں کے باہمی اختلاف اور شور کرنے کی وجہ سے ترک نہیں فرما سکتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہارے رب کی طرف سے جو چیز تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اس کو پہنچائیے۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے مخالفین کی مخالفت اور دشمنوں کی دشمنی کی وجہ سے تبلیغ دین کا عمل کبھی ترک نہیں فرمایا تھا۔

(دلائل النبوہ للبیہقی ص ۱۸۴ ج ۷، باب ما جاء فی ھمہ بان یکتب الاصحابہ کتابا)

اور اس مسئلہ کو علامہ الذہبی ؒ نے بھی اپنی تصنیف "المنتقی" کے متعدد مقامات میں اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

اور تحریر کیا ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر کوئی واجب امر تحریر کروانا چاہتے تو اسے ضرور تحریر کروا دیتے۔ ان کے لیے کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی تھی۔ یاایہا الرسول بلغ ما انزل اليك وان لم تفعل فما بلغت رسالته)

(المنتقی للذہبی ؒ ص ۳۴۹، ۵۱۱، ۵۱۲، تحت مسئلہ ہذا، طبع مصر)

مطلب یہ ہے کہ جس چیز کو آنجناب ﷺ تحریر کرانا چاہتے تھے اگر وہ امت کے لیے اصل ہدایت کا مدار ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسے ہرگز ترک نہ فرماتے، کیونکہ یہ بات جناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان ہدایت اور شان تبلیغ کے سراسر منافی ہے۔

امامت صلوٰۃ

بحث ہذا میں ایک خاص چیز جو علمائے کبار صدیقی خلافت کے اثبات اور اس

کی حقانیت میں پیش کیا کرتے ہیں، وہ امامت صلوٰۃ کا مسئلہ ہے اور اس کی روشنی میں واقعہ قرطاس کے "اجمال" کا حل بھی پایا جاتا ہے۔

وہ اس طرح ہے کہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے مرض الوفاۃ میں نماز پنجگانہ کی امامت کے لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حکم دے کر امام مقرر فرمایا اور ارشاد ہوا کہ

--- مروا ابابکر فلیصل بالناس۔ یعنی ابوبکر کو حکم دو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔

یہ فرمانِ نبوی شیعہ سنی علماء نے اپنی اپنی تصنیفات میں بالاتفاق درج کیا ہے۔

چنانچہ سرِدست ذیل میں بخاری شریف اور بیہقی کا حوالہ درج کیا جاتا ہے۔

(۱) بخاری شریف ص ۹۳، جلد اول، باب اہل العلم والفضل احق بالامامۃ، طبع نور محمد، دہلی (کتاب الصلوۃ)

(۲) دلائل النبوۃ للبیہقی، ص ۱۸۲ ج ۷، باب ما جاء فی امرہ حین اشدہ المرض الخ، طبع بیروت لبنان۔

تائید من جانب شیعہ

اور شیعہ کے معتمد علماء کے صرف دو حوالے پیش خدمت ہیں۔ شارح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید نے اپنی شرح حدیدی میں درج کیا ہے کہ

--- قال علی "والزبیر" انه صاحب الغار وانا لنعرف له سنه۔ امره رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم بالصلوه وهو حی۔

(شرح نہج البلاغہ حدیدی بحث بقیہ السقیفہ واختلاف آراء الناس بعد النبی، جلد اول، ص ۱۵۴ طبع بیروت)

(۲) شرح نہج البلاغہ درہ نجفیہ میں بھی یہ حوالہ بہ عبارت ذیل موجود ہے:

فلما اشتد به المرض امر ابابکر ان یصلی بالناس--- وان ابابکر صلی الناس بعد ذالک یومین ثم مات۔

یعنی جب مرض شدید ہو گئی تو آنجناب ﷺ نے حکم فرمایا کہ ابوبکر لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ اور ابوبکر نے اس کے بعد دو دن نماز پڑھائی پھر آپ کا انتقال ہو گیا۔

(درہ نجفیہ ص۲۲۵، طبع قدیم، ایران)

چنانچہ بعض علماء نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سترہ اور بعض علماء کے نزدیک بیس نمازیں فرمانِ نبوی کے تحت پڑھائیں۔

وقال الزهری عن ابی بکر بن ابی سبرہ: ان ابابکر صلی بهم سبع عشرہ صلاہ۔ وقال غیر عشرین صلاہ فالله اعلم۔

یعنی زہری نے ابوبکر بن ابی سبرۃ سے نقل کیا ہے کہ جناب ابوبکر نے (اس موقعہ پر) سترہ نمازیں پڑھائیں اور بقول بعض بیس نمازیں پڑھائیں۔

(البدایہ لابن کثیرؒ ص۲۳۵ ج۵، تحت ذکر امرہ علیہ السلام ابابکر الصدیق ان یصلی بالصحابہ--- الخ)

مقصد یہ ہے کہ نماز جو اسلام کے عملی ارکان میں سب سے بڑا اہم و عظیم رکن ہے، اس کی امامت کے لیے جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو منتخب فرما کر مقدم فرمایا۔

شیخ الاشعری رحمتہ اللہ علیہ کا کلام

اس موقع پر شیخ ابوالحسن الاشعری کا کلام بڑا عمدہ پایا جاتا ہے جو ابن کثیرؒ نے اپنی تصنیف "البدایہ" میں ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ

--- وقال تقدیمه له دلیل علی انه اعلم الصحابه واقروهم لما ثبت فی الخبر المتفق علی صحته بین

العلماء ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال يوم القوم اقروهم لكتاب الله، فان كانوا فى القراه سواء فاعلمهم بالسنه، فان كانوا فى السنه سواء فاكبرهم سنا- فان كانوا فى السن سواء فاقدمهم اسلاما قلت وهذا من كلام الاشعرى رحمه الله مما ينبغى ان يكتب بماء الذهب ثم قد اجتمعت هذا الصفات كلها فى الصديق رضى الله عنه وارضاه-

(البدایہ والنہایہ لابن کثیرؒ ص۲۳۶ ج۵، تحت ذکر امرہ علیہ السلام ابابکر الصدیق رضی اللہ عنہ، ان یصلی--- الخ)

مطلب یہ ہے کہ شیخ ابوالحسن کہتے ہیں کہ جناب ابوبکرالصدیق رضی اللہ عنہ، کا امر دین (اقامت نماز) کے لیے مقدم کیا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے زیادہ عالم ہیں اور ان سے زیادہ قاری ہیں۔

وہ اس روایت کی بنا پر ہے جس کی صحت پر علماء کے درمیان اتفاق پایا گیا ہے۔ روایت اس طرح ہے کہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قوم کی امامت وہ شخص کرائے جو کتاب اللہ کا زیادہ قاری ہو، اگر حاضرین قرأت میں برابر ہوں تو جو سُنّت نبوی سے زیادہ واقف ہو، وہ امامت کرائے اور اگر حاضرین سُنّت کے علم میں برابر ہوں تو جو ان میں سے عمر کے لحاظ سے بڑا ہے، وہ امامت کرائے اور اگر حاضرین عمر میں بھی برابر ہوں تو ان میں سے جو زیادہ قدیم الاسلام ہو وہ امامت کرائے۔ اس پر ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ الاشعریؒ کا یہ کلام آب زر کے ساتھ لکھنے کے لائق ہے۔

اور یہ تمام صفات حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، میں مجتمعاً پائی جاتی ہیں اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو اور اللہ تعالیٰ ان کو راضی فرمائے۔

مندرجہ بالا ہر چہار صفات کاملہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں

بدرجہ اتم موجود تھیں- اس وجہ سے اس منصب کے اہل ٹھہرے اور ان کو امت کی امامت کا شرف حاصل ہوا- پس یہی چیز آنجناب رضی اللہ عنہ کی خلافت کی طرف اشارہ کرنے والی ہے اور یہاں سے اس کے نائب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کا ثبوت ملتا ہے جسے امت کے اکابرین نے بغیر اختلاف تسلیم کر لیا-

حضرت ابو مسعود الانصاری رضی اللہ عنہ کی روایت

نیز اس مقام میں مشہور محدث ابو عوانہ نے ایک دیگر فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت کے ذریعے ذکر کیا ہے- اس فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے خلیفہ اور قائم مقام حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی ہیں- ابو عوانہ ذکر کرتے ہیں کہ

--- فدل قوله في خبر ابومسعود حيث قال ولا يومن رجل في سلطانه انه خليفه عليهم بعده- والله اعلم-
(مسند ابو عوانہ ص۱۲۱، جلد ثانی، طبع حیدر آباد دکن، طبع اول)

یعنی ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ نے جو فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ذکر کیا ہے "کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی سلطنت و امارت میں (اس کی اجازت کے بغیر) امامت نہ کرائے-" یہ فرمان دلالت کرتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اہلِ اسلام پر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ ہیں-

کیونکہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ نبوت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمانِ نبوی کے تحت اہلِ اسلام کی امامت کے فرائض سرانجام دیئے-

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تحقیق

آخری ایام مرض الوفاۃ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے امامت الصلوۃ

کے لیے استخلاف سے کبار علماء نے جس طرح مسئلہ کو مستنبط کیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف "قرۃ العینین" میں اسے اختصاراً بہ عبارت ذیل درج کیا ہے:

--- حدیث استخلاف ابی بکر الصدیق در امامت صلوۃ وقت مرض اخیر واباکردن آنحضرت ﷺ بتصریح از امامت غیری وایں قصہ متواتر است و فقہای صحابہ مثل عمر و علی رضی اللہ عنہما استدلال کردن باین استخلاف برخلیفہ بودن ابی بکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ وسائر صحابہ سکوت کردند و تسلیم نمودند۔ پس مسئلہ مجمع علیہ گشت و دلالت ایں قصہ بالیقین ثابت شد۔

(قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین ص٦-٥ طبع قدیم، مطبع مجتبائی، دہلی از شاہ ولی اللہ محدث دہلوی)

یعنی اپنے مرض الوفات کے آخری ایام میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امامت صلوٰۃ کے لیے خلیفہ بنانا اور آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کسی دوسرے شخص کی امامت صلوٰۃ سے تصریحاً انکار فرمانا "متواترات" میں سے ہے۔ پھر فقہاء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مثلاً حضرت عمر فاروق اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے استخلاف امامت صلوٰۃ سے ان کے خلیفہ ہونے پر استدلال کیا ہے اور باقی تمام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس پر سکوت اختیار کیا اور تسلیم کر لیا۔

پس اس طرح یہ مسئلہ مجمع علیہ اور متفق علیہ ہوگیا اور اس واقعہ کی دلالت بالیقین ثابت ہوگئی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ مندرجات بالا کی روشنی میں واضح ہوا کہ دور نبوت کے آخری اوقات میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے امامت نماز کے فرائض سرانجام دینے میں ان کی خلافت بلا فصل کی طرف واضح اشارہ ہے اور واقعہ

قرطاس کا پس منظر معلوم کرنے کا عمدہ قرینہ ہے اور اس کی طرف اس میں صحیح رہنمائی پائی جاتی ہے۔

ازالہ شبہات

--------- (۱) ---------

واقعہ قرطاس سے مخالفین نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر چند اعتراضات وارد کیے ہیں، ان کے ازالہ کے لیے ذیل میں کلام پیش خدمت ہے:

ایک اعتراض یہ ہے کہ مرض الوفات میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم امت کے لیے ایک ضروری تحریر لکھوانا چاہتے تھے جس کی موجودگی میں امت مسلمہ کبھی گمراہ نہ ہوتی۔ لیکن بموجب بعض روایات حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حسبنا کتاب اللہ کہا اور اس تحریر سے مانع ہوئے اور اس طرح انہوں نے سنت نبوی کو رد کر دیا اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نافرمان ہوئے اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو ان کے ہمنوا تھے، وہ بھی اسی زمرہ میں شامل ہوئے۔

الجواب

○ واقعہ قرطاس کے موقع پر اس مجلس میں جو گفتگو ہوئی اس کی واقعہ کے مطابق صحیح تفصیل معلوم نہیں۔ معرض خفا میں ہے جو کچھ عام روایات سے دستیاب ہوتا ہے اس کے اعتبار سے یہ کلام کیا جا رہا ہے۔

○ ایک بات تو یہ ہے کہ اہم اعتراض کا دارومدار حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ہے، لیکن واقعہ قرطاس کی بعض روایات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام تک ہی مذکور نہیں اور حسبنا کتاب اللہ کے کلمات کا ان سے صدور ہی نہیں ہوا جیسا کہ مسند ابی یعلیٰ کی روایت میں ہے اور اس کو ابتداء بحث میں درج کر دیا ہے تو پھر ایسی صورت

میں طعن ہذا قائم کرنا بے جا ہے۔

اور بعض روایات کے مطابق اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مذکورہ کلمات فرمائے ہیں تو وہ آنموصوف رضی اللہ عنہ نے جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شدت مرض کی حالت کے پیش نظر ذکر کیے تھے اور طبع مبارک کی رعایت مقصود خاطر تھی۔

چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ

انما قصد عمر بن الخطاب بما قال التخفيف على رسول الله صلى الله عليه وسلم حين رآه قد غلب عليه الوجع ---الخ

(دلائل النبوۃ ص ۱۸۴، ج ۷ (للبیہقی) باب ماجاء فی ہمہ بان یکتب لاصحابہ کتاباً الخ)

مطلب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس وقت جو کچھ ذکر کیا تھا اس سے فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو رد کرنا ہرگز مقصود نہیں تھا بلکہ آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حالت میں تخفیف مدنظر تھی تاآنکہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طبیعت میں کچھ سکون اور راحت آجائے اور تعب و شدت زائل ہو جائے۔ (بعدہ تحریر لکھوالی جائے گی)

دیگر بات یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے "حسبنا کتاب اللہ" ذکر کیا تھا تو یہ کوئی غلط کلمہ تو نہیں تھا بلکہ آیت الیوم اکملت لکم دینکم کی طرف حاضرین مجلس کو یاددہانی کرانا اور توجہ دلانا مقصود تھا۔

یعنی دین مکمل ہو چکا ہے اور اس میں کسی قسم کی کوئی کمی باقی نہیں اور اللہ تعالیٰ کی کتاب ہمارے ہاں محفوظ ہے اور ہمارے لیے کافی ہے بالفرض اگر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت مزید کوئی چیز نہ بھی لکھوا سکیں تو کوئی حرج نہیں۔ اگر کوئی ضروری چیز ہے تو اس کی تحریر میں ہمیں تعجیل اور جلدی کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی طبیعت میں سکون و

راحت آنے پر خود ہمیں لکھوا دیں گے۔

○ اور بالفرض اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مذکورہ کلمہ ذکر کرنا اس موقعہ پر غلط اور معصیت تھا تو اس پر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہرگز سکوت اختیار نہ فرماتے اور انکار و نکیر فرما دیتے کیونکہ پیغمبر کی ذات گرامی کسی منکر اور معصیت پر ہرگز سکوت اختیار نہیں فرماتی بلکہ اسے رد کر دیتی ہے۔

معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مذکورہ کلمہ نہ معصیت تھا اور نہ ہی کسی عناد و فساد پر مبنی تھا بلکہ تقاضائے وقت کے مطابق تھا۔

○ نیز حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حسبنا کتاب اللہ کے کہنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے تو سنت نبوی کی ضرورت نہیں۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان حسبنا اللہ ونعم الوکیل کا یہ مطلب ہرگز نہیں لیا جا سکتا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کافی ہے اور ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت و نبوت کی ضرورت نہیں۔

مختصر یہ ہے کہ حسبنا کتاب اللہ کے قول سے سنت نبوی کی نفی مراد لینا ہرگز درست نہیں۔ یہ توجیہ القول بما لا یرضی بہ قائلہ کا معاملہ کرنا ہوا۔

○ اور جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حاضرین مجلس کو کاغذ قلم دوات لانے کا حکم فرمایا تو اس میں خود حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ بھی موجود و شامل تھے اور آپ رضی اللہ عنہ بھی قلم و قرطاس نہیں لائے۔ لہٰذا اگر اس حکم کی نافرمانی کا اعتراض ہے تو سب حاضرین مجلس صحابہ پر ہے بلکہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ خود فرماتے ہیں کہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے طبق (قرطاس) لانے کے لیے ارشاد فرمایا تاکہ اس میں وہ بات تحریر کر دیں جس سے امت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد گمراہی میں نہ پڑ جائے۔

--- عن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ قال امرنی

النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان آتیہ بطبق یکتب فیہ مالا تضل امتہ من بعدہ ---الخ۔

(مسند امام احمد ص۹۰ الجزو الاول تحت مسندات حضرت علی رضی اللہ عنہ، الادب المفرد للبخاری رحمتہ اللہ علیہ ص۲۶ باب حسن الملکہ طبع مصر، البدایہ لابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ ص۲۳۸ ج۵، تحت احتضارہ ووفاتہ صلی اللہ علیہ وسلم)

چنانچہ اس صورت میں قرطاس لانے کی ذمہ داری حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر اور زیادہ ہوئی کیونکہ براہ راست ان کو خصوصی حکم ہوا تھا جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس قسم کا کوئی حکم الگ ارشاد نہیں فرمایا گیا۔

ان حالات میں اگر قرطاس پیش نہیں کیا گیا تو نافرمانی کے ارتکاب کا اعتراض (العیاذ باللہ) سب پر واقع ہو گا۔

○ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر کوئی واجب و لازم فرمان لکھوانا چاہتے تھے تو یوم الخمیس سے دو شنبہ (یوم الوصال) تک کے اوقات میں نہ آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لکھوایا اور نہ ہی حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سمیت کسی دیگر اہلِ بیت رضی اللہ عنہ وصحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے لکھوایا۔ حالانکہ ان اوقات میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہر وقت تو مانع بن کر موجود نہیں رہے۔ یہاں شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ--- "دراں جا عمر رضی اللہ عنہ کجا حاضر بود کہ از نویسانیدن وصیت نامہ مخالفت کرد۔"

(تحفہ اثنا عشرہ ص۲۹۱ تحت مطاعن فاروقی، آخر طعن اول مطبع لاہور)

یہ چیزیں لائق غور اور قابل توجہ ہیں۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی واجب امر تحریر نہیں کرانا چاہتے تھے یا اگر پہلے یہ خیال تھا تو بعد میں آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رائے مبارک میں تبدیلی آگئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر کرانے کی ضرورت نہیں خیال فرمائی۔

بالفاظ دیگر جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رائے کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کی موافقت پائی گئی۔ لہٰذا آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس تحریر کو ملتوی کر دیا۔

اس واقعہ سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اصابت رائے اور فقاہت فی الدین کی تائید پائی جاتی ہے۔ یہ مخالفت نہیں ہے بلکہ ان کی دینی بصیرت اور فہم و فراست کی علامت ہے اور اس واقعہ کو موافقات عمر میں شمار کیا جا سکتا ہے لیکن مخالفین نے الٹا اس کو اعتراض کا رنگ دے دیا ہے۔ سچ ہے کہ ہنر بچشم عداوت بزرگ ترعیب است۔

--------- (۲) ---------

مخالفین کی طرف سے یہاں دوسرا اعتراض یہ ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حق میں ہجران (ہذیان) کی نسبت کی اور کہا اھجر استفھموہ۔

یہ شان رسالت میں کمال گستاخی ہے جس کے یہ لوگ مرتکب ہوئے کیونکہ ہجران یعنی (ہذیان) کے معنی اختلال ذہنی کی وجہ سے پریشان کلام کرنے کے ہیں۔

○ اولاً یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ مذکورہ قول حدیث کی بعض روایات میں پایا ہی نہیں جاتا۔

اور جن روایات میں یہ کلمہ پایا جاتا ہے، وہاں قالوا (صیغہ جمع مذکر غائب) کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

یعنی (حاضرین مجلس) نے کہا کسی ایک فرد نے نہیں کہا۔ فلہذا اس قول کے قائل ان روایات کے اعتبار سے ایک آدمی نہیں بلکہ اس کے قائل متعدد حضرات ہیں۔

چنانچہ کلمہ اھجر استفھموہ کا صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف انتساب

کر کے گستاخی کا الزام لگانا بالکل غلط اور بے جا ہوا۔

○ اس موقع کی جن روایات میں اھجرا استفھموہ کا کلمہ پایا جاتا ہے وہاں محدثین ذکر کرتے ہیں کہ ھجر یھجر کے معنی فراق اور جُدائی کے ہیں اور یہاں صحابہ کرام اپنے ہم مجلس دیگر صحابہ سے اسی فراق اور جدائی کے معنی میں کلام کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ کیا جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم سے جدا ہو رہے ہیں؟ ان سے دریافت کیجئے!!

○ نیز ھجر یھجر کے معنی ہذیان یعنی مرض کی شدت میں اختلال ذہنی کی وجہ سے کلام کرنا بھی لغت میں پایا جاتا ہے۔ لیکن ان روایات کی بنا پر جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہذیان کی نسبت کرنا ممنوع ہے اور شان نبوت سے بعید ہے، کیونکہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحت و مرض دونوں حالتوں میں معصوم اور مامون ہیں۔

چنانچہ ابن حجرؒ نے "فتح الباری" میں تصریح کر دی ہے کہ

--- وقوع ذالک من النبی صلی اللہ علیہ وسلم مستحیل لانہ معصوم فی صحتہ ومرضہ لقولہ تعالی وما ینطق عن الھوی۔

(فتح الباری لابن حجر العسقلانی ص۱۰۸ ج۸، باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ووفاتہ)

○ علماء کرام لکھتے ہیں کہ بعض روایات کے مطابق جن حضرات سے اھجرا استفھموہ کا قول صادر ہوا تو انہوں نے یہ قول بطور استفہام انکاری کے استعمال کیا ہے (یعنی استفہام تقریری نہیں) مطلب یہ ہے کہ جن حضرات نے بھی یہ کلمہ کہا ہے، انہوں نے ہذیان کے انکار کے طور پر ذکر کیا ہے۔ اثبات کے طور پر نہیں ذکر کیا اور اس کلمہ کے قائل وہ حضرات تھے جو تحریر لکھوانے کے حق میں تھے۔ یہ حضرات اپنے دیگر صاحبان کے قول کو رد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہذیان ہرگز نہیں ہوا بلکہ آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے

ارشاد کے مطابق ہمیں قرطاس پیش کرنا چاہیے۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ اس کلمہ کے قائل حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہرگز نہیں تھے کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ تو اس وقت تحریر لکھوانے کے حق میں نہیں تھے۔

بالفرض اگر یہاں اھجر استفھموہ سے مراد ہذیان اور استفہام تقریری لیا جائے تو کلمہ استفھموہ کی وجہ سے عبارت بے جوڑ اور بے ربط ہو جاتی ہے۔

یعنی جو شخص ہذیان میں مبتلا ہو اس سے کوئی بات دریافت کرنا بالکل بے جا اور بے سود ہے۔

لہٰذا یہاں استفہام تقریری مراد لینا ہرگز درست نہیں۔

اس مقام میں علامہ کرمانی نے شرح بخاری شریف میں امام النواوی کا قول ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں کہ

--- قال النواوی رحمته الله علیه هو (اهجر) بهمزه الاستفهام الانکاری ای انکروا علی من قال لاتکتبوا ای لا تجعلوا امره کامر من هذا فی کلامه--- او هو من الهجر ضد الوصل ای هجر من الدنیا واطلق بلفظ الماضی لما راوه فیه من علامات الهجر من دار الفناء۔

(شرح البخاری الکرمانی ص ۲۳۵، ج ۱۶ باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم و وفاتہ)

مطلب یہ ہے کہ امام النواوی فرماتے ہیں کہ یہاں لفظ اھجر استفہام انکاری کے ساتھ مستعمل ہے یعنی جو صحابہ تحریر لکھوانے کے حق میں نہیں تھے، ان کا رد کرتے ہوئے دیگر صحابہ کرام سے کہہ رہے ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معاملہ کو اس شخص کی طرح نہ بنا دیا جائے جو ذہنی اختلال کی وجہ سے غیر متوازن کلام کرتا ہے۔

یا یہ کلمہ ھجر (جدائی، فراق، ہجرت) کے معنی میں ہے جو وصل کی ضد ہے یعنی کیا آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا فانی سے ہجرت فرما رہے ہیں؟؟

لفظ ھجر کا فعل ماضی سے اطلاق اور استعمال کیا ہے کیونکہ آنجناب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لیے اس دار فانی سے ہجرت کے علامات وہاں نظر آ رہے تھے۔

حاصل کلام

یہ ہے کہ اول تو یہ کلمہ اھجر تمام مرویات میں نہیں پایا جاتا بلکہ بعض روایات میں ہے۔

پھر جہاں یہ کلمہ مروی ہے وہاں صیغہ جمع ہے' واحد سے نہیں تو اس کا قائل شخص واحد نہ ہوا۔

نیز اس کلمہ کا جدائی و فراق والا معنی محدثین نے مراد لیا ہے' اس کے ہذیان والے معنی مراد لینے سے حاضرین مجلس انکار کر رہے ہیں بلکہ اس معنی کے مراد لینے سے روایت کی عبارت بے ربط اور بے جوڑ ہو جاتی ہے۔

شروح بخاری فتح الباری و کرمانی وغیرہ نے روایت کے مفہوم و مضمون کو اس طرح درج کیا ہے جیسا کہ مندرجات گزشتہ میں واضح کیا گیا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ مندرجات بالا کی روشنی میں یہ اعتراض حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر وارد کرنا بالکل غلط ہے اور ان کو ان کلمات کا قائل قرار دینا کسی طرح بھی درست نہیں۔

--------- (۳) ---------

تیسرا اعتراض اس موقع پر مخالفین صحابہ کی طرف سے یہ قائم کیا جاتا ہے کہ مجلس ہذا میں حاضرین صحابہ رضی اللہ عنہم نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا احترام ملحوظ نہیں رکھا اور آں جناب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سامنے اختلاف اور تنازع کرتے ہوئے آوازیں بلند کیں اور وہ لوگ حکم خداوندی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے شرعاً ناجائز امر کے مرتکب ہوئے۔ اسی وجہ سے جناب نبی کریم صلی

اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے انہیں ارشاد فرمایا کہ قوموا عنی "میرے پاس سے اُٹھ جاؤ۔"
جواباً اس کے متعلق ذکر کیا جاتا ہے کہ

○ اصل بات یہ ہے کہ کسی مسئلہ پر اختلاف رائے کا اظہار کرنا فی نفسہ کوئی قبیح فعل نہیں ہے۔ دورِ نبوت میں مختلف مسائل پر رائے کا اختلاف ہوتا رہا اور پھر اظہار رائے کے موقع پر غیر شعوری طور پر آواز کا بلند ہو جانا ایک فطری امر ہے اور قابلِ طعن نہیں۔

اس موقع پر بھی یہی صورت پیش آئی اور آوازیں غیر شعوری طور پر بلند ہوئیں لیکن یہ چیز قصداً اور بالارادہ ہرگز واقع نہیں ہوئی۔

اس سلسلہ میں نصوص قرآنیہ اور آداب مجلس نبوی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پیش نظر تھے اور وہ ان پر ہمیشہ عمل درآمد کیا کرتے تھے۔

اس چیز پر حدیث شریف میں بعض واقعات بطور شاہد کے پائے جاتے ہیں، چنانچہ "المصنف لعبد الرزاق" میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک واقعہ اس طرح لکھا ہے کہ

مسجد نبوی میں ایک روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف فرما تھے اسی اثناء میں ایک شخص نے مسجد ہذا میں آواز بلند کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے بلا کر دریافت فرمایا کہ تو کس قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے تو اس شخص نے جواب دیا کہ میں قبیلہ بنو ثقیف سے ہوں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ تو کون سے علاقے سے ہے تو اس نے کہا کہ میں علاقہ طائف کا رہنے والا ہوں تو اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

قال اما انک لو انک کنت من اھل بلدنا ھذا لا وجعتک ضربا۔ ان مسجدنا ھذا لا یرفع فیہ الصوت۔

یعنی اگر تو ہمارے ہمارے اس شہر (مدینہ منورہ) سے ہوتا تو میں تجھے سزا دیتا۔ قاعدہ یہ ہے کہ ہماری اس مسجد نبوی میں آواز بلند نہیں کی جاتی۔

(المصنف لعبد الرزاق ص ۴۳۷-۴۳۸، جلد اول باب اللغط و رفع الصوت فی المسجد)

(۲) اسی مفہوم کی ایک دیگر روایت "بخاری شریف" میں ہے۔ اس میں سائب بن یزید کا واقعہ اس طرح درج ہے کہ

سائب بن یزید کہتے ہیں کہ

--- کنت قائما فی المسجد فحصبنی رجل فنظرت الیہ فاذا ھو عمر بن الخطاب فقال اذھب فاتنی بھذین فجئتہ بھما فقال ممن انتما ومن این انتما قالا من اھل الطائف قال لو کنتما من اھل البلد لاوجعتکما ترفعان اصواتکما فی مسجد رسول اللہ ﷺ -

یعنی میں ایک روز مسجد نبوی میں کھڑا تھا کہ میری طرف کسی صاحب نے کنکری پھینکی۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ آپ نے مجھے فرمایا کہ جاؤ اور ان دونوں شخصوں کو میرے پاس لاؤ، الخ۔

(بخاری شریف ص ۶۷، جلد اول، باب رفع الصوت فی المسجد، طبع دہلی)

مذکورہ بالا واقعات سے یہ بات واضح ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں خود بھی آواز بلند نہیں کرتے تھے اور دوسروں کو بھی آواز بلند کرنے سے منع فرماتے تھے۔

ان قرائن کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہمیشہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس کے آداب کو پوری طرح ملحوظ رکھتے تھے۔

فلہذا واقعہ قرطاس کے موقع پر بھی حاضرین مجلس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آداب کو ترک نہیں کیا اور کوئی خلاف ادب بات ان سے قصداً صادر نہیں ہوئی۔

جن روایات میں آوازیں بلند ہونے کا ذکر پایا جاتا ہے تو اس کا محمل یہ ہے کہ شرکائے مجلس سے یہ فعل غیر ارادی طور پر سرزد ہوا اور بعض دفعہ گفتگو کی مجالس

میں غیر شعوری طور پر اس طرح رفع صورت پایا جاتا ہے۔ البتہ قصداً و ارادتاً ایسا نہیں ہوا۔

پھر اس پر معترض کہتے ہیں کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قوموا عنی کیوں فرمایا؟ تو اس کے متعلق معلوم ہونا چاہئے کہ یہ کلمہ (قوموا عنی) جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا تو کسی خاص فرد کے لیے تو نہیں تھا۔ سب حاضرین کے لیے ہوگا لیکن اصل بات یہ کہ یہ حکم وقتی اختلاف کو ختم کرنے کے لیے فرمایا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ آپ اس بات کو ترک کر دیں اور چھوڑ دیں۔

اس پر قرینہ یہ ہے کہ قوموا عنی کا اطلاق ایسے مواقع میں حدیث میں مستعمل ہے مثلاً:

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اقراو القران ما ائتلفت علیہ قلوبکم۔ فاذا اختلفتم قوموا عنہ۔	مطلب یہ ہے کہ تم قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہو جب تک کہ تم پر دل جمعی رہے اور جب تم اکتا جاؤ تو اس کو ترک کردو اور چھوڑ دو۔

(بخاری شریف ص۲۹۵، ج۲، کتاب الاعتصام باب کراہیتہ الاختلاف، طبع اول، بخاری شریف ص۷۵۷، ج۲، باب۲، اقراؤ القرآن ما ائتلفت قلوبکم، طبع دہلی)

یہاں قوموا عنہ کے الفاظ ہیں اور اس سے اس عمل اور بات کا ترک کر دینا مراد لیا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح واقعہ قرطاس کی روایت میں قوموا عنی سے بھی یہی مراد ہے کہ اس اختلاف والی بات کو چھوڑ دو اور ترک کر دو۔

مزید اس پر ایک دیگر قرینہ یہ ہے کہ واقعہ قرطاس کی بعض دیگر روایات میں قوموا عنی کے الفاظ کی بجائے دعونی اور ذرونی کے الفاظ پائے جاتے ہیں جن سے بات کو ترک کر دینے اور چھوڑ دینے کا مفہوم بالکل واضح ہے۔

پس ان قرائن سے قوموا عنی کا مفہوم متعین ہو جاتا ہے اور واضح ہوتا

ہے کہ قوموا عنی کے معنیٰ "اٹھ کر چلے جاؤ" ہرگز مراد نہیں بلکہ اس مقام میں اس کا معنیٰ "بات کو چھوڑ دو اور ترک کر دو" درست ہے۔

حاصل کلام

یہ ہے کہ مندرجات بالا کی روشنی میں اعتراض ہذا بالکل زائل ہو جاتا ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ادب و احترام کے خلاف کوئی فعل سرزد نہیں ہوا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کے ہرگز مرتکب نہیں ہوئے۔

آخر کلام

واقعہ قرطاس کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر جو اعتراضات قائم کئے جاتے ہیں، ان کے ازالہ کے لیے گزشتہ صفحات میں کوشش کی گئی ہے اور واضح کر دیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے پیغمبر کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی کوئی نافرمانی ہرگز نہیں کی اور نہ ہی واقعہ ہذا میں خلافت مرتضوی مطلوب تھی بلکہ واقعہ قرطاس میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پیش نظر اپنی قائم مقامی و نیابت اور امت کی امامت کا اہم مسئلہ تھا جسے آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قولاً و فعلاً ابوبکر الصدیق کے حق میں طے فرمایا اور خوش اسلوبی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فرمان کے مطابق قدرت نے اسے مکمل کر دیا اور اس کی تکمیل میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے پوری اطاعت اور فرمانبرداری کا ثبوت دیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت و خلافت کو تسلیم کر لیا۔

رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

اختتام بحث بصورت جائزہ

واقعہ قرطاس کی روایت پر بصورت جائزہ کے یہاں چند کلمات درج کئے جاتے ہیں جو اہلِ علم کے لیے قابلِ توجہ ہوں گے اور اہلِ بصیرت کے لیے لائق غور ہوں گے اور غور و خوض کرنے کے بعد اصل مسئلہ کے حل کرنے میں معین ثابت ہوں گے اور رفع طعن میں مفید ہوں گے۔ (بعونہ تعالیٰ)

واقعہ ہذا کے متعلق جن روایات سے مخالفین طعن قائم کرتے ہیں وہ عموماً عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں اور ابنِ عباس رضی اللہ عنہ اس وقت کم سن تھے، کم و بیش ۱۳۔۱۴ برس عمر ہوگی یعنی اکابر حضرات کے سامنے اصاغر میں ہی شمار ہوتے تھے۔

لیکن اس واقعہ کی جو روایات دیگر اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مثلاً حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ، جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ، عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا وغیرہم سے مروی ہیں۔ ان میں قابلِ اعتراض اشیاء بالعموم مفقود ہیں اور ان روایات پر عام طور پر اعتراضات نہیں کئے جاتے، اور بالفرض اگر کوئی بات قابل اعتراض ہے بھی تو نہایت کمزور ہے کوئی وزنی چیز نہیں۔

البتہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی واقعہ قرطاس کی روایات کو ایک سرسری نگاہ سے دیکھا جائے تو اس میں رواۃ کی تعبیرات نے عجیب اضطراب پیدا کر دیا ہے اور عام ناظر کو پریشانی میں ڈال دیا ہے۔ بعض مقامات میں وہ کچھ ذکر کرتے ہیں تو بعض دیگر مواقع میں کچھ اور بیان کرتے ہیں، چنانچہ اس چیز کا مختصر تذکرہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

(۱) مثلاً ابن عباس کا بہت گریہ کرنا بعض روایات میں منقول ہے اور کثرت سے اشک بار ہونا مذکور ہے اور بعض دیگر روایات میں یہ چیز نہیں پائی جاتی بلکہ رونے کا ذکر تک موجود نہیں۔

(۲) اور بعض مرویات ابن عباس رضی اللہ عنہ میں اختلاف رائے کرنے والوں میں

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام پایا جاتا ہے اور حسبنا کتاب اللہ کا قول ان سے منقول ہے اور بعض مقامات میں اس امر کا کچھ تذکرہ نہیں۔

(۳) بعض مرویات عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ میں پایا جاتا ہے کہ اھجر یا یھجر کے کلمات بعض حاضرین مجلس سے صادر ہوئے۔

اور بعض دیگر روایات میں ان کلمات کے صادر ہونے کا ذکر تک مفقود ہے اور کسی نے یہ الفاظ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حق میں نہیں کہے۔

(۴) پھر ابن عباس رضی اللہ عنہ کی بعض روایات میں آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول قوموا عنی کا ذکر موجود ہے اور ان کی ہی دیگر مرویات میں اس قول کے بجائے دیگر فرمانِ نبوی پایا جاتا ہے۔

---دعونی فالذی انا فیہ خیر مما تدعوننی الیہ۔

ان کلمات میں کوئی قابلِ اعتراض بات ہی نہیں۔

(۵) نیز اسی طرح ابن عباس رضی اللہ عنہ کی بعض روایات میں ان کا قول آتا ہے کہ

---ان الرزیہ کل الرزیہ ما حال---الخ

اور ان کی دیگر مرویات میں اس کا کچھ ذکر تک ندارد اور نہ کسی رزیت و بلیت کا تذکرہ کیا ہے اور نہ اس بات کو مصیبت سے تعبیر کیا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ان روایات کے الفاظ کا یہ تنوع و تفرق اور باہم عبارات کا تخالف و تعارض بہت قابل توجہ ہے۔

نیز اگرچہ روایت بالمعنی عام مروج ہے تاہم عبارات میں ایسا تفاوت و تضاد پایا جانا جس سے مقصد اور مطلب میں قصور آجائے، کہاں تک درست ہے؟؟ حالانکہ ان روایات میں یہ واقعہ ایک ہی ہے اور ناقل واقعہ ایک ہی ہے۔

اور ازواج مطہرات اور دیگر اکابر شرکائے مجلس اپنی روایات میں ابن عباس والی قابل اعتراض چیزوں کا ذکر تک نہیں کرتے۔

بلکہ ان حضرات (ازواج مطہرات ہوں یا دیگر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم) کی

مرویات جو اس موقعہ سے متعلق ہیں، ان میں ابن عباس والی روایات کا تمام مضمون نہیں پایا جاتا اور نہ ان کے ساتھ کوئی تائیدی پہلو نکلتا ہے۔

مذکور حضرات کی اس موقعہ کی مرویات کتابوں میں موجود ہیں اور ان میں سے بعض کو ہم نے موقعہ بموقعہ یہاں درج بھی کیا ہے، لیکن ان میں یہ قابل طعن مضمون اور قابل اعتراض مفہوم نہیں پایا جاتا جو ابن عباس کی روایات نے بیان کیا ہے۔

اندریں حالات مذکورہ تمام امور پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے قرطاس کا اصل واقعہ بیان کیا اور موقع کی صورت حال ذکر کی جیسا کہ مسند ابی یعلیٰ کی روایت میں مذکور ہے اور اس کو ہم نے واقعہ قرطاس کی ابتدا میں اپنے موقع پر درج بھی کر دیا ہے۔

لیکن بعد میں راویوں نے اور واقعہ ہذا نقل کرنے والوں نے اس کو بہت کمی بیشی کے ساتھ نقل کیا اور آگے چلا دیا۔

بعض دفعہ کچھ بیان کیا اور دیگر موقع پر اس میں قابل اعتراض اشیاء کا اضافہ کر دیا۔ اس طرح اصل واقعہ میں رواۃ کی طرف سے قابل طعن چیزوں کا اوراج پایا گیا۔

مختصر یہ ہے کہ واقعہ قرطاس کی روایت پر نظر انصاف ڈالنے سے یہی چیز ثابت ہوتی ہے کہ واقعہ ہذا کے معبرین کی مختلف تعبیرات کی بنا پر اس میں قابل اعتراض چیزیں شامل ہو گئی ہیں، ورنہ اصل واقعہ میں کوئی قابل طعن چیز نہیں۔



الحمد للہ وکفی --- والسلام علی
سیدنا محمد وآلہ وصحبہ وسلم

تصدیقِ ایمانی میں شک کا طعن

شیعہ کی طرف سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ایک اعتراض وارد کیا جاتا ہے جس کا تعلق معاہدہ صلح حدیبیہ سے ہے۔ صلح حدیبیہ چھ ہجری کے موقع پر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفار مکہ کے ساتھ مصالحت اور صلح کی جو شرائط طے فرمائیں، ان کی ظاہری صورت میں مسلمانوں کی کمزوری اور کفار کا تفوق اور غلبہ نظر آتا تھا۔

اس چیز کو دیکھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پریشان تھے۔ خاص طور پر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اس مسئلہ میں بہت مضطرب ہوئے۔

چنانچہ بعض روایات میں مذکور ہے کہ اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ قول کیا کہ

والله ما شككت منذ سلمت الا يومئذ۔

یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: اللہ کی قسم! مجھے آغاز اسلام سے لے کر کبھی شک نہیں ہوا تھا، مگر آج کے دن۔

مندرجہ بالا کلمات سے مخالفین صحابہ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شک فی النبوۃ ہوگیا تھا جو ضعف ایمان کی علامت ہے اور نفاق کی نشانی ہے۔

چنانچہ ایک رسالہ "یاد فاروق" میں شیعہ صاحبان نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر طنز کرتے ہوئے "حضرت فاروق کی تصدیق ایمان" کے عنوان کے تحت مذکورہ بالا طعن وارد کیا ہے اور ان کو مشکوک الایمان ثابت کرنے کی سعی کی ہے۔

الجواب

واقعہ حدیبیہ ۶ ہجری میں پیش آیا تھا۔ صلح حدیبیہ سے متعلق جو صحیح روایات ہیں، وہ مندرجہ ذیل مقامات میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں:

(۱) بخاری شریف--- جلد اول، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد، طبع دہلی۔

(۲) مسلم شریف--- جلد ثانی، باب الصلح فی الحدیبیہ۔

اور دیگر حدیث و سیرت کی کتابوں میں بھی واقعہ ہذا پایا جاتا ہے۔

بخاری ؒ و مسلم ؒ کی مذکورہ بالا روایات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پریشانی اور اضطراب کا ذکر موجود ہے لیکن معترضین کی طرف سے پیش کردہ قابل اعتراض کلمات واللہ ما شککت منذ اسلمت الا یومئذ۔ ان صحیح روایات میں ہرگز موجود نہیں۔

اس مقام میں حضرت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا جو اضطراب اور پریشانی پائی جاتی ہے، وہ دینی حمیت اور ملی خیر خواہی کی وجہ سے ہے کیونکہ فریقین (اہلِ اسلام، کفارِ مکہ) کے مابین مصالحت اور معاہدہ ایسی شروط پر طے ہوا تھا جن میں اہلِ اسلام کا پہلو بظاہر مغلوب نظر آتا تھا اور کفار کے حق میں یہ شرائط بظاہر بہت مفید اور نفع بخش معلوم ہوتی تھیں۔ ایسی مغلوبانہ شرائط کو دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دینی حمیت اور ملی غیرت کی بنا پر پریشانی کا لاحق ہونا جبلی اور فطری امر تھا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ

کو اسلام یا نبوت و رسالت میں ہرگز شک نہیں ہوا۔ جیسا کہ ہم آئندہ سطور میں اس پر قرائن و شواہد ذکر کر رہے ہیں۔ اسی چیز کو شارحین حدیث نے ان روایات کے تحت مفصل ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

فتح الباری شرح بخاری ص۲۶۵، ج۵، باب الشروط فی الجہاد والمصالحہ مع اہل الحرب۔

مختصر یہ ہے کہ معاہدہ ہذا کے اہل اسلام کے حق میں مصالح اور فوائد باعتبار انجام علم خداوندی میں مستور تھے اور بظاہر یہ مغلوبانہ شرائط اہل اسلام کے حق میں مفید نظر نہیں آتی تھیں۔ ان ظاہری حالات کو دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مضطرب ہونا کمال ایمان کی علامت ہے لیکن مخالفین صحابہ نے اس چیز کو زوال ایمان کی نشانی قرار دیا ہے۔ (یاللعجب)

قرائن و شواہد

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس معاملہ میں پریشانی پر درج ذیل قرائن و شواہد موجود ہیں۔

○ اولاً قرینہ یہ ہے کہ اس موقعہ پر اضطراب کی حالت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاں تشریف لائے اور اپنی پریشانی کا اظہار فرمایا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: انی اشهد انه رسول الله تو جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی یہی ذکر کیا کہ انی اشهد انه رسول الله۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس معاہدہ کی شرائط کا ذکر کر رہے تھے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسی مغلوبانہ شرائط کس طرح تسلیم فرمائیں؟ یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس میثاق و عہد کی شرائط و قیود کے انجام کار مفید یا مضر ہونے میں شک ہوا لیکن انہیں آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت و نبوت میں ہرگز شک و شبہ نہیں تھا۔ اسی لیے آپ رضی اللہ عنہ نے مذکورہ کلمات شہادت

سے اقرار رسالت و نبوت کی تصدیق فرمائی۔

○ ثانیاً قرینہ یہ ہے کہ اس مقام کی روایت میں مذکور ہے کہ معاہدہ جب طے ہوگیا تو صلح نامہ کی تحریر پر اہلِ اسلام کی جانب سے حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علی المرتضیٰ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے بطور شاہد کے دستخط فرمائے جبکہ کفار مکہ کی طرف سے مکرز اور سہیل وغیرہم نے دستخط کیے اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ معاہدہ ہذا کے تحریر کرنے والے تھے۔ یہ چیز بھی ان حضرات کے کمال ایمان کی تصدیق ہے اور ان کی دینی پختگی کی توثیق ہے۔ کسی مشکوک الایمان کو گواہ اور شاہد نہیں بنایا جاتا۔

(البدایہ والنہایہ لابن کثیرؒ ص۱۶۹ ج۴، تحت غزوۂ حدیبیہ)

نیز یہ واضح ہو کہ مذکورہ قرائن خود اس موقعہ کی روایات میں موجود ہیں، ان واضح ثبوت پائے جانے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان اور اسلام میں شک و شبہ کرنے کا ہرگز کوئی جواز نہیں ہو سکتا۔

روایت کا جواب

جس روایت میں مذکورہ قابل اعتراض کلمات واللہ ما شککت منذ اسلمت الا یومئذ۔ پائے جاتے ہیں وہ ابن جریر الطبری متوفی ۳۱۰ھ نے اپنی تفسیر جلد ۲۶ میں سورۃ فتح کی تفسیر کے تحت باسند درج کی ہے اور اس روایت کی سند میں ایک راوی ابن شہاب الزہری ہے اور روایت ذکر کرنے میں قال الزہری قال الزہری (یعنی زہری نے کہا) متعدد بار واقع ہوا ہے۔ اس مقام میں مذکورہ قابل اعتراض کلمات الزہری کا اپنا قول ہے اور یہ کلمات روایت میں زہری کی طرف سے مدرج یعنی (درج شدہ) ہیں اور اصل روایت میں یہ قابل اعتراض کلمات نہیں پائے گئے بلکہ اسے زہری نے روایت میں اپنی طرف سے درج کیا اور ایزاد کیا۔

○ زہری کی اسی کارکردگی کی نظیر بھی دستیاب ہوتی ہے مثلاً ابن شہاب الزہری

نے "مطالبہ فدک" کی روایت میں بھی ادراج کیا۔

--- "قال (الزھری) فھجرتہ فاطمہ فلم تکلمہ حتی ماتت۔

مذکورہ بالا کلمات کا الزہری نے اپنی طرف سے ادراج فی الروایت کیا ہے (جیسا کہ ہم نے قبل ازیں اس چیز کو اپنی کتاب رحماء بینھم حصہ صدیقی بحث فدک میں ص۱۲۵ تا ۱۳۸ پر ذکر کیا ہے)

مختصر یہ ہے کہ مخالفین صحابہ نے جن کلمات پر اعتراض کی بنیاد قائم کی ہے وہ کلمات اصل روایت میں موجود نہیں بلکہ راوی کی طرف سے درج شدہ ہیں اور یہ راوی کا اپنا ظن و گمان ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ راوی کا ظن اور خیال دوسروں پر حجت نہیں ہوتا۔

○ نیز معلوم ہونا چاہیے کہ ابن جریر الطبری متوفی ۳۱۰ھ کے بعد میں آنے والے مفسرین حضرات جنہوں نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے اور اس میں قابل اعتراض کلمات درج کیے ہیں تو وہ عموماً الطبری سے ناقل ہیں۔

اور حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اس موقعہ کی کافی روایات ذکر کی ہیں اور آخر میں لکھا ہے کہ

--- وقد رواہ ایضا عن عبدالرزاق عن معمر عن الزھری نحوہ وخالفہ فی اشیاء وفیہ اغراب۔ (تفسیر ابن کثیرؒ ص۱۹۷، ج۴، پارہ ۲۶، سورۂ فتح)

یعنی عبدالرزاق نے معمر سے اور معمر نے الزہری سے روایت اسی طرح ذکر کی ہے اور اس روایت میں بہت سی چیزیں دوسروں سے مختلف ذکر کی ہیں اور ان میں اغراب ہے یعنی یہ روایات "غریب" ہیں اور معروف روایات کے خلاف ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اس مقام میں ان روایات کے متعلق کہا ہے کہ جن میں قابل اعتراض کلمات پائے جاتے ہیں، ان میں غرابت

ہے اور یہ روایات "غریب" ہیں۔

ہم نے قبل ازیں اس روایت میں "ادرج راوی" ذکر کیا ہے۔ اس صورت میں نتائج کے اعتبار سے مآل واحد ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اس مقام کی غریب روایات اور مدارج روایات میں اس قسم کے قابل اعتراض کلمات پائے جاتے ہیں جن کی بنا پر مخالفین صحابہ نے مطاعن قائم کیے ہیں اور اعتراض وارد کیے ہیں جبکہ اس مقام کی صحیح روایات میں قابل اعتراض مواد نہیں پایا جاتا۔

آخر میں

اہم بات جو تمام قرائن و شواہد پر وزنی ہے یہ ذکر کی جاتی ہے کہ

اللہ تعالیٰ جل شانہ نے اپنے مقدس کلام میں صلح حدیبیہ والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان و اسلام کے متعلق متعدد آیات میں توثیق و تصدیق فرمائی ہے اور ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی شریک و شامل ہیں، مثلاً

- لقد رضی اللہ عن المومنین اذ یبایعونک تحت الشجرہ---الخ
- والزمھم کلمہ التقوی وکانوا احق بھا واھلھا---الخ

لہٰذا ان قرآنی آیات مقدسہ کی موجودگی میں کسی معترض کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان و اسلام میں شک پیدا کرنے کی ہرگز گنجائش نہیں اور اگر آنموصوف رضی اللہ عنہ کے ساتھ قلبی عناد والا معاملہ چل رہا ہے تو اس کا کوئی علاج نہیں اور یہ مرض لاعلاج ہے۔ واللہ الھادی۔



قابلِ اعتراض روایت کا جواب

حدیث کی بعض روایات میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں مال فئی او اموال بنو نضیر وغیرہ کی تقسیم کے سلسلہ میں حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کا باہم تنازع ہوا اور یہ معاملہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش ہوا تو اس وقت حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہم دونوں کی یہ رائے تھی کہ جو کچھ مذکورہ اموال میں سے ہمیں حصہ دیا جاتا ہے، اسی کے مطابق قطعات زمین ہمارے حصوں کے مطابق تقسیم کر دیئے جائیں اور علیحدہ علیحدہ ہماری ولایت اور تصرف میں دیئے جائیں۔

○... چنانچہ شرح السنہ للبغوی میں یہی مضمون بہ عبارت ذیل درج ہے کہ

انما اختصما الیہ (عمر رضی اللہ عنہ) فی رای حدث لهما فی اسباب الولایہ والحفظ فرای کل واحد منهما التفرد۔

(۱) شرح السنہ للبغوی ج ۱۱ / ۱۳۴ باب حکم الفئی تحت روایت خصومتہ علی و عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم طبع بیروت۔

(۲) فتح الباری شرح بخاری، جلد ۶ / ۱۵۲ تحت کتاب فرض الخمس۔

○... اس طرح جامع الاصول للجزری جلد ثالث الفرع فی الفئی کے تحت مسئلہ ہذا کی بحث کے حواشی میں لکھا ہے کہ

ان طلب علی والعباس رضی اللہ عنهما انما کان طلب تولی القیام بها بانفسهما وقسمتها بینهما کما سبق۔

...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تنازع ہذا کے سلسلہ میں فریقین کے درمیان زمین کے قطعات کی تقسیم نہیں کی تھی تاکہ بعد والے لوگوں میں میراث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تقسیم کا اشتباہ پیدا نہ ہو۔

...... اس سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں فریقین کے بیانات ہوئے اور کلام و تکلم میں شدت پیدا ہوئی۔

...... اس موقعہ کی بعض روایات میں مذکور ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق مندرجہ ذیل شدید الفاظ استعمال کیے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم لوگوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی اور مجھے بھی کاذب آثم غادر اور خائن خیال کیا، حالانکہ خدا جانتا ہے کہ ہم سچے منصف اور تابع حق ہیں اور اس موقعہ پر بعض روایات میں ظالم اور فاجر کے الفاظ بھی منقول ہیں، چنانچہ ان روایات میں مذکورہ بالا کلمات شدیدہ کے پیش نظر لوگوں نے اعتراض قائم کیا ہے کہ

شیخین انہی مذکورہ اوصاف کے ساتھ متصف تھے اور انہوں نے اپنی زبانی اس چیز کا اقرار کیا۔

فلہذا ان اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مذکورہ قبیح اوصاف کے ساتھ ذکر کرنا کوئی عیب کی بات نہیں، کیونکہ وہ اپنے حق میں اس چیز کا اپنی زبانی اقرار کر رہے ہیں۔

اعتراض ہذا کا مفہوم درج ذیل کتب میں منقول ہے

(۱) فلک النجاۃ جلد اول، ص ۳۹۰، مولوی علی محمد و امیر دین جھنگوی بحث فدک کا بیان۔

(۲) آئینہ مذہب سنی ۱۴۳-۱۴۴ بار چہارم / ڈاکٹر نور حسین جھنگوی۔

الجواب

کچھ لوگوں کا شیوہ ہے کہ حدیث کی روایات میں جہاں کہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

کے خلاف کچھ چیز معلوم کریں، اگرچہ قلیل ہی کیوں نہ ہو، اس کو بڑی اہمیت دے کر اور بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں اور اعتراض کا رنگ دے کر خوب نشر کرتے ہیں، چنانچہ عہد فاروقی کا مذکورہ واقعہ جو حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان بصورت تنازع پیش آیا، اس میں بعض روایات میں ان حضرات کا ایک دوسرے کے خلاف اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے خلاف شدید الفاظ کا استعمال کیا جانا پایا گیا (جیسا کہ مذکورہ بالا اعتراض کی عبارت میں درج کیا ہے) اس بات کو انہوں نے خوب طعن بنا کر ذکر کیا ہے اور حقیقت الامر یہ ہے کہ تنازعہ والی مذکورہ روایت اپنے مقام پر درست ہے۔ ان حضرات کا جو اموال بنی نضیر وغیرہ کے متعلق باہمی تنازع ہوا تو اس موقعہ پر ایک دوسرے کے خلاف شدت کے الفاظ کا پایا جانا واقعات کے اعتبار سے عقلاً کچھ بعید نہیں ہے، ایک انسان دوسرے فریق کی بات کو رد کرنے کے لیے بسا اوقات سخت تعبیر اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں اس واقعہ کو نقل کرنے والے بعض رواۃ نے روایت بالمعنیٰ ذکر کرتے ہوئے بطور ادراج کے بعض شدید الفاظ کا اضافہ کر دیا ہے جن کو معترضین نے اپنے اعتراض کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اصل واقعہ میں یہ الفاظ شدید منقول نہیں ہیں اور اس چیز پر قرائن و شواہد پائے جاتے ہیں۔

شواہد و قرائن

چنانچہ بہت سے محدثین نے واقعہ ہذا کو اپنی اپنی تصانیف میں باسند درج کیا ہے لیکن مذکورہ الفاظ شدید (کاذبا، اثما، غادرا، خائنا، ظالم فاجر) ان میں بالکل مذکور نہیں ہیں مثلاً:

(۱) مسند امام احمد ج اول، ص۲۰۸ تحت مسندات عمر رضی اللہ عنہ، بحاشیہ منتخب کنز العمال، طبع قدیم مصری۔

(۲) مسند امام احمد ج اول، ص۶۰ تحت مسندات عثمان رضی اللہ عنہ، طبع قدیم مصری۔

(۳) بخاری شریف ج اول ص۴۳۵-۴۳۶ باب فرض الخمس طبع نور محمد، دہلی۔
(۴) بخاری شریف ج ثانی، ص ۹۹۲ کتاب الفرائض طبع نور محمدی دہلی باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا نورث ما ترکنا صدقہ۔
(۵) السنن لابی داؤد السجستانی ج ثانی، ۵۵-۵۶ باب فی صفایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم من الاموال طبع مجتبائی دہلی۔
(۶) ترمذی شریف ۲۵۰، طبع قدیم لکھنؤ، باب ما جاء فی ترکتہ النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم۔
(۷) شمائل جامع الترمذی ص۱۰۹، تحت باب ماجاء فی میراث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم۔
(۸) السنن الکبریٰ ج ۴، ص۶۸-۶۵ کتاب الفرائض، ذکر مواریث الانبیاء، طبع بیروت۔
(۹) السنن الکبریٰ للبیہقی ج۶، ص۲۹۸-۲۹۹، تحت بیان مصرف اربعہ اخماس الفئی بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم --- الخ، معہ الجواہر النقی، طبع اول، حیدر آباد، دکن۔

..... مذکورہ بالا تمام حوالہ جات میں اکابر محدثین نے فریقین کے درمیان تنازع کا اصل واقعہ درج کیا، لیکن قابل اعتراض شدید الفاظ (کانبا اثما غادرا خائنا اور ظالم، فاجر) کہیں ذکر نہیں کیے اور یہ چیز ادراج راوی پر مستقل قرینہ ہے اور امام النواوی نے شرح مسلم میں المازری کے حوالہ سے یہی توجیہہ بحث ہذا کے تحت نقل کی ہے۔ نیز یہ چیز بھی قابل ذکر ہے کہ اس مقام کی بعض روایات میں ایک فریق نے دوسرے فریق کو انت کذا وکذا کے الفاظ سے خطاب کیا۔

اس کے متعلق شارحین حدیث نے وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

..... ان العباس رضی اللہ عنہ، و علیا رضی اللہ عنہ، جاء الی عمر رضی اللہ عنہ، یختصمان یقول کل منھما لصاحبہ انت کذا وکذا،

لیس کنایته عن سب احدهما الاخر کما وهم بل المراد انت لا تستحق الولایه علی هذه الصدقه ونحو نالك مایذکر المخاصم فی رد حجه خصمه من غیر شتم ولا سب۔"

(۱) شرح شمائل الترمذی للشیخ عبدالرؤف المناوی ص۲۸۵ بهامش جمع الوسائل۔

(۲) کتاب جمع الوسائل فی شرح الشمائل الترمذی لعلی القاری ص۲۸۵ تحت باب ما جاء فی میراث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

(۳) شرح شمائل الترمذی لشیخ ابراہیم البیجوری ص۲۹۶۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم تنازع کرتے ہوئے تشریف لائے درآنحالیکہ ہر فریق دوسرے فریق کو انت کذا و کذا کہتا تھا۔ یہ الفاظ ایک دوسرے کو سب و شتم کرنے سے کنایہ نہیں ہیں (جیسے کہ بعض لوگوں کو وہم ہوا ہے)

بلکہ ان کلمات سے یہ مراد ہے کہ ایک فریق دوسرے فریق سے کہہ رہا ہے کہ صدقہ ہذا پر تم ولایت اور تصرف کے مستحق نہیں ہو وغیرہ وغیرہ جس طرح کہ ایک تنازع کرنے والا دوسرے فریق کی حجت کو سب و شتم کیے بغیر شدید الفاظ سے رد کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس موقعہ کی روایات میں جہاں کہیں کذا وکذا یا وغیرہ کے الفاظ پائے جاتے ہیں تو وہاں فحش گوئی اور معروف سب و شتم مراد نہیں بلکہ تنازعہ کے دوران سخت کلامی مراد ہے۔ حاصل یہ ہے کہ

اس واقعہ میں اعتراض کرنے والے لوگوں نے جن شدید الفاظ کی بنا پر اعتراض قائم کیا ہے، وہ دراصل روایات اور نفس واقعہ میں موجود ہی نہیں اور نہ ہی ان کا استعمال منقول ہے بلکہ رواۃ کی طرف سے مدرج الفاظ ہیں اور روایت ہذا

میں ادراج پایا گیا ہے۔ اس چیز پر ہم نے سطور بالا میں قرائن و شواہد پیش کر دیئے ہیں اور روایت ہذا میں راوی کی طرف سے درج شدہ الفاظ پر اعتراض قائم کرنا کسی صورت میں درست نہیں اور درج شدہ کلمات دیگر لوگوں پر حجت نہیں ہوتے اور ان کا تسلیم کرنا ضروری نہیں ہوتا۔

اور حقیقت یہ ہے کہ اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مذکورہ شدید الفاظ (کاذب، آثم، خائن، ظالم اور فاجر وغیرہ سے متصف نہیں ہیں)

اور یہ چیز ان حضرات کے حسن اخلاق، تقویٰ اور شان عدالت و دیانت کے خلاف ہے۔ قرآنی آیات اور صحیح احادیث اس پر شاہد عادل ہیں فلہذا اس مقام پر معترضین کا اعتراض قائم کرنا بے جا اور بے محل ہے۔

تنبیہ

روایت مندرجہ میں جو تنازع پایا جاتا ہے، اس کی متعلقہ وضاحت بقدر ضرورت ہم نے قبل ازیں اپنی تالیف رحماء بینھم حصہ اول صدیقی ص۹۵-۹۶ بمع حواشی کے (تحت عنوان مال فئ اور آل رسول ﷺ الخ) ذکر کر دی تھی مگر وہاں الفاظ شدید والی روایت سامنے نہیں لائی گئی تھی اور نہ اس کا جواب وہاں درج ہوا تھا۔ اب اس کو جواب المطاعن کے سلسلہ میں پیش کر کے طعن کے جواب کے طور پر ذکر کیا ہے اور پیش کردہ معروضات پر بشرط انصاف نظر کرنے سے معترض کا اعتراض زائل ہے۔ باقی لانسلم کا کوئی علاج نہیں۔



لولا علی رضی اللہ عنہ لھلک عمر رضی اللہ عنہ

"صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے معاندین ایک شبہ ذکر کیا کرتے ہیں کہ عمر بن الخطاب شریعت کے عالم نہیں تھے اور دیگر لوگوں سے کم علم تھے۔"

مسئلہ کے فیصلہ کرنے میں غلطی کر بیٹھتے تو علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ ان کے غلط فیصلے کو توڑ دیتے۔

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہا کرتے:

لولا علی رضی اللہ عنہ لھلک عمر رضی اللہ عنہ۔ یعنی اگر علی رضی اللہ عنہ نہ ہوتے تو عمر رضی اللہ عنہ ہلاک ہو جاتا۔

(آئینہ مذہب سنی از ڈاکٹر نور حسین، ص ۹۵۳ فلک النجاۃ از حکیم علی محمد و امیر دین، ص ۴۴۲-۴۴۳)

اعتراض کنندگان کا مقصد یہ ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ مسائل شرعیہ سے جاہل تھے اور امامت و خلافت کے مہمات میں سے ہے کہ وہ مسائل شرعیہ کے متعلق پورا واقف اور عالم ہو لیکن وہ ناواقف تھے اور خلافت کے اہل نہیں تھے۔

الجواب

اس شبہ کے ازالہ کے لیے ذیل میں ہم چند چیزیں پیش کرتے ہیں، ان پر توجہ فرمائیں--- یہ شبہ زائل ہو جائے گا۔

○ ایک بات تو یہ ہے کہ خلیفہ اسلام جن اوصاف کی بنا پر منتخب کیا جاتا ہے، وہ

اس کی عدالت، دیانت، تقویٰ، علم دین اور اس کے شرعی مسائل سے واقفیت اور انتظامی امور کی اہلیت اور احکام شریعہ کے نفاذ کی صلاحیت ہیں۔

اس مقام میں یہ شرط نہیں ہے کہ خلیفہ اسلام تمام شرعی امور کے متعلقہ تمام علوم سے ہر طرح واقف ہو اور کوئی معاملہ بھی اس کے علم سے پوشیدہ نہ ہو۔

پھر اس عدم شرط پر قرائن و شواہد موجود ہیں:

چنانچہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ جو مسلم بین الفریقین خلیفہ عادل اور واقف علوم شرعیہ ہیں۔ ان کے متعلق بھی بعض واقعات ایسے موجود ہیں جن میں ان سے علمی فروگزاشت پائی جاتی ہے اور بعض مواقع میں تو آنموصوف رضی اللہ عنہ نے صاف طور پر اپنی لاعلمی کا اظہار فرمایا ہے، مثلاً روایات میں منقول ہے کہ

..... ان علیا حرق قوما ارتدوا عن الاسلام فبلغ ذالک ابن عباس فقال لو کنت انا لقتلتھم بقول رسول اللہ ﷺ قال رسول اللہ ﷺ من بدل دینہ فاقتلوہ ولم اکن لا حرقھم لان رسول اللہ ﷺ قال لا تعذبوا بعذاب اللہ۔ فبلغ ذالک علیا فقال صدق ابن عباس۔ ھذا حدیث حسن صحیح۔ (جامع الترمذی، ابواب الحدود، باب ما جاء فی المرتد، مسند حمیدی ص۲۲۵-۲۲۴، جلد اول، روایت نمبر ۵۳۳ طبع مجلس علمی)

یعنی ایک قوم مرتد ہوگئی تو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ان کو آگ میں جلوا دیا۔ جب اس چیز کی جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ اگر میں ان کو سزا دیتا تو قتل کر دیتا اس لیے کہ فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس طرح ہے کہ جو شخص اپنا دین اسلام چھوڑ دے تو اس کو قتل کر دو۔ اور میں آگ میں نہ جلاتا اس لیے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ اللہ کا عذاب نہ دیا کرو۔ جب یہ خبر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے سچ کہا ہے۔

(۲) اور بعض دفعہ اس طرح ہوا ہے کہ ایک شخص نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مسئلہ دریافت کیا تو حضرت علی المرتضیٰ نے اس کو جواب دیا۔ وہ شخص کہنے لگا کہ یہ مسئلہ اس طرح نہیں ہے بلکہ اس طرح ہے۔

جواب سن کر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تو نے مسئلہ ٹھیک کہا ہے اور میں چوک گیا ہوں۔ ہر علم والے سے دوسرا زیادہ عالم ہو سکتا ہے۔ کنز العمال میں ہے کہ

--- عن محمد بن کعب قال سال رجل علیا عن مسئله فقال فیها فقال الرجل لیس هکذا ولکن کذا وکذا قال اصبت واخطات وفوق کل ذی علم علیم۔

(کنز العمال ص۲۴۱، خامس باب فی آداب العلم والعلماء، طبع اول حیدر آباد دکن)

اسی طرح حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے متعلق اس نوع کے کئی مسائل اور واقعات کتابوں میں پائے جاتے ہیں، ہم نے یہاں صرف دو واقعات ذکر کیے ہیں جو اصل مسئلہ کی تائید میں کافی ہیں۔

(۳) نہج البلاغہ میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی زبان سے اقرار یوں مذکور ہے کہ فرمایا کہ میں خطا کرنے سے بالاتر نہیں ہوں اور میں اپنے فعل میں غلطی سے بے خوف نہیں ہوں، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ میری کفایت کرے جو مجھ سے زیادہ قدرت والا ہے۔

فلا تکفوا عن مقاله بحق او مشوره بعدل فانی لست فی نفسی بفوق ان اخطی ولا امن ذالک من فعلی الا ان یکفی الله من نفسی ما هو املک به منی۔

(نہج البلاغہ ص۴۳۷، ج۱، خطبہ علی علیہ السلام ۔صفین)

مندرجات بالا سے یہ چیز ثابت ہوتی ہے کہ بعض مسائل میں لاعلمی کا اظہار کرنا اور بعض واقعات میں خطا کرنا یا اپنی تحقیق کو ترک کرکے دوسروں کے قول کو

اختیار کرنا۔ یہ کوئی نقص اور عیب کی بات نہیں اور یہ کوئی قابل تنقید اور لائق اعتراض فعل نہیں۔ اکابر ائمہ سے اسی طرح یہ چیز منقول ہے۔

(نوٹ) مضمون ہذا ہماری تالیف رحماء بینھم حصہ فاروقی میں ص ۱۳۵ تا ۱۳۹ تک مذکور ہے۔ مزید تفصیل وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

اسی سلسلہ میں یہ مشہور واقعہ ذکر کیا جاتا ہے کہ ایک زانیہ عورت کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رجم کرنے کا حکم فرمایا اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ یہ عورت حاملہ ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ چیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ کا حکم اس عورت پر تو چل سکتا ہے مگر جو چیز اس کے بطن میں ہے اس پر آپ کا حکم نہیں چل سکتا۔ تو اس صورت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی بات کو تسلیم کر لیا اور فرمایا لولا علی لھلک عمر۔ یعنی اگر علی رضی اللہ عنہ نہ ہوتے تو عمر رضی اللہ عنہ ہلاک ہو جاتا۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو عورت کے حاملہ ہونے کا علم نہیں تھا اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو معلوم تھا تو ان کے متنبہ کرنے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک بہت بڑی غلطی سے بچ گئے اور انہوں نے اس موقعہ پر ادائے شکر کے طور پر مذکورہ بالا کلمہ فرمایا اور اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کی۔ جیسا کہ اکابر شرفاء کا طریق کار رہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شخصیت بہت بلند ہے اور ان کا منصفانہ اخلاق باکمال پایا جاتا ہے اور مذکورہ بالا واقعہ ان کے اخلاق کی بلندی کی نشاندہی کرتا ہے کہ انہوں نے اپنی ایک فروگزاشت پر دیگر صحابہ کے حق میں کلمات شکر ادا کیے۔

ایک دیگر واقعہ

اسی سلسلہ میں ہم ایک دیگر واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بلندی اخلاق اور انصاف پسندی پر ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں جو متعدد محدثین نے اپنی

اسانید کے ساتھ ذکر کیا ہے، چنانچہ حافظ دار قطنی نے اپنے سنن میں یہ واقعہ اس طرح تحریر کیا ہے کہ

عن ابی سفیان قال حدثنی اشیاخ منا قالوا: جاء رجل الی عمر بن الخطاب فقال یا امیر المومنین! انی غبت عن امراتی سنتین فجئت وھی حبلی فنشاور عمر رضی اللہ عنہ الناس فی رجمھا- قال فقال معاذ بن جبل یا امیرالمومنین! ان کان لک علیھا سبیل فلیس لک علی ما فی بطنھا سبیل فاترکھا حتی تضع فترکھا فولدت غلاما قد خرجت ثنیاہ- فعرف الرجل الشبہ فیہ فقال ابنی ورب الکعبہ فقال عمر عجزت النساء ان یلدن مثل معاذ- لولا معاذ لھلک عمر-

(سنن الدار قطنی ص ۳۲۲، ج ۳، تحت کتاب النکاح، طبع القاہرہ، ص ۳۲۵، ج ۲ طبع انصاری دہلی، المصنف لابن ابی شیبہ ص ۸۸، ج ۱۵ تحت کتاب الحدود، طبع کراچی، کتاب السنن السعید بن منصور ص ۷۰، ۳، قسم ثانی، تحت باب المراۃ تلدلستہ اشہر)

مطلب یہ ہے کہ--- ابوسفیان کہتے ہیں کہ مجھے اپنے مشائخ نے بیان کیا ہے کہ ایک شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا، اے امیرالمومنین! میں اپنی زوجہ سے دو سال غائب رہا ہوں اور جب میں آیا ہوں تو وہ حاملہ ہے- (فلھذا میری زوجہ سزا کے لائق ہے)

تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیگر صحابہ سے اس عورت کے رجم کے معاملہ میں مشورہ کیا تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے امیرالمومنین! آپ کو عورت کے رجم کرنے کا حق ہے لیکن جو اس کے بطن میں ہے، اس پر آپ کو اختیار حاصل نہیں، لہٰذا اسے وضع حمل تک ملتوی کر دیں-

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو (وضع حمل تک) ملتوی کر دیا- پھر اس

عورت نے ایک لڑکا جنا، جس کے سامنے کے دانت نکل چکے تھے۔ پس اس شخص نے اس بچے میں اپنی مشابہت پائی اور کہنے لگا، رب کعبہ کی قسم! یہ بچہ میرا ہے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: عورتیں معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جیسا شخص پیدا کرنے سے عاجز ہو چکی ہیں۔ اور فرمایا کہ

لولا معاذ لھلک عمر۔ اگر معاذ رضی اللہ عنہ نہ ہوتے تو عمر رضی اللہ عنہ ہلاک ہو جاتا۔

حاصل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت معاذ کے مشورہ کو قبول کرتے ہوئے ان کے حق میں قدردانی اور عزت افزائی کے کلمات ذکر کیے۔ گویا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے حق میں یہ کلمات تشکر کے درجہ میں ہیں اور ساتھ ساتھ حوصلہ افزائی بھی اس میں مطلوب ہے اور باکمال شخصیات کے کلام کا انداز ایسا ہی ہوتا ہے۔

خلاصہ کلام

حاصل کلام یہ ہے کہ معترض لوگ اس مسئلہ کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی لاعلمی اور نااہلی کا رنگ دے کر ان کے حق میں طعن و اعتراض پیدا کرتے ہیں۔

حالانکہ اس نوع کے کلمات کا ان حضرات رضی اللہ عنہم سے صادر ہونا ان کے کمال انصاف پسندی اور قبول حق کے نشانات میں سے ہے اور منصفانہ کردار کی علامات میں سے ہے۔

اور اگر ان لوگوں کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی لاعلمی اور مسائل دینی سے ناواقفی ثابت کرنے پر اصرار ہے تو یہ چیز تو خود حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے بھی ان کے اپنے کلام کے مطابق ثابت ہے اور متعدد واقعات حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے منقول ہیں جن میں ان سے لاعلمی کا ثبوت اور ناواقفی کا اقرار پایا جاتا ہے (جیسا کہ سابقہ سطور میں مختصراً بیان کیا گیا ہے)

پھر اس معاملہ میں صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہی کیوں ہدف اعتراضات بنایا جاتا ہے؟؟ مقصد یہ ہے کہ خلیفہ اسلام کے لیے تمام علوم کا عالم ہونا اور تمام امور سے واقف ہونا شرط خلافت نہیں۔

اس بارے میں بہتر طریق یہی ہے کہ ان دونوں اکابر ہستیوں کے بارے میں اس قسم کے اعتراضات نہ اٹھائے جائیں اور ان کے حق میں کف لسان کیا جائے۔ ایمان کی سلامتی اسی میں ہے۔



مسئلہ تراویح

مسئلہ ہذا کے اہم عنوانات

- دورِ نبوی میں نماز تراویح کی تین صورتیں۔
- گیارہ رکعت والی روایت کے تعارض کا جواب (بیس (۲۰) رکعات کے ساتھ تعارض کا حل)
- ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کے مضمون کو تلقی امت حاصل ہے۔
- ایک وہم کا ازالہ (ابن عباس رضی اللہ عنہ کے صغر سنی کا شبہ)
- خلافت راشدہ کے دور میں نماز تراویح۔
- عہد صدیقی میں تراویح کا معمول
- عہد فاروقی میں تراویح کا اجتماعی عمل۔
- ایک شبہ کا ازالہ (تراویح کے بدعت ہونے کا شبہ)
- بیس (۲۰) رکعات تراویح پر کبار علماء کی تائید۔ (ابن تیمیہ وغیرہم)
- ایک شبہ کا ازالہ (حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے پہلے گیارہ رکعات اور بعد میں بیس رکعات نماز تراویح شروع کرائیں)
- عہد عثمانی میں تراویح کا اہتمام۔
- خواتین کا شمول۔
- عہدِ مرتضوی میں تراویح کا انتظام۔
- حاصل کلام (خلفاء راشدین کے ادوار خلافت میں بیس رکعات تراویح

باجماعت کا پچیس برس تک دوامی عمل رہا)

- بفرمان رسالت خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے اتباع کی تاکید۔
- مشاہیر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تعامل۔ (ابی بن کعب، ابن مسعود، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم، ام المومنین صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا)
- تابعین اور تبع تابعین اور دیگر کبار علماء کے فرمودات۔
- امہات المومنین کا طرزِ عمل۔
- کیا تراویح آٹھ رکعت ہیں؟
- خلاصہ بحث۔

ابتدائیہ

الحمد لله وكفى والصلوه والسلام على سيد الورى وعلى آله الشرفاء واصحابه النجباء واتباعه الصلحاء صلوه دائمه بدوام الارض والسماء۔ امابعد۔

تراویح کا مسئلہ آئندہ سطور میں درج کیا جاتا ہے اور اس مسئلہ کے متعلقات ذکر کرنے سے قبل ہم یہاں تحریر مدعی کے درجہ میں چند سوالات ناظرین کی خدمت میں ذکر کرتے ہیں۔ اس طریقہ سے مسئلہ ہذا کے قابل وضاحت پہلو سامنے آسکیں گے۔

کیا:

(۱) بیس رکعات تراویح پڑھنا مسنون ہے یا بدعت؟؟

(۲) خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم، و صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے دور میں بیس رکعات پڑھی گئی ہیں یا نہیں؟؟ اور اس مسئلہ میں تعامل صحابہ کس طرح تھا؟؟

(۳) قرونِ ثلاثہ میں کسی معتمد عالم دین، نامور محدث یا فقیہ نے بیس رکعات کو بدعت قرار دیا ہے؟ یا اس دوامی عمل پر نکیر فرمائی ہے؟؟ یا اسے بخوشی قبول کرلیا

ہے؟؟

اب اس مسئلہ کے متعلقہ معروضات پیش کیے جاتے ہیں، بغور ملاحظہ فرماویں۔ تمام بحث پر نظر غائر کر لینے سے اطمینان قلب ہو جائے گا اور مندرجہ بالا سوالات کے جوابات بھی پائے جائیں گے۔

عہدِ نبوت

اہلِ علم پر واضح ہے کہ عہد رسالت کے دوران مسئلہ تراویح میں متعدد صورتیں پائی جاتی ہیں۔ دورِ نبوت (علی صحبہا الصلوہ والسلام) میں جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ۲ھ میں رمضان شریف کے روزوں کی فرضیت کے بعد شب ہائے رمضان المبارک میں صلوٰۃ رمضان کی ترغیب دلائی اور ارشاد فرمایا:

عن ابی ھریرہ من قام رمضان ایمانا واحتسابا غفرلہ ما تقدم من ذنبہ۔

(۱) مشکوۃ شریف ص ۱۱۴ باب قیام شہر رمضان، الفصل لاول، طبع دہلی، بحوالہ مسلم شریف۔

(۲) السنن الکبریٰ ص ۴۹۲ جلد ثانی مباحث صلوٰۃ التراویح، الامام البیہقی۔

(۳) ریاض الصالحین ص ۴۵۰، ۴۵۱ باب استحباب قیام رمضان وھو التراویح۔

یعنی جو شخص رمضان کی راتوں میں ایمان اور ارادہ ثواب کے ساتھ قیام کرے گا تو اس کے لیے گزشتہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

پہلی صورت

قیامِ رمضان کے سلسلہ میں یہ ابتدائی مراحل تھے اور بطور ترغیب کے اس پر عمل ہوتا تھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ترغیب

کی بنا پر شب ہائے رمضان میں اپنے طور پر مختلف جماعتوں کی شکل میں مسجد نبوی کے اندر اطراف و جوانب میں تراویح ادا کرتے تھے۔

چنانچہ متعدد محدثین نے اس چیز کو اپنی تصانیف میں باسند ذکر کیا ہے۔ مثلاً

عن العلاء بن عبدالرحمن عن ابیه عن ابی هریره انه قال خرج رسول الله صلی الله علیه وسلم وانا الناس فی رمضان یصلون فی ناحیه المسجد فقال ما هولاء؟ فقیل هولاء ناس لیس معهم قرآن وابی بن کعب یصلی بهم وهم یصلون بصلاته فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم اصابوا- اونعم ما صنعوا-

(صحیح ابن خزیمہ ص۳۳۹، جلد ثالث، باب امامتہ القاری الامیین فی قیام شہر رمضان (المتوفی ۳۱۱ھ)، الصحیح لابن حبان ص۱۰۷، جلد خامس، تحت فصل فی التراویح، روایت نمبر ۲۵۳۲، ابوداؤد شریف ص۲۰۲، جلد اول، باب فی قیام شہر رمضان، طبع دہلی)

روایت مندرجہ بالا کا مفہوم یہ ہے کہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رمضان شریف میں ایک رات اپنے خانہ مبارک سے باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ مسجد نبوی کے مختلف اطراف و جوانب میں لوگ رمضان المبارک میں متفرق جماعتوں کی شکل میں نمازیں ادا کر رہے ہیں تو آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ تو جواب میں عرض کیا گیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو پورا قرآن مجید یاد نہیں اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ قرأت کر رہے ہیں اور یہ لوگ ان کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے ہیں تو اس موقعہ پر جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ان لوگوں نے بالکل ٹھیک کیا یا یوں فرمایا کہ جو کچھ انہوں نے کیا، عمدہ کیا اور بعض روایات کے الفاظ اس طرح منقول ہیں کہ

قال قد احسنوا او قد اصابوا ولم یکرہ ذالک لھم۔

یعنی ارشاد فرمایا کہ انہوں نے اچھا کیا یا فرمان دیا کہ انہوں نے درست کیا اور ان لوگوں کے اس عمل کو ان کے حق میں ناپسند نہیں جانا اور ان کو اس فعل سے منع نہیں فرمایا بلکہ ان کے عمل کی تصویب فرمائی۔

نتیجہ کے اعتبار سے یہاں ذکر کرنا مناسب ہے کہ:

اول تو یہ "سنت قولی" ہے جو ظاہر الفاظ حدیث سے ثابت ہو رہی ہے اور پھر اگر اس سے صرف نظر کر لی جائے اور کم درجہ دیا جائے تو کم از کم "سنت تقریری" ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔

حاصل یہ ہے کہ تراویح کے لیے یہ ایک مرحلہ تھا کہ دور نبوی میں جماعت کے ساتھ تراویح مسجد نبوی میں ادا کی جاتی تھی اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے علم میں یہ فعل جاری تھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس عمل کو تصویب و تائید نبوی ﷺ حاصل تھی۔

قابل توجہ

اور یہ چیز اہل علم پر مخفی نہیں ہے کہ اس مضمون کی دیگر روایات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین سے مروی ہیں۔ ان میں سے بطور مضمون کی تائید کے ایک روایت ہم عنقریب ذکر کر رہے ہیں اور جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مذکورہ روایت صحیح ابن خزیمہ جلد ثالث اور الصحیح لابن حبان جلد خامس اور ابوداؤد شریف جلد اول وغیرہ میں مروی ہے۔ پھر ابوداؤد رضی اللہ عنہ نے خود ہی اس کی سند پر درج ذیل الفاظ میں نقد کیا ہے کہ

لیس ھذا الحدیث بالقوی ومسلم بن خالد ضعیف۔

یعنی مسلم بن خالد راوی ضعیف ہیں اور یہ حدیث قوی نہیں ہے۔

اس مقام میں علماء نے نقد ہذا کے متعلق جوابات ذکر کیے ہیں۔ ان کے بیانات کی روشنی میں یہاں مختصراً معروضات پیش کی جاتی ہیں۔

راوی مذکور مسلم بن خالد الزنجی المکی پر اگرچہ بعض علماء نے ناقدانہ کلام کیا ہے اور اس کی تضعیف کی ہے لیکن اس کے باوجود دیگر کبار علماء نے اس کی توثیق بھی ذکر کی ہے چنانچہ اس راوی کی توثیق کے متعلق علماء کرام کے چند کلمات پیش کیے جاتے ہیں مثلاً

یحییٰ بن معین نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ

ثقه وهو صالح الحديث۔

یعنی مسلم بن خالد قابل اعتماد ہے صالح حدیث والا ہے۔ (اس کی روایت قابل قبول ہے)

(تاریخ یحییٰ بن معین ص۵۶۱-۵۶۲ جلد ثانی تحت مسلم بن خالد الزنجی)

اور ابن حبان نے "کتاب الثقات" میں تحریر کیا ہے کہ

وكان مسلم بن خالد يخطى احيانا۔

یعنی مسلم بن خالد بعض دفعہ خطاء کرتا تھا۔

لیکن ساتھ ہی اس کی توثیق بھی ذکر کی ہے کہ

كان من فقهاء الحجاز--- وروى عنه عبدالله بن المبارك والشافعى والحميدى وغيرهم ومنه تعلم الشافعى الفقه---الخ۔

(کتاب الثقات لمحمد بن حبان، ص۴۴۸، جلد سابع، تحت مسلم بن خالد)

اور ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں درج کیا ہے کہ

قال ابن عدى حسن الحديث- وكان فقيه مكه وكان من فقهاء اهل الحجاز- قال الساجى صدوق' قال الدارقطنى ثقه---الخ

(تہذیب التہذیب لابن حجر ص۱۲۹-۱۳۰ جلد عاشر تحت مسلم بن خالد، طبع دکن)

مندرجہ حوالہ جات کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلم بن خالد اہل حجاز کے فقہاء میں شمار ہوتے تھے، مکہ والوں کے لیے فقیہ تھے اور ان سے ابن المبارک امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ۔ الحمیدی" وغیرہ کبار علماء نے روایت حاصل کی ہے اور امام شافعی" نے فقہ کا علم ان سے بھی لیا ہے۔ ابن عدی نے کہا ہے بہتر حدیث لاتے ہیں اور الساجی نے کہا ہے کہ یہ شخص صادق اور سچے ہیں اور دار قطنی نے فرمایا ہے کہ یہ معتمد آدمی ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ مسلم بن خالد الزنجی المکی پر تنقید و نقد پائی جاتی ہے تاہم اس کے ساتھ اس کی توثیق بھی علماء نے ذکر کی ہے جو ہم نے کلام بالا میں پیش کر دی ہے۔ اس کے پیش نظر اس کی روایت بہمہ وجوہ اور بالکلیہ قابل رد نہیں ہے بلکہ اس کی توثیق کی وجہ سے قابل قبول ہے۔

تائید

اس کے بعد یہ ذکر کر دینا مناسب ہے جیسا کہ سابقاً ذکر ہوا ہے مذکورہ بالا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے ہم مفہوم و ہم معنی ایک دیگر روایت امام بیہقی نے السنن الکبریٰ وغیرہ تصانیف میں درج کی ہے۔

بیہقی کی یہ روایت جناب ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی روایت کی موید ہے اور اس کے مفہوم کی پوری طرح توثیق و تائید کرتی ہے۔

فلہذا مندرجہ بالا روایت تائید پائی جانے کی وجہ سے قابل قبول ہو جائے گی اور اپنے مقام میں درست ثابت ہوگی اور قابل ترک نہ رہے گی، چنانچہ ذیل میں بیہقی کی موید روایت ذکر کی جاتی ہے:

عن ثعلبہ بن ابی مالک رضی اللہ عنہ القرظی قال خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذات لیلہ فی رمضان

یعنی ایک رات جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر سے باہر تشریف لائے۔ رمضان المبارک تھا۔ دیکھا کہ مسجد کے

فرای ناسا فی ناحیه المسجد یصلون فقال ما یصنع هولا؟ قال قائل یارسول الله! هولاء ناس لیس معهم القرآن وابی بن کعب یقرا وهم معه یصلون بصلته- قال قد احسنوا وقد اصابوا ولم یکره ذالک لهم- (السنن الکبریٰ مع الجواہر النقی ص ۴۹۵، جلد ثانی باب من زعم انھا بالجماعه افضل لمن لا یکون حافظا)	کونہ میں کچھ لوگ نماز پڑھ رہے ہیں تو آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ تو ایک شخص نے عرض کیا کہ جن لوگوں کو قرآن مجید یاد نہیں وہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں باجماعت نماز پڑھ رہے ہیں تو آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ انہوں نے اچھا کیا اور درست کیا۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فعل کو مکروہ نہیں جانا۔

اور الفاضل النیموی نے آثار السنن" میں اس روایت کے تحت لکھا ہے کہ

رواہ البیهقی فی المعرفه واسناده جید-

فاضل بیہقی نے مذکورہ مندرجہ روایت کے متعلق سنن الکبریٰ میں بحث کی ہے، وہاں درج کیا ہے کہ قال الشیخ هذا مرسل حسن-

مطلب یہ ہے کہ چونکہ ثعلبہ راوی صحابی نہیں بلکہ تابعی ہے، اس بنا پر حکم لگایا ہے کہ یہ روایت مرسل ہے لیکن درجہ حسن میں ہے اور ضعیف نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جناب ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت اور ثعلبہ کی روایت ہذا دونوں مقبول ہیں اور ان سے ثابت ہوا کہ سردار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں جماعت کے ساتھ تراویح مسجد نبوی میں ادا کی جاتی تھی اور آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے اس فعل کو تصویب حاصل تھی اور اس کو منع نہیں فرمایا۔

معلوم ہوا کہ رمضان المبارک میں تراویح کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا دورِ نبوت میں ثابت ہے اور سُنّت کے مطابق ہے۔

دوسری صورت

دور نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں نماز تراویح کی ادائیگی کے متعلق ایک وہ صورت تھی جو سابقہ صفحات میں ذکر کی گئی ہے۔

دوسری صورت اس مسئلہ میں مندرجہ ذیل پائی جاتی ہے جس کو متعدد صحابہ کرام (مثلاً ابوذر غفاری اور نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما وغیرہم) نقل کرتے ہیں کہ

عن ابی ذر (رضی الله عنه) قال صمنا مع النبی صلی الله علیه وسلم فی رمضان فلم یقم بنا حتی بقی سبع من الشهر فقام بنا حتی ذهب ثلث اللیل ثم لم یقم بنا فی السادسه وقام بنا فی الخامسه حتی ذهب شطر اللیل فقلت یارسول الله صلی الله علیه وسلم لو نفلنا بقیه لیلتنا هذه؟ قال انه من قام مع الامام حتی ینصرف کتب له قیام لیله۔ ثم لم یصل بنا حتی بقی ثلاث من الشهر فقام بنا فی الثالثه وجمع اهله ونساء۔

یعنی مطلب یہ ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہم نے رمضان المبارک میں روزے رکھے۔ اس دوران آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ رات کی نماز (تراویح) میں نہیں کھڑے ہوئے حتیٰ کہ اس مہینہ کے سات یوم رہ گئے (یعنی وہ مہینہ ۲۹ یوم کا شمار تھا) پھر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ثلث شب تک نماز پڑھائی۔ پھر چوبیسویں شب کو آپ تشریف نہیں لائے اور پچیسویں شب کو پھر تشریف لائے اور نصف شب تک نماز پڑھائی--- پھر آپ نے نماز نہ پڑھائی۔ حتیٰ کہ تین یوم رہ گئے تو اس وقت آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ستائیسویں شب ہمیں نماز

فقام بناحتی تخوفنا ان یفوتنا الفلاح قلت وما الفلاح؟قال السحور-

پڑھائی اور اپنے اہلِ خانہ کو بھی جمع فرمایا اور اس رات دیر تک نماز پڑھائی حتیٰ کہ ہم نے سحری کے فوت ہو جانے کا خوف کیا۔

روایت نعمان بن بشیر

اسی طرح النعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ صحابی نے بیان کیا کہ

قمنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فى شهر رمضان ليله ثلاث و عشرين الى ثلث الليل ثم قمنا معه ليله خمس و عشرين الى نصف الليل ثم فمنا ليله سبع وعشرين حتى ظننا ان لن ندرك الفلاح وكذانسميه السحور---الخ-

یعنی رمضان المبارک میں تسویں شب میں ہم جناب اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اقتداء میں ثلث لیل تک کھڑے ہوئے پھر ہم جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف میں پچیسویں شب میں نصف شب تک کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد پھر ستائیسویں شب میں (نماز تراویح) کے لیے کھڑے ہوئے حتیٰ کہ ہم نے کافی تاخیر کی وجہ سے اپنی جگہ گمان کیا کہ فلاح (یعنی سحری) کو ہم نہ پا سکیں گے۔

(صحیح ابنِ خزیمہ ص۳۳۶ جلد ثالث، باب الصلوۃ جماعۃ فی قیام رمضان... الخ، طبع بیروت، السنن الکبریٰ للنسائی جلد اول، ص۴۱۰-۴۱۱، روایت نمبر۱۲۹۹ تحت قیام شہر رمضان، طبع بیروت)

یہ روایت نعمان بن بشیر صحابی نے حمص شہر کے منبر پر بیٹھ کر بیان کی۔ یہ روایت مذکورہ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت کے ہم معنی و ہم مفہوم ہے اور بطور تائید کے پیش کی گئی ہے اور اہل علم کو معلوم ہے کہ اس مضمون کی روایت صحاحِ ستہ کی کتابوں میں دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی منقول ہے۔

پس ان روایات میں جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا تراویح کو

جماعت کے ساتھ پڑھانا ثابت ہے۔ اگرچہ ان روایات میں تعداد رکعات مذکور نہیں لیکن نماز تراویح کا شب ہائے رمضان میں جماعت سے پڑھانا اور ان میں کافی وقت لگانا اور رات کا ایک حصہ صرف کرنا سنت صحیح سے ثابت ہوتا ہے۔

رمضان شریف کی راتوں میں تراویح کے لیے شب خیزی کا عمل جاری رہا۔ پھر بعض دفعہ آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قصداً جماعت کرانے کے لیے نہیں تشریف لائے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے تقاضا بھی ہوا' اس کے باوجود نہیں پہنچے۔ پھر اس روز صبح کو آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس چیز کی حکمت بیان فرمائی کہ

اما بعد فانه لم يخف على شانكم ولكني خشيت ان تفرض ليكم صلاه الليل فتعجزوا عنها---الخ-

یعنی فرمایا کہ تمہارے تقاضے کا حال مجھ پر مخفی نہیں تھا لیکن میں نے اس بات کا خوف کیا کہ رمضان کی راتوں کی نماز تم پر واجب کر دی جائے' پھر اس کی ادائیگی سے تم عاجز آجاؤ---الخ۔

(صحیح ابن خزیمہ ص۳۳۹-۳۳۸ جلد ثالث' طبع بیروت' باب اللیل علی ان النبی ﷺ انما ترک قیام لیالی رمضان... الخ' مشکوۃ شریف ص۱۱۴ باب قیام شہر رمضان' الفصل الاول' متفق علیہ)

یعنی اس نماز کے وجوب کے خوف سے ناغہ کر دیا۔ یہ ایک عظیم مصلحت تھی جس کی وجہ سے امت پر شفقت فرمائی اور اس فعل پر دوام نہیں فرمایا۔ گویا کہ عدم دوام کی علت اور وجہ ظاہر فرما دی۔

خلاصہ یہ ہے کہ نماز تراویح کی ادائیگی کی یہ دوسری صورت تھی جو اس شکل میں عہد نبوت میں پائی گئی۔

تیسری صورت

اب یہاں مسئلہ ہذا کے لیے نماز تراویح کے حق میں ایک تیسری روایت پیش کی جاتی ہے جو جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

عن ابن عباس ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يصلى فى رمضان عشرين ركعه والوتر-

(۱) المصنف لابن ابی شیبہ (المتوفی ۲۳۵ھ) ص۳۹۴ جلد ثانی، تحت کم یصلی فی رمضان من رکعۃ، حیدر آباد دکن۔

عن مقسم عن ابن عباس قال كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلى فى رمضان عشرين ركعه ويوتر بثلاث-

(۲) المنتخب مسند عبد حمید (المتوفی ۲۴۹ھ) ص۲۱۸ روایت نمبر ۶۵۳ طبع بیروت۔

(۳) مجمع الزوائد لنور الدین الہیثمی ص۱۷۲ جلد ثالث باب قیام رمضان بحوالہ الطبرانی فی الکبیر والاوسط وفیہ ابوشیبہ ابراھیم وھو ضعیف، طبع اول، مصری)

مذکورہ روایت کا مفہوم یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رمضان شریف میں بیس رکعتیں پڑھتے تھے اور وتر تین رکعات میں ادا فرماتے تھے۔

روایت ہذا کی رو سے یہ بات ثابت ہوئی کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیس رکعات نماز تراویح ادا فرمایا کرتے تھے۔

نماز تراویح کی یہ تیسری صورت ہے اور عہد نبوت میں اس کا ثبوت موجود ہے۔ اب اس سے انکار کرنا زیغ عن الحق ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ عہد نبوت میں ان متعدد صورتوں میں صلوٰۃ التراویح ادا کی جاتی تھی۔

اس مقام میں چند ایک چیزیں قابل وضاحت ہیں۔

------ (۱) ------

روایت ہذا جو ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے بظاہر اس کا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت کے ساتھ تعارض معلوم ہوتا ہے جس میں گیارہ رکعات نماز ادا کرنے کا ذکر پایا جاتا ہے تو اس کے متعلق گزارش ہے کہ آخر بحث میں "مستقل عنوان" قائم کر کے ان دونوں روایات کا رفع تعارض کر دیا ہے۔ وہاں آپ اس کی تفصیل بقدر کفایت ملاحظہ فرما سکیں گے۔

------ (۲) ------

دوسری گزارش یہ ہے کہ یہاں محدثین نے اس روایت کے ایک راوی "ابراہیم بن عثمان ابوشیبہ" پر کلام کیا ہے اور کہا ہے کہ "وھو ضعیف۔" یعنی یہ راوی کمزور ہے۔ اب اس مقام میں راوی مذکور کے ضعف کے جواب میں چند چیزیں ذکر کی جاتی ہیں۔ علماء فن نے اگرچہ راوی مذکور کے ضعف کی تصریح کی ہے لیکن اس روایت کے مقبول ہونے کے لیے دیگر قرائن موجود ہیں جن کی بنا پر راوی کے ضعف کا مداوا اور ازالہ ہو سکتا ہے۔ پھر اس طریقہ سے روایت قابل قبول ہو جاتی ہے اور متروک نہیں رہتی۔

قرائن

○ ایک بات تو یہ ہے کہ اس روایت کی خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے عمل اور دیگر کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تعامل سے تائید پائی جاتی ہے اور اس دور میں بیس رکعات تراویح کا پڑھا جانا اس روایت کے صحیح ہونے کا قرینہ ہے۔ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے تعامل کی تفصیل ہم عنقریب ذکر کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

چنانچہ علماء کرام نے لکھا ہے کہ

وموا ظبہ الصحابہ علی عشرین قرینہ صحہ ھذہ الروایہ۔

یعنی بیس رکعات ادا کرنے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مواظبت اور دوام کرنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کے صحیح ہونے پر قرینہ ہے۔

(رسائل الارکان از بحر العلوم مولانا عبد العلیٰ لکھنوی، ص۱۳۸، تحت فصل صلوٰۃ التراویح فی رمضان، طبع قدیم)

(۲) اسی طرح کبار تابعین اور جمہور علمائے امت کے بیس رکعات ادا کرنے کے تعامل سے بھی روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے صحیح ہونے کی تائید پائی جاتی ہے اور متعدد آثار قویہ اس روایت کی توثیق و تائید میں دستیاب ہوتے ہیں۔

(۳) نیز ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت مذکورہ اگرچہ خبر واحد ہے، لیکن اس کی صحت کا ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ اس روایت کے مضمون کو "تلقی امت" حاصل ہے اور جس روایت کے مضمون کو تلقی امت حاصل ہو جائے اور امت اس کو عملاً قبول کر لے اور تصدیق کر دے تو وہ جمہور علماء کے نزدیک علم یقینی کا فائدہ دیتی ہے، ظنی نہیں رہتی۔

چنانچہ "شرح عقیدۃ الطحاویہ فی عقیدۃ السلفیہ" میں لکھا ہے کہ

وخبر الواحد اذا تلقہ الامہ بالقبول عملا بہ وتصدیقا لہ یفید العلم الیقینی عند جماھیر الامہ۔ وھو احد قسمی المتواتر ولم یکن بین سلف الامہ فی ذالک نزاع۔

(۱) شرح الطحاویہ ص۳۲۰، تحت بحث ہذا قاضی علی بن علی بن ابی العز الحنفی المتوفی ۷۹۲ھ۔

(۲) احکام القرآن للجصاص الحنفی ص۴۵۶، جلد اول، تحت الطلاق مرتان، الخ۔

پس اس قاعدہ کے اعتبار سے بھی جناب ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت مذکورہ

متروک نہیں بلکہ قابل قبول ہے اور اس کے صحیح ہونے پر امت نے یقین کیا ہے۔ فلہذا اس کے ضعف کا اعتبار نہیں کیا جائے گا اور مندرجہ قرائن کے پیش نظر اسے رتبہ قبولیت حاصل ہوگا۔

ایک وہم کا ازالہ

روایت ہذا کی بحث میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ صغار صحابہ میں سے ہیں، اس مسئلہ پر کسی کبیر صحابی کی روایت پیش کی جائے تو اس وہم کے ازالہ کے لیے اتنا قدر ذکر کر دینا کافی ہے کہ ام المومنین حضرت میمونہ بنت الحارث رضی اللہ تعالیٰ عنہا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی خالہ ہیں (یعنی ان کی ماں ام الفضل کی بہن ہیں) اپنی خالہ جان کی خدمت میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی آمد و رفت رہتی تھی اور کئی بار اپنی خالہ کے خانہ مبارک میں شب باشی بھی ان کو نصیب ہوتی تھی۔ پس ان ذرائع کی بنا پر ان کو مسئلہ ہذا (یعنی بیس رکعات تراویح ادا ہونے کا) علم حاصل تھا جسے ابن عباس رضی اللہ عنہ نے مذکورہ روایت میں بیان کیا ہے اور وہ بالکل صحیح ہے۔

پھر اس روایت کی صحت کے لیے متعدد قرائن پائے جاتے ہیں جیسا کہ گزشتہ سطور میں ہم نے ان کو مختصراً ذکر کر دیا ہے، پس ان حالات کے پیش نظر ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حق میں صغر سنی کا اعتراض اٹھانا بالکل بے وزن ہے اور حق بات سے اعراض کرنے کے مترادف ہے۔ والحق احق ان یتبع۔

خلافت راشدہ کا دور

دورِ نبوت میں جو نماز تراویح کی صورتیں پیش آئیں، ان کو ہم نے گزشتہ اوراق میں بالاختصار درج کیا ہے اور اس کی تائید میں دلائل بقدر کفایت پیش کر دیئے ہیں۔

اس کے بعد خلفائے راشدین (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے ایام خلافت میں "مسئلہ تراویح" کے لیے جو عملی نظم قائم رہا' اس کو ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کو بغور ملاحظہ فرمائیں:

عہدِ صدیقی

جناب حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں نماز تراویح کے ادا کرنے کی سابقہ صورت ہی جاری رہی یعنی جس طرح مسجد نبوی میں مختلف مقامات پر الگ الگ اجتماعات کی صورت میں صلوٰۃ تراویح اہلِ اسلام ادا کرتے تھے۔

یا پھر بعض حضرات اپنے اپنے گھروں میں تراویح پڑھتے تھے' اس طرح صدیقی دور خلافت میں تراویح ادا کرنے کا عمل جاری رہا' لیکن اجتماعی شکل میں تراویح کو ادا نہیں کیا گیا۔

صدیقی خلافت کا دور قریباً دو سال تین ماہ کا تھا۔ اس میں یہی طریقہ قائم رہا اور عہد ہذا میں صرف دو رمضان المبارک گزرے تھے۔

عہدِ فاروقی

اس کے بعد فاروقی عہد خلافت ۱۳ھ سے شروع ہوا جو قریباً ساڑھے دس سال کے عرصہ پر محیط ہے۔ اس میں ۱۴ھ میں صلوۃ تراویح کے لیے "اجتماعی عمل" اختیار کیا گیا۔

مسئلہ ہذا کے متعلق ابتدائی مرحلہ کے کوائف میں محدثین نے ذکر کیا ہے کہ ایک صاحب (عبدالرحمٰن بن عبدالقاری) کہتے ہیں کہ عہد فاروقی میں ایک دفعہ میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی معیت میں مسجد نبوی کی طرف نکلا۔ دیکھا کہ لوگ متفرق صورت میں نمازیں ادا کر رہے ہیں۔ کوئی شخص اپنے طور پر نماز

پڑھ رہا ہے تو کوئی دوسروں کے ساتھ مل کر تراویح پڑھ رہا ہے۔ اس حالت کو دیکھ کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ ان لوگوں کو اگر ایک قاری کے خلف میں جمع کر دیا جائے تو افضل اور بہتر ہو گا۔

عبدالرحمٰن مذکور کہتے ہیں کہ پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو ایک امام کے خلف میں جمع کر دینے کا عزم کر لیا اور جناب ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اقتداء میں انہیں جمع کر دیا۔

دوسری شب میں پھر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مسجد نبوی میں آیا تو دیکھا کہ تمام نمازی ایک امام اور ایک قاری کے خلف میں مجتمعا نماز تراویح ادا کر رہے ہیں تو اس صورت کو دیکھ کر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ

نعمت البدعہ ھذہ۔ یعنی یہ نیا طریقہ بڑا عمدہ ہے۔

(مشکوۃ شریف ص۱۱۵ الفصل الثالث، بحوالہ البخاری، تحت قیام شہر رمضان)

ایک شبہ کا ازالہ

اس مقام میں بعض لوگوں کی جانب سے اعتراض کیا جاتا ہے کہ

(۱) تراویح کی نماز جناب عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایجاد کی۔

(۲) اور پھر جماعت تراویح کو "نعمت البدعہ ھذہ" سے تعبیر کیا، حالانکہ شریعت میں "کل بدعہ ضلالہ" ہے اور بدعت کو مذموم قرار دیا گیا ہے، وہ اچھی کیسے ہو سکتی ہے؟؟

ازالہ

اس اعتراض کے جواب کے لیے ذیل میں کلام پیش کیا جاتا ہے:

اعتراض میں معترض نے دو چیزیں ذکر کی ہیں:

(۱) ایک یہ ہے کہ صلوٰۃ تراویح کی ایجاد خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے

یعنی شرع کا فرمان نہیں ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ تراویح کی نماز کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بالکل ایجاد نہیں کیا بلکہ یہ تو سردار دو جہاں صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے (اللہ تعالیٰ کے حکم سے) جاری کی ہے اور امت کو ادا کرنے کا ارشاد فرمایا ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذکر شھر رمضان فقال شھر کتب اللہ علیکم صیامہ وسننت لکم قیامہ۔ (السنن لابن ماجہ، ص۹۵، تحت باب ماجاء فی قیام شہر رمضان، طبع نظامی دہلی)

یعنی جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے ماہ رمضان کا ذکر کیا اور فرمایا کہ رمضان وہ مہینہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں روزہ رکھنا تم پر واجب کیا ہے اور میں نے (اس کے حکم سے) اس ماہ میں تمہارے لیے رات کو قیام کرنے (یعنی تراویح ادا کرنے) کا طریقہ جاری کیا۔

اس حدیث نبوی سے واضح ہوگیا کہ نماز تراویح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایجاد نہیں ہے بلکہ ارشاد نبوی کے موافق ادا کی جاتی ہے۔

(۲) اور دوسرا اعتراض کہ تراویح کو "نعمہ البدعہ ھذہ" کہا اور بدعت شرعاً مذموم چیز ہے تو اس کے جواب میں اکابر علماء نے اپنے اپنے دور میں جوابات تحریر کیے ہیں جن سے شبہ ہذا زائل ہو جاتا ہے اور اعتراض ساقط ہو جاتا ہے۔ ذیل میں ان بیانات کی روشنی میں چند کلمات درج کیے جاتے ہیں۔

○ مطلب یہ ہے کہ ایک امام کے خلف میں لوگوں کو نماز تراویح کے لیے جمع کر دینے کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بدعت باعتبار لغت کے کہا ہے کیونکہ لغت میں نئی چیز کو یا نئے کام کو بدعت کہتے ہیں، یعنی یہ ایک جدید طریقہ ہے لیکن باعتبار شرع کے بدعت نہیں فرمایا۔ جو چیز شرعاً بدعت ہو، وہ مذموم ہے۔

اسی مقصد کو دوسرے الفاظ میں یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا

یہ فعل باعتبار شکل و صورت کے بدعت ہے مگر باعتبار حقیقت کے بدعت نہیں ہے کیونکہ یہ امر جناب اقدس صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی سنت قولی ہے، سنت فعلی ہے اور سنت تقریری بھی ہے۔ اور اس فعل پر دوام نہ فرمانا اس کے افتراض کے خوف سے ہوا تھا اور جبکہ انتقال نبوی ﷺ کے بعد یہ خشیت اور خوف نہیں رہا تو اس پر دوام کرنا صحیح ہے، بدعت نہیں ہے۔

مرقاۃ شرح مشکوۃ میں ہے کہ

(۱) انما سماها بدعه باعتبار صورتها فان هذا الاجتماع محدث بعده علیه الصلوه والسلام واما باعتبار الحقیقه فلیست بدعه لانه علیه السلام- انما امرهُم بصلاتها فی بیوتهم للعه هی خشیه الافتراض، الخ

(مرقات شرح مشکوۃ ص۱۸۶، ج۳، تحت قیام شهر رمضان)

(۲) اور حافظ الذہبی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف "المنتقی) میں اسی مقولہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

فسماه بدعه وما هو بالبدعه الشرعیه التی هی الضلاله اذ هی ما فعل بلا دلیل شرعی- ولو کان قیام رمضان جماعه قبیحا لابطله امیر المومنین علی وهو بالکوفه بل روی عنه انه قال نور الله علی عمر قبره کما نور علینا مساجدنا-

(المنتقی للذہبی"، ص۵۴۲، بحث ابتدع التراویح)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جو (اجتماعی عمل) کو بدعت کہا ہے تو یہ بدعت شرعی نہیں ہے جو گمراہی ہوتی ہے۔

اس وجہ سے کہ بلا دلیل شرعی یہ اجتماع اور یہ فعل نہیں کیا گیا۔ اگر رمضان المبارک میں اس طرح جماعت کا قیام قبیح ہوتا تو اس چیز کو امیرالمومنین حضرت علی

بن ابی طالب رضی اللہ عنہ باطل قرار دیتے، حالانکہ وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد میں کوفہ میں خلیفتہ المومنین اور حاکم وقت تھے، بلکہ ان سے اس مسئلہ پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حق میں یہ جملہ مروی ہے کہ "حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالٰی عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی قبر کو منور فرمائے جس طرح انہوں نے ہماری مساجد کو (اس اجتماعی عبادت سے) منور کر دیا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فعل و عمل جماعت تراویح کے "عدم بدعت" ہونے پر عمدہ قرینہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تراویح کے اس اجتماع کو اکابر خلفائے راشدین نے مستحسن قرار دیا ہے اور بدعت تصور نہیں کیا۔

○ اور جناب ابن تیمیہ رضی اللہ عنہ نے مذکورہ جملہ کو اپنی تصنیف "اقتضاء الصراط المستقیم" کے صفحہ ۲۷۶ پر بحث تراویح کے تحت مختصراً اس طرح واضح کیا ہے کہ

وهذه تسميه لغويه لا تسميه شرعيه۔	یعنی جماعت تراویح کو بدعت کہنا لغت کے لحاظ سے ہے، شرعی لحاظ سے نہیں ہے۔

علماء کرام کی ان صریحات و تشریحات کے پیش نظر مذکورہ شبہ اور اعتراض بالکلیتہ زائل ہو جاتا ہے۔

مذکورہ روایت جو مشکوٰۃ شریف سے بحوالہ بخاری پیش کی ہے اس میں تراویح کی رکعات کے متعلق تصریح موجود نہیں بلکہ جماعت تراویح کا مسئلہ اجمالاً مذکور ہے۔

اب ذیل میں فاروقی دور کے متعلق ان روایات کو ایک ترتیب سے درج کیا جاتا ہے جن میں رکعات تراویح کی تعداد کے متعلق تفصیل دستیاب ہوتی ہے۔

چنانچہ امام مالک رحمتہ اللہ علیہ نے الموطاء میں مسئلہ ہذا ذیل روایت میں ذکر کیا ہے۔

...... حدثنا مالك عن يزيد بن رومان انه قال كان

الناس يقومون في زمان عمر بن الخطاب في رمضان بثلاث وعشرين ركعه-

(۱) الموطاء الامام مالک" ص۴۰، طبع مجتبائی، دہلی، باب ما جاء فی قیام رمضان۔

(۲) کتاب التمہید لابن عبدالبر، ص۱۱۵ ج۸، جلد ثامن، طبع جدید مراکش۔

ابو عبداللہ محمد بن نصر المروزی نے اپنی تصنیف "قیام اللیل" میں مندرجہ ذیل عبارت میں یہی مسئلہ تحریر کیا ہے:

...... عن يزيد بن رومان كان الناس يقومون في زمان عمر بن الخطاب في رمضان بثلاث وعشرين ركعه-

(قیام اللیل و قیام رمضان و کتاب الوتر ص۱۵۷، طبع المکتبۃ الاثریۃ)

اور علامہ البیہقی نے اپنی تصنیف السنن الکبریٰ میں یزید بن رومان سے مذکورہ بالا روایت بالفاظہ اسی طرح درج کی ہے۔

(السنن الکبریٰ للبیہقی ص۴۹۶، جلد ثانی باب ماروی فی عدد رکعات القیام فی شہر رمضان، طبع دکن)

ان روایات کا مفہوم یہ ہے کہ عہدِ فاروقی میں لوگ تیئس (۲۳) رکعات نماز رمضان المبارک میں ادا کرتے تھے۔

مذکورہ روایات اگرچہ مرسل ہیں مگر ان کے متعلق کبار علماء نے یہ تصریح کر دی ہے کہ

رواه مالك واسناده مرسل قوی-	یعنی اگرچہ یہ روایت مرسل ہے لیکن یہ مرسل قوی ہے، ضعیف نہیں ہے۔

(آثار السنن للشیخ محمد بن علی النیموی ص۵۵، ج۲)

اور مرسلات امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے لیے عام ضابطہ علماء نے لکھا ہے کہ وہ اہلِ فن کے نزدیک صحیح اور مقبول و قابلِ عمل ہیں، ملاحظہ ہو۔

(کتاب توضیح و تلویح، الرکن الثانی، فصل فی الانقطاع)

چنانچہ سابقہ ہر سہ روایات سے یہ چیز ثابت ہوئی کہ عہد فاروقی میں رمضان شریف میں تیئیس (۲۳) رکعات نماز تراویح جماعت کے ساتھ ادا کی جاتی تھی اور اہلِ علم حضرات پر واضح ہے کہ ان میں بیس رکعات صلوٰۃ تراویح تھیں اور تین رکعات وتر کی نماز کے لیے تھیں۔

اب ہم اس کے بعد عام دوستوں کے لیے بیس عدد رکعات کی مزید وضاحت ثابت کرنے کی خاطر چند روایات پیش کرتے ہیں' ان میں مسئلہ ہذا کی پوری صراحت مروی ہے۔ اس میں کسی تشریح اور تاویل کی حاجت ہی نہیں اور محدثین کے نزدیک روایات درست ہیں اور قابلِ قبول ہیں۔

(۱) ابنِ ابی شیبہ نے اپنی تالیف "المصنف" میں ذکر کیا ہے کہ

...... حدثنا وکیع عن مالک بن انس عن یحیی بن سعیدان عمر بن الخطاب امر رجلا یصلی بھم عشرین رکعہ۔

(المصنف لابنِ ابی شیبہ ص ۳۹۳' جلد ۲' باب کم یصلی فی رمضان من رکعہ' طبع دکن)

(۲) محمد بن نصر المروزی نے اپنی کتاب "قیام اللیل" میں لکھا ہے کہ

...... قال محمد بن کعب القرظی کان الناس یصلون فی زمان عمر بن الخطاب فی رمضان عشرین رکعہ یطیلون فیھا القراہ ویوترون بثلاث۔

(قیام اللیل وقیام رمضان از محمد بن نصر المروزی ص ۱۵۷' طبع المکتبہ الاثریہ)

(۳) عن سائب بن یزید ایضا انھم کانو یقومون فی رمضان بعشرین رکعہ و یقراون بامئین من القرآن... فی زمان عمر بن الخطاب۔

(قیام اللیل وقیام رمضان محمد بن نصر المروزی ص ۱۵۷' طبع مکتبہ الاثریہ)

(۴) اور علامہ البیہقی نے السنن الکبریٰ میں درج کیا ہے کہ

......عن يزيد بن خصيفه عن سائب بن يزيد قال كانوا يقومون على عهد عمر بن الخطاب رضى الله عنه فى شهر رمضان بعشرين ركعه وكانوا يقراون بالمئين--- الخ-

(السنن الکبریٰ للبیہقی ص۴۹۶، جلد ثانی، باب ماروی فی عدد رکعات القیام فی شہر رمضان)

فائدہ

علامہ بیہقی کی اس روایت کے متعلق کبار علماء نے تصریح کی ہے کہ

قال النواوی فی الخلاصه اسناده صحیح-

(فتح القدیر شرح ہدایہ ص۳۳۴، ج۱، فصل فی قیام رمضان طبع مصر معہ عنایہ، حاشیہ مشکوۃ شریف ص۱۱۵، باب قیام شہر رمضان، الفصل الثالث)

○ اور شیخ النیموی نے آثار السنن ص۵۳ تا۵۵، جلد ثانی میں لکھا ہے کہ

......رواه البيهقى واسناد صحيح-

حاصل یہ ہے کہ علمائے فن نے مذکورہ البیہقی کی روایت عشرین رکعت والی کو اسناداً صحیح قرار دیا ہے۔ (ضعیف نہیں ہے)

خلاصہ

مندرجہ بالا ہر چہار عدد روایات کا مفہوم یہ ہے کہ

حضرت امیرالمومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں اہل اسلام تراویح کی نماز باجماعت بیس (۲۰) رکعات ادا کرتے تھے اور وتر تین رکعات میں پڑھتے تھے۔

اور اقتداء کرنے والوں میں ہاشمی حضرات سیدنا علی المرتضیٰ اور سیدنا عباس بن

عبدالمطلب وغیرہما کے علاوہ دیگر اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی شامل اور شریک ہوتے تھے۔

اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مستقل امام مقرر کیے ہوئے تھے۔ ان کو نماز تراویح پڑھانے کے لیے ارشاد فرماتے تھے (اور وہ بیس (۲۰) رکعات نماز تراویح پڑھاتے تھے)

تائید

مسئلہ مندرجہ بالا کی تائید میں کبار علماء کی طرف سے چند کلمات درج کرنا مفید ہیں، وہ ملاحظہ فرمائیں۔

فتاویٰ ابن تیمیہ میں تحریر ہے کہ

... فانه قد ثبت ان ابی بن کعب کان یقوم بالناس عشرین رکعه فی قیام رمضان ویوتر بثلاث۔ فرای کثیر من العلماان ذالک هوالسنه لانه اقامه بین المهاجرین والانصارولم ینکره منکر۔

یعنی بے شمار علماء کی یہ رائے ہے کہ (بیس (۲۰) رکعت نماز تراویح ادا کرنا) سُنّت ہے (بدعت نہیں) کیونکہ یہ عمل مہاجرین و انصار کے درمیان قائم ہوا اور کسی نے اس فعل پر انکار نہیں کیا۔ (مجموعہ فتاویٰ ابن تیمیہ ص ۱۱۲، جلد ۲۳، تحت ابحاث القنوت)

مختصر یہ ہے کہ یہ "اجتماعی عمل" خلافت راشدہ کے دور میں منعقد ہوا اور کسی مشہور صحابی کی طرف سے اس کے بدعت ہونے پر اعتراض و انکار نہیں پایا گیا۔ فلہذا یہ عمل صحیح ہے، خلاف سُنّت نہیں ہے۔

اسی طرح علامہ السیوطی رحمتہ اللہ علیہ اپنی تصنیف "الحاوی الفتاویٰ" میں لکھتے ہیں کہ

... وفی الموطاء وابی ابن

یعنی الموطاء لامام مالک" المصنف

شیبه والبیهقی عن عمر رضی الله عنه جمع الناس علی ابی بن کعب فکان یصلی بهم فی شهر رمضان عشرین رکعته- (الحاوی للفتاویٰ ص ۵۴، ج اول، کتاب الصلوة باب التراویح)

لابن ابی شیبہ اور السنن الکبریٰ للبیہقی تینوں کتب حدیث میں درج ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں لوگوں کو جمع کیا۔ پس وہ رمضان المبارک میں لوگوں کو بیس رکعات نماز (تراویح) پڑھاتے تھے۔

اور اس مقام میں حافظ الذہبیؒ نے مزید ایک بات یہ ذکر کی ہے کہ عہد فاروقی رضی اللہ عنہ میں ایک انصاری بزرگ معاذ بن الحارث القاری بھی نماز تراویح پڑھاتے تھے۔ ان کی کنیت ابو حکیمہ تھی اور عند البعض ابو حلیمہ تھی۔

...... ابو حکیمه معاذ بن الحارث القاری الانصاری الذی اقامه عمر یصلی بالناس التراویح-

(تاریخ الاسلام للذہبی ص ۳۵۸، جلد ثانی، تحت قصہ الحرہ طبع مصر)

مطلب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے عہد میں تراویح کے لیے متعدد امام تھے۔ ایک ابی بن کعب، دوسرے معاذ بن الحارث الانصاری وغیرہ تھے۔ یہ حضرات فاروقی ہدایات کے مطابق تراویح کی امامت کراتے تھے۔

اس مقام میں یہ ذکر کرنا نیز مفید ہے کہ عہد فاروقی میں تراویح کے لیے ایک تیسرے امام کا ذکر بھی محدثین نے کیا ہے اور وہ حضرت تمیم الداری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ بعض اوقات یہ بھی امام ہوتے تھے۔

فائدہ

تائیدات ہذا کے ذریعے واضح ہوگیا کہ عہد فاروقی والی روایات مذکورہ صحیح

ہیں، ان کو امت کے جمہور اکابر علماء نے اپنے اپنے مقام پر درست تسلیم کیا ہے۔

ایک دیگر شبہ کا ازالہ

بعض روایات حدیث میں مروی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رمضان المبارک میں گیارہ رکعت نماز ادا کرنے کا حکم فرمایا تھا۔ تو یہ روایت ان روایات کے برخلاف ہوئی جو گزشتہ صفحات میں پیش کی گئی ہیں اور ان میں بظاہر تعارض پایا جاتا ہے۔

اس شبہ کے ازالہ کے لیے تحریر کیا جاتا ہے کہ

روایات میں تعارض و تخالف کے لیے زمانہ واحد ہونا شرط ہے اور ان روایات میں زمانہ واحد نہیں بلکہ ان میں تقدیم و تاخیر پائی جاتی ہے۔

بصورت دیگر اگر اس بات سے صرف نظر کرلی جائے تاہم محدثین نے ان کے درمیان تطبیق کی صورت اس طرح بیان کی ہے کہ

بحوالہ البیہقی علامہ الزیلعی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

قال البیھقی ویجمع بین الروایتین بانھم قاموا باحدی عشرہ رکعہ ثم قاموا العشرین واوتروا بثلاث۔

(السنن الکبریٰ للبیہقی، ص۴۹۶، ثانی باب، فی عدد رکعات قیام شھر رمضان، نصب الرایہ الزیلعی ص۱۵۴ جلد ثانی، فصل فی قیام رمضان، طبع مجلس علمی)

(۳) ...... وفی الموطاء روایہ باحدی عشرہ وجمع بینھما بانہ وقع اولا ثم استقر الامر علی عشرین فانہ المتوارث۔

(مرقات شرح مشکوٰۃ ص۱۹۴ ج۳ الفصل الثالث، باب قیام شہر رمضان، تحت روایت علن الاعرج، طبع ملتان)

مطلب یہ ہے کہ ان ہر دو روایات میں تطبیق اس طرح ہے کہ پہلے پہلے گیارہ رکعات ادا کرنی شروع کی تھیں، لیکن بعد میں بیس رکعات پڑھنے پر اتفاق و استقرار ہوا، پھر جمہور صحابہ کرام اور تابعین میں یہی عمل متوارث چلا آ رہا ہے (اور وتر تین رکعات ادا کرتے تھے)



عہدِ عثمانی میں تراویح کا اہتمام

سابقہ صفحات میں عہد فاروقی (جو قریباً ساڑھے دس سال کے عرصہ پر محیط تھا) میں مسئلہ تراویح کا عمل مختصراً بیان کیا ہے۔ اب عہد عثمانی (جو قریباً بارہ دن کم بارہ سال ہے) میں تراویح کے متعلق جو نظم قائم تھا، اس کو بالاختصار پیش کیا جاتا ہے:

(۱) خلافت عثمانی کے دور میں علماء نے لکھا ہے کہ بعض دفعہ خود حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نوافل (تراویح) کی جماعت کراتے تھے۔

چنانچہ قتادہ رضی اللہ عنہ نے حسن رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ایک بار حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہمیں بیس راتیں (تراویح) کی امامت کرائی اور نماز پڑھائی پھر (بقایا راتوں میں) رک گئے اور تشریف نہیں لائے۔

بعض لوگ کہنے لگے کہ حضرت موصوف اپنی عبادت میں مصروف ہو گئے ہیں، پھر ابو حلیمہ معاذ القاری نے لوگوں کی امامت کرائی اور ابو حلیمہ القاری نماز میں دعائے قنوت (نازلہ) پڑھتے تھے۔

... قتادہ عن الحسن امنا علی بن ابی طالب فی زمن عثمان عشرین لیلہ ثم احتبس فقال بعضھم قد تفرغ لنفسہ ثم امھم ابو حلیمہ معاذ القاری فکان یقنت۔

(کتاب قیام اللیل و قیام رمضان ص ۱۵۵ باب صلوٰۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم جماعۃ لیلا۔۔۔ الخ)

(۲) اس طرح عہد عثمانی میں تراویح ادا کرنے کا اہتمام کیا جاتا تھا اور بعض ائمہ

حضرات اس نماز میں طویل قرات کرتے تھے اور جن سورتوں میں سو سو آیات ہیں، وہ سورتیں تلاوت تراویح میں پڑھتے تھے، پھر اس صورت حال کی وجہ سے بعض کمزور حضرات اپنے ضعف کی بنا پر لاٹھیوں پر (سہارا) لینے پر مجبور ہو جاتے۔ البیہقی نے السنن میں یہ چیز بیان کی ہے:

...... قال (السائب بن يزيد) وكانو يقراون بالمئين وكانو يتوكئون على عصيتهم في عهد عثمان بن عفان رضي الله عنه من شده القيام-

(السنن الکبریٰ للبیہقی، ص۴۹۶، ج۲ باب ماروی فی عدد رکعات القیام فی شہر رمضان، مرقات شرح مشکوٰۃ لعلی القاری، ص۱۹۲ ج۳، باب قیام شہر رمضان، الفصل الثالث، طبع ملتان، آثار السنن للشیخ محمد بن علی النیموی ص۳۳، ۵۵، باب التراویح۔عشرین رکعۃ)

خواتین کا شمول

(۳) تراویح ادا کرنے کا اجتماعی معمول مردوں میں عہد فاروقی سے جاری تھا۔ اسی طرح عہد خلافت عمر رضی اللہ عنہ میں ہی خواتین کے لیے ایک صاحب تابعی (سلیمان بن ابی حثمہ) کو امام مقرر کیا گیا۔ یہ بزرگ خواتین کو مسجد کے ایک طرف چبوترہ پر نماز تراویح پڑھاتے تھے (اور وہیں پردہ کا انتظام کر لیا جاتا تھا)

پھر جب عہد عثمانی آیا تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرمان کے مطابق مردوں اور عورتوں کو ایک قاری (سلیمان بن ابی حثمہ) کی اقتدا میں جمع کر دیا گیا (اور یہ بھی باپردہ انتظام تھا)--- جب نماز ختم ہوتی تو خواتین کو مسجد سے خارج ہونے سے روک دیا جاتا حتیٰ کہ تمام مرد پہلے جاتے تھے، پھر اس کے بعد خواتین کو مسجد سے نکلنے کی اجازت ہوتی تھی۔ اس چیز کی تفصیل طبقات ابن سعد کی درج ذیل روایت میں موجود ہے:

...... ان ابی بن کعب و تمیما الداری کانا یقومان فی مقام النبی علیہ السلام یصلیان بالرجال وان سلیمان بن ابی حثمہ کان یقوم بالنساء فی رحبہ المسجد فلما کان عثمان بن عفان جمع الرجال والنساء علی قاری واحد سلیمان بن حثمہ وکان یامر بالنساء فیحسن حتی یمضی الرجال ثم یرسلن۔

(۱) طبقات ابن سعد ص۱۷، ج۵، تحت سلیمان بن ابی حثمہ، طبع لیدن۔

(۲) مرقات شرح مشکوۃ لعلی القاری ص۱۹۳ ج۳، باب قیام شہر رمضان، الفصل الثالث، طبع ملتان۔

مندرجہ بالا حوالہ جات سے واضح طور پر ثابت ہوا کہ

تراویح ادا کرنے کا "اجتماعی عمل" خلافت عثمانی میں بھی جاری تھا اور بعض دفعہ اکابرین میں سے خود حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہ نفس نفیس تراویح کی امامت فرمایا کرتے تھے اور بیس رکعات ادا کرتے تھے اور مرد و زن اس اجتماعی عمل میں شامل ہوتے تھے اور دیگر ائمہ بھی بالالتزام ایک نظم کے مطابق نماز پڑھایا کرتے تھے۔ اس طریقہ کو کسی مشہور صحابی نے بدعت نہیں کہا اور اس پر نکیر نہیں فرمائی۔

عہدِ مرتضوی رضی اللہ عنہ میں تراویح کا انتظام

دور عثمانی کے بعد عہد علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ (جو قریباً چار سال نو ماہ کے عرصہ پر مشتمل تھا) اس میں بھی نماز تراویح کا باقاعدہ اہتمام ہوتا تھا۔

محدثین اور کبار علماء نے اس مسئلہ کی تفصیلات نقل کی ہیں۔ ذیل میں چند ایک حوالہ جات پیش کیے جاتے ہیں۔ ان میں مسئلہ تراویح کے متعلق وضاحت دستیاب ہوتی ہے۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے ائمہ اور شاگردوں کو نماز تراویح کی ادائیگی کے لیے ہدایات جاری فرماتے تھے۔

(۱) چنانچہ ابوالحسناء ذکر کرتے ہیں کہ جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو ارشاد فرمایا کہ رمضان شریف میں بیس رکعات نماز تراویح لوگوں کو پڑھائیں۔

...... حدثنا وکیع عن حسن بن صالح عن عمرو بن قیس عن ابی الحسناء ان علیا امر رجلا یصلی بھم فی رمضان عشرین رکعه۔

(المصنف لابن ابی شیبہ ص ۳۹۳ ج ۲ تحت باب کم یصلی فی رمضان من رکعۃ، کتاب التمہید لابن عبدالبر ص ۱۱۵ جلد ثامن، تحت بحث ہذا، طبع جدید)

(۲) اسی طرح عرفجہ الثقفی ذکر کرتے ہیں کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ لوگوں کو قیام رمضان کا امر فرمایا کرتے تھے اور مردوں کے لیے ایک امام مقرر فرمایا اور عورتوں (کو نماز پڑھانے) کے لیے مجھے امام مقرر کرتے ہوئے فرمایا کہ میں خواتین کے لیے نماز (تراویح) کی امامت کروں۔

......عن عمر الثقفی عن عرفجه الثقفی ان علیا کان یامر الناس بالقیام فی شهر رمضان ویجعل الرجال اماما وللنساء امام فقال فامرنی فاممت النساء۔

(المصنف لعبد الرزاق ص ۱۵۲ ج ۴ روایت نمبر ۵۱۲۵، المنتقی للذہبی، ص ۵۴۲، مختصر منہاج السنہ لابن تیمیہ)

(۳) ابو عبدالرحمٰن السلمی نقل کرتے ہیں کہ آپ نے رمضان المبارک میں قاریوں کو بلوایا اور ان میں سے ایک شخص کو حکم فرمایا کہ بیس رکعات نماز (تراویح) لوگوں کو پڑھائیں اور خود حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ لوگوں کو وتر پڑھاتے تھے۔

...عن عطا بن السائب عن ابی عبدالرحمن السلمی

عن علی رضی اللہ عنہ قال دعا القراء فی رمضان فامر منهم رجلا یصلی بالناس عشرین رکعه وکان علی رضی اللہ عنہ یوتربهم- وروی ذالک من وجه آخر من علی-

(۱) السنن الکبریٰ للبیہقی ص۴۹۶، ۴۹۷، جلد ۲، باب ماروی فی عدد رکعات القیام فی شہر رمضان، طبع حیدر آباد، المنتقی للذہبی" ص۴۲، طبع مصر)

اب ذیل میں ان روایات کو پیش کیا جاتا ہے جو حضرت علی المرتضیٰ کے بلاواسطہ شاگردوں سے مروی ہیں اور ان میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے شاگردوں کا "دائمی عمل" ذکر کیا گیا ہے۔

یہ وہ عمل ہے جو انہوں نے جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ہدایات کے مطابق ہمیشہ سرانجام دیا۔ اور ان کے اس طریقہ کار پر اس دور میں کسی نے خلاف سنت ہونے کا اعتراض وارد نہیں کیا۔

تنبیہ

ہماری کتاب سیرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ میں فقہی مسائل کی بحث میں بھی یہ مسئلہ درج ہو چکا ہے۔

(۱) حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشہور شاگرد سوید بن غفلہ ہیں۔ یہ کبار تابعین میں سے ثقہ شخصیت ہیں اور ان کے متعلق علماء نے لکھا ہے کہ جس روز جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دفن ہوا، اسی روز یہ صاحب مدینہ منورہ پہنچے تھے۔

ان کے شاگرد ابوالحصیب کہتے ہیں کہ جناب سوید بن غفلۃ رمضان المبارک میں ہمیں تراویح کی نماز پڑھایا کرتے تھے اور وہ نماز پانچ ترویحوں کے ساتھ تمام کرتے تھے (اور ہر چار رکعت کے بعد کچھ دیر بیٹھنے کو ترویحہ کہا جاتا ہے) اس صورت میں تراویح بیس رکعت میں ادا ہوتی ہے۔

...انباء ابوالخصیب قال کان یئومنا سوید بن غفلہ فی رمضان فیصلی خمس ترویحات عشرین رکعہ۔

(السنن الکبریٰ للبیہقی ص۴۹۶، ج۲ باب ماروی فی عدد رکعات القیام فی شہر رمضان)

(۲) اسی طرح علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگردوں میں سے ایک شاگرد شتیر بن شکل ذکر کرتے ہیں کہ وہ رمضان شریف میں بیس رکعات کے ساتھ لوگوں کی امامت کرتے تھے اور تین رکعات کے ساتھ وتر پڑھایا کرتے تھے۔

......رویناعن شتیر بن شکل وکان من اصحاب علی رضی اللہ عنہ انہ کان یومھم فی شھر رمضان بعشرین رکعہ ویوتر بثلاث۔

(السنن الکبریٰ للبیہقی ص۴۹۶، ج۲ باب ماروی فی عدد رکعات القیام فی شہر رمضان)

حاصل کلام

سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں نماز تراویح کے متعلق جو اہتمام اور انتظام ہوتا تھا اور ان کے شاگرد حضرات جس طریق کار پر ہمیشہ کاربند رہتے تھے، اس کا ایک مختصر سا نمونہ مندرجات بالا میں ذکر کر دیا ہے۔

یہاں سے یہ مسئلہ واضح ہوگیا کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں اور ان کے شاگردوں کے دور میں نماز تراویح اجتماعی طور پر بیس رکعات کے ساتھ اور وتر تین رکعات کے ساتھ باجماعت ادا کی جاتے تھے اور ان کے اس "اجتماعی عمل" پر اہل اسلام کاربند تھے۔ مختصر یہ ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ خلافت میں نہ تو تراویح کو ترک کیا گیا اور نہ ہی اس کی بیس رکعات تعداد میں کمی کی گئی۔

گزشتہ سطور میں خلافت راشدہ کے تین ادوار عہد فاروقی، عہد عثمانی، عہد علوی میں تراویح ادا کرنے کی کیفیت مختصراً ذکر کی گئی ہے۔ یہ مدت کم و بیش پچیس

برس پر مشتمل ہے۔ اس تمام مدت میں اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور کبار تابعین کا "دوامی عمل" بیس رکعات ادا کرنے کا پایا جاتا ہے۔

پھر اس دور میں صحابہ یا تابعین میں سے کسی نامور شخصیت نے اس معمول پر بدعت ہونے شبہ نہیں پیدا کیا اور اس عمل کو خلاف سُنّت قرار دے کر متروک نہیں کیا۔ فلہذا تراویح کے مسئلہ پر تمام ادوار میں اہلِ اسلام کا تعامل گمراہی پر اجتماع نہیں ہے اور نہ ہی یہ بدعت ہے بلکہ مسنون طریقہ کے موافق ہے۔

بفرمانِ رسالت

خلفاء راشدین کی اتباع کی تاکید

اب ہم بیس رکعات نماز تراویح کے اجتماعی عمل کے صحیح ہونے کو ایک دیگر طریقہ سے پیش کرتے ہیں اور اس مسئلہ میں فرمان نبوت سے تائید حاصل کرتے ہیں۔

وہ اس طرح ہے کہ جناب سید دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کو ارشاد فرمایا ہے کہ لوگو! میری سنت اور طریقہ کو لازم پکڑو اور میرے ہدایت یافتہ خلفاء کی سُنّت کو مضبوطی سے پکڑو، ان کی پیروی کرو اور ان کے طریقہ پر خوب جے رہو۔۔۔ الخ۔

اس فرمانِ رسالت کو متعدد محدثین نے اپنے اپنے اسناد کے ساتھ اپنی تالیفات میں درج کیا ہے اور اہلِ علم حضرات ان مقامات سے بخوبی واقف ہیں لیکن عام دوستوں کے اطمینان کی خاطر مذکورہ روایات کو ہم کتب احادیث سے نقل کرتے ہیں۔

(۱) چنانچہ مشہور محدث محمد بن نصر المروزی (المتوفی ۲۹۴ء) نے "کتاب السنہ" میں بالفاظ ذیل یہ روایت ذکر کی ہے۔

...عن عرباض بن ساریہ الفزاری وکان من الباکین

قال صلی بنا رسول الله صلی الله علیه وسلم صلاه الغداه- فاقبل علینا فوعظنا موعظه بلیغه... فانه من یعیش منکم فسیری اختلافا کثیرا فعلیکم بسنتی وسنه الخلفاء الراشدین المهدیین من بعدی... الخ-

(کتاب السنہ لمحمد بن نصر المروزی ص۲۱ مطبوعہ ریاض، سعودی عرب)

(۲) دوسری کتاب مشکوٰۃ شریف میں یہ روایت بہ عبارت ذیل درج ہے:

...عن عرباض بن ساریه قال صلی بنا رسول الله صلی الله علیه وسلم ذات یوم ثم اقبل علینا بوجهه... فعلیکم بسنتی وسنه الخلفاء الراشدین المهدیین تمسکوا بها وعضوا علیها بالنواجذ... الخ رواه احمد و ابوداود والترمذی وابن ماجه-

(مشکوٰۃ شریف ص۲۹-۳۰ باب الاعتصام بالکتاب والسنہ، الفصل الثانی، طبع نور محمد، دہلی)

مذکورہ بالا روایت مضمون ہذا کے ساتھ مقامات ذیل میں بھی مروی ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) السنن للدارمی ص۲۶ باب اتباع السنہ، طبع نظامی کانپوری۔

(۴) المستدرک للحاکم ص۹۶ جلد اول کتاب العلم، طبع اول، دکن۔

(۵) السنن الکبریٰ للبیہقی ص ۱۱۴ جلد عاشر، طبع اول، دکن۔

(۶) موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان لنور الدین الہیثمی ص۵۶ روایت نمبر ۱۰۲ تحت کتاب العلم باب اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

مندرجہ روایات کا خلاصہ اور مفہوم وہی ہے جو سطورِ بالا میں تحریر کر دیا گیا ہے، یعنی جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا جس میں دیگر امور کے علاوہ یہ فرمان دیا کہ میرے بعد اختلافات دیکھے جائیں گے تو اس وقت تم پر لازم ہے کہ میری سُنّت پر عمل کرو اور میرے بعد خلفاء راشدین کے طریقے کے

ساتھ تمسک کرو اور دانتوں کے ساتھ اسے مضبوطی سے پکڑو اور ترک نہ کرو۔ (یعنی سختی کے ساتھ اس پر کاربند رہو)

پھر اس کے بعد مزید برآں حضرات شیخین (سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ) کی اتباع و اقتدا کے متعلق خصوصی ارشادات نبوت بھی پائے جاتے ہیں اور وہ روایات عند المحدثین صحیح ہیں۔

ان میں سے چند ایک مرویات ذیل میں بغور ملاحظہ فرمائیں:

عن حذیفہ قال کنا جلوسا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال انی لاادری ما قدر بقائی فیکم اقتدوا بالذین من بعدی وارشار الی ابی بکر و عمر... الخ۔

(المصنف لابن ابی شیبہ ص۵۶۹، ج ۱۴، روایت نمبر ۱۸۸۹۵، کتاب المغازی، طبع کراچی)

(۲) اور ترمذی شریف میں یہ روایت بہ عبارت ذیل مذکور ہے:

... عن حذیفہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر و عمر۔

(ترمذی شریف ص۲۰۷، جلد ثانی، باب مناقب ابی بکر الصدیق، طبع مجتبائی دہلی)

(۳) جامع مسانید الامام الاعظم ص۲۲۶، جلد اول، للقاضی ابوالموئد الخوارزمی، طبع دکن۔

مذکورہ بالا روایت حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی تھی، اب ذیل میں اسی مضمون کی روایت جناب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کی جاتی ہے:

... عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اقتدوا بالذین من بعد ابوبکر و عمر۔

(المسند الامام ابی حنیفہ ص۱۷۲، باب الفضائل والشمائل، طبع، عقود الجواہر المنیفہ ص۱۳۱، جلد اول، بیان الخبر الدال علی تقدیم ابی بکر علی وغیرہ)

روایات مذکورہ بالا کا مفہوم یہ ہے کہ جناب حذیفہ بن الیمان اور جناب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم دونوں حضرات ذکر کرتے ہیں کہ جناب سردار دوعالم صلی اللہ علیہ و آلہٖ و سلم نے ایک موقعہ پر ارشاد فرمایا کہ میرے بعد ابوبکرو عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اقتدا و اتباع کرنا... الخ۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان فرمودات رسالت میں رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہٖ و سلم کے خلفاء راشدین اور خصوصاً شیخین حضرات حضرت ابوبکرالصدیق و حضرت عمرفاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اتباع و تابعداری کرنے کے متعلق تاکیدی حکم موجود ہے۔

اور ان میں سے تینوں خلفاء راشدین بیس رکعات نماز تراویح باجماعت ادا کرتے رہے ہیں اور ان کی ہدایات کے تحت ان کے عہد میں اس طریقہ پر دواماً عمل ہوتا رہا ہے۔

فلہذا مسئلہ ہذا میں ان خلفاء حضرات کی اقتدا کرنا بفرمانِ نبوت لازم ہے اور یہ طریقہ شریعت محمدی کے عین مطابق ہے اور خلاف سنت نہیں ہے بلکہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ و آلہٖ و سلم کے فرمان کی صحیح اطاعت ہے۔

مشاہیر صحابہ کرامؓ کا تعامل

سابقہ سطور میں تراویح کے متعلق خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کا طریق کار بالاختصار ذکر کیا گیا ہے۔ اب مسئلہ تراویح کے متعلق مزید چند ایک اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دوامی عمل ذکر کیا جاتا ہے، جس سے تراویح کی بیس رکعات کا مسئلہ واضح ہوتا ہے۔

ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا عمل

محدثین نے لکھا ہے کہ جناب ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ طیبہ میں لوگوں کو رمضان شریف میں بیس رکعات نماز تراویح پڑھایا کرتے تھے اور وتر تین

رکعت میں ادا کرتے تھے۔ روایت کے الفاظ سے یہ ان کا دوامی معمول واضح ہوتا ہے، چنانچہ ابنِ ابی شیبہ ذکر کرتے ہیں کہ

... کان ابی بن کعب یصلی بالناس فی رمضان بالمدینہ عشرین رکعہ ویوتر بثلاث۔

(المصنف لابن ابی شیبہ ص ۳۹۳، طبع حیدر آباد دکن، باب ۔ صلی فی رمضان من رکعہ)

روایت ہذا سے معلوم ہوا کہ مدینہ شریف میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہمیشہ رمضان شریف میں بیس رکعات (نماز تراویح) اور تین رکعات میں وتر ادا کیا کرتے تھے۔

ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کا معمول

اس کے بعد جناب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تراویح کے متعلق طریق کار ذکر کیا جاتا ہے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ صحابی ہیں جن کے متعلق محدثین نے لکھا ہے کہ

...وکان اقرب الناس دلا وسمتا وھدیا برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (مشکوۃ شریف ص ۵۷۴، الفصل الاول، جامع المناقب، بحوالہ بخاری)

یعنی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ باعتبار طریقہ، میانہ روی اور حسن سیرت کے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیادہ قریب تھے۔

نیز جناب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے حق میں فرمانِ نبوت یہ بھی ہے کہ

...وتمسکوا بعھد ابن مسعود۔

یعنی ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کے عہد اور وصیت کے ساتھ تمسک کرو۔

(ترمذی شریف ص ۵۴۲، تحت باب المناقب، مناقب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، طبع قدیم لکھنؤ)

ان فرمودات کی روشنی میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا اتباع سنت کے سلسلہ میں مقام و مرتبہ واضح ہوگیا اور سیرت نبوی کے ساتھ ان کا شغف ظاہر ہوا۔

مسئلہ تراویح کے سلسلہ میں محدثین نے جناب ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے متعلق تحریر کیا ہے کہ

...كان عبدالله بن مسعود يصلي عشرين ركعه ويوتر بثلاث...الخ (قیام اللیل وقیام رمضان للمروزی ص۱۵۷، ۱۵۸، طبع مکتبہ اثریہ، شیخوپورہ)

یعنی جناب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیس رکعات (تراویح) پڑھتے تھے اور وتر تین رکعات میں ادا کرتے تھے، یہ ان کا دائمی معمول تھا۔

روایات ہذا کے ذریعے یہ چیز عیاں ہوگئی ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو بیس رکعات تراویح ادا کرنے کا عمل جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محفوظ تھا اسی لیے آنموصوف اس کا التزام کیے ہوئے تھے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا شرعی مسائل میں طریق کار

جناب عبداللہ بن عباس ہاشمی رضی اللہ تعالیٰ سے جب کوئی شخص مسئلہ دریافت کرتا تو اس کا حکم اگر کتاب اللہ میں موجود ہوتا تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے اور اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ میں نہیں ہے اور سنت نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پایا جاتا تو سنت نبوی کے مطابق قول کرتے۔ اور اگر وہ مسئلہ نہ تو کتاب اللہ میں ہوتا اور نہ ہی سنت نبوت میں پایا جاتا اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے فرمودات میں پایا جاتا تو آنموصوف ان حضرات کے قول کے مطابق عمل کرتے۔ اور اگر مذکورہ بالا تینوں صورتیں موجود نہ ہوتیں تو پھر اپنی مجتہدانہ رائے پر عمل کرتے تھے۔

......عن عبدالله بن ابي يزيد قال سمعت عبدالله بن

عباس رضی اللہ عنہما انا سئل عن شیئ ھو فی کتاب اللہ قال بہ وان لم یکن فی کتاب اللہ وقالہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال بہ وان لم یکن فی کتاب اللہ ولم یقلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقالہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما قال بہ والا اجتہد رایہ۔

(السنن الکبریٰ للبیہقی ص۱۱۵ ج۱۰ کتاب آداب القاضی، طبع قدیم، دکن)

روایت بالا کا روشنی میں معلوم ہوا کہ جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی بیس رکعات نماز تراویح کے قائل تھے اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کا یہ فیصلہ شدہ عمل ہے کہ بیس رکعات نماز تراویح باجماعت پڑھی جاتی تھی اور ابن عباس رضی اللہ عنہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق عمل کرتے اور اس کو حجت شرعی سمجھتے تھے۔

فلہذا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بھی بیس رکعات تراویح با جماعت کا قول کرتے اور اسے صحیح عمل قرار دیتے تھے، اس لیے کہ یہ مسئلہ فاروقی عہد کا فیصلہ شدہ امر ہے جس کو وہ حجت سمجھتے تھے۔

تنبیہہ

سابقہ صفحات یعنی عہد نبوت کی مرویات میں جناب ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بیس رکعات تراویح کی مرفوع روایت نقل کی گئی ہے، اس روایت کے بعض رواۃ پر اگرچہ کلام پائی گئی ہے لیکن دیگر قرائن کے ساتھ موید ہے اور وہ اپنے مقام پر درست ہے۔ اب اکابر صحابہ کرام کے تعامل اور ان کے طریقہ کار کے سلسلہ میں یہ علامہ البیہقی کی روایت ذکر کی ہے اور اس سے جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے طرز عمل کے ذریعہ مسئلہ تراویح بیس رکعات ادا کرنے کی تائید حاصل کرنا مقصود ہے اور اسی ضرورت کے تحت یہ روایت نقل کی گئی ہے۔

امہات المومنینؓ کا طرزِ عمل

اکابر محدثین اور فقہاء نے اپنی معروف تالیفات میں یہ مسئلہ ذکر کیا ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تراویح کے متعلق یہ صورت اختیار کرتی تھیں کہ آنموصوفہ رضی اللہ عنہا رمضان المبارک میں خواتین کو نوافل کی امامت کرایا کرتی تھیں اور ادائیگی نماز کی یہ صورت ہوتی تھی کہ آں محترمہ رضی اللہ عنہا صف کے وسط میں (تھوڑا آگے) کھڑے ہو کر تراویح کی نماز پڑھاتی تھیں۔ یہی مسئلہ اکابر فقہاء کی ذیل کتب میں مذکور ہے:

...... عن ابی حنیفه عن حماد بن ابراهیم عن عائشه رضی الله عنها انها کانت توم النساء فی رمضان تطوعا و تقوم فی وسط الصف۔

(کتاب الآثار لامام ابی یوسف ؒ ص ۴۱، روایت نمبر ۲۱۲، طبع بیروت، لبنان، کتاب الآثار الامام محمدؒ ص ۴۳، باب المراۃ توم النساء و کیف تجلس فی الصلوۃ قدیم طبع انوار محمدی، لکھنؤ)

(۲) محدثین نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ایک غلام ذکوان تھا اس کی کنیت ابو عمرو تھی اور وہ ام المومنین صدیقہ رضی اللہ عنہا کا حاجب (دربان) بھی تھا۔ اسے آنموصوفہ رضی اللہ عنہا نے فرمان دے رکھا تھا کہ تو میری وفات کے بعد آزاد ہے اور ذکوان ایک خصوصی خدمت یہ بھی بجا لاتا تھا کہ رمضان المبارک میں ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو تراویح پڑھاتا تھا۔

امام مالکؒ نے اپنے موطا میں یہی چیز بہ عبارت ذیل درج کی ہے:

...... مالك بن هشام بن عروه عن ابیه ان ذکوان ابا عمرو وکان عبدا لعائشه زوج النبی صلی الله علیه وسلم فاعتقته عن دبر منها یقوم یقرالها فی رمضان۔

(موطا امام مالکؒ، ص ۹۹، طبع کراچی نور محمدی، باب ما جاء فی قیام رمضان)

(۴) اور کبار فقہاء نے امہات المومنین کی تراویح کی ادائیگی کے متعلق یہ تصریح کی ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنے غلام ذکوان کی اقتدا میں نماز تراویح ادا کیا کرتی تھیں۔ اور ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نماز تراویح عورتوں کی جماعت کے ساتھ ادا کرتی تھیں اور ان کی خادمہ ام الحسن البصری جماعت کرایا کرتی تھیں۔

یہی چیز فتاویٰ قاضی خان میں بالفاظ ذیل مذکور ہے:

... واقامها ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم نحو عائشہ وام سلمہ رضی اللہ عنہن خلف ذکوان وام سلمہ رضی اللہ عنہا بجماعہ النساء امتها مولاتها ام الحسن البصری رضی اللہ عنہا وکانت هی فی صفهن۔

(فتاویٰ قاضی خان علی الہندیہ، ص ۲۱۳، ج اول باب التراویح، طبع قدیم، مصر)

مختصر یہ ہے کہ ازواج مطہرات کا یہ طرز عمل رمضان المبارک میں جاری رہتا تھا اور یہ معمول جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور ہدایت کے تحت تھا، ان کے خلاف ہرگز نہیں تھا۔

گزشتہ اوراق میں ہم نے مسئلہ تراویح کے متعلق مشاہیر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کا دوامی عمل ذکر کیا ہے۔ اور ان حضرات کا کسی شرعی مسئلہ میں اتفاق کر لینا اور اس کو بالاتفاق معمول بنا لینا مستقل "شرعی دلیل" اور "حجت قاطعہ" کا درجہ رکھتا ہے۔

چنانچہ اسی چیز کو کبار علماء نے بطور قاعدہ کے مندرجہ ذیل عبارت میں پیش کیا ہے:

"قاعدہ" التوارث والتعامل ھو معظم الدین۔ یعنی اذا ثبت تعامل الصحابہ بامر فھو حجہ قاطعہ وسنہ ثابتہ۔ لا یمکن دفعھا۔

(فیض الباری علی صحیح البخاری للحدیث الکبیر مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری"

ص ۲۵۴ ج ۲ طبع مجلس علمی ڈابھیل)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شرعی مسئلے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا توارث اور تعامل پایا جانا یہ دین میں عظیم امر ہے یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک معاملہ میں جب تعامل ہو جائے تو وہ حجت قاطعہ ہے اور ثابت شدہ سنت ہے' اس کو رد کرنا ممکن نہیں اور اسے ناقابل عمل نہیں قرار دیا جا سکتا۔

اجماع سکوتی

پھر یہاں یہ چیز بھی پائی گئی ہے کہ اس دور کی کسی مشہور شخصیت نے بیس رکعات نماز تراویح کے "اجتماعی عمل" پر اعتراض نہیں کیا اور اسے خلاف سنت قرار نہیں دیا۔

پس اس بنا پر اس امر کو "اجماع سکوتی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اور مسئلہ ہذا کے اثبات کے لیے جہاں دیگر دلائل و شواہد پیش کیے جاتے ہیں' وہاں اس دور میں "اجماع سکوتی" بھی اس مسئلہ میں مستقل شاہد کی حیثیت رکھتا ہے۔

حضرات تابعین، تبع تابعین و دیگر کبار علماء کے فرمودات

اس سے پہلے صحابہ کرام کے تراویح کے متعلق معمولات ایک ترتیب سے ذکر کئے ہیں اس کے بعد ذیل میں مشاہیر تابعین اور تبع تابعین کے فرمودات کو اختصاراً پیش کیا جاتا ہے۔

جناب ابراہیم النخعیؒ

جناب ابراہیم النخعی رحمتہ اللہ تعالیٰ کبار تابعین میں سے ہیں اور ان کے مرسلات عند الفقہاء مقبول ہیں اور محدثین اور فقہاء نے ان کا مندرجہ ذیل قول

نقل کیا ہے۔

...عن ابراهيم بن يزيد (النخعى) ان الناس كانوا يصلون خمس ترويحات فى رمضان۔	یعنی ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کے دور میں اہلِ اسلام رمضان شریف میں پانچ ترویحوں کے ساتھ نماز تراویح ادا کرتے تھے۔

(کتاب الآثار الامام ابی یوسف" ص۴۱، روایت نمبر۲۱۱، طبع بیروت)

اور فقہ کی اصطلاح میں ہر چار رکعات نماز تراویح ادا کرنے کے بعد قلیل وقت کے لیے ٹھہر جانے کو ترویحہ کہا جاتا ہے اور پانچ ترویحہ کی صورت میں بیس رکعات نماز تراویح تمام ہو جاتی ہیں۔

جناب عطاء بن رباحؒ

جناب عطاء بن رباحؒ مشہور تابعی کا قول اکابر محدثین نے بہ عبارت ذیل ذکر کیا ہے:

......عن عطاء قال ادركت الناس وهم يصلون ثلاثه وعشرين ركعه بالوتر۔

(المصنف لابنِ ابی شیبہ ص۳۹۳، ج۲، تحت باب کم یصلی فی رمضان من رکعہ، الشیخ النیموی نے آثار السنن ص۵۵، جلد ثانی پر مذکورہ بالا روایت درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اسنادہ حسن" طبع دکن)

یعنی جناب عطاء بن رباح رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے اہلِ اسلام کو اس طرح پایا ہے کہ وہ لوگ (رمضان شریف میں) تیئس (۲۳) رکعات نماز تراویح وتروں سمیت ادا کرتے تھے۔

مطلب یہ ہے کہ بیس رکعات نماز تراویح ہوتی تھی اور تین رکعات میں وتر ادا کرتے تھے۔

جناب عطاء بن رباح رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے دور کے اہلِ اسلام کا معمول ذکر کیا ہے' ان پر وہ لوگ ہمیشہ سے کاربند چلے آرہے تھے۔

جناب ابنِ ابی ملیکہؒ

تابعین حضرات میں ایک نامور تابعی جناب عبداللہ بن عبیداللہ بن ابی ملیکہ ہیں جو "ابنِ ابی ملیکہ" کی کنیت سے مشہور ہیں۔

محدثین نے ان کا معمول ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ

... حدثنا وکیع عن نافع مولی لابن عمر کان ابن ابی ملکیہ یصلی بنا فی رمضان عشرین رکعہ... الخ۔

(المصنف لابن ابی شیبہ ص۳۹۳ جلد ثانی تحت باب کم یصلی فی رمضان من رکعہ' طبع حیدر آباد' دکن' الشیخ النیموی نے آثار السنن' ص۵۶' ۵۵' جلد ثانی پر مذکورہ بالا روایت ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اسنادہ صحیح")

مطلب یہ ہے کہ ابنِ ابی ملیکہؒ کے شاگرد کہتے ہیں کہ ہمیں آنموصوف رحمتہ اللہ علیہ رمضان شریف میں بیس رکعات (نماز تراویح) پڑھایا کرتے تھے... الخ۔

گویا کہ اس دور کے اکابرین امت کا یہ دوامی معمول اور اجتماعی عمل تھا کہ وہ رمضان المبارک میں بیس رکعات نماز تراویح ادا کیا کرتے تھے۔

علی بن ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ

علی بن ربیعہ رحمتہ اللہ علیہ مشہور تابعین میں سے ہیں آنموصوف کے متعلق محدثین نے لکھا ہے کہ وہ رمضان المبارک میں اہل اسلام کو پانچ ترویحوں کے ساتھ نماز تراویح پڑھاتے تھے اور وتر تین کعات کے ساتھ ادا کرتے تھے۔

چنانچہ ابنِ ابی شیبہ نے اس سلسلہ میں درج ذیل روایت درج کی ہے:

...عن سعید بن عبید ان علی بن ربیعہ کان یصلی بہم

فی رمضان خمس ترویحات ویوتر بثلاث۔

(۱) المصنف لابن ابی شیبہ ص۳۹۳، جلد۲، تحت باب کم یصلی فی رمضان من رکعۃ، طبع حیدر آباد، دکن۔

(۲) الشیخ النیموی نے مذکورہ بالا روایت آثار السنن ص۵۶، ج۲ میں درج کی ہے اور روایت کے متعلق لکھا ہے کہ "اسنادہ صحیح۔"

اس مسئلہ میں بہت سے کبار تابعین کے اقوال اور معمولات پائے جاتے ہیں لیکن یہاں اختصار کی بنا پر چند ایک روایات پر اکتفا کیا ہے۔

تنبیہ

سطور بالا میں چند ایک اکابر تابعین کے اقوال اور معمولات ذکر کیے ہیں۔ یہ وہ دور ہے جس کے متعلق ارشادات نبوی ﷺ میں خیرالقرون ہونے کی بشارت پائی جاتی ہے۔ (خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم) پس تابعین کے اس خیر دور میں بیس رکعات تراویح کا ادا کیا جانا عند الشرع صحیح ہے، خلاف سنت اور بدعت ہرگز نہیں۔ اور یہ طریقہ خیر ہی ہے جو خیرالقرون میں پایا گیا ہے۔

اکابر علمائے امت کے بیانات

اب اس کے بعد تراویح کے متعلق کبار محدثین اور مشاہیر علماء کے چند ایک بیانات ہم مختصراً پیش کرتے ہیں--- ان میں بیس رکعات تراویح کا مسئلہ بڑی صراحت کے ساتھ سامنے آئے گا اور اکابرین امت کے نزدیک اس کی اہمیت واضح ہوگی۔

○ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ (نعمان بن ثابت ابوحنیفہ المتوفی ۱۵۰ھ) سے ان کے شاگرد کبیر امام ابویوسف رحمتہ اللہ علیہ نے ایک بار مسئلہ تراویح میں حضرت عمر

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے طریقہ کار کے متعلق دریافت کیا تو امام صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا کہ

تراویح کی نماز "سنت موکدہ" ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے اپنی جانب سے تخریج و تجویز نہیں فرمایا اور آنموصوف رضی اللہ عنہ اس معاملہ میں بدعتی نہیں تھے اور انہوں نے بغیر کسی اصل (یعنی ثبوت شرعی) اور عہد نبوی ﷺ کے اس چیز کا امر نہیں فرمایا۔

چنانچہ علامہ ابن نجیم نے اپنی تصنیف "البحرالرائق" میں یہ واقعہ کتاب "الاختیار" سے بہ عبارت ذیل نقل کیا ہے:

... وذکر فی "الاختیار" ان ابا یوسف رحمه الله علیه سال ابا حنیفه رحمه الله علیه عنها وما فعله عمر فقال التراویح سنه موکده- ولم یتخرجه عمر من تلقاء نفسه- ولم یکن فیه مبتدعا- ولم یامر به الا عن لدیه وعهد من رسول الله صلی الله علیه وسلم-

(۱) البحرالرائق شرح کنز الدقائق لابن نجیم ص۶۶ جلد ثانی تحت بحث تراویح، طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ۔

(۲) ردالمحتار لابن عابدین الشامی (حاشیہ در مختار) ص۴۳۶، ج اول تحت بحث تراویح، طبع قدیم، مصر۔

(۳) کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ لعبد الرحمٰن الجزیری ص۳۴۱، جلد اول تحت کتاب الصلوٰۃ، باب صلوٰۃ التراویح حکمہا و کتبہا طبع بیروت، لبنان)

اور امام ترمذی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی تالیف جامع ترمذی میں اس مسئلہ پر مندرجہ ذیل عبارت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے:

... واکثر اهل العلم علی ما روی عن علی و عمر	یعنی امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اکثر اہلِ علم حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ (نماز

وغیرھما من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم عشرین رکعہ۔ وھو قول سفیان ثوری، وابن المبارک والشافعی ھکذا ادرکت ببلدنا بمکہ یصلون عشرین رکعہ۔

(ترمذی شریف ص۹۹، جلد اول، باب ما جاء فی قیام شہر رمضان، طبع قدیم لکھنؤ)

تراویح) کی بیس رکعات ہیں۔ یہ چیز حضرت علی المرتضیٰ، حضرت عمر فاروق اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے اور جناب سفیان ثوری، ابن المبارک اور امام شافعی (رحمہم اللہ) نے یہی قول کیا ہے اور مزید برآں امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے شہر مکہ مکرمہ میں اہلِ اسلام کو بیس رکعات (تراویح) ادا کرتے ہوئے پایا ہے۔

○ اور اسی طرح مسئلہ ہذا کو مشہور محدث امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ (الحسین بن مسعود المتوفی ۵۱۶ھ) نے اپنی تالیف "شرح السنہ" میں مذکورہ بالا عبارت کے ساتھ بلفظہ درج کیا ہے:

واما اکثر اھل العلم فعلی عشرین رکعہ...: یصلون عشرین رکعہ۔

(شرح السنہ لامام بغویؒ ص ۱۲۳، ج ۴، تحت بحث روایات تراویح، باب قیام شہر رمضان و فضلہ)

○ ائمہ احناف کے مشہور فقیہ شمس الائمہ السرخسی (ابوبکر محمد بن ابی سہل السرخسی المتوفی ۴۹۰ھ) نے اپنی تصنیف "المبسوط" میں مسئلہ ہذا کو مندرجہ ذیل الفاظ میں واضح کیا ہے:

... والمبتدعہ انکروا ادائھا بالجماعہ فی المسجد فاداء ھا بالجماعہ جعل شعار للسنہ کاداء الفرائض بالجماعہ شرع شعار الاسلام۔

(کتاب المبسوط لشمس الائمہ السرخسی ص۱۴۵، ج ۲، تحت کتاب التراویح الفصل

ثانی، طبع اول مصر)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ تراویح کو باجماعت مسجد میں ادا کرنے سے بدعتیوں نے انکار کیا تو تراویح کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا سنت طریقے کے لیے شعار بنایا گیا۔ جیساکہ فرائض کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا اسلام کا شعار قرار دیا گیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ تراویح کو باجماعت مساجد میں ادا کرنا اکابرین امت کے نزدیک اس قدر اہمیت کا حامل ہے کہ ان کو شعائرِ دین میں شمار کیا ہے۔

نیز السرخسی نے اس مقام میں یہ چیز بھی ذکر کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تراویح کے اجتماعی قیام کے مسئلہ میں منفرد نہیں تھے اور ان کا یہ انفرادی عمل نہیں تھا بلکہ اجلائے صحابہ رضی اللہ عنہم ان کے ساتھ تھے۔ خصوصاً حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اس مسئلہ میں راضی اور خوش تھے حتیٰ کہ آنموصوف نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد ان کے حق میں دعائے خیر کے کلمات فرمائے اور اپنے عہدِ خلافت میں بیس تراویح کی جماعت کا حکم فرما کر اسے قائم کیا۔

وان عمر رضی اللہ تعالی عنہا صلاھا بالجماعہ مع اجلاء الصحابہ فرضی بہ علی رضی اللہ تعالی عنہ حتی دعا لہ بالخیر بعد موتہ کما ورد وامر بہ فی عہدہ۔

(المبسوط لشمس الائمہ السرخسی ص ۱۴۵ ج ۲، الفصل الثالث، من کتاب التراویح)

مندرجہ حوالہ سے واضح ہوگیا کہ بڑے جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس مسئلہ میں متعاون تھے اور فیصلہ شدہ امر یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کسی غلط کام اور خلاف شرع بات پر جمع نہیں ہوتے۔ فلہذا بیس رکعات میں تراویح ادا کرنے کا مسئلہ شرع کے موافق ہے اور سنت طریقہ کے مخالف و متعارض نہیں۔

○ اکابر حنفیہ کے مشہور فقیہ علامہ کاشانی (علاء الدین ابوبکر بن مسعود الحنفی متوفی ۵۸۷ھ) نے اپنی تصنیف "البدائع والصنائع" میں یہی مسئلہ بیان کیا ہے۔

فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رمضان المبارک میں جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اصحاب کو جمع کیا اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو ان کا امام بنایا۔

...... فصلی بهم كل ليله عشرين ركعه ولم ينكر عليه احد فيكون اجماعا منهم على ذالك۔

(البدائع والصنائع للکاشانی، ص۲۸۸، جلد اول، فصل فی مقدار التراویح)

یعنی حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ ان حضرات کو رمضان شریف میں ہر رات بیس رکعات نماز تراویح پڑھاتے تھے اور اس چیز پر کسی ایک صاحب نے بھی انکار نہیں کیا اور منکر نہیں جانا۔

پس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے یہ امر اس مسئلہ پر اجماع ہے۔

مقصد یہ ہے کہ بیس رکعات تراویح پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے اجماع پایا گیا ہے جسے اجماع سکوتی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور "اجماع" مستقل حجت شرعیہ ہے، فلہذا اس امر کو بدعت کہنا اور خلاف سنت قرار دینا صحیح نہیں۔

○ اور مشہور عالم علامہ محمد بن احمد بن رشد القرطبی متوفی ۵۹۵ھ المعروف لابن رشد المالکی نے اپنی تالیف بدایہ المجتہد میں اس مسئلہ کو اس طرح واضح کیا ہے:

... واختلفوا فی المختار من عدد الركعات التی يقوم بها الناس فی رمضان فاختار مالك ؒ فی احد قوليه و ابوحنيفه والشافعی واحمد وداود (رحمهم الله تعالى) القيام بعشرين ركعه سوى الوتر۔

یعنی رمضان شریف میں جو نماز (تراویح) ادا کی جاتی ہے اس کی عدد رکعات میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن امام مالک رحمتہ اللہ علیہ نے ایک قول میں اور امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام احمد اور محدث داؤد (رحمہم اللہ تعالیٰ) حضرات نے وتر کے بغیر بیس رکعات (تراویح) کو پسند کیا ہے اور اسے راجح قرار دیا ہے۔

(بدایہ المجتہد لابن رشد المالکی ص۲۱۰، جلد اوّل، الباب الخامس فی قیامِ رمضان)

مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا تمام ائمہ کرام کے نزدیک تراویح کو بیس رکعات میں ادا کرنا فیصلہ شدہ امر ہے۔

○ اور حنبلی علماء میں علامہ ابنِ قدامہؒ (ابو محمد عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ، المتوفی ۶۲۰ھ) ایک مشہور عالمِ دین ہیں۔ انہوں نے اپنی مشہور تصنیف "المغنی" میں مسئلہ تراویح کی وضاحت کرتے ہوئے اکابر ائمہ کا مسلک ذکر کیا ہے۔

...... والمختار عند ابی عبدالله رحمه الله (الامام احمد رحمه الله عليه) فيها عشرون ركعه وبهذا قال الثوری وابوحنيفه والشافعی...الخ

(المغنی لابن قدامہ ص۱۳۸-۱۳۹ الجزء الثانی بحث صلوٰۃ التراویح وعدد رکعاتہا)

یعنی امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بیس رکعات (نماز تراویح پسندیدہ قول ہے اور امام ثوری رحمتہ اللہ علیہ، امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ ان تمام ائمہ کے نزدیک بھی یہی پسندیدہ اور مختار قول ہے۔

مختصر یہ ہے کہ مذکورہ اکابرین امت کے نزدیک نماز تراویح بیس رکعات ہیں اور یہی امر ان کے ہاں مختار اور پسندیدہ ہے۔

○ مشہور محدث اور فقیہ علامہ بدر الدین العینی (المتوفی ۸۵۵ھ) شارح بخاری نے بخاری شریف کی شرح میں مسئلہ ہذا کی تشریح بالفاظ ذیل ذکر کی ہے:

... واما القائلون به (عشرين ركعه) من التابعين فشتير بن شكل، وابن ابی مليكه والحارث الهمدانی وعطاء بن ابی رباح وابو البختری وسعيد بن ابی الحسن البصری اخوا

اس کا مفہوم یہ ہے کہ تابعین حضرات میں سے بیس رکعات نماز تراویح کا قول درج ذیل حضرات نے کیا ہے۔ شتیر بن شکل، ابنِ ابی ملیکہ، الحارث ہمدانی، عطاء بن رباح، ابوالبختری سعید بن ابی الحسن البصری، اخوالحسن، عبدالرحمٰن بن ابی بکر اور عمران العبدی اور ابنِ عبدالبر نے کہا

الحسن وعبدالرحمن بن ابی بکر وعمران العبدی- وقال ابن عبدالبر وھو قول جمہور العلماء وبہ قال الکوفیون والشافعی واکثر فقہاء- وھو الصحیح ابی بن کعب من غیر خلاف من الصحابہ-

ہے کہ جمہور علماء کا یہی قول ہے اور فقہائے کوفہ امام شافعیؒ اور اکثر فقہاء نے بیس رکعات نماز تراویح کا قول کیا ہے- اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں بغیر اختلاف کے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے یہی صحیح قول منقول ہے یعنی صحابہ میں کوئی معتدبہ اختلاف اس مسئلہ میں نہیں پایا گیا-

(عمدۃ القاری شرح بخاری شریف للعینی ص۱۲۸۷، ج۱۱، باب فضل من قیامِ رمضان)

کیا تراویح آٹھ رکعات ہیں؟ ایک سوال پھر اس کا جواب

بعض لوگوں کی طرف سے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی درج ذیل روایت اس مسئلہ پر پیش کی جاتی ہے کہ تراویح آٹھ رکعات ہیں، اس سے زیادہ ادا کرنا سنت کے برخلاف ہے-

...عن ابی سلمہ بن عبدالرحمن انہ سال عائشہ کیف کانت صلوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی رمضان- فقالت ماکان یزید فی رمضان ولا فی غیرہ علی احدی عشرہ رکعہ- یصلی اربعا فلا تسئل عن حسنھن وطولھن ثم یصلی اربعا فلاتسئل حسنھن وطولھن ثم یصلی ثلاثا فقلت یارسول اللہ اتنام قبل ان توتر قال یا عائشہ ان عینی تنامان ولا ینام قلبی-

(الموطا مالک بن انس رضی اللہ عنہ، ص۱۰۲-۱۰۳، تحت صلوٰۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فی الوتر، طبع نور محمدی، کراچی، مسلم شریف ص۲۶۵ جلد اوّل، باب صلوٰۃ اللیل وعدد رکعات النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، طبع نور محمدی، دہلی، مسند اسحاق بن

راہویہ ص۵۵۵، روایت نمبر۵۸۷، جلد ثانی، طبع المدینہ المنورہ، صحیح حبان ص ۱۳۵ جلد خامس تحت حدیث نمبر۲۶۰۴)

یعنی ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے سوال کیا کہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رمضان میں نماز کیسی اور کس طرح ہوتی تھی؟ تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جواب میں فرمایا کہ رمضان اور غیر رمضان میں آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم گیارہ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھاتے تھے۔ آپ ﷺ چار رکعت ادا فرماتے، ان کے حُسن اور طول کے متعلق کچھ نہ پوچھیے، پھر آپ چار رکعات اور ادا فرماتے۔ ان کے بھی حُسن اور طول کے متعلق کچھ نہ پوچھیے، پھر اس کے بعد تین رکعات ادا فرماتے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے کہا: یارسول اللہ! آپ وتر ادا کرنے سے پہلے سو جاتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ رضی اللہ عنہا! میری آنکھیں سوتی ہیں، میرا دل نہیں سوتا۔

یہ روایت متعدد محدثین نے ذکر کی ہے جیسا کہ ہم نے اس کے بعض حوالہ جات درج کر دیئے ہیں۔ روایت ہذا اپنے مقام میں صحیح اور درست ہے۔ اوپر ذکر کر دیا ہے کہ اس روایت کے پیش نظر بعض لوگ یہ اعتراض قائم کرتے ہیں کہ نماز تراویح کی آٹھ رکعات ادا کرنا سنت ہے اور اس سے زائد (بیس رکعات) ادا کرنا سنت کے برخلاف ہے اور سنت کے برخلاف عمل کرنا ناجائز ہے۔

فلہذا ہمیں صرف آٹھ رکعات سنت تراویح ادا کرنی چاہیے، اس سے زیادہ ادا نہیں کرنی چاہیے۔

الجواب

مذکورہ اعتراض کے جواب میں یہاں چند چیزیں پیش کی جاتی ہیں، ان پر نظر انصاف کرنے سے مسئلہ واضح ہو جائے گا۔

استنباط مسئلہ کے لیے محدثین کے نزدیک طریق کار یہ ہے کہ پیش نظر مسئلہ کے متعلق تمام روایات پر نظر کرتے ہیں اس کے بعد پھر مسئلہ کا استنباط کیا جاتا ہے۔

اس طریق کار کے موافق ہم پہلے یہاں کے مسئلہ کی دیگر روایات کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔

وہ اس طرح ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شب کی نماز کے متعلق روایت پائی جاتی ہے۔

... عن عائشه قالت كان رسول الله ﷺ يصلي بالليل ثلاث عشره ركعه- ثم يصلي اذا سمع النداء الصبح بركعتين خفيفتين- (انتهى)

یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم رات میں تیرہ رکعات نماز ادا فرماتے تھے۔ جب صبح کی اذان ہوتی تو ہلکی سی دو رکعتیں پھر ادا فرماتے تھے۔

(موطاءِ امام مالکؒ، ص۱۰۳، تحت صلوٰۃ النبی ﷺ فی الوتر، طبع کراچی، مسلم شریف ص۲۵۴-۲۵۵، جلد اوّل، باب الصلوۃ اللیل وعدد رکعات النبی صلی اللہ علیہ وسلم، طبع دہلی)

اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے دیگر روایات میں اس طرح بھی مذکور ہے کہ

... عن مسروق قال سالت عائشه عن صلوه رسول الله صلى الله عليه وسلم بالليل فقالت سبع وتسع واحدى عشره ركعه سوى ركعتى الفجر- (رواه البخاري)

یعنی مسروق کہتے ہیں کہ میں نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شب کی نماز کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے دریافت کیا تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب میں فرمایا کہ فجر کی دو رکعت کے سوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سات، نو اور گیارہ رکعات ادا فرماتے تھے۔

(مشکوٰۃ شریف ص۱۰۶، الفصل الاول باب صلوٰۃ اللیل، طبع دہلی، صحیح ابن حبان،

ص۱۳۶-۷ ۹۳ جلد خامس، روایت نمبر۲۶۲ فصل قیام اللیل)

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی مندرجہ بالا روایات سے ثابت ہوا کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شب کی نماز سات، نو، گیارہ اور کبھی تیرہ رکعات پر مشتمل ہوتی تھی۔

اسی طرح دیگر صحابہ کرام مثلاً ابن عباس، زید بن خالد الجہنی وغیرہم رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے بھی جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شب کی نماز تیرہ رکعات منقول ہے۔ اس سلسلہ میں مقامات ذیل ملاحظہ فرمائیں:

(۱) مسلم شریف ص۲۶۰ جلد اوّل، باب صلوٰۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم و دعاء باللیل۔

(۲) مسلم شریف ص۲۶۲ جلد اوّل، باب صلوٰۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم و دعاء باللیل۔

(۳) مشکوٰۃ شریف ص۱۰۶ الفصل الاول باب صلوٰۃ اللیل، طبع نور محمدی، دہلی۔

فلہذا یہ روایات حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی گیارہ رکعات والی روایت کے بظاہر متعارض اور مخالف پائی جاتی ہیں۔

یعنی یہ روایات باعتبار عدد رکعات کے اور باعتبار ہیئت ادا کے دونوں باتوں میں حدیث عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے خلاف ہیں۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شب کی نماز صرف گیارہ رکعات نہیں ہوتی تھی بلکہ کبھی سات، کبھی نو، کبھی گیارہ اور کبھی تیرہ رکعات پر مشتمل ہوتی تھی جیسا کہ مندرجہ بالا روایات ظاہر کرتی ہیں۔

تو اس صورت حال کے پیش نظر رفع تعارض کے لیے پہلے ہم محدثین سے ان میں تطبیق پیش کریں گے، پھر اس کے بعد روایت ہذا کی دیگر اشیاء بیان کریں گے، انشاء اللہ تعالیٰ۔

تطبیق بین الروایات

اس مقام کی روایات میں تطبیق کے لیے:

(۱) علماء کرام نے اس مسئلہ کی اس طرح توجیہہ درج کی ہے:

...... لعل الاختلاف بحسب اختلاف الاوقات والحالات او طول القراه وقصرها او صحۃ و مرض وقوه وفتره اولتنبيه على سعه الامر في ذالك۔

(جمع الوسائل ص۹۱، جلد ثانی، لعلی القاری ؒ، باب ما جاء فی عبادۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، طبع مصر)

یعنی روایات کا یہ اختلاف درج ذیل چیزوں پر محمول ہے:

(۱) اوقات میں اختلاف۔ (۲) حالات میں اختلاف۔ (۳) نماز میں قرأت کے چھوٹے اور لمبے ہونے کا اختلاف۔ (۴) صحت یا بیماری کی حالت کا فرق۔ (۵) طبیعت میں قوت اور سستی کا فرق۔ (۶) نیز اس مسئلہ میں امت پر آسانی اور سہولت کی رعایت کرنا۔

مختصر یہ ہے کہ ان روایات میں اختلاف کو محدثین مندرجہ بالا وجوہ پر محمول کرتے ہیں۔ فلہذا روایات میں رفع تعارض کی یہ صورت صحیح ہے اور ان روایات میں کوئی تخالف و تعارض نہیں رہتا۔

(۲) اور یہاں محدثین نے ایک یہ صورت بھی ذکر کی ہے جس سے رفع تعارض ہو جاتا ہے کہ

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی گیارہ رکعات والی روایت بطور اکثر الاوقات کے ذکر کی گئی ہے یعنی بیشتر اوقات میں اس طرح نماز شب ہوتی تھی لیکن بالدوام بطور قاعدہ کلیہ کے یہ روایت مذکور نہیں ہے۔

چنانچہ اس طرح سے بھی روایات کا تخالف اور تدافع دُور ہو جاتا ہے۔

(۳) اور فن حدیث کے علماء کرام نے یہاں تطبیق و توفیق بین الروایات کے لیے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت مذکورہ کے ناقل ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن ہیں۔ ابو سلمہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے

آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز تہجد (قیام اللیل) کے متعلق دریافت کیا تھا کہ رمضان المبارک اور غیر رمضان میں یہ نماز یکساں تھی؟ یا کوئی فرق تھا؟؟ تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ نماز رمضان وغیرہ رمضان میں گیارہ رکعات سے زیادہ عام طور پر نہیں ہوتی تھیں--- الخ۔

معلوم ہونا چاہیے کہ راوی کا یہ سوال صلوٰۃ التراویح کی بہ نسبت نہیں تھا اور نہ ہی موصوفہ رضی اللہ عنہا نے اس سے کچھ بحث کی ہے اور نہ ہی روایت ہذا کے سیاق و سباق میں تراویح کا تذکرہ تک ہے۔

مختصر یہ ہے کہ نہ سائل کے سوال میں نماز تراویح کے متعلق کچھ ذکر ہے اور نہ ہی جواب صدیقہ رضی اللہ عنہا میں--- بلکہ یہ گفتگو صلوٰۃ اللیل یعنی (تہجد) کے بابت ہوئی تھی۔

مذکورہ بالا تشریح کی تائید میں "فتاویٰ عزیزی" کی عبارت پیش کی جاتی ہے۔

جناب شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے فتاویٰ عزیزی جلد اول ص ۱۱۸-۱۱۹ بیان تراویح میں اس کی روایت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

...... دلیل بر ایں حمل آنست کہ راوی ایں حدیث ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن است در تتمہ ایں روایت میگوید کہ قالت عائشہ فقلت یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتنام قبل ان توتر؟ قال یاعائشہ ان عینی تنامان ولا تنام قلبی۔ کذا رواہ البخاری والمسلم۔

وظاہراست کہ نوم قبل از وتر در نماز تہجد مقصود می شود نہ درغیر آں۔ و روایات زیادت محمول بر نماز تراویح است کہ در عرف آں وقت، بہ قیام رمضان معبر بود۔

(فتاویٰ عزیزی ص ۱۱۹ جلد اول، دربیان تراویح، طبع مجتبائی دہلی)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سے عرض کیا کہ کیا آپ ﷺ وتر ادا کرنے سے قبل سو جاتے ہیں؟ تو جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ اے عائشہ رضی اللہ عنہا! میری آنکھیں سوتی ہیں، لیکن میرا دل نہیں سوتا۔ شارحین حدیث کہتے ہیں کہ ظاہر بات ہے کہ وتر ادا کرنے سے پہلے سو جانا تہجد کی نماز میں متصور ہو سکتا ہے لیکن اس کے ماسوا نمازوں میں متصور نہیں۔

اور اس عدد سے زیادہ نماز ادا کرنے کی روایات تراویح پر محمول ہیں جن کو اس وقت قیام رمضان سے تعبیر کیا جاتا تھا۔

معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت کا تعلق نماز تہجد کے ساتھ ہے، نماز تراویح کے ساتھ اس کا کچھ ربط نہیں ہے۔

پھر جب روایت ہذا کا محمل تراویح نہیں ہے تو اس سے آٹھ رکعات تراویح کی خاطر استدلال قائم کرنا بالکل بے جا ہے اور صحیح نہیں ہے۔

یہ تو توجیہ القول بما لا یرضیٰ بہ قائلہ والا معاملہ ہوگا۔

فائدہ

اس بحث کے آخر میں اس چیز کا بیان کر دینا فائدہ سے خالی نہیں ہے کہ نماز تراویح اور نماز تہجد دو الگ الگ نمازیں ہیں اور ان کے احکام و کوائف جُدا جُدا ہیں۔

○ نماز تہجد ابتداء اسلام میں فرض ہوئی تھی ایک سال کے بعد اس کی فرضیت منسوخ ہو گئی اور اس کے تطوع و تنفل ہونے کا درجہ باقی رہا۔

(۱) سورۂ مزمل۔

(۲) مسلم شریف جلد اوّل، ص۲۵۶ باب صلوٰۃ اللیل وعدد رکعات النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی اللیل، طبع نور محمد، دہلی۔

اور تراویح کی صورت اس طرح ہے کہ ہجرت کے بعد ۲ ہجری میں جب

رمضان المبارک کے روزے فرض ہوئے تو آنجناب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا:

جعل الله صيامه فريضة وقيامه تطوعا۔	یعنی اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزے فرض کر دیئے اور اس مہینہ میں رات کو نوافل مقرر کیے۔(جسے تراویح کہا جاتا ہے)

○ اور تہجد کو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آخر شب میں ادا فرماتے تھے اور تراویح کو آپ نے اول شب میں دوسری بار نصف شب تک اور تیسری دفعہ آخر شب تک ادا فرمایا۔

○ نماز تہجد کو منفرداً پڑھتے تھے۔ کبھی کوئی صاحب ازراہ خود آکر ساتھ کھڑا ہو گیا تو مضائقہ نہیں تھا جیسا کہ ایک دفعہ ابن عباس رضی اللہ عنہ آکر ساتھ شامل ہو گئے۔

بخلاف تراویح کے کہ اس کو متعدد بار تداعی کے ساتھ باجماعت ادا فرمایا۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ تہجد و تراویح دو الگ نمازیں ہیں اور ان کے احوال و کوائف مختلف ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ ان کوائف پر نظر کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ روایت مذکورہ بالا تراویح کے متعلق نہیں، بلکہ نوافل و تہجد کے متعلق ہے۔ فلہذا اس روایت کے ساتھ معترض کا تراویح کے لیے استدلال قائم کرنا ہرگز صحیح نہیں۔

الزامیات

مسائل کی بحث و تمحیص میں الزامیات بھی جاری ہوتے ہیں۔ جن حلقوں کی جانب سے حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت مذکورہ کے پیش نظر آٹھ رکعات تراویح پڑھنے پر زور دیا جاتا ہے اور بیس رکعت تراویح کے خلاف سنت ہونے پر شور و غل کیا جاتا ہے، ان دوستوں کے لیے بطور الزام کے ذیل چیزیں پیش کی جاتی ہیں۔ توجہ فرماویں اور اپنے مزعومات پر نظر ثانی فرماویں۔

○ یہ دوست تراویح بمع وتر کے ابتدائی حصہ شب میں ہمیشہ ادا کرتے ہیں، یعنی نصف اول شب مقرر کر لیا ہے۔

حالانکہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم وتر کو کبھی اول شب میں کبھی اوسط شب میں گاہے آخر شب میں ادا فرماتے تھے اور عموماً آخر شب تک پڑھنا زیادہ پایا جاتا ہے۔

○ روایات معہودہ میں نماز چار چار رکعت ملا کر پڑھنا اور پھر وتر تین رکعت ادا کرنا آیا ہے۔

حالانکہ یہ احباب دو دو رکعت ملا کر پڑھتے ہیں، اور وتر ایک رکعت ادا کرتے ہیں اور وتر کی تین رکعت والی روایت کو ضعیف کہہ دیتے ہیں۔ گویا نصف روایت کو قابل عمل اور نصف روایت کو متروک العمل قرار دیتے ہیں۔ یہ عجیب طریقہ ہے--- ترجیح۔

○ نیز یہ حضرات نماز ہذا کو تمام ماہ رمضان میں ہمیشہ جماعت کے ساتھ پڑھتے ہیں، حالانکہ آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تین یوم کے بعد یہ عمل ترک کر دیا۔

○ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا سو جانے کے بعد اٹھ کر اس نماز کو ادا کرنا روایت ہذا سے ثابت ہوتا ہے۔

حالانکہ یہ احباب نیند کرنے سے قبل ہی پڑھ لیتے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ اتنے قدر تغیرات اور تبدیلیوں کو خلاف سنت نہیں سمجھتے (جو خود ان کی طرف سے پائی جاتی ہیں) بلکہ صرف بیس عدد کو خلاف سنت قرار دینے میں تمام تر قوت صرف کرتے ہیں اور سنت کی مخالفت ثابت کرنے میں پوری سعی فرماتے ہیں۔

خلاصہ بحث

مختصر یہ ہے کہ گزشتہ صفحات میں خلفائے راشدین اور مشاہیر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا طریقہ کار مسئلہ تراویح کے متعلق ذکر کیا گیا ہے۔

اور اس کے بعد اکابر تابعین کے فرمودات اور کبار علمائے امت کے بیانات بقدر کفایت اس مسئلہ میں درج کیے ہیں اور گیارہ رکعت والی روایت کا جواب اور محمل بھی ذکر کر دیا ہے۔

اور ان تمام مندرجات کی روشنی میں تراویح کا مسئلہ اس طرح منقح ہوتا ہے کہ

- نماز تراویح کے لیے بیس رکعات ادا کرنا فیصلہ شدہ امر مسنون ہے' بدعت نہیں۔
- صلوٰۃ تراویح سنت موکدہ ہے' آثار قویہ اور قرائن مضبوطہ سے ثابت شدہ ہے۔
- جماعت تراویح شعار سنت اور شعار دین ہے۔
- جماعت تراویح سنت متوارثہ ہے۔
- تراویح پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا "اجماع سکوتی" پایا گیا اور اجماع مستقل "حجت شرعیہ" ہے۔
- اکابرین امت کی اکثریت کا بیس رکعات تراویح کے تعامل پر اتفاق اور اجماع پایا گیا۔
- اس پر مستزاد یہ امر ہے کہ عہد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے لے کر آج پندرھویں صدی ہجری تک حرمین شریفین (مسجد الحرام اور مسجد نبوی) میں صلوٰۃ التراویح بیس رکعات کے ساتھ اہلِ اسلام ادا کرتے چلے آ رہے ہیں اور سید دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ

لا تجتمع امتی علی الضلاله۔ یعنی میری امت گمراہی پر نہیں جمع ہوگی۔

معلوم ہوا کہ جمہور اہلِ اسلام اس مسئلہ میں گمراہی پر جمع نہیں ہوئے اور سنت طریقہ کی مخالفت پر اجماع نہیں کیا بلکہ شرعی طریقہ پر ہی قائم ہیں۔

○ نیز بیس رکعات تراویح کے اس "اجتماعی عمل" کو بلاوجہ و بلاعذر شرعی کے ترک کر دینا جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے واضح ارشادات (علیکم بالجماعه... الخ وغیرہ) کے ساتھ متصادم ہے اور شعائرِ اسلام کو ترک کر دینے کے مترادف ہے۔



لہ الحمد وعلیہ الصلوۃ والسلام

متعہ النساء کا مسئلہ

(اسلامی ہدایات کی روشنی میں)

متعہ کا مسئلہ اہل السنہ اور شیعہ کے نزدیک قدیم زمانہ سے "مختلف فیہ" چلا آیا ہے۔

شیعہ صاحبان اس کے جواز کے قائل ہیں اور اس فعل کو کار خیر اور موجب اجر و ثواب سمجھتے ہیں بلکہ اسے بہترین عبادت قرار دیتے ہیں جبکہ اہل سنت کے نزدیک متعہ النساء بعض اوقات اسلام میں جائز تھا' مگر بعدہ عہد نبوی ﷺ میں ہی اس کا جواز ختم ہو گیا اور کتاب و سنت سے اس کا ممنوع ہونا قرار پایا۔

لہٰذا جمہور اہل اسلام کے نزدیک اب یہ فعل ممنوع اور ناجائز ہے اور ہرگز حلال نہیں۔

اس پر دونوں فریق کی جانب سے عنقریب دلائل پیش کئے جائیں گے۔ پہلے ہم متعہ کے مفہوم و معنی کی تشریح پیش کرتے ہیں پھر اس کے بعد ہر ایک فریق کے نزدیک نکاح اور متعہ کا فرق و مابہ الامتیاز ذکر کیا جائے گا اور ساتھ اس کے احکام مذکور ہوں گے تاکہ نکاح و متعہ کی وضاحت عندالفریقین خوب سامنے آجائے۔

تنبیہہ

اتنی بات ذکر کر دینا مفید ہے کہ کتاب سیرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ میں ص ۵۱۳ سے لے کر ۵۱۶ تک بحث متعہ کو ہم نے قبل ازیں بیان کیا ہے لیکن وہاں اجمال و اختصار ہے اور یہاں اس بحث کو قدرے تفصیل کے ساتھ لکھا جا رہا ہے۔

متعہ النساء کا مفہوم

شیعہ کے نزدیک

لفظ "متعہ" اور تمتع کا لغوی معنی "نفع اٹھانا" اور فائدہ حاصل کرنا ہے۔

شیعہ علماء ذکر کرتے ہیں کہ "نکاح منقطع" اور "متعہ" ایک ہی چیز ہے اور اس کے لیے شرائط درج ذیل ہیں:

اور عند الشیعہ انہیں کو "ارکان متعہ" بھی کہا جاتا ہے۔

شرائط متعہ

(۱) متعہ کرتے وقت اس لفظ کے مادہ (م۔ ت۔ ع) کے ساتھ متعہ کا انعقاد ہوتا ہے مگر یہی الفاظ ادا کرنا لازم نہیں بلکہ الفاظ "انکحت" اور "زوجت" ادا کرنے سے بھی متعہ جائز ہے اور اسے صیغہ کے لفظ سے بھی ادا کرتے ہیں۔

(۲) متعہ میں "اجل مسمیٰ" لازم ہے۔ یعنی امتداد وقت ایک محدود عرصہ کا مقرر کرنا ضروری ہے۔

(۳) متعہ میں "اجر مسمی" لازم ہے۔ یعنی کچھ درہم یا کوئی چیز اگرچہ قلیل ہو، عورت کو بطور معاوضہ ادا کرنا ضروری ہے۔

(۴) متعہ کرنے والے دونوں (مرد و زن) "عاقل، بالغ اور آزاد" ہوں اور جس عورت کے ساتھ متعہ کیا جا رہا ہے وہ فی الوقت کسی کے نکاح میں نہ ہو۔

مطلب یہ ہے کہ مندرجات بالا کے اعتبار سے شیعہ کے نزدیک متعہ کا انعقاد اس طرح ہوتا ہے کہ

مثلاً عورت کہے کہ میں نے اپنے نفس کو تیرے متعہ میں دیا (شرائط بالا کے ساتھ) اور مرد فوراً کہے کہ میں نے تمہیں اپنے نفس کے لیے قبول کیا۔

یہاں گواہوں کی شہادت بالکل نہیں ہوتی اور یہ عقد خفیہ طور پر خاص جنسی تعلق قائم کرنے کے لیے ایک وقت تک مرد اور عورت آپس میں کر لیتے ہیں۔

اسی طرح دیگر الفاظ اور صیغوں کے ساتھ بھی متعہ منعقد ہو جاتا ہے۔ اس کی تفصیل ان کی کتب میں موجود ہے، مثلاً ملاحظہ ہو:

(۱) عجالہ حسنہ (ترجمہ رسالہ متعہ از ملا باقر مجلسی) (مترجم: سید محمد جعفر قدسی جائسی ص۱۷ تا ۲۲) مطبع اثنا عشری، دہلی۔

(۲) تحفۃ العوام ص۳۶۵-۳۶۶، باب نمبر۱۳ (ثواب مباشرت و متعہ میں) مطبوعہ کتب خانہ اثنا عشری، مغل حویلی لاہور، تالیف حاجی حسن علی صاحب، طبع بار سیزدہم۔

اہل السنت کے نزدیک

اہل السنت والجماعت کے نزدیک متعہ کا مفہوم یہ تھا کہ قلیل مدت کے لیے ایک عورت سے عقد کر لیا جاتا جس کو نکاح موقت یعنی وقتی نکاح کہا جاتا اور اس میں حق مہر اور گواہوں کی شہادت ہوتی تھی لیکن عقد میں دوام نہیں ہوتا تھا۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، اسلام میں بعض اوقات اس نوع کے نکاح کی اجازت تھی لیکن بعد میں کتاب و سنت کے مطابق عہد نبوی میں ہی یہ فعل ممنوع ہوگیا اور حرام قرار دیا گیا، جس طرح کہ بعض دیگر اشیاء بھی پہلے مباح تھیں لیکن انہیں بعد میں ممنوع اور ناجائز قرار دیا گیا مثلاً

(۱) شرب خمر (شراب پینا)

(۲) مسلم و کافر کا باہمی نکاح کرنا۔
(۳) نماز ادا کرنے کی حالت میں کلام کرنا۔
(۴) ربا یعنی سود کا لین دین --- وغیرہ وغیرہ۔

یہ چیزیں پہلے مباح اور جائز تھیں لیکن بعد میں اپنے اپنے مواقع میں انہیں ناجائز اور ممنوع قرار دیا گیا۔

بالکل اسی طرح متعہ النساء بھی پہلے مباح تھا لیکن بعد میں اس کے عدم جواز کا حکم صادر فرمایا گیا۔

اب اسلام میں صرف نکاح دائمی ہے۔ وقتی نکاح یا (جسے متعہ کہا جاتا ہے) وہ ختم ہو گیا۔

اور شیعہ صاحبان کے سوا باقی تمام طبقات اہل سنت و مالکی، حنفی، شافعی اور حنبلی نیز اہل ظواہر متعہ (وقتی نکاح) کو ناجائز قرار دیتے ہیں اور دوامی عقد نکاح کے قائل ہیں۔

اور اس معروف نکاح میں ایجاب و قبول کے علاوہ گواہوں کی شہادت، حق مہر کا تقرر اور خطبۃ النکاح یہ سب چیزیں پائی جاتی ہیں۔

اس مختصر سی تشریح کے بعد ہم نکاح اور متعہ کے احکامات و اوصاف عند الشیعہ اور عند اہل السنہ بصورت تقابل کے الگ الگ تحریر کرتے ہیں تاکہ متعہ اور نکاح کا باہم فرق و امتیاز واضح طور پر سامنے آجائے۔

متعہ کے احکام و اوصاف شیعہ کے نزدیک

متعہ میں:

(۱) شاہدوں (گواہوں) کی "شہادت" کی ضرورت نہیں۔
(۲) "اُجرت" لازم ہے (عورت ممتوعہ کو اُجرت دی جائے گی)
(۳) "اجل مسمی" (مدت اور وقت طے کرنا لازم ہے اگرچہ قلیل ہی ہو)

(۴) "احصان" کی صفت مفقود ہوتی ہے بلکہ "سفاحت" مطلوب ہوتی ہے۔ (یعنی عورت کو قید میں لا کر اس کی عفت اور حقوق کا تحفظ کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس میں شہوت رانی اور خواہش نفس کو پورا کرنا مطلوب ہوتا ہے)

(۵) "طلاق" دینے کی ضرورت نہیں۔ (مدت معینہ کا اختتام ہی کافی ہے)

(۶) "عدت" (معروفہ) نہیں ہوتی۔ (بقول بعض)

(۷) "ایلاء" متعہ میں نہیں ہوتا۔

(۸) "لعان" نہیں ہوتا۔

(۹) "ظہار" بھی نہیں ہوتا۔

(۱۰) ترکہ میں "وراثت" نہیں ہوتی۔

(۱۱) "ولی" کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ متعہ کرنے والی عورت کو متعہ کرنے میں مانع ہو۔

(۱۲) متعہ کرنے والی عورت کا "نان نفقہ" واجب نہیں ہوتا۔

(۱۳) متعہ سے ہونے والی "اولاد" سے متعہ کرنے والا مرد انکار کر سکتا ہے۔

(۱۴) "ممتوعہ عورت" زوجہ کے حکم میں نہیں ہے بلکہ انماھی مستاجرۃ یعنی وہ کرایہ کی عورت ہے۔

چودہ عدد مندرجہ بالا متعہ کے احکام و صفات کے حوالہ کے لیے مقامات ذیل ملاحظہ فرمائیں:

(۱) فروع کافی جلد ثانی ابواب متعلقہ متعہ مطبوعہ نول کشور، لکھنؤ۔

(۲) جامع رضوی از سید عبدالغنی، تحت ابحاث متعہ، مطبوعہ نول کشور، لکھنؤ۔

(۳) مجالہ حسنہ مترجم از مولوی سید محمد جعفر قدسی جائسی (رسالہ متعہ از ملا باقر مجلسی) طبع دہلی۔

نکاح کے احکام واوصاف اہل السنت کے نزدیک

نکاح میں:

(۱) شہادتوں (گواہوں) کی شہادت لازم ہے۔

(۲) حق مہر کی ادائیگی واجب ہے۔

(۳) ہمیشگی، دوام اور استمرار ملحوظ خاطر ہے۔

(۴) "احصان" کی صفت مقصود ہے اور سفاحت مطلوب نہیں۔ (یعنی نکاح میں عورت کو قید میں لا کر اس کی عفت اور حقوق کا تحفظ کرنا مقصود ہوتا ہے، صرف شہوت رانی ہی مطلوب نہیں ہوتی)

(۵) "حق طلاق" مرد کو حاصل ہے۔

(۶) "عدت" (معروفہ) لازم ہے۔

(۷) "ایلاء" جائز ہے۔

(۸) "لعان" جائز ہے۔

(۹) "ظہار" جائز ہے۔

(۱۰) "حق وراثت" ثابت ہے۔ (یعنی ترکہ میں)

(۱۱) اجازت "ولی" اور وارث لازم ہے۔

(۱۲) عورت منکوحہ کو نان نفقہ اور مکان مہیا کرنا واجب ہے۔

(۱۳) اپنی منکوحہ سے ہونے والی "اولاد" ناکح کی ہوتی ہے اور اس سے انکار شرعاً ناجائز ہے۔

(۱۴) منکوحہ عورت دواماً اہلیہ ہے، بااجرت اور کرایہ دار نہیں۔

چودہ عدد مندرجہ بالا احکام و صفات نکاح کے حوالہ جات کے لیے فقہ کے مشہور فتاویٰ بحرالرائق عالمگیری الشامی وغیرہ کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ

مندرجات بالا کے ذریعے "نکاح اور متعہ" کا فرق اور امتیاز واضح طور پر سامنے

آگیا اور ہر دو فریق (سنی و شیعہ) کا اس مسئلہ میں موقف عیاں ہوگیا۔ نیز نکاح اور متعہ کا تقابل اور تخالف پوری طرح واضح ہوگیا۔

اب اس کے بعد ہم سابقہ متعہ (جو اسلام میں بعض اوقات مباح تھا اور شیعوں کے نزدیک جو متعہ جاری ہے۔ ان دونوں کے درمیان مزید ایک موازنہ پیش کرتے ہیں، جس سے اس مسئلہ میں پیدا کردہ غلط فہمی دُور ہوسکتی ہے اور یہاں جو مغالطہ دیا جاتا ہے، وہ رفع ہوسکتا ہے۔

ایک موازنہ

اہل السنت کے نزدیک "سابقہ متعہ" (جو اسلام میں بعض اوقات مباح تھا)

(۱) وہ وقتی نکاح ہوتا تھا، مگر گواہ اور شاہد اس میں ہوتے تھے اور مرد و عورت میں کوئی خفیہ عقد نہیں تھا۔

(۲) یہ سفرِ جہاد میں بوقت ضرورت شدیدہ جائز تھا اور علی العموم جائز نہ تھا یعنی گھروں میں مقیم لوگ یہ عمل نہیں کرتے تھے۔

(۳) یہ ان لوگوں کے لیے جائز تھا جن کے لیے عورتیں نہ تھیں اور وہ طویل العزبہ اور قلہ الیسار وغیرہ کی حالت میں ہوتے تھے۔

(۴) یہ فعل اس دور میں بطور رخصت کے مباح ہوا تھا "عزیمت" کے درجہ میں نہیں تھا کہ ثواب کی امید پر کیا جاتا۔

(۵) یہ فعل بوقت ضرورت و بوجہ ضرورت تھا، کوئی امر تعبدی نہیں تھا کہ ہمیشہ کے لیے جاری رہتا۔

بنا بریں اس کو اسلام میں بعد میں ممنوع اور حرام قرار دیا گیا اور جو حضرات اس دور میں اس کے جواز کے قائل تھے، انہوں نے اس سے رجوع کرلیا۔

شیعوں کے نزدیک متعہ

(۱) یہ عارضی عقد ہوتا ہے اور اس میں گواہ اور شاہد نہیں ہوتے اور یہ خفیہ طور پر جنسی تعلق قائم کیا جاتا ہے اور اس کو صیغہ کے الفاظ سے بھی یاد کرتے اور ادا کرتے ہیں۔

(۲) یہ علی العموم جائز ہے اور ہر وقت سفر و حضر میں ہو سکتا ہے۔

(۳) اس میں طویل العزبہ اور قلہ الیسار وغیرہ کی کوئی قید نہیں، ہر مومن مرد ہر حالت میں اس فعل کو کر سکتا ہے۔

(۴) یہ فعل بطور "عزیمت" کے ہے اور اس فعل کے مرتکب کو بہت بڑا ثواب اور عالی درجات ملتے ہیں جیسا کہ ان کی کتابوں میں درج ہے۔

(۵) اس میں بوقت ضرورت اور بوجہ ضرورت کی کوئی قید نہیں۔ یہ امر "تعبدی" ہے اور یہ ہمیشہ کے لیے کار خیر اور موجب ثواب ہے۔

(تفسیر الصافی تحت آیت ہذا)

حاصل کلام یہ ہے کہ

موازنہ ہذا سے "سابقہ متعہ" اور شیعہ کے متعہ کے مابین بون بعید اور فرق عظیم پایا گیا۔

فلہذا مروجہ متعہ کو سابقہ متعہ پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔

اور دونوں متعہ کو ایک جیسا قرار دینا عظیم مغالطہ اور فریب دہی ہے جو اس مسئلہ میں ان لوگوں نے پھیلا دی ہے۔

بلکہ یہ ایک عجیب قسم کی تلبیس و مخادعت ہے جسے عوام میں نشر کر دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس غلط فہمی اور مغالطہ سے بچا کر راہ صواب اور ہدایت نصیب فرمائے اور فکر آخرت کی توفیق بخشے۔

شیعہ کا جواز متعہ کے لیے استدلال

شیعہ نے "جواز متعہ" کے لیے قرآن مجید میں سے آیت ذیل سے استدلال کیا ہے:

..... فما استمتعتم به منهن فاتوهن اجورهن فريضه...
الخ۔ (ابتدا پارہ پنجم)

جناب مقبول احمد صاحب دہلوی شیعہ نے مندرجہ بالا آیت کا ذیل ترجمہ کیا ہے:

... یعنی پھر ان میں سے جن سے تم متعہ کر لو تو مقرر کیا ہوا مہر ان کو دے دو۔ (ترجمہ مقبول احمد دہلوی ص۹۷ پارہ پنجم تحت آیت ہذا)

اور فرمان علی صاحب نے ترجمہ ذیل لکھا ہے:

ہاں جن عورتوں سے تم نے متعہ کیا تو انہیں جو مہر معین کیا ہے وہ دے دو۔ (ترجمہ جناب فرمان علی صاحب ص۱۲۹، پارہ پنجم تحت آیت ہذا)

ان کے سابق مفسرین مثلاً علی بن ابراہیم قمی نے یہاں لکھا ہے کہ

... قال الصادق عليه السلام فهذه الايه دليل على المتعه۔ (تفسیر قمی تحت آیت ہذا پارہ پنجم)

اور ان کی تفسیر الصافی میں لکھا ہے کہ

... فى الكافى عن الصادق عليه السلام المتعه نزل بها القرآن وجرى بها السنه من رسول الله صلى الله عليه وآله۔
(فروع کافی، باب المتعہ، تفسیر الصافی تحت آیت ہذا)

مطلب یہ ہے کہ امام جعفر صادق فرماتے ہیں کہ

یہ آیت متعہ کے جواز پر دلیل ہے۔

نیز امام نے فرمایا کہ

جواز متعہ میں قرآن نازل ہوا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کی سنت

کے ذریعے یہ جاری ہوا۔

اس کے بعد جواز متعہ میں شیعہ کے اپنے استدلالات مختصراً پیش کیے جاتے ہیں۔

ان کی کتابوں میں جواز متعہ کے متعلق بے شمار روایات پائی جاتی ہیں، ان میں سے صرف چند ایک روایات یہاں ذکر کی جاتی ہیں:

... عن ابی عبداللہ علیہ السلام قال ان اللہ تبارک وتعالی حرم علی شیعتنا المسکر من کل شراب و عوضھم من ذالک المتعہ۔

یعنی امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہمارے شیعوں پر اللہ تعالیٰ نے ہر نشہ آور چیز حرام کر دی ہے اور اس کے عوض میں متعہ کرنے کی ان کو اجازت دے دی۔

(من لا یحضرہ الفقیہ ص۴۳۲، کتاب النکاح، باب المتعہ، طبع تہران)

... قال الصادق علیہ السلام لیس منا من لم یومن بکرتنا ولم یستحل۔

(من لا یحضرہ الفقیہ ص۴۲۹، کتاب النکاح، باب المتعہ، طبع تہران)

اور منہج الصادقین تفسیر میں اسی روایت کا مفہوم بہ عبارت ذیل ذکر کیا ہے۔

یعنی از ما نیست آنکس کہ اعتقاد بکند و باور ندارد ظہور ما را و حلال نداند متعہ ما را۔

یعنی جناب جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ جو شخص ہمارے دنیا میں دوبارہ آنے پر ایمان نہ رکھتا ہو اور متعہ کو حلال نہ جانتا ہو، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

(۱) تفسیر منہج الصادقین ص۴۸۸، ج۲، تحت الآیۃ فما استمتعتم بہ منھن ۵۔

(۲) ضمیمہ ترجمہ مقبول احمد شیعی ص۱۷، پارہ پنجم تحت آیت متعہ۔

مندرجہ بالا روایات کے ذریعے متعہ کی اہمیت جو شیعہ کے ہاں ہے، وہ واضح ہو گئی اور دین میں ان کے نزدیک متعہ کا جو درجہ ہے، وہ سامنے آ گیا۔

یعنی جو شخص متعہ کے جواز کا قائل نہ ہو، وہ دین سے باہر ہے۔

تنبیہ

شیعہ نے متعہ کے فضائل و ثواب اور متعہ نہ کرنے والے کے لیے وعیدیں بے شمار کتابوں میں درج کی ہیں اور ان چیزوں کو آئمہ کرام کی طرف منسوب کیا ہے۔

ان مقامات سے چند ایک مواضع کی طرف راہنمائی کی جاتی ہے، ملاحظہ فرماویں:

- فروع کافی جلد ثانی، باب المتعہ ص۱۹۰، ۱۳۱، طبع نو لکشور، لکھنؤ۔
- من لا یحضرہ الفقیہ للشیخ الصدوق باب المتعہ ص۴۲۹، ۴۳۱، طبع تہران۔
- تفسیر القمی (علی بن ابراہیم القمی) ص۲۰۷، ج۲، تحت آیت ما یفتح اللہ للناس من رحمتہ الخ۔
- تفسیر منہج الصادقین از ملا فتح اللہ الکاشانی تحت آیتہ فما استمتعتم، سورۃ النساء، طبع تہران۔
- تفسیر الصافی از ملا محسن الفیض الکاشانی ص۳۴۷، ج۱، تحت الایتہ فما استمتعتم بہ منھن۔
- الانوار النعمانیہ للشیخ نعمتہ اللہ الجزائری تحت نور فی وقت الطہارۃ والصلوۃ۔
- تحفہ العوام از شیخ حسن علی ص۳۶۵، طبع دہم تحت ثواب مباشرت و متعہ، طبع لاہور۔

اہل السنہ کا عدم جواز متعہ پر استدلال

مسئلہ ہذا میں اہل السنت والجماعتہ نے ذیل آیات کے ساتھ استدلال قائم کیا ہے کہ عقد متعہ جائز نہیں، اسلام میں منع کر دیا گیا ہے۔

ارشادِ خداوندی ہے کہ

والذین هم لفروجهم حافظون الا علی ازواجهم او	یعنی (فلاح یافتہ ہیں...) وہ لوگ جو اپنی شرم گاہوں کو نگاہ رکھتے ہیں، مگر اپنی

ما ملکت ایمانهم فانهم غیر ملومین- فمن ابتغی وراء ذالك فاولئك هم العادون- (ابتداء پ۱۸، قد افلح المومنون، پ۲۹، سورة المعارج)	عورتوں یا اپنی باندیوں پر--- تو ان پر کچھ الزام اور ملامت نہیں- پس جو کوئی طلب کرے، اس کے ماسوا، سو وہ لوگ حد سے بڑھنے والے اور حدود شریعت سے تجاوز کرنے والے ہیں-

آیت ہذا سے یہ مسئلہ واضح ہوگیا کہ مومنوں کے لیے اپنی عورتوں اور باندیوں کے حق میں اپنی شرم گاہوں کا استعمال حلال اور جائز ہے اور ان دونوں (زوجہ اور باندی) کے ماسوا اگر کوئی قضائے شہوت کا راستہ ڈھونڈے تو وہ حلال کی حد سے تجاوز کرنے والا ہوگا اور حد اعتدال اور حد جواز سے باہر قدم نکالنے والا ہوگا-

یہاں سے قضائے شہوت کے دیگر تمام طریقے ناجائز ثابت ہوئے- ان میں سے ایک متعہ بھی ہے- پس اس کا عدم جواز یہاں سے ثابت ہوتا ہے-

کیونکہ ممتوعہ عورت فریقین کے نزدیک نہ تو زوجہ کے حکم میں ہے اور نہ ہی باندی ہے- اس بنا پر متعہ والی عورت کے لیے نہ نان ہے نہ نفقہ اور نہ سکنی، نہ طلاق ہے، نہ عدت اور نہ ہی اس کے لیے میراث کے احکام جاری ہیں-

فلهذا متعہ کرنے والی عورت اور مرد دونوں فرمان خداوندی فاولئك هم العادون کے اعتبار سے حدود شرع سے تجاوز کرنے والوں میں سے ہوں گے-

مضمون ہذا مندرجہ ذیل مقام میں ملاحظہ فرماویں- (کتاب منہاج السنہ لابن تیمیہ جلد ثانی ص۱۵۶، ج۲، تحت متعہ النساء)

علمائے کرام عدم جواز متعہ کے لیے دیگر آیات سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ

(۲) قرآن مجید میں نکاح طلب کرنے والوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا واضح فرمان ہے کہ

ان تبتغوا باموالكم محصنین غیر مسافحین...	یعنی طلب کرو تم عورتوں کو اپنے مال کے بدلے میں، قید میں لانے کے لیے (اپنی

الخ۔ (ابتدا پ۵)

حفاظت میں رکھنے کے لیے) نہ کہ شہوت رانی کے لیے۔

اس مقام پر مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ

... فیہ اشارہ الی النھی عن کون القصد مجرد قضاء الشھوہ وصب الماء واستفراغ ادعیہ المنی۔ فبطلت المتعہ بھذا القید لان مقصود المتمتع لیس الا ذالک۔ دون التاھل والا ستیلاد وحمایہ الذمار والعرض۔ فالا حضان غیر حاصل فی امراہ المتعہ اصلا۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس آیت میں محض قضائے شہوت اور پانی گرانے اور منی کے استفراغ کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ پس اس قید (محصنین غیر مسافحین) کے ذریعے متعہ باطل ہوگیا۔ کیونکہ متمتع (متعہ کرنے والے) کا مقصود صرف شہوت رانی ہوتا ہے اور عورت ممتوعہ کو اپنی اہلیہ بنانا، اولاد پیدا کرنا اور مال و ناموس کی حفاظت کرنا اس کا مقصود نہیں ہوتا۔

(تفسیر رُوح المعانی، سید محمود آلوسیؒ ص۹ ج۵، تحت الآیۃ)

اور شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلوی بھی اسی مضمون کو بہ عبارت ذیل تحریر کرتے ہیں کہ

... مسافح بودن متمتع ہم بدیہی است کہ غرض او ریختن آب مے باشد نہ خانہ داری و اخذ ولد و حمایت ناموس وغیر ذالک۔ (تحفہ اثنا عشریہ ص۳۰۳، تحت بحث متعہ، طبع سہیل اکیڈمی، لاہور)

یعنی متعہ کرنے والے کا مسافح (پانی گرانے والا) ہونا ظاہر بات ہے کیونکہ اس کی غرض صرف منی کا پانی گرانا ہوتا ہے، خانہ داری اور اولاد کا حاصل کرنا اور عزت و ناموس کی حمایت و حفاظت کرنا وغیرہ چیزیں مقصد نہیں ہوتیں۔

مندرجات بالا کے ذریعہ واضح ہوا کہ

متعہ والی عورت کو "احصان" کی صفت حاصل نہیں ہوتی، البتہ یہ صفت منکوحہ عورت کو ہی حاصل ہے۔

تنبیہہ

مزید اس مقام میں قابل غور بات یہ ہے کہ

قرآنی آیات میں جہاں خاوند بیوی کے مابین نکاح کا مسئلہ مذکور ہوا ہے (خواہ نکاح آزاد عورت کے ساتھ ہو یا باندی کے ساتھ ہو یا اہل کتاب کی خواتین سے کیا جائے) ان تمام مقامات میں صفت "احصان" بطور قید (اور صفت) کے ذکر کی گئی ہے اور اس امر کا خصوصی طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔ مثلاً:

(ا) حرام رشتوں کو ذکر کرنے کے بعد حلال طریقہ سے نکاح طلب کرنے کا جہاں بیان ہوا، وہاں فرمان خداوندی ہے کہ

"اپنے اموال کے عوض میں تم نکاح طلب کرو۔"

تو محصنین غیر مسافحین کی قید و صفت کے ساتھ یہ معاملہ کرنا ہوگا۔ یعنی عفت طلب کرتے ہوئے اور قید میں لاتے ہوئے نہ شہوت رانی کرتے ہوئے --- جس طرح کہ سطور بالا میں اس چیز کو بیان کیا گیا ہے۔

(۲) اسی طرح لونڈیوں اور باندیوں کو نکاح میں لانے کا بیان جہاں مذکور ہوا، وہاں بھی ارشادِ خداوندی ہے کہ

ان کو ان کے مالکوں کی اجازت کے ساتھ نکاح میں لاؤ اور ان کو ان کے اجر (حق مہر) دستور کے موافق دے دو۔

. محصنات غیر مسافحات ولا متخذات اخدان۔

یعنی اس حال میں کہ وہ قید میں آنے والیاں ہوں، نہ مستی نکالنے والیاں ہوں اور نہ چھپی یاری کرنے والیاں ہوں۔

یہاں بھی گولیوں اور باندیوں کے حق میں یہی "صفت احصان" ذکر فرمائی اور

شہوت رانی کرنے والیاں، خفیہ یاری کرنے والیاں نہ ہونے کی شرط لگائی ہے۔
مطلب یہ ہے کہ مذکورہ صفات والی گولیوں باندیوں کو نکاح میں لایا جائے نہ کہ ہر قسم کی گولیوں باندیوں کو جو ان صفات سے عاری ہوں۔
(۳) دیگر مقام سورۃ المائدۃ کے پہلے رکوع کے آخر میں جہاں اہل کتاب کے ساتھ نکاح کے حلال ہونے کا ذکر فرمایا گیا، وہاں بھی یہی مسئلہ مذکور ہے کہ

اذا اتیتموھن اجورھن محصنین غیر مسافحین ولا متخذی اخدان۔	یعنی (تمہارے لیے حلال ہیں) قید والی عورتیں اہلِ کتاب کی جب دو ان کو مہران کے۔ قید میں لانے کو، نہ مستی نکالنے کو اور نہ چھپی آشنائی کرنے کو... الخ۔

حاصل یہ ہے کہ
متعدد آیات قرآنی سے یہ مسئلہ واضح ہوا کہ:
خاوند اور بیوی کے نکاح کے مابین "صفت احصان" اور "عدم سفاحت" مطلوب و مقصود ہونا لازم ہے۔
اور منکوحہ عورت خاوند کے نکاح میں ہوتی ہے تو گویا وہ اس کی قید میں ہے اور خاوند کے چھوڑے بغیر وہ آزاد نہیں ہوگی۔ نیز وہ وقتی طور پر اپنے زوج کے ساتھ منسلک نہیں ہے بلکہ ہمیشہ کے لیے زوجین میں رابطہ قائم ہے۔
اور میاں بیوی کا یہ تعلق خفیہ طور پر قائم نہیں بلکہ شاہدوں اور گواہوں کی شہادت کے ذریعے قائم ہے۔
خلاصہ یہ ہے کہ یہ قیود اور یہ صفات جو نکاح کے مواقع میں آیات قرآنی میں مذکور ہیں، وہ متعہ والے عقد میں بالکل مفقود ہیں اور متعہ میں ان کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔
فلہذا ارشادات خداوندی کی روشنی میں متعہ کا ناجائز ہونا برملا ثابت ہے اور اس کا جواز ہرگز درست نہیں۔

عدم جواز متعہ پر احادیث و آثار سے استدلال

عدم جواز متعہ پر احادیث صحیحہ موجود ہیں جو محدثین نے اپنی تصنیفات میں اپنے اپنے اسانید کے ساتھ ذکر کی ہیں، ان میں متعہ کا ناجائز ہونا واضح طور پر ثابت ہے۔

ان میں سے بعض روایات ذیل میں درج کی جاتی ہیں جو مضمون ہذا کے ثبوت میں واضح اور صریح ہیں۔ علاوہ ازیں دیگر آثار بھی اس مسئلہ میں متعدد پائے جاتے ہیں۔ جن میں بعض کو روایات صحیحہ کے بعد ایک ترتیب سے پیش کیا جائے گا۔ انشاء اللہ۔

جناب ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

... عن ابی هریره عن النبی صلی الله علیه وآله وسلم، قال حرم او هدم المتعه النکاح والطلاق والعده والمیراث۔

یعنی ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آنجناب نے ارشاد فرمایا کہ نکاح، طلاق، عدت اور میراث نے متعہ کو حرام قرار دیا اور ختم کر دیا۔

(۱) السنن للدار قطنی ص ۲۵۹، ج ۳، طبع القاہرہ، تحت ابواب النکاح۔

(۲) شرح معانی الآثار الامام طحاوی ص ۱۵، جلد ثانی تحت باب النکاح المتعہ، طبع دہلی۔

مطلب یہ ہے کہ متعہ ایک وقت تک مباح اور جائز تھا۔ اس کے بعد جب نکاح کے احکامات، طلاق اور عدت و میراث وغیرہ آ گئے تو ان چیزوں نے متعہ کی اباحت اور جواز کو ختم کر دیا۔

اور امام جمال الدین الزیلعی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف "نصب الرایہ" میں بہ عبارت ذیل یہ روایت کی ہے:

... عن ابی هریره مرفوعا حرم او هدم المتعه النكاح والطلاق والميراث۔

... اخرجه الدارقطنی وقال ابن القطان فی كتابه اسناده حسن۔

(۱) نصب الرایہ للزیلعی ص۱۸۱ جلد ثالث (بحث متعہ) (طبع مجلس علمی۔

اور حافظ ابن حجر نے اس کے "حسن" ہونے کی تصدیق کی ہے۔

(۲) الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ اسنادہ حسن ص۵۸، ج۲، فصل فی بیان المحرمات، طبع قاہرہ مصر۔

(۳) مجمع الزوائد للہیثمی ص۲۶۴ جلد رابع، باب نکاح المتعہ بحوالہ ابی یعلیٰ الخ، طبع مصری قدیم۔

(۴) موارد الظمان الی زوائد ابن حبان، لنور الدین للہیثمی ص۳۰۹، باب ما جاء فی نکاح للمتعہ۔

(۵) البنایہ شرح الہدایہ ص۸۳، ج۲ جلد سادس تحت کتاب النکاح، طبع ملتان۔

مختصر یہ ہے کہ روایت ہذا اکابر محدثین نے بااسناد ذکر کی ہے۔ پھر ان کی تائید جمال الدین الزیلعی اور حافظ ابن حجر عسقلانی جیسے اعاظم علماء نے کر دی ہے اور اس روایت کو "حسن" کے درجہ میں شمار کیا ہے۔ اب اس کے قابل استدلال اور لائق استناد ہونے میں شبہ نہیں رہا۔

اس بنا پر کہ "حسن" روایات سے فقہی احکام ثابت ہوتے ہیں اور وہ اس باب میں معتمد ہیں۔

اور متعدد مشاہیر علماء کے حوالے بھی ہم نے بطور تائید و تصدیق درج کر دیئے ہیں۔

ربیع بن سبرۃ بن معبد

(۲) خلیفہ راشد جناب عمرو بن عبدالعزیز کا ایک "مسند" محدثین میں مشہور ہے۔ اس میں سے ربیع بن سبرہ الجہنی کی مرفوع روایت نقل کی جاتی ہے۔

...عن عمرو بن عبدالعزیز حدثنی الربیع بن سبرہ الجھنی عن ابیہ- ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن المتعہ وقال الا انھا حرام من یومکم ھذا الی یوم القیامہ ومن کان اعطی شیا فلا یاخذہ-

(مسند عمرو بن عبدالعزیز ص ۱۲-۱۳، طبع قدیم ملتان)

○ سبرۃ بن معبد الجہنی متعہ کے معاملہ میں اپنے ساتھ پیش آمدہ واقعہ کی تفصیلات ذکر کرتے ہیں کہ سابقاً جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ہمیں متعہ کے معاملہ میں رخصت ملی تھی، پھر اس کے بعد میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم زمزم اور کعبہ کے درمیان قیام فرما تھے۔ آنجناب ﷺ نے اس موقع پر ارشاد فرمایا:

... فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انا کنا قد اذنا لکم فی ھذہ المتعہ فمن کان عندہ من ھذہ النسوان شیئی فیرسلہ- فان اللہ قد حرمھا الی یوم القیامہ- ولا تاخذوا مما آتیتموھن شیا-

سبرۃ بن معبد الجہنی کی روایت ہذا کو متعدد محدثین اور مصنفین نے اپنے اپنے الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ان میں سے چند ایک حوالہ جات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ اہلِ علم حضرات ان مقامات کی طرف رجوع فرما سکتے ہیں۔

(۱) کتاب مسند الحمیدی ص ۳۷۴، الجزء الثانی تحت مسانید سبرۃ بن معبد الجہنی روایت نمبر ۸۴۷، طبع مجلس علمی۔

(۲) السنن للدارمی ص ۲۸۲، تحت باب النھی عن متعۃ النساء۔

(۳) مسلم شریف ص ۴۵۰-۴۵۱، جلد اوّل کتاب النکاح باب تحریم المتعہ۔

(۴) مسند ابی یعلیٰ الموصلی ص ۴۴۲-۴۴۳، جلد اوّل، تحت مسند سبرۃ بن معبد الجہنی، روایت نمبر ۹۳۵۔

(۵) المصنف لابن ابی شیبہ ص ۲۹۲، جلد رابع، باب نکاح المتعہ، طبع حیدر آباد دکن۔

(۶) المصنف لعبد الرزاق ص ۵۰۴، ج ۷ باب المتعہ، روایت سبرۃ بن معبد۔

(۷) المسند الامام احمد رحمتہ اللہ علیہ ص ۴۰۵، ۴۰۶ ج ۳، تحت مسانید سبرۃ بن معبد الجہنی، طبع اوّل مصری۔

(۸) السنن لابن ماجہ ص ۱۴۲ باب النھی عن نکاح المتعہ، طبع دہلی۔

(۹) المحلی لابن حزم الاندلسی ص ۱۳۰ ج ۹ تحت بحث متعہ، طبع بیروت۔

(۱۰) الاحسان بہ ترتیب صحیح ابن حبان ص ۱۷۹ ج ۷، روایت نمبر ۴۱۳۸، طبع جدید، تحت باب نکاح المتعہ۔

(۱۱) شرح معانی الآثار الطحاوی ص ۱۵ ج ۲ باب نکاح المتعہ ص ۲۹۰، طبع دہلی۔

(۱۲) ابوداؤد شریف باب النکاح فی المتعہ ص ۲۹۰، طبع مجتبائی دہلی۔

(۱۳) المنتقی لابن جارود ص ۲۳۴، طبع مصر تحت کتاب النکاح روایت نمبر ۶۹۹۔

(۱۴) کتاب الآثار لامام ابی یوسفؒ ص ۱۵۲، روایت نمبر ۷۰۰۔

(۱۵) کتاب الآثار امام محمدؒ ص ۹۳، روایت نمبر ۴۳۲۔

(۱۶) جامع مسانید الامام اعظم رحمتہ اللہ علیہ ص ۸۶، ج ۲، طبع دکن۔

(۱۷) تاریخ بغداد للخطیب بغدادی ص ۱۰۶ ج ۲، تحت ابراہیم طہمان۔

(۱۸) السنن الکبریٰ للنسائی جلد ثالث ص ۳۲۷، ۳۲۸ تحت تحریم المتعہ، طبع جدید بیروت۔

ان تمام محدثین و مصنفین نے متعہ سے منع کی روایت ہذا کو نقل کیا ہے اور

اس کا ماحصل اور خلاصہ یہ ہے کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے تمہیں متعہ کے معاملہ میں اجازت دی تھی' اب اعلان کیا جاتا ہے کہ جس کے پاس ان متعہ والی عورتوں میں سے کوئی عورت ہو تو وہ اس کو چھوڑ دے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے متعہ کے فعل کو تاقیامت حرام کر دیا ہے۔ اور جو کچھ تم نے ان عورتوں کو دیا ہے' اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔

گزشتہ صفحات میں متعہ کے متعلق اہل السنت اور شیعہ حضرات کے استدلالات ذکر کیے ہیں اور ہر ایک فریق کا موقف واضح کیا گیا ہے۔

شیعہ حضرات بعض اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال کے ذریعے اپنے مسلک کی تائید حاصل کرتے ہیں اور بطور الزام کے ہماری کتب سے ان کی روایات کو اپنی حمایت میں پیش کرتے ہیں۔

اس چیز کی وضاحت کے لیے ہم آئندہ صفحات میں مفصل کلام چلانا چاہتے ہیں۔

اس مقام میں شیعہ صاحبان حضرات صحابہ کرام پر جو مطاعن قائم کرتے ہیں' ان کا جواب بھی دیا جائے گا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روایات سے جواز متعہ کے لیے جو استدلال قائم کرتے ہیں' اس کے غیر صحیح ہونے پر کلام کیا جائے گا اور مدلل طور پر اس کی تردید کی جائے گی۔

حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ

مسئلہ ہذا میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت کتب حدیث میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے ذیل میں چند ایک روایات ایک ترتیب سے ذکر کی جاتی ہیں۔ ان روایات مرفوعہ میں متعہ کے حرام ہونے کا بالوضاحت بیان مذکور ہے۔ اور ان سے حضرت موصوف رضی اللہ عنہ کا مسلک و موقف عمدہ طریق سے معلوم ہو جاتا ہے۔

(الف) ... عن علی بن ابی   روایت ہذا کا مفہوم یہ ہے کہ

طالب ان النبی صلی الله علیه وسلم نهی عن متعه النساء و عن لحوم الحمر الاهلیه زمن خیبر۔

جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تحقیق جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورتوں کے ساتھ متعہ سے منع فرمایا اور پالتو گدھوں کا گوشت کھانے سے بھی ایامِ خیبر میں منع فرمایا۔

(۱) ترمذی شریف ص ۱۳۳، باب ما جاء فی نکاح المتعہ، طبع دہلی۔
(۲) مسلم شریف ص ۴۵۲، ج ۱، تحت باب نکاح المتعہ، طبع دہلی۔
(۳) مشکوٰۃ شریف ص ۲۷۲، فصل الاول باب اعلان النکاح، طبع دہلی۔
(۴) کنز العمال ص ۲۹۴، ج ۸، روایت ۵۰۳۷، باب المتعہ، طبع حیدر آباد دکن۔
(۵) جامع الاصول للجزری ص ۱۳۲-۱۳۳، ج ۱۲ تحت ابحاث متعہ۔

(ب) ... عن عبدالله والحسن ابن محمد بن الحنفیه عن ابیهما ان علیا مربا بن عباس وهو یفتی فی متعه النساء انه لاباس بها۔ قال له علی ان رسول الله صلی الله علیه وسلم نهی عنها ومن لحوم الحمر الاهلیه یوم خیبر۔[1]

روایت ہذا کا مفہوم یہ ہے کہ عبداللہ اور حسن اپنے والد محمد بن الحنیفہ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک دفعہ جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے درآنحالیکہ وہ متعہ النساء کے جواز کا قول کرتے ہوئے کہتے تھے کہ متعہ کرنے میں کوئی حرج نہیں تو اس وقت حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ النساء سے منع فرمایا ہے اور گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے سے بھی خیبر کے دن منع فرمایا۔

(۱) کتاب السنن لسعید بن منصور ص ۲۱۰، ج ۱، روایت نمبر ۸۴۹، باب ما جاء فی المتعہ۔
(۲) المصنف لعبد الرزاق ص ۵۰۱، ج ۷، باب المتعہ، طبع مجلس علمی۔

(۳) طحاوی شریف ص۱۴، ج۲، باب نکاح المتعہ، طبع دہلی۔

(۴) مسلم شریف ص۴۵۲، ج۱، باب نکاح المتعہ، طبع دہلی۔

(۵) بخاری شریف ص۷۶۷، ج۲، باب نہی رسول اللہ ﷺ من نکاح المتعہ، طبع دہلی۔

(۶) المصنف لابن ابی شیبہ ص۲۹۲، ج۴، تحت نکاح المتعہ و حرمتھا طبع حیدر آباد، دکن۔

(۷) تاریخ بغداد للخطیب بغدادی ص۱۰۲، ج۶، تحت ابراہیم بن شریک، طبع مصر۔

(۹) کتاب التمہید لابن عبدالبر ص۹۸، ج۱۰، تحت روایات ابن شہاب عن عبداللہ والحسن۔

(۱۰) کنزالعمال ص۲۹۵، ج۸، روایت نمبر۵۰۵۹، باب المتعہ، طبع دکن۔

(۱۱) تفسیر کبیر للرازی ص۲۸۷، ج۳، تحت آیہ متعہ انما استمتعتم، الخ۔

اسی روایت کو ابو جعفر محمد النحاس (المتوفی ۳۳۸ھ) نے اپنی تصنیف میں بہ عبارت ذیل نقل کیا ہے اور اس پر بطور نتیجہ کے عمدہ کلام کیا ہے۔ ناظرین کرام کے فائدہ کے لیے ان کی عبارت بلفظہ نقل کی جاتی ہے۔

... حدثنا عبداللہ بن محمد بن اسماء قال حدثنا جویریہ عن مالک بن انس عن الزہری ان عبداللہ بن محمد بن علی بن ابی طالب والحسن بن محمد حدثاہ عن ابیہما انہ سمع علی بن ابی طالب یقول لابن عباس انک رجل تائہ یعنی مائل ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن المتعہ... قال ابوجعفر) ولہذا الحدیث طرق فاخترنا ھذا لصحتہ والجلالہ جویریہ من طریق اسماء ولان ابن عباس رضی اللہ عنہ لما خاطبہ علی رضی اللہ عنہ بہذا لم یحاججہ۔ فصار تحریم المتعہ اجماعا۔ لان الذین یحلونہا اعتمادھم علی ابن عباس۔ (۲)

(کتاب الناسخ والمنسوخ فی القرآن الکریم لابی جعفر النحاس ص۱۰۴، باب ذکر الآیہ السادسہ، طبع قدیم مصر)

مذکورہ بالا روایات کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ تم ایک طرف میلان رکھنے والے شخص ہو۔ (مسئلہ حق سے ایک طرف مائل ہونے والے ہو)

تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے متعہ (النساء) سے منع فرمایا...
ابو جعفر محمد النحاس کہتے ہیں کہ اس حدیث کے لیے متعدد طریقے ہیں اور ہم نے راوی جویریہ کی جلالت شان کی بنا پر اس روایت کو صحیح قرار دیتے ہوئے اختیار کیا ہے اور (دوسری بات) یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کو جب حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے خطاب کر کے متعہ کے جواز کے قول سے منع فرمایا تو جواباً ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کوئی حجت اور دلیل پیش نہیں کی اور اس میں نزاع کھڑا نہیں کیا۔

پس اس بنا پر متعہ کی تحریم کا مسئلہ اجماعی ہوگیا۔ اس لیے کہ جو لوگ متعہ کی حلت کا قول کرتے ہیں، ان کا اعتماد عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے قول پر ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے سامنے اس مسئلہ میں خاموشی اختیار کی اور کوئی مخالفت نہیں کی تو اس طرح تحریم متعہ پر اتفاق و اجماع ثابت ہوگیا۔

(ج) نیز حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے اسی مسئلہ میں ایک دیگر مرفوع روایت مروی ہے کہ

... عن ایاس بن عامر عن علی بن ابی طالب قال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن المتعہ۔ قال وانما کانت لعانب لم یجد فلما نزل النکاح والطلاق والعدہ والمیراث بین الزوج المراہ نسخت۔(۳)

روایت ہذا کا مطلب یہ ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے متعہ (النساء" سے منع فرمایا اور آنموصوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ متعہ اس شخص کے لیے تھا جس نے نکاح کو (تاحال) نہیں پایا۔ پس جب نکاح، طلاق اور عدت کے احکام نازل کیے گئے اور زوجین میں میراث کے

احکام پائے گئے تو متعہ منسوخ کر دیا گیا۔

(۱) السنن الکبریٰ للبیہقی ص۲۰۷، ج۷، کتاب النکاح، طبع دکن۔

(۲) کنز العمال ص۲۹۵، ج۸، کتاب النکاح باب المتعہ، روایت نمبر ۵۰۹۸۔

(۳) مجمع الزوائد للہیثمی ص۲۶۵ تحت نکاح المتعہ، طبع مصر۔

(ز) اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس مسئلہ کے لیے کبار علماء نے ایک اور تصریح ذکر کی ہے جس میں مذکور ہے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے نقل فرمایا ہے کہ متعہ (النساء) کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ بخاری شریف میں یہ بات بہ عبارت ذیل مذکور ہے:

... قال (ابو عبداللہ البخاری) وقد بینہ علی من النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ منسوخ۔

(بخاری شریف ص۷۶۷، جلد ثانی، باب نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن نکاح المتعہ)

مختصر یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فیصلہ فرما دیا کہ متعہ کا جواز منسوخ ہو چکا ہے اور اسلام میں اس کی اباحت ختم کر دی گئی ہے۔

الزامیات

اس کے بعد شیعہ صاحبان کی اصول کی کتابوں سے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہم بطور الزام ذکر کرتے ہیں۔ اس میں متعہ کو بفرمانِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) ائمہ کرام نے حرام قرار دیا ہے اور ممنوع بتلایا ہے۔

کتب اصول اربعہ میں سے کتاب تہذیب الاحکام ابو جعفر الطوسی شیعہ کی تصنیف ہے۔ اس میں آنموصوف نے اپنی سند کے ساتھ جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا فرمان نقل کیا ہے کہ

... عن علی علیہ السلام قال حرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یوم خیبر لحوم الحمر الاھلیہ ونکاح

المتعہ۔[1]

(تہذیب الاحکام الشیخ جعفر الطوسی الشیعی ص۱۸۶، تحت کتاب النکاح، تحت تفصیل احکام النکاح، مطبوعہ ایران قدیم)

اسی طرح یہ فرمانِ نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ذریعہ ان احباب کی دوسری اصول کی کتاب "الاستبصار" لابی جعفر محمد بن الحسن الطوسی میں بھی منقول ہے، ملاحظہ ہو:

... عن علی علیہ السلام قال حرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لحوم الحمر الاھلیہ ونکاح المتعہ۔[2]

(الاستبصار لابی جعفر محمد بن الحسن الطوسی الشیعی ص۱۴۲، ج۳، تحت ابواب متعہ، مطبوعہ ایران)

ان ہر دو روایات مندرجہ کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے روز پالتو گدھوں کا گوشت اور متعہ کا نکاح حرام قرار دیا ہے (اور دونوں چیزوں سے منع فرما دیا)

مطلب یہ ہے کہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ "متعہ شرع میں حرام ہے۔" اس کو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے۔ یہ مرفوع روایت ہے اور ان کے ائمہ کرام سے باسند مروی ہے اور شیعہ احباب کی متعدد و معتبر کتب اصول میں موجود ہے۔ فلہذا اس فرمان کے صحیح ہونے میں کچھ اشتباہ نہیں۔

نیز (متعہ کے عدم جواز کا) یہ مسئلہ ان کی اصول کی کتاب "فروع کافی" کتاب الروضہ میں بھی درج ہے۔ وہاں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں متعہ کو ناجائز رکھا اور اس کو جائز قرار دے کر رائج نہیں کیا۔

مقام مذکور میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ایک مفصل خطبہ مذکور ہے۔ اس میں کم و بیش اٹھائیس (۲۸) عدد اشیاء کو شمار فرمایا ہے۔ ان میں سے ایک متعہ کا مسئلہ

بھی ہے۔

تطویل عبارت سے گریز کرتے ہوئے ہم صرف مقصد کے مطابق بقدر ضرورت الفاظ نقل کرتے ہیں۔

... لو ... امرت باحلال المتعتین... انا لتفرقوا عنی... الخ۔(۳)	یعنی جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ متعہ حج و متعہ زنان کے حلال ہونے کا فرمان میں صادر کروں... تو لوگ مجھ سے متفرق ہو جائیں گے۔(اور علیحدہ ہو جائیں گے)

(۱) فروع کافی ص۲۹، ۳۰ ج۳، کتاب الروضہ تحت خطبۃ الامیرالمومنین علیہ السلام طبع نول کشور، لکھنؤ۔

(۲) کتاب الروضہ من الکافی ص۹۶، ۱۰۷، تحت خطبہ نمبر۲۱، طبع تہران۔

کتاب الروضہ میں خطبہ علوی سے یہ بات واضح ہوئی کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جہاں دیگر متعدد احکامات سابقہ طریقہ پر جاری رہے اور ان کے خلاف حضرت موصوف نے نہیں کیا ان میں سے ایک متعہ النساء کا مسئلہ بھی ہے۔ اس کو سابقہ خلفاء راشدین کے معمول کے مطابق ناجائز ہی قرار دیا یعنی اس کے سابق حکم کو تبدیل نہیں کیا اور جواز کا حکم صادر نہیں فرمایا۔ درآں حالیکہ یہ ان کی اپنی خلافت راشدہ کا دور تھا۔ آنموصوف رضی اللہ عنہ پر کوئی پابندی یا دباؤ نہیں تھا۔ مطلقاً آزاد تھے اور امام عادل کے اوصاف سے متصف تھے۔ ان حالات میں تقیہ کرنے کا کوئی جواز باقی نہیں تھا۔

افادہ برائے ناظرین کرام

دونوں فریق کی کتب معتبرہ سے بفرمان ابوالائمہ (جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ) مسئلہ واضح ہوگیا کہ شرع اسلام میں عورتوں کے ساتھ متعہ کرنا ممنوع ہے، قطعاً حلال

نہیں۔

تو پھر یہ متعہ کے حامی دوست کیوں اس کا ارتکاب کرتے ہیں؟؟ اس کا جواب ان لوگوں کی طرف سے ان کے رہنماؤں نے یہ تیار کیا ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے متعہ کو ناجائز اور حرام فرمایا اور اپنے عہد خلافت میں اسی حکم کو نافذ رکھا لیکن:

- جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ شیر خدا نے اس مسئلہ میں تقیہ کیا تھا... الخ۔
- اور دوسرا یہ کہ روایت ہذا عامتہ الناس (اہل السنۃ والجماعۃ) کے مذہب کے موافق ہے اور قاعدہ ان کے ہاں یہ جاری ہے کہ

قاعدہ

دعوا ما وافق القوم فان الرشد فی خلافھم... الخ (۴)

یعنی جو روایت قوم (اہل السنۃ والجماعۃ) کے موافق آجائے، اس کو چھوڑ دو کیونکہ رشد وہدایت ان کے خلاف کرنے میں پائی جاتی ہے۔

(۱) اصول کافی ۲ (ابتدائی خطبہ کتاب) طبع قدیم، لکھنؤ۔

(۲) مراۃ العقول ص ۳۲ جلد اول، طبع ثانی، تہران۔

فلھذا شیعہ علماء کے اس ضابطہ تیار کرنے کا نتیجہ یہی ہے کہ اہل اسلام کے ساتھ مسائل میں ان کا اختلاف و افتراق قائم رہتا ہے اور اسی وجہ سے دونوں فریق ایک دوسرے کے قریب نہیں ہوسکتے۔

بہرکیف ان دوستوں کے ہاں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے فرامین کا بہتر جواب جو دیا جاتا ہے، وہ ہم نے پیش کر دیا ہے (یعنی وہ تقیہ ہے) ان کے ماسوا ان کے پاس حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے فرمودات کا کوئی معقول جواب نہیں۔

اب ناظرین کرام مندرجات بالا پر تدبر کی نظر فرما کر خود فیصلہ کریں۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے تمام عہد خلافت کو تقیہ پر محمول کرنا اور آنموصوف رضی اللہ عنہ میں تمام عادلانہ اوصاف اور شجاعت کے جمیع کمالات تسلیم کر لینے کے باوجود پھر بھی "مصلحت بینی" اور "دفع وقتی" پر عملدرآمد کرنے کا جواب بنانا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا اور کوئی منصف مزاج اور فہمیدہ آدمی اسے درست نہیں مان سکتا۔ یہ بات تو حضرت شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان ولایت اور شان شجاعت اور شان دیانت و راست بازی اور راست کرداری سب کے خلاف ہے۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو حق بات قبول کرنے کی توفیق بخشے۔

الزام کا اختتام

اب ہم یہاں ایک چیز الزامیات کے آخر میں ذکر کرتے ہیں۔ ناظرین کرام اس پر بغور نظر فرمالیں۔ "نہج البلاغہ" میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کلام میں امام زمان کے فرائض بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں فرمایا ہے کہ امام پر اپنے رب کی طرف سے مندرجہ ذیل چیزوں کے ادا کرنے کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

(۱) (قوم کو) وعظ و موعظت کا ابلاغ کرنا اور پہنچانا۔

(۲) (قوم کے حق میں) نصیحت و خیر خواہی کرنے میں سعی کرنا۔

(۳) سنت پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کو زندہ کرنا۔

(۴) جو حد لگانے کے مستحق ہیں، ان پر حدود اللہ کو جاری کرنا اور قائم کرنا۔

(۵) حق داروں کے حقوق کو ان کی طرف اعادہ کرنا اور لوٹانا۔

...انہ لیس علی الامام الی ما حمل من امر ربہ الابلاغ فی الموعظہ والاجتھاد فی النصیحہ والاحیاء للسنہ واقامتہ الحدود علی مستحقیھا واصدار السھمان علی اھلھا۔

(نہج البلاغہ ص ۲۰۲، جلد اول، طبع مصر، من خطبہ لہ علیہ السلام حتیٰ بعث اللہ

محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ شہیدا و بشیر--- الخ)

مقصد یہ ہے کہ یہ امام عادل اور خلیفہ منصف کے اوصاف اور فرائض منصبی ہیں- ان میں اپنے پیغمبر کریم کی سنتوں کا احیاء کرنا اور ان کے طریقوں کا زندہ کرنا امام کی ایک اہم ذمہ داری ہے- ان تقاضوں کی روشنی میں متعہ کے مسئلے کا حل کرنا اور اس کا فیصلہ فرما کر عمل درآمد کرنا اور اس کے نفاذ کا حکم جاری کرنا بھی اس میں شامل ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس مسئلہ کو اپنے دورِ خلافت میں کس طرح حل فرمایا؟ اور کیا حکم دیا؟؟ پس اس چیز کو معلوم کر لیں تو دیگر کسی بحث و تکرار کی حاجت نہیں رہے گی اور اس کو ہم نے قبل ازیں گزشتہ اوراق میں ذکر کر دیا ہے-

یعنی--- حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنے دور امامت و ایام خلافت میں فرائض منصبی کو ادا کرتے ہوئے فرمانِ نبوت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی روشنی میں متعہ کے عمل سے منع فرمایا اور اس کے جواز پر عمل درآمد نہیں کیا-

نیز قوم کے حق میں نصیحت و خیر خواہی فرماتے ہوئے انسداد متعہ کے طریقہ کو بہتر قرار دیا اور جواز متعہ کے طریقہ کو فروغ نہیں دیا- یہ تمام کام انہوں نے امام کے فرائض کے موافق کیا-

ازالہ شبہات

مسئلہ متعہ کی بحث میں شیعہ کی طرف سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر طعن قائم کرنے کے لیے درج ذیل قول پیش کیا جاتا ہے کہ

حضرت علی فرماتے تھے کہ عمر بن الخطاب نے سبقت کر کے متعہ کو بند نہ کر دیا ہوتا تو سوائے کسی بدبخت کے اور کوئی زنا میں مبتلا نہ ہوتا-

(مقبول احمد صاحب الشیعی دہلوی لکھتے ہیں کہ یعنی عمر نے غصباً خلافت لے لی اور اپنے وقت میں متعہ سے ممانعت کر دی)[1]

---

[1] حاشیہ مقبول احمد صاحب الشیعہ دہلوی ص ۹۷... تحت آیہ متعہ پ ۵، طبع دہلی-

درجہ جواب

حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کی طرف سے منسوب اس قول کے جواب میں چند چیزیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں' ان پر نظر غائر کرنے سے اس روایت کے بے اصل ہونے میں کوئی اشتباہ باقی نہیں رہے گا۔

(ا) معترض لوگوں نے جس کتاب سے یہ قول ذکر کیا ہے' اس میں اس طرح مذکور ہے کہ

... قال الحکم قال علی لولا نھی عمر عن المتعہ ما زنٰی الا شقی۔

(ا) مقصد یہ ہے کہ الحکم بن عتبتہ الکندی نے یہ قول اپنے سامعین کے سامنے بیان کیا--- الحکم الکندی مذکور کی ولادت علماء رجال نے ۵۰ ہجری میں ذکر کی ہے جبکہ حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کی وفات ۴۰ ہجری میں ہوچکی تھی گویا کہ الحکم الکندی حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کی وفات کے دس سال کے بعد پیدا ہوئے۔ پھر الحکم بارہ' چودہ سال کے بعد سن شعور کو پہنچے۔ اس دوران بائیس' چوبیس سال بعد الحکم کو خدا جانے کس شخص نے یہ قول ذکر کیا؟؟ اور کیسے افراد کے ذریعے یہ انہیں پہنچا؟؟

بہرکیف الحکم نے حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کے دور کو نہیں پایا۔ بس ان دونوں حضرات میں انقطاع زمانی بین طور پر موجود ہے۔ فلہذا یہ روایت سنداً منقطع ہے۔ (متصل نہیں ہے) اور روایت ہذا مرسل بھی ہے۔

○ نیز یہ چیز بھی قابل لحاظ ہے کہ حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کی دیگر روایات اور آنموصوف رضی اللہ عنہ کے فرمودات جو حرمت متعہ کے بارے میں صحیح اسانید کے ساتھ پائے جاتے ہیں اور شیعہ سنی دونوں فریق کی کتب میں مذکور ہیں جیسا کہ قبل ازیں باحوالہ درج کر دیا ہے۔ یہ قول ان کے خلاف ہے۔ فلہذا یہ شاذ روایت کے درجہ میں ہے۔

مختصر یہ ہے کہ یہ قول مرتضوی سنداً منقطع اور مرسل ہے اور متن کے لحاظ

سے صحیح روایات کے مقابل ہونے کی وجہ سے شاذ ہے۔

بنابریں اس قول پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور فن کے ضوابط کے اعتبار سے اسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) معترضین کی طرف سے سابق قول کی طرح حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ایک دیگر قول پیش کیا جاتا ہے اور اس میں بھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر اعتراض کرنا مقصود ہے۔ وہ قول اس طرح نقل کرتے ہیں کہ

... ان علیا قال... لو لا ما سبق من رای عمر بن الخطاب لامرت بالمتعہ ثم ما زنی الا شقی۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے متعہ کے بارے میں اگر سبقت نہ کر جاتی تو میں متعہ کے جواز کے متعلق حکم دیتا تو پھر بد بخت کے سوا کوئی شخص زنا نہ کرتا۔

درجہ جواب---(ابن جریج کی روایت)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب یہ قول بعض کتابوں میں مندرجہ ذیل طریقہ سے منقول ہے کہ

... قال ابن جریج اخبرنی من اصدق ان علیا قال... الخ

یعنی ابن جریج کہتا ہے کہ مجھے اس شخص نے خبر دی جس کو میں صادق سمجھتا ہوں اور اس کی تصدیق کرتا ہوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں یہ بیان کیا لو لا ما سبق... الخ۔

اس قول مرتضوی رضی اللہ عنہ کے جواب میں ذیل میں چند چیزیں ذکر کی جاتی ہیں جن کے ملاحظہ کر لینے کے بعد اس قول کا بے وزن اور غیر مقبول ہونا واضح ہو جائے گا۔ مندرجہ ذیل معروضات پر توجہ فرمائیں۔

(۱) ایک بات تو یہ ہے کہ اس قول کا ناقل ابن جریج ہے اور ابن جریج کا انتقال ۱۵۰ ہجری میں ہے اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا انتقال ۴۰ ہجری میں ہوا۔ اس طرح یہاں درمیانی عرصہ (قریباً ۱۱۰ سال) کے وسائط اور رواۃ غیر مذکور میں ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ خدا جانے وہ کیسے اور کس طرح کے لوگ تھے؟؟؟

پس یہاں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت اور ابن جریج کے دور حیات کے درمیان بین انقطاع پایا گیا۔

فلہذا یہ قول "منقطع" ہے (متصل الاسناد نہیں ہے) اور مرسل بھی ہے۔

(۲) دوسری چیز یہ ہے کہ علماء رجال نے ابن جریج کی توثیق اور مدح کی چیزیں ذکر کی ہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے ابن جریج کے حق میں درج ذیل امور بھی لکھ کر تصویر کا دوسرا رُخ پیش کیا ہے۔

چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے اپنی تصنیف تہذیب التہذیب میں دار قطنی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

... قال الدارقطنی تجنب تدلیس ابن جریج فانه قبیح التدلیس لا یدلس الا فی ما سمعه من مجروح۔ (۱)

یعنی دار قطنی کہتے ہیں: ابن جریج مدلس ہے۔ اس کی تدلیس سے بچنا چاہیے کیونکہ ابن جریج قبیح التدلیس ہے۔ یہ تدلیس اس موقعہ میں کرتا ہے جہاں اس نے مجروح شیخ سے سنا ہو۔

(تہذیب التہذیب لابن حجر عسقلانی ص۴۰۵-۴۰۶، ج۶ تحت ترجمہ ابن جریج)

نیز ابن حجر نے تہذیب التہذیب کی جلد رابع میں لکھا ہے کہ ابن جریج جن بعض روایات میں ارسال کرتا ہے اور مرسل روایات لاتا ہے تو وہ بعض روایات موضوع ہوتی ہیں اور ابن جریج اس بات کی پرواہ نہیں کرتا کہ وہ کیسے شخص سے روایت لے کر بیان کر رہا ہے۔

... بعض تلك الاحادیث التی کان یرسلها ابن جریج

احادیث موضوعہ- کان ابن جریج لا یبالی عن من اخذھا-

(۱) تہذیب التہذیب لابن حجر عسقلانی ص۴۴۴ ج۴ تحت ترجمہ سنید بن داؤد المصیصی-

(۲) میزان الاعتدال للذہبی ص۶۵۹ ج۲، تحت عبدالملک، بیروت-

مندرجہ بالا حوالہ جات سے یہ بات واضح ہوئی کہ ابن جریج مدلس ہے اور قبیح تدلیس کرتا ہے اور مجروح راویوں سے روایت لے کر تدلیس کر دیتا ہے- (یعنی اپنے شیخ کو بیان نہیں کرتا) اور اس کی روایات مرسل بھی ہوتی ہیں اور ان مرسل روایات میں بعض دفعہ کئی موضوع چیزیں بھی ذکر کر دیتا ہے- اس وجہ سے ابن جریج کی روایات پر علی الاطلاق اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور اس کی مرویات کو بغیر تحقیق و تنقیح کے قبول نہیں کیا جاتا اور مندرجہ بالا روایت جو اس نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کی ہے- وہ بھی اسی نوع کی روایت معلوم ہوتی ہے- اس بنا پر یہ روایت قابل تسلیم نہیں ہے-

(۳) اور حافظ ابن حجر نے اسی مقام میں امام شافعیؒ کے فرمان کے حوالہ سے ابن جریج کے متعلق ایک عجیب انکشاف کیا ہے- اہلِ علم کی تسلی کے لیے اصل عبارت نقل کی جاتی ہے، ملاحظہ فرمائیں:

... قال الشافعی رحمہ اللہ علیہ استمتع ابن جریج بسبعین امراۃ-

تہذیب التہذیب لابن حجر عسقلانی ص۴۰۵-۴۰۶، ج۶ تحت ابن جریج، طبع اوّل، دکن-

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ ابن جریج جواز متعہ کا صرف قائل ہی نہیں بلکہ خود فاعل بھی تھا اور اس نے ستر عورتوں کے ساتھ متعہ کیا-

علماء نے لکھا ہے کہ ابن جریج متعہ کے جواز کا قائل تھا اور اس نے بصرہ میں

جواز متعہ کے لیے اٹھارہ (۱۸) احادیث بیان کیں۔

ابنِ جریج کا رجوع

لیکن اس کے بعد علماء فرماتے ہیں کہ اس نے جواز متعہ کے قول سے رجوع کرلیا اور اپنے جواز کے فتویٰ کو واپس لے لیا۔

... ویحکی عن ابن جریج جوازھا۔ وقد نقل ابو عوانہ فی صحیحہ عن ابن جریج انہ رجع عنھا بعد ان روی بالبصرہ فی اباحتھا ثمانیہ عشر حدیثا۔

(فتح الباری شرح بخاری شریف ص۱۴۲، ج۹، تحت باب نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن النکاح المتعہ)

ان حضرات نے مندرجہ بالا مضمون کو دوسرے مقام میں بہ عبارت ذیل تحریر کیا ہے:

... قال (ابن جریج) بالبصرہ اشھدوا انی قد رجعت عنھا یعنی عن الفتوی بحل المتعہ بعد ان حدثھم ثمانیہ عشر حدیثا انہ لا باس بہ۔

(تفسیر مظہری ص۷۷، ج۲، تحت آیت فما استمتعتم بہ، پ۵)

تنبیہہ

فتح الباری اور تفسیر مظہری کے حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ متعہ کے جواز کے حق میں ابنِ جریج نے کئی روایات نشر کر دیں۔ خدا جانے ابنِ جریج کی وہ روایات کہاں کہاں پہنچیں اور روایات کے ذخائر میں انہوں نے کہاں کہاں جگہ پائی؟؟

یہاں یہ بات ذکر کرنا مفید ہے کہ مسئلہ متعہ کے بارے میں جہاں ابنِ جریج

کے حوالہ سے مواد پایا جائے تو اس کو بغیر تحقیق و تنقیح کے بالکل قبول نہ کیا جائے اور اس پر اعتماد نہ کیا جائے۔

اس بزرگ نے اگرچہ بعد میں اپنے قول سے رجوع کر لیا لیکن متعہ کی متعلقہ روایات کو اس نے مشکوک بنا ڈالا اور ان میں کئی شبہات پیدا کر دیئے اور لوگ اس کی نشر کی ہوئی روایات کے ذریعے غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔

اور لطف یہ ہے کہ یہ خود ان روایات سے دستبردار ہو گیا۔ اب ان کی صحت پر کیسے اعتماد و اعتبار کیا جا سکتا ہے؟؟ غور فرماویں۔

دیگر تنبیہہ

اہلِ علم کی معلومات میں اضافہ کے لیے ایک مزید چیز ابن جریج کے متعلق ذکر کی جاتی ہے جو شیعہ احباب کی معتبر و معتمد کتب میں ائمہ کی زبانی مذکور ہے۔

فروع کافی میں ہے کہ شیعہ کے ایک راوی اسماعیل بن الفضل الہاشمی نے کہا کہ

...سالت ابا عبداللہ علیہ السلام عن المتعہ فقال الق عبدالملک بن جریج فاسئلہ عنہا فان عندہ منہا علما فلقیتہ فاملی علی منہا شیا کثیرا فی استحلالہا۔

کافی کی اس روایت معتبر کے ذریعہ یہ بات واضح ہوئی کہ ابن جریج شیعہ کے ہاں معتمد شخصیت ہے اور اس کے پاس جواز متعہ کی روایات کا مواد کافی وافی موجود ہے اور وہی اس نے مختلف ذرائع سے لوگوں میں نشر کیا۔

اہل السنہ کی کتابوں میں وہ مواد پھیلایا اور شیعہ نے بھی اس سے مواد حاصل کیا اور عجیب بات یہ ہے کہ ابن جریج نے آخر آخر میں بصرہ میں متعہ کے جواز سے رجوع کر لیا، جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں درج کر دیا ہے۔ چیست یاران طریقت بعد

زیں تدبیرما (ترجیع) اب ایسے شخص کے اقوال کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر طعن کرنا اور اعتراض وارد کرنا کس طرح درست ہو سکتا ہے؟؟ ناظرین کرام انصاف کے ساتھ خود فیصلہ فرمائیں۔ مقصد یہ ہے کہ

(۱) حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایات متعہ کے منع کے متعلق وارد ہیں اور پھر شیعہ کی کتب میں بھی منع کی روایات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہیں اور ان کی اصول کی معتبر کتابوں میں درج کی گئی ہیں۔ (جیسا کہ گزشتہ صفحات میں اس کا بیان ہو چکا ہے)

(۲) اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو بھی متعہ کو جائز قرار دینے سے منع فرمایا ہے۔

(۳) اور جناب علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں اپنی خلافت راشدہ کے دور میں متعہ کو رائج اور نافذ نہ کر کے عملاً اس بات کی تصدیق اور تائید کر دی کہ یہ فعل اسلام میں ناجائز ہے اور یہ طریقہ ترویج اور تنفیذ کے قابل نہیں بلکہ ترک کر دینے کے لائق ہے۔

(۴) باقی ہماری کتابوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جو اقوال جواز متعہ کے لیے پیش کیے جاتے ہیں، وہ قطعاً صحیح نہیں اور بالکل بے بنیاد ہیں۔

ان اقوال کے غیر صحیح اور غیر مقبول ہونے کو ہم نے گزشتہ صفحات میں دلائل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

آخر بحث

اصولی ضابطہ

اب یہاں ایک اصولی قاعدہ بیان کر کے اختتام بحث کیا جاتا ہے۔ متعہ کے مسئلہ میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی مرویات (جواز متعہ و عدم جواز متعہ) دونوں

طرح کی اگر بالفرض والتقدیر تسلیم کر لی جائیں تو بھی یہاں ایک اصولی قاعدہ جاری ہو گا جو بین الفریقین مسلم ہے اور دونوں فریق میں وہ معمول بہا رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ--- ہرگاہ کہ دو دلیل مستاوی در قوت و یقین متعارض نمانید در حلت و حرمت، حرمت را مقدم باید داشت۔

(۱) تحفہ اثنا عشریہ ص ۳۰۳، تحت طعن یازدہم از مطاعن فاروقی، طبع سہیل اکیڈمی، لاہور۔
(۲) تفسیر روح المعانی ص ۷، ج ۵، تحت آیتہ فما استمتعتم بہ۔

مطلب یہ ہے کہ جب حلت و حرمت میں دلیلیں متعارض پائی جائیں تو اصولی ضابطہ کا تقاضا یہ ہے کہ محرم کو مبیح پر ترجیح دی جائے گی اور حرمت کو حلت پر مقدم رکھا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ متعہ کو حرام قرار دینے والی روایات پر عمل درآمد ہو گا جواز والی مرویات متروک العمل ہوں گی۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مسئلہ متعہ کے متعلق ایک خطبہ منقول ہے، جس میں انہوں نے متعہ النساء کے حرام ہونے کے متعلق جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے فرمان کا واضح طور پر اعلان فرمایا۔

چنانچہ محدثین نے اپنی اپنی سند کے ساتھ اس خطبہ کو نقل کیا ہے کہ

...عن ابن عمر قال لما ولی عمر بن الخطاب خطب الناس فقال ان رسول الله صلی الله علیه وسلم اجاز لنا فی المتعه ثلاثا- ثم حرمها- والله لا اعلم احدا یتمتع وهو

مطلب یہ ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب میرے والد عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے ایک موقعہ پر لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے تین ایام کے لیے متعہ کے متعلق ہمیں

محصن الا رجمته بالحجارہ الا ان یاتینی باربعه یشهدون ان رسول الله (صلی الله علیه وسلم) احلها بعد اذ حرمها۔ (السنن لابن ماجہ ص۱۴۲، باب نہی عن النکاح المتعہ، طبع نظامی دہلی، فتاویٰ عزیزی ص۱۹، ج۲، تحت حرمت متعہ)

اجازت دی تھی۔ اس کے بعد آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعہ کو حرام کر دیا۔ اب اگر کوئی شادی شدہ شخص متعہ کرے اور مجھے معلوم ہو جائے تو اسے میں پتھروں کے ساتھ رجم کروں گا مگر یہ صورت پائی جائے کہ وہ میرے پاس چار گواہ لائے کہ رسول اللہ ﷺ نے متعہ کو حرام کر دینے کے بعد حلال کر دیا تھا۔ (تو رجم نہیں کیا جائے گا)

(الف) مسئلہ ہذا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کسی مختصر مجلس میں بیان نہیں فرمایا بلکہ عام مجلس میں خطبہ دے کر متعہ کے حرام ہونے کا اعلان فرمایا تاکہ سب لوگوں کو معلوم ہو جائے۔

(ب) نیز متعہ کے حرام ہونے کا بیان حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی جانب سے ازخود نہیں کیا بلکہ اس کی نسبت جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کی ہے اور آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کا "ابلاغ" اور "اظہار" فرمایا۔ فلہذا یہ نہی (متعہ النساء) کے لیے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ہے۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حکم نہیں۔

اسی چیز کو علماء نے اپنی مشہور تصانیف میں ذکر کیا ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر فتح الباری میں تحریر فرماتے ہیں کہ

... وانما نهى عنها مستندا الى نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم وقد وقع التصريح عند بذالك فيما

اس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے متعہ کے متعلق جو نہی ذکر کی ہے۔ وہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے کی ہے۔ اس بات کی

اخرجه ابن ماجه من طريق ابى بكر بن حفص عن ابن عمر قال لما ولى عمر خطب فقال ان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذن لنا فى المتعه ثلاثا ثم حرمها واخرج ابن منذر والبيهقى من طريق سالم بن عبدالله بن عمر بن ابيه قال صعد عمر رضى الله عنه لمنبر فحمد الله واثنى عليه ثم قال ما بال رجال ينكحون هذه المتعه بعد نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عنها۔ (فتاویٰ عزیزی (از شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ دہلوی) ص۱۹، ج۲، تحت حرمت متعہ، فتح الباری شرح بخاری شریف ص۱۴۱، ج۹، طبع قدیم، مصر تحت باب نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن النکاح المتعہ آخرا)

تصریح اس روایت میں موجود ہے جو ابن ماجہ نے ابوبکر بن حفص عن ابن عمر رضی اللہ عنہ کے طریق سے ذکر کی ہے۔ اس روایت میں ابن عمر کہتے ہیں کہ جب (میرے والد) عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے ایک موقعہ پر لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین (ایام) کے لیے متعہ کے متعلق ہمیں اجازت دی۔ پھر اس کے بعد جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کو حرام قرار دے دیا اور ابن منذر اور بیہقی نے سالم بن عبداللہ عن ابیہ کے طریقہ سے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ ان لوگوں کا کیا حال ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے متعہ سے نہی کے بعد بھی متعہ کا نکاح کرتے ہیں؟؟

اور دیگر یہ چیز بھی قابل غور ہے کہ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ اعلان اگر بالفرض صحیح نہیں تھا اور غلط تھا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کی مخالفت ضرور کرتے اور خاموش ہرگز نہ رہتے۔

پھر اس اعلان پر اس دور کے اکابر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مثلاً

حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ، حضرت عباس بن عبدالمطلب، حضرت عثمان بن عفان، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت سعید بن زید، (رضی اللہ تعالٰی عنہم) وغیرہم کا مخالفت نہ کرنا اور اس کے خلاف آواز نہ اٹھانا اس بات کا قرینہ ہے کہ وہ حضرات خود اس مسئلہ پر متفق تھے کہ زبانِ نبوت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے متعہ کو حرام کر دیا گیا ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اپنا حکم نہیں ہے۔

چنانچہ امام طحاوی رحمتہ اللہ علیہ نے اسی مسئلہ کو بطور وضاحت کے عبارت ذیل میں ذکر کیا ہے۔

---قال ابو جعفر فهذا عمر رضی اللہ عنہ قد نهی عن متعه النساء بحضره اصحاب رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فلم ينكر ذالك عليه منهم منكر- وفي هذا دليل على متابعتهم له على ما نهى عنه من ذالك وفي اجماعهم على النهي في ذالك عنها دليل على نسخها وحجه-

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کی مجلس میں اور ان حضرات کی موجودگی میں متعہ النساء سے ممانعت کا اظہار فرمایا تو اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خلاف کسی نے انکار نہیں کیا اور آنموصوف کے خلاف کسی نے آواز نہیں اٹھائی۔

(۱) شرح معانی الآثار للطحاوی، ص۱۵، ج۲، باب نکاح المتعہ، دہلی۔

(۲) فتح الباری شرح بخاری شریف ص۱۴۳، ج۹، طبع قدیم، مصر۔

پس یہ چیز اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی متعہ پر نہی کرنے کی موافقت اور متابعت کی--- لہٰذا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ممانعت متعہ پر اتفاق کر لینا متعہ کے منسوخ ہو جانے پر دلیل اور حجت ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ درحقیقت حضرات صحابہ کرام کو اس حکم (متعہ) کا نسخ پہلے معلوم ہو چکا تھا۔ اس بناء پر انہوں نے اس موقعہ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فرمان کی تردید یا مخالفت نہیں کی، بلکہ اس پر اتفاق کیا۔

مسئلہ ہذا کی تائید

امام طحاوی رحمتہ اللہ علیہ اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمتہ اللہ علیہ کا کلام جو یہاں درج کیا گیا ہے، اب اس کی تائید میں دیگر علماء کی تحقیق پیش کی جاتی ہے۔ اس میں بھی اسی طرح مسئلہ کی وضاحت پائی جاتی ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ متعہ کے ممنوع ہونے پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع کر لینا، یہ اس کے منسوخ ہونے پر حجت و دلیل ہے اور اس مسئلہ کی مزید وضاحت کبار علماء نے بطور ضابطہ کے اس طرح ذکر کی ہے کہ

مسئلہ میں اصل ناسخ "اجماع" نہیں بلکہ ناسخ دلیل شرعی ہے اور اجماع دال علی الناسخ اور مظہر للناسخ ہے کیونکہ علی مذہب الصحیح کتاب و سنت کے لیے اجماع ناسخ نہیں ہو سکتا۔

علامہ ابن الصلاح نے "علوم الحدیث" میں یہ قاعدہ ذکر کیا ہے:

والاجماع لا ینسخ ولا ینسخ ولکن یدل علی وجود النسخ غیرہ۔ (علوم الحدیث لابن اصلاح ص۲۵۱، النوح الرابع والثلاثون (۳۴) تحت معرفہ ناسخ الحدیث منسوخہ)

اور علامہ بدر الدین العینی نے شرح ہدایہ میں اس مضمون کو بہ عبارت ذیل ذکر کیا ہے۔

... ثم اجتمعت الصحابہ رضی اللہ عنہم علی ان المتعہ قد انتسخت فی حیاہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فکانت الاحادیث ناسختہ والا جماع مظہر لان

نسخ الكتاب والسنته بالاجماع ليس بصحيح على المذهب الصحيح۔

(البنایہ فی شرح الہدایہ بدر الدین العینی ص ۸۴، ج ۲ تحت کتاب النکاح، طبع ملتان)

حاصل یہ ہے کہ مسئلہ متعہ میں نسخ تو روایات کے اعتبار سے ہے اور اس کو ظاہر کرنے والا اجماع ہے کیونکہ اجماع کو ناسخ نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ وہ مظہر نسخ ہوتا ہے۔

(د) نیز حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خطبہ میں یہ بات بڑی وزنی اور معقول فرمائی ہے کہ اس حرمت کے فرمان کے بعد کسی صاحب کے پاس حلت متعہ کا ثبوت موجود ہو تو وہ چار شاہد لا کر اس مسئلہ کو علی رؤس الاشہاد مدلل طریقہ سے ثابت کرے۔ (تب اس کی بات تسلیم کی جائے گی)

حضرت شاہ ولی اللہؒ کا ایک تائیدی بیان

گزشتہ سطور میں مسئلہ ہذا پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک خطبہ کی تشریحات ذکر کی ہیں اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف سے ان کی متابعت اور عدم انکار کا بیان ہوا ہے، اس سلسلہ میں شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اس موقعہ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کوشش کا ذکر کیا ہے اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے اتفاق کر لینے اور اختلاف کو فرو کر دینے کا اظہار کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس مسئلہ پر اجماع ہونے میں جو اختلاف تھا، وہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کی سعی سے مضمحل ہو گیا۔

پھر کہتے ہیں کہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے فضائل پر یہ مسائل شاہد عادل ہیں کہ ان کے ایام میں بڑے اہم مسائل پر صحابہ رضی اللہ عنہم میں رفع اختلاف ہو کر ان کا اتفاق و اجماع ہوا۔ (ان میں سے ایک مسئلہ متعہ بھی ہے)

عبارت ذیل میں یہ مضمون مذکور ہے، ملاحظہ فرماویں۔

باید دانست کہ ایں مسئلہ از جملہ آں مسائل است کہ حدیث برآں

ولالت می کند بتصریح و جمعی از صحابہ بسبب عدم بلوغ حدیث مصرح یا بہ سبب تاویل احادیث بر غیر محل او اختلاف داشتند و بہ سعی فاروق اجماع واقع شد و اختلاف مضمحل گشت و ایں مسئلہ باں مسائل شاہد عادل است برفضائل فاروق۔

(قرۃ العینین ص۲۶۵، ۲۶۶، تحت بحث متعہ النساء طبع مجتبائی دہلی از شاہ ولی اللہ محدث دہلوی)

ایک شبہ

شیعہ اس مقام میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ پر طعن قائم کرنے کے لیے درج ذیل روایت ہماری کتابوں سے پیش کرتے ہیں کہ

ایک مرتبہ عمر بن الخطاب نے کہا کہ

...متعتان کانتا علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم وانا محرمهما و معاقب علیهما متعه الحج ومتعه النساء۔ (حاشیہ مقبول احمد الشیعی ص۹۷، تحت آیت متعہ پ۵، تصنیف مولوی خادم حسین شیعہ "جواز متعہ" ص۹ و ص۴۲-۴۱)

یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا کہ دو قسم کے متعہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے۔ ان دونوں سے ممانعت کرتا ہوں اور حرام قرار دیتا ہوں اور ان کے مرتکب کو سزا دوں گا۔ ایک متعہ الحج ہے اور دوسرا متعہ النساء ہے۔

روایت مذکورہ بالا کی رو سے شیعہ صاحبان حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ پر سخت اعتراض قائم کرتے ہیں کہ کسی امر کی حلت اور حرمت کا کتاب و سُنّت کے سوا کسی کو حق حاصل نہیں۔

پھر حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کس بنا پر از خود متعہ کو حرام قرار دیتے ہیں؟؟

حالانکہ ان کو کسی چیز کے حلال یا حرام قرار دینے کا کوئی شرعی اختیار نہیں۔

ازالہ

گزشتہ صفحات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خطبہ کی تشریحات ذکر کرنے میں اصل طعن کا جواب آ گیا ہے۔ تاہم اس شبہ کے ازالہ کے لیے ذیل میں مزید چند معروضات پیش کی جاتی ہیں، ان پر نظر غائر کرنے سے اعتراض زائل ہو جائے گا۔

اور متعدد کبار علماء نے اس شبہ کے جوابات اپنی اپنی عبارات میں درج کیے ہیں۔ ان میں سے بالاختصار چند ایک حوالہ جات ناظرین کے لیے تحریر کیے جاتے ہیں۔

اس مقام میں اعتراض مذکور کے جواب میں ایک لغوی اور نحوی چیز ذکر کی جاتی ہے۔ اس فن کے علماء اس موقع پر فرماتے ہیں کہ یہ لفظ (انا احرمھا --- یا انا محرمھما) باب تفعیل سے ہے اور اس کا معنی یہ بھی ہوتا ہے کہ میں حرمت کو ظاہر کرتا ہوں۔

اور یہاں لفظ تحریم کا معنی حلال چیز کو حرام کرنا مراد نہیں بلکہ اس کا معنی حرام چیز کو حرام کہنا ہے، یعنی حرمت کو ظاہر کرنا اور بیان کرنا ہے۔

اس پر قرینہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہے: قاتلوا الذین لا یومنون باللہ ولا بالیوم الاخر ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ۔

(پارہ دہم، پاؤ دوم، سورۃ توبہ)

اس آیت میں لا یحرمون کا معنی حلال چیز کو حرام کر دینے کے نہیں بلکہ حرام کی ہوئی چیز کو حرام کہنے کے معنی میں ہے۔ مختصر یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مذکور قول کا معنی اور مفہوم یہ ہے کہ میں حرمت ظاہر کرتا ہوں اور اس کی حرمت کو بیان کرتا ہوں اور اس کی تشہیر کرتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تحلیل و تحریم کی نسبت صاحب شرع کے بغیر دوسرے کی طرف صحیح نہیں۔

اور اسی تحریم و تحلیل کے مسئلہ کو ابن قدامہ حنبلی نے اپنی کتاب "المغنی" میں یہ عبارت ذیل ذکر کیا ہے:

... واما حدیث عمر رضی اللہ عنہ ان صح عنہ فالظاہر انہ انما قصد الاخبار عن تحریم النبی صلی اللہ علیہ وسلم لہا ونہیہ عنہا اذ لا یجوز ان ینہی عما کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اباحہ وبقی علی اباحتہ۔ (المغنی قدامتہ ص ۱۰۴، جلد ہفتم تحت لایجوز نکاح المتعہ، طبع مصر)

یعنی اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ میں یہ قول صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آنموصوف رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعہ کو حرام کرنے کی خبر دینے یا اس سے منع کر دینے کا ارادہ کیا۔ اس بنا پر کہ جس چیز کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مباح کر دیا ہو اور اس کی اباحت کو باقی رکھا ہو، اس کے منع کر دینے کا کسی کو کوئی جواز اور اختیار نہیں۔

اور شمس الائمہ السرخسی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کا محمل یہ ذکر کیا ہے کہ ان کو متعہ کے منسوخ ہونے کا علم ہو چکا تھا۔

اس بنا پر انہوں نے متعہ کو ممنوع قرار دیا اور ساتھ ہی تہدید و تنبیہہ بھی کر دی تاکہ لوگ اس فعل سے اجتناب کریں۔ السرخسی فرماتے ہیں کہ

... فانما یحمل ھذا علی علمہ بالانتساخ۔

(۱) اصول السرخسی ص ۹۶ جلد ثانی فصل فی الخبر الخ، طبع معارف النعمانیہ، دکن۔

(۲) کشف الاسرار شرح المصنف علی المنار، ص ۴۹، جلد ثانی تحت الطعن الذی یلحق الحدیث از ابوالبرکات النسفی)

شبہ ہذا کے جواب کے لیے شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اپنی تصنیف تحفہ اثنا عشریہ میں مندرجہ ذیل عبارت ذکر کی ہے، فرماتے ہیں کہ

چوں وقت عمر رضی اللہ عنہ در بعضے جاہا ایں (امر) شنیع شیوع یافت اظہار حرمت او و تشہیر و ترویج او و تخویف و تہدید مرتکب او را بیان نمود۔ تا حرمت آں نزد خاص و عام ثبوت پیوست۔

یعنی جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بعض مقامات میں متعہ کا شنیع فعل عام ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی تحریم کی تشہیر کی اور اس کے مرتکب کو تخویف اور تنبیہ کی تاکہ متعہ کا عدم جواز عام و خواص کے لیے ثابت ہو جائے۔

(تحفہ اثناء عشریہ ص ۳۰۳، تحت طعن یازدہم (۱۱) فاروقی، طبع لاہور)

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کی مندرجہ بالا عبارت سے معلوم ہوا کہ متعہ کی حرمت کو عام و خاص تک پہنچانا مقصود تھا۔ اس بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تنبیہ اور تہدید کے الفاظ اپنے کلام میں بیان فرمائے۔

نیز شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے فتاویٰ عزیزی میں اس اشکال کا حل ایک دیگر طریقے سے بھی ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں کہ

نهى عمر رضي الله عنه في خلافته فانه نهي تاكيد لا نهي تشريع۔

یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے دور میں جو نہی کی وہ نہی بطور تاکید ذکر کی ہے، وہ نہی تشریعی نہیں ہے۔

(فتاویٰ عزیزی ص ۲۳، ج ۳، آخر بحث متعہ، طبع دہلی)

فلہذا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرمان پر جو اشکال واقع ہو رہا تھا، ان تشریحات کے بعد زائل ہو گیا۔

علمائے کرام اس مسئلہ میں طعن مذکور کے جواب میں یہ تعبیر بھی اختیار کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانب جو تحریم متعہ کی نسبت کی جاتی ہے۔ وہ بہ معنی "اظہار حرمت" ہے نہ کہ "اثبات حرمت" پس اس تعبیر سے بھی یہ طعن زائل ہے۔

سطور بالا میں ہم نے اشکال مذکور کے زائل کرنے کے لیے چند حوالہ جات

پیش کیے ہیں۔

اس مسئلہ میں مزید حوالہ جات بھی پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن ہم نے اختصار کے پیش نظر اسی پر اکتفا کیا ہے۔

اہلِ علم کی تشفی کے لیے ذکر کیا جاتا ہے کہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمتہ اللہ علیہ نے یہی بحث بڑی تفصیل کے ساتھ اپنی تالیف فتح الملہم بشرح صحیح المسلم، ص ۴۴۲، جلد ثالث، تحت ابواب متعہ (قولہ نہی عنہا) میں تحریر کی ہے۔ ضرورت مند حضرات اس مقام کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

نیز صاحب تفسیر روح المعانی سید محمود آلوسی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی صفحہ ۶ ج۵، پارہ پنجم تحت الآیتہ الاستمتاع میں بھی اسی طرح وضاحت مسئلہ ہذا ذکر کی ہے جس سے اعتراض مذکور زائل ہو جاتا ہے۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ

متعہ سے منع کے متعلق ماقبل میں چند ایک روایات درج ہیں۔ اسی ضمن میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بن الخطاب سے بھی ایک مرفوع روایت مروی ہے جو ذیل میں بلفظہ نقل کی جاتی ہے۔

... عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال نہی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن لحوم الحمر الاھلیہ او الانسیہ وعن المتعہ متعہ النساء وما کنا مسافحین۔

مطلب یہ ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا اور عورتوں کے ساتھ متعہ کرنے سے بھی منع کیا۔ پھر ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اب ہم سفاحت کا معاملہ (شہوت رانی) نہیں کریں گے۔

(کتاب الآثار الامام ابی یوسف" ص ۱۵۲، روایت نمبر ۶۹۹، جامع مسانید الامام الاعظم

ص۸۵، ج۴، طبع دکن)

یہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی منع متعہ کے لیے مرفوع روایت ہے اور اکابر حنفی علماء نے اسے اپنی سند کے ساتھ اپنی تصانیف میں نقل کیا ہے۔

اس روایت میں متعہ کے ممنوع ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے واضح کر دی ہے کہ متعہ کے فعل میں صرف شہوت رانی ہوتی ہے اور اب وہ اس فعل (سفاحت) کا ارتکاب نہیں کریں گے۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا روایت کی تائید میں ہم ان کی ایک دوسری روایت ذکر کرتے ہیں، جس میں مسئلہ متعہ کا ممنوع ہونے کے علاوہ ایک دیگر چیز کی طرف بھی راہنمائی ہوتی ہے۔

... عن سالم بن عبدالله قال اتى عبدالله بن عمر فقيل له ان ابن عباس يامر بنكاح المتعه- فقال ابن عمر سبحان الله ما اظن ابن عباس يفعل هذا قالوا بلى انه يامر به قال وهل كان ابن عباس الا غلاما صغيرا-اذ كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم قال ابن عمر نهانا عنها رسول الله صلى الله عليه وسلم وما كنا مسافحين- رواه الطبرانى فى الاوسط ورجاله رجال

روایت بالا کا مفہوم یہ ہے کہ ابن عمر کے فرزند سالم بن عبداللہ کہتے ہیں کہ ایک بار ابن عمر رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو لوگوں نے ان کی خدمت میں کہا کہ عبداللہ ابن عباس متعہ کے جواز کا حکم دیتے ہیں تو ابن عمر نے یہ بات سن کر تعجب کے طور پر سبحان اللہ کہا اور کہنے لگے کہ میں عبداللہ بن عباس کے متعلق یہ گمان نہیں رکھتا کہ وہ ایسا کہتے ہوں تو لوگوں نے کہا کہ نہیں وہ تو متعہ کے جواز کا حکم دیتے ہیں تو یہ سن کر ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ابن عباس تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں غلام صغیر السن تھے۔ (یعنی مسئلہ ہذا کی صحیح معلومات بڑوں سے معلوم کریں، ابن عباس تو کم عمر

الصحیح خلا المعافی بن سلیمان وھو ثقہ- تھے) (مجمع الزوائد للہیثمی، ص۲۶۵، ج۴، تحت باب نکاح المتعہ)

اس کے بعد عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا متعہ کے متعلق جو منع کا حکم تھا، وہ لوگوں کو بیان فرمایا کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں متعہ سے منع فرمایا اور اب ہم مسافح یعنی شہوت رانی کرنے والے نہیں ہیں-

ابن عمر رضی اللہ عنہ کی ان روایات سے متعہ کے ممنوع ہونے کا صراحتاً حکم معلوم ہوا اور ساتھ ہی یہ چیز بھی واضح ہوگئی کہ متعہ کے فعل میں صرف سفاحت (یعنی شہوت رانی) ہوتی ہے-

اور صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ یہ فعل ہم نہیں کریں گے- نیز ابن عمر رضی اللہ عنہ نے مسئلہ ہذا میں درایت سے کام لینے کی طرف اشارہ کیا کہ صغار لوگوں کی بجائے کبار حضرات کے بیانات کو اہمیت دی جاتی ہے کہ وہ اس معاملہ میں زیادہ واقفیت رکھتے ہیں اور یہاں کبار صحابہ رضی اللہ عنہم متعہ سے منع کو نقل کرتے ہیں- فلہذا اس مسئلہ میں کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روایت زیادہ قابل اعتماد ہے اور راجح ہے-

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ

متعہ کے جواز کے متعلق عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا قول شیعہ صاحبان پیش کرتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ متعہ کو جائز قرار دیتے تھے-

تو اس کے متعلق ہماری جانب سے مندرجہ ذیل امور تحریر کیے جاتے ہیں اور یہاں جناب ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قراۃ کا جواب بھی ضمناً درج کر دیا گیا ہے-

○ علماء امت نے لکھا ہے کہ جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کچھ عرصہ تک مسئلہ ہذا کے متعلق جواز کا قول کرتے تھے-

لیکن جب مسئلہ ہذا ان پر منقح ہو کر سامنے آیا تو انہوں نے اپنے موقف سے رجوع فرمالیا۔

اسی سلسلہ میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ کتب حدیث میں منقول ہے، جسے ہم قبل ازیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیانات کے تحت اسی مسئلہ میں درج کر چکے ہیں کہ

○ ایک بار ابن عباس رضی اللہ عنہ ایک مجلس میں جواز متعہ کے متعلق بیان فرما رہے تھے۔ وہاں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا گزر ہوا تو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ان کو فرمایا کہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعہ النساء سے منع فرمایا ہے۔

...قال له علی رضی اللہ عنہ ان رسول الله صلی الله علیه وسلم نهی عنها (متعه النساء) الخ۔

(مسلم شریف ص ۴۵۲، ج۱، تحت باب نکاح المتعہ)

نوٹ: روایت ہذا کے دیگر حوالہ جات قبل ازیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیانات کے تحت درج ہو چکے ہیں۔

○ اسی طرح ایک دیگر روایت جناب محمد بن الحنیفہ ؒ سے مروی ہے جس کو الطبرانی نے معجم الاوسط میں ذکر کیا ہے اور صاحب کنز العمال نے اسے بحوالہ الطبرانی اس بحث میں یہ عبارت ذیل درج کیا ہے:

...عن محمد بن الحنیفه قال تکلم علی رضی اللہ عنہ وابن عباس رضی اللہ عنہ فی متعه النساء فقال له علی رضی اللہ عنہ انک امر تائه۔ ان رسول الله صلی الله علیه وسلم نهی عن المتعه النساء فی حجه

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرزند محمد بن حنیفہ کہتے ہیں کہ ایک بار متعہ النساء کے مسئلہ میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی باہم گفتگو ہوئی تو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے (ناراض ہو کر) جناب ابن عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم ایک متحیر اور ایک طرف میلان رکھنے

الوداع- (کنز العمال لعلی متقی الہندی ص۲۹۵، ج۸، بحوالہ طبس، طبع اوّل، دکن)

والے شخص ہو- جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجتہ الوداع کے موقعہ پر متعہ النساء سے منع فرمادیا اور روک دیا-

گویا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعدد بار منع فرما دینے کے بعد جناب عبداللہ بن عباس کی رائے میں تبدیلی واقع ہوئی اور انہوں نے اس میں رجوع فرمالیا-

○ نیز عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو قرآن مجید کی آیت:

...الا علی ازواجھم او ما ملکت ایمانھم...الخ (پ ۱۸ المومنون) سے بھی تنبہ ہوا تو اس کے بعد آنموصوف رضی اللہ عنہ نے جواز متعہ اور اس کی ضرورت کا پس منظر خود بیان کیا اور فرمایا کہ

... عن ابن عباس قال انما کانت المتعه فی اول الاسلام کان الرجل یقدم البلده لیس له بها معرفه فیتزوج المراه بقدر ما یری انه یقیم فتحفظ له متاعه وتصلح له شیه حتی انا نزلت الایه الا علی ازرواجھم او ما ملکت ایمانھم قال ابن عباس فکل فرج سواھما فھو حرام-

روایت ہذا کا مطلب یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اسلام کے اوائل میں متعہ مباح تھا- ایک شخص کسی شہر میں آتا وہاں اس کی جان پہچان نہیں ہوتی تھی تو وہ اس موقع پر جتنا قدر اس نے وہاں قیام کرنا ہوتا وہ ان ایام کے موافق کسی عورت سے تزوج کرلیتا- تو وہ عورت (منکوحہ) اس کے سامان اور مال و متاع کی حفاظت کرتی- حتیٰ کہ قرآن مجید کی آیت الا علیٰ ازواجھم او ما ملکت ایمانھم (یعنی ان پر ان کے ازواج اور باندیاں حلال ہیں نازل ہوئی) تو ابن عباس نے فرمایا: ان دو قسم کی عورتوں کے ماسوا باقی تمام قسم کی عورتیں حرام ہیں-

(۱) الجامع الترمذی ص۱۸۱، ج۱، کتاب النکاح باب ما جاء فی نکاح المتعہ، طبع قدیم لکھنؤ۔
(۲) السنن الکبریٰ للبیہقی، ص۲۰۵-۲۰۶، ج۷، بحث متعہ۔
(۳) مشکوٰۃ شریف ص۲۷۳، تحت اعلان النکاح الفصل الثالث، طبع دہلی۔
(۴) نصب الرایہ للزیلعی ص۱۸۲، ج۳، بحث متعہ، طبع مجلس علمی، ڈابھیل۔
(۵) شرح ہدایہ فتح القدیر ص۳۸۶، ج۲، تحت کتاب النکاح المتعہ، طبع مصر، معہ العنایہ۔
(۶) روح المعانی ص۶، ج۵، تحت الآیتہ۔

پس روایت ہذا کے ذریعہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا مسلک متعہ کے حرام ہونے کے متعلق واضح ہوگیا۔ نیز یہ روایت جواز متعہ کے قول سے ان کے رجوع کر لینے پر عمدہ قرینہ ہے۔

آیت و روایت کی مزید تشریح

شارحین حدیث کے کبار علماء نے اس مقام میں مندرجہ ذیل وضاحت ذکر کی ہے۔ اس کو ہم بطور تائید نقل کرتے ہیں:

...قال الطیبی یرید ان اللہ تعالی وصفھم یحفظون فروجھم عن جمیع الفروج الا عن الازواج والسراری... والمتمتعہ لیست منھما لان حکم الازواج من التوریث والا یراث غیر جار علیھا ولا ھی مملوکہ بل ھی مستاجرہ نفسھا ایاما معدوتہ فلا یدخل تحت الحکم۔ (الطیبی

یعنی شارح الطیبی کہتے ہیں کہ آیت ہذا کی وضاحت میں جناب ابن عباس رضی اللہ عنہ یہ مراد لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان مومنوں کی توصیف میں فرمایا ہے کہ وہ لوگ اپنے ازواج و گولیوں کے بغیر تمام فروج سے اپنی شرم گاہوں کو محفوظ رکھتے ہیں۔ اور متعہ والی عورت نہ ازواج سے ہے نہ گولیوں میں سے ہے کیونکہ ازواج کے احکام وراثت وغیرہ اس پر جاری نہیں ہوتے اور نہ ہی مملوکہ اور باندی ہے۔ بلکہ

شرح مشکوۃ ص ۲۶۴، ج ٦، تحت الحدیث (ابن عباس رضی اللہ عنہ، شرح مشکوۃ مرقات ص ۲۲۰، ج ٦، تحت حدیث ابن عباس)

یہ چند اوقات یا چند ایام تک اپنی ذات کو اُجرت و کرایہ پر دیئے ہوئے ہے۔ فلہذا یہ زوجہ کے حکم میں داخل نہیں ہو سکتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت ہذا پیش کر کے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اپنا موقف واضح کر دیا کہ زوجہ اور گولی کے ماسوا تمام عورتیں حرام ہیں، حلال نہیں اور متعہ والی عورت بھی انہی میں سے ہے۔

آیت فما استمتعتم به منهن...الخ کی تشریح

ابن عباس رضی اللہ عنہ کے فرمودات کی روشنی میں

(ا) علماء میں "تنویر المقباس عن تفسیر ابن عباس" کے نام سے ایک تفسیر کی کتاب مشہور ہے۔ اس میں جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مذکورہ بالا آیت کے تحت درج ذیل تشریح منقول ہے۔

... فما (استمتعتم) ای استنفعتم (به منهن) بعد النكاح (فاتوهن) فاعطو من اجورهن مهورهن كامله (فريضه) من الله عليكم ان تعطوا المهر تاما...الخ۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ نکاح کے بعد جن عورتوں سے تم نے نفع اٹھایا، پس ان کو ان کے کامل مہر دے دو۔ یہ اللہ کی طرف سے تم پر لازم ہے کہ مہر تمام ان کو دو۔

(تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس ص ۵۵، تحت الآیہ فما استمتعتم...الخ، طبع قدیم مصر)

آیت ہذا کی اس تشریح سے واضح ہو گیا کہ جناب ابن عباس رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس آیت میں نکاح کے بعد عورتوں سے نفع اٹھانا مراد ہے اور پھر ان کو کامل مہر ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (اور متعہ معروفہ مراد نہیں)

(۲) اور ایک مشہور قدیم مفسر ابو جعفر النحاس المتوفی ۳۳۸ھ اپنی تصنیف "الناسخ والمنسوخ" میں جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا آیت ہذا کے تحت قول نقل کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ

... عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال و قولہ (فما استمتعتم) بہ منھن فاتوھن اجورھن فریضہ یقول انا تزوج الرجل المراہ فنکحھا مرہ واحدہ وجب لھا الصداق کلہ' والا ستمتاع النکاح- قال وھو قولہ عزوجل (وآتو النساء صدقاتھن نحلہ) فبین ابن عباس ان الاستمتاع ھو النکاح باحسن بیان-

اس کا مطلب یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ آیت فما استمتعتم بہ... الخ کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص عورت کو تزوج کرے اور اس سے ایک بار نکاح کرے تو اس پر عورت کے لیے تمام مہر واجب ہو جاتا ہے اور اس آیت میں استمتاع سے مراد نکاح ہے- ابو جعفر النحاس کہتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے عمدہ بیان کے ساتھ بتلایا کہ استمتاع سے مراد نکاح ہے- (یعنی متعہ مراد نہیں ہے)

(کتاب الناسخ والمنسوخ لابی جعفر النحاس ص۱۰۵' تحت ذکر آیت السادسہ' طبع قدیم مصر)

جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف سے آیت ہذا کی اس تشریح سے واضح ہوگیا کہ آنموصوف رضی اللہ عنہ کے نزدیک آیت میں استمتاع سے مراد نکاح ہے' معروفہ متعہ مراد نہیں-

قراۃ "الی اجل مسمی" کا حکم

گزشتہ سطور میں آیت فما استمتعتم بہ منھن... الخ کی تشریح کے سلسلہ میں ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہ کے اقوال پیش کیے گئے ہیں- "استمتاع" سے مراد "نکاح کی صورت میں فائدہ اٹھانا" ہے' متعہ مراد نہیں-

اس مقام میں بطور معارضہ کے ہماری کتب سے یہ پیش کیا جاتا ہے کہ بعض روایات میں "الی اجل مسی" کی قرأت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے جس سے اس عقد میں مدت مقررہ معلوم ہوتی ہے تو یہ چیز مذکورہ بالا حوالہ جات کے خلاف پائی گئی۔

تو اس شبہ کے رفع کرنے کے لیے کبار علماء نے مندرجہ ذیل امور ذکر کیے ہیں:

(۱) چنانچہ علامہ ابن عربی اپنے احکام القرآن میں لکھتے ہیں کہ

... روی عن ابن عباس انه سئل عن المتعه فقرا فما استمتعتم به منهن الی اجل مسمی- قال ابن عباس والله لا نزلها الله كذالك وروى عن حبيب بن ثابت قال اعطانی ابن عباس مصحفا قال هذا قراه ابی وفيه مثل ما تقدم ولم يصح ذالك عنهما فلا تلتفتوا اليه-

مطلب یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے جو الی اجل مسمی کی قرأت مروی ہے یا ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔ یہ دونوں چیزوں کا انتساب صحیح نہیں اور ان کی طرف التفات نہ کیا جائے، یہ قابل قبول نہیں۔ (احکام القرآن لابن العربی ص ۱۶۲، ج۱، تحت المسئلہ السابعہ عشر، طبع مصر)

(۲) نیز اس مقام میں مفسرین علماء ایک ضابطہ بیان کرتے ہیں کہ

ایک ضابطہ

... والقراه الشانه لا يبنی عليها حكم لانه لم يثبت لها اصل- (احکام القرآن لابن العربی

اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ قراۃ شاذہ ہے اور جو شاذ قرأت ہو، اس پر کوئی حکم مبنی نہیں ہوتا، اس بنا پر کہ اس کے لیے کوئی

ص ۴۴، ج۱، تحت وعلی الذین یطیقونہ فدیہ، طبع مصر) اصل ثابت نہیں۔

(۳) اور یہ چیز تسلیم شدہ ہے کہ قراۃ شاذہ قراۃ متواترہ کے مقابلہ میں متروک اور ناقابل عمل ہوتی ہے۔ امام النواوی شرح مسلم میں فرماتے ہیں کہ

... وقراه... شاذه لا يحتج بها قرانا ولا خبرا ولا يلزم العمل بها۔

(شرح مسلم شریف للنواوی ص۴۵۰، ج۱، تحت باب نکاح المتعہ، طبع دہلی)

حاصل یہ ہے کہ مندرجات بالا کی روشنی میں "الی اجل مسمی" والی قراۃ ناقابل اعتماد ہے اور غیر مقبول ہے۔ اس کو قبول نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ شاہ عبدالعزیزؒ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ دونوں حضرات کی قرات الی اجل مسمی کے متعلق درج ذیل قاعدہ ذکر کیا ہے:

... روایت شاذہ منسوخہ را در مقابلہ قرآن متواتر و محکم آوردن و قران متواتر محکم بالیقین را گذاشتہ بایں روایت شاذہ کہ بہ ہیچ سند صحیح تاحال ثابت نہ شدہ تمسک کردن برچہ چیز حمل تواں کرد؟

(تحفہ اثنا عشریہ ص ۳۰۳، تحت طعن یازدہم (فاروقی) طبع لاہور)

تنبیہہ

گزشتہ سطور میں ہم نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قراۃ (الی اجل مسمی) کا ضمناً حکم درج کیا ہے لیکن یہاں مستقل طور پر بھی اس کا جواب پیش کرنا مناسب خیال کیا ہے۔

تفسیر الطبری کے جس مقام سے معترض دوستوں نے مواد لے کر اعتراض قائم کیا ہے، وہیں اس کا جواب بھی مذکور ہے۔ السائل کالاعمیٰ کے موافق انہوں نے معاملہ کیا۔ قابل اعتراض مواد لے لیا اور قابل جواب مواد ترک کر دیا، جیسا کہ ان

لوگوں کا شیوہ ہے۔

چنانچہ الطبری لکھتے ہیں:

...اما ما روٰی ابی بن کعب وابن عباس من قراتهما فما استمتعتم به منهن الی اجل مسمی- فقراه بخلاف ما جاءت به مصاحف المسلمین- وغیر جائز لاحد ان یلحق فی کتاب الله شیا لم یات به الخبر القاطع-

اس کا حاصل یہ ہے کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے جو قرأت "الٰی اجل مسمی" کی مروی ہے- وہ تمام مصاحف اہلِ اسلام کے برخلاف پائی گئی ہے اور کسی شخصیت کے لیے یہ بات جائز نہیں کہ کتاب اللہ میں وہ ایسی چیز کا الحاق کرے جو قطعی الثبوت نہ ہو اور یقینی خبر کے ذریعے ثابت شدہ نہ ہو-

(تفسیر الطبری ص ۱۰ ج ۵، تحت الآیۃ بحاشیہ النیشاپوری، طبع قدیم مصری)

نیز ابن العربی نے بھی (جیسا کہ ہم نے قبل ازیں درج کر دیا ہے) ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ دونوں کی قراۃ (الٰی اجل مسمی) کے حق میں ذکر کیا ہے-

ولم یصح ذالک عنهما فلا تلتفتوا الیه-

(احکام قرآن لابن العربی ص ۱۶۲ ج ۱، تحت الآیۃ، طبع قدیم مصر)

یعنی مطلب یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے جو الٰی اجل مسمی کی قرأت مروی ہے یا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے، ان دونوں چیزوں کا انتساب صحیح نہیں اور ان کی طرف التفات نہ کیا جائے، یہ قابل قبول نہیں-

ان تشریحات کے بعد دونوں بزرگوں کی قرأت شاذہ کے ساتھ استدلال کرنے کا جواز نہ رہا-

مسئلہ متعہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کا موقف

ماقبل میں جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے مسئلہ

متعہ کی روایات و آیت اور قرأۃ مخصوصہ کی متعلقہ تشریحات بقدر ضرورت بیان کی ہیں۔

اس کے بعد مسئلہ ہذا میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کا آخری موقف جو علمائے کبار نے ذکر کیا ہے، وہ تحریر کیا جاتا ہے۔ یعنی انہوں نے جواز متعہ کے قول سے رجوع کر لیا تھا۔ ناظرین کرام کے اطمینان کی خاطر چند عبارات پیش کی جاتی ہیں، جو اثبات مسئلہ کے لیے صریح ہیں۔ اس چیز کو بے شمار علماء نے اپنی تصانیف میں اپنی اپنی عبارات میں تحریر کیا ہے۔ ان تمام کو یکجا ذکر کر دینا موجب تطویل اور باعث ملال ہے۔ اختصاراً بعض عبارات لکھی جاتی ہیں:

شمس الائمہ ابوبکر السرخسی اپنے "اصول" میں لکھتے ہیں کہ

...وابن عباس كان يقول باباحه المتعه ثم رجع الى قول الصحابه ويثبت الاجماع برجوعه لا محاله ولم يكن ذالك موجبا تضليله فيها كان يفتي به قيل هذا۔

(اصول السرخسی ص۳۲۱، جلد اول، فصل فی الحکم، طبع معارف النعمانیہ، دکن)

(۲) نیز ابوبکر شمس الائمہ السرخسی نے المبسوط میں تحریر کیا ہے:

... وقال جابر بن يزيد رضى الله عنه ما خرج ابن عباس رضى الله عنهما من الدنيا حتى رجع عن قوله في الصرف والمتعه فثبت النسخ باتفاق الصحابه رضى الله عنهم۔

(المبسوط لابی بکر محمد بن سہل السرخسی ص۱۵۲، جلد خامس (۵) باب نکاح المتعہ)

(۳) اور محی السنہ امام البغوی نے اپنی مشہور تصنیف "شرح السنہ" میں اس مسئلہ کو بہ عبارت ذیل درج کیا ہے:

...وروى عن ابن عباس رضی اللہ عنہ شي عن الرخصه للمضطره اليه بطول لغربه ثم رجع عنه حيث بلغه النهى۔

(شرح السنہ الامام البغوی (الحسین بن مسعود) ص۱۰۰ جلد تاسع (۹) باب نکاح المتعہ، طبع جدید، بیروت)

(۴) اور مشہور محدث ابوبکر محمد بن موسیٰ الہمدانی الحازمی (۵۸۴ ہجری) نے اپنی تصنیف "الاعتبار للناسخ والمنسوخ" میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا رجوع مندرجہ ذیل عبارت میں ذکر کیا ہے:

...واما یحکی عن ابن عباس فانہ کان یتاول فی اباحتہ للمضطرین الیہ بطول الغربہ وقلہ الیسار والجدہ ثم توقف عنہ وامسک عن الفتوی بہ۔

(الاعتبار للناسخ و المنسوخ من الآثار للحازمی ص۱۴۱، تحت ماورد فی المتعہ)

(۵) اسی طرح فاضل القرطبی نے اپنی تفسیر میں ابن العربی کے حوالہ سے اس مسئلہ کو اس طرح ذکر کیا ہے:

... قال ابن العربی وقد کان ابن عباس رضی اللہ عنہ یقول بجوازھا ثم ثبت رجوعہ عنھا فانعقد الاجماع علی تحریمھا۔

(تفسیر القرطبی ص۱۳۲-۱۳۳، ج۵، تحت الآیۃ فما استمتعتم بہ منھن)

(۶) اور صاحب ہدایہ" اور اس کے شارح علامہ بدر الدین العینی رحمتہ اللہ علیہ نے متعہ کے مسئلہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کے موقف کو بالفاظ ذیل لکھا ہے:

م- وابن عباس صح رجوعہ الی قولھم۔

ش - ھذا جواب عما یقال این الاجماع؟ وقد کان ابن عباس رضی اللہ عنہ مخالفا- فاجاب بقولہ وابن عباس رضی اللہ عنہ صح رجوعہ عن اباحتہ المتعہ الی قول الصحابتہ فی تحریمھا وروی جابر بن یزید ان ابن عباس ما خرج من الدنیا حتی رجع عن قولہ فی الصرف والمتعہ فتقرر

الاجماع- ش- ای جماع الصحابتہ فی تحریمها-

(العینی شرح ہدایہ ص۸۴، ج۶ کتاب النکاح، تحت نکاح المتعہ، طبع جدید، ملتان)

اسی طرح متعدد کبار علماء نے ابن عباس کے مسئلہ ہذا میں رجوع کر لینے کو ذکر کیا ہے، ہم نے صرف چند حوالے پیش کر دیئے ہیں۔

حاصل مطلب

مندرجہ بالا حوالہ جات کا حاصل مطلب یہ ہے کہ کچھ عرصہ تک جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ متعہ النساء کے جواز کا قول کرتے تھے اور اس کی رخصت کے قائل تھے۔

لیکن وہ بھی ان لوگوں کے لیے جو مجرد و بے زوجہ ہونے کی وجہ سے اور قلت مال کی بنا پر اس عقد کی طرف مجبور ہوں۔ (یعنی ہر شخص کے حق میں جواز کا حکم نہیں دیتے تھے)

پھر اس کے بعد (متعدد وجوہ کی بنا پر جس طرح کہ قبل ازیں بیان کیا گیا) اس موقف سے رجوع کر لیا اور سابق فتویٰ سے رک گئے۔

پس جناب ابن عباس رضی اللہ عنہ کے رجوع کر لینے سے متعہ کے عدم جواز پر صحابہ کا اتفاق پایا گیا اور اس کی تحریم و حرام ہونے پر اجماع ہو گیا۔

ازالہ شبہات

شیعہ صاحبان جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے بعض اقوال ہماری کتابوں سے پیش کرتے ہیں جن سے جواز متعہ کی تائید حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر طعن کرنا مقصود ہوتا ہے، مثلاً ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ

... انہ کان یراھا الان حلالا قال وقال ما کانت المتعہ الا رحمتہ من اللہ- یرحم اللہ علی عبادہ- ولولا نہی عمر ما

احتج الی الزنا ابدا۔

(رسالہ "جواز متعہ" از سید خادم حسین بخاری شیعی ص۳۱، ۳۲ صدر مبلغ ادارہ تبلیغ شیعہ، جعفریہ کالونی، وزیر آباد)

اسی طرح اس نوع کی دیگر روایات بھی پیش کی جاتی ہیں، جن کا ماحصل یہ ہے کہ

ابن عباس رضی اللہ عنہ متعہ کو حلال اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت جانتے تھے جو اس نے اپنے بندوں پر کی ہے۔ اگر عمر رضی اللہ عنہ اس کی ممانعت نہ کرتے تو کوئی شخص سوائے شقی کے زنا کی طرف محتاج نہ ہوتا۔ (اور زنا نہ کرتا)

جواب

ان پیش کردہ روایات میں ہماری جستجو کی حد تک روایات کی سند میں ایک راوی "ابن جریج" پایا جاتا ہے۔ (جو ان روایات کا ناقل ہے)

ابن جریج کے متعلق ہم نے قبل ازیں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی مرویات کے تحت شبہات کا ازالہ کرتے ہوئے کلام کیا ہے اور یہ بات ذکر کی ہے کہ

ابن جریج کی توثیق اور مدح رجال کی کتابوں میں مذکور ہے۔ تاہم علمائے رجال نے اس پر نقد بھی کیا ہے اور اس کی عملی تصویر کا دوسرا رُخ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

(۱) ... قال الدارقطنی تجنب تدلیس ابن جریج فانہ قبیح التدلیس۔ لا یدلس الا فی ما سمعہ من مجروح۔

(تہذیب التہذیب لابن حجر ص۴۰۵، ۴۰۶، ج۶، تحت ابن جریج)

یعنی دار قطنی کہتے ہیں کہ ابن جریج مدلس ہے (یعنی اپنے شیخ کو بیان نہیں کرتا) اس کی تدلیس سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ ابن جریج قبیح تدلیس کرتا ہے اور اس موقعہ پر کرتا ہے جہاں اس نے مجروح شیخ سے سماعت کی ہو۔

اور ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں ایک دوسرے مقام میں ابن جریج کا طریق کار ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

... بعض تلك الاحاديث التی کان یرسلها ابن جریج احادیث موضوعه- کان ابن جریج لایبالی عن من اخذها-

یعنی ابن جریج جن بعض روایات میں ارسال کرتا ہے تو وہ بعض روایات "موضوع" ہوتی ہیں اور ابن جریج اس بات کی پرواہ نہیں کرتا کہ وہ کیسے شخص سے روایت لے کر بیان کر رہا ہے۔

(۱) تہذیب التہذیب لابن حجر ص۲۴۴،۴۰۶، ج۴، تحت سنید بن داؤد المصیصی۔

(۲) میزان الاعتدال للذہبی ص۶۵۹، جلد ثانی، طبع بیروت، تحت عبدالملک (ابن جریج)

مطلب یہ ہے کہ ابن جریج کی روایات پر علی الاطلاق اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور اس کی مرویات بغیر تحقیق و تنقیح کے قابل قبول نہیں ہو سکتیں۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر طعن کی روایات جو ابن جریج سے منقول ہیں، اسی نوع کی معلوم ہوتی ہے اور ان پر مذکورہ وجوہ کی بنا پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

ابن جریج کا ایک دیگر کردار

نیز کبار علماء نے امام شافعی رحمہ اللہ کے حوالہ سے ابن جریج کے متعلق ایک عجیب انکشاف کیا ہے کہ

امام شافعی فرماتے ہیں... استمتع ابن جریج بسبعین امراه-

(۱) تہذیب التہذیب لابن حجر ص۴۰۵،۴۰۶، تحت ابن جریج، طبع اول، دکن۔

(۲) میزان الاعتدال للذہبی ص۶۵۹، جلد ثانی بیروت، تحت عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج۔

مطلب یہ ہے کہ ابن جریج جواز متعہ کا نہ صرف قائل تھا بلکہ خود فاعل بھی تھا اور اس نے ستر عورتوں کے ساتھ متعہ کیا۔

ابنِ جریج کا رجوع

علماء نے لکھا ہے کہ ابن جریج متعہ کے جواز کا قائل تھا اور اس نے اباحت متعہ کے متعلق اٹھارہ حدیثیں بصرہ میں بیان کیں لیکن اس کے بعد اس نے جواز متعہ کے قول سے رجوع کر لیا اور اپنے جواز متعہ کے فتویٰ کو واپس لے لیا اور ابنِ جریج نے بصرہ میں یہ رجوع علی الاعلان کیا تھا۔

اس چیز پر حوالہ جات ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) ... ویحکی عن ابن جریج جوازها وقد نقل ابوعوانه فی صحیحه عن ابن جریج انه رجع عنها بعد ان روی بالبصره فی اباحتها ثمانیه عشر حدیثا۔

(۲) ... قال (ابن جریج) بالبصره اشهدوا انی قد رجعت عنها یعنی عن الفتوی بحل المتعه بعد ان حدثهم ثمانیه عشر حدیثا انه لا باس به۔

(۱) فتح الباری شرح بخاری ص۱۴۲، ج۹، تحت باب نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم عن النکاح المتعہ۔

(۲) تفسیر مظہری از قاضی ثناء اللہ پانی پتی ص۷۷، ج۲، تحت الآیۃ فما استمتعتم بہ۔ (پ۵)

مندرجہ بالا روایات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ

ابنِ جریج جواز متعہ کا قائل تھا، اباحت متعہ پر اس نے اٹھارہ احادیث نشر کیں، خود کثیر عورتوں سے متعہ کیا اور پھر علی الاعلان جواز متعہ کے قول سے اس نے رجوع کر لیا۔

فلہذا ایسے شخص سے منقول بے اصل روایات کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی اور خلیفہ راشدین پر طعن قائم کرنا ہرگز درست نہیں اور وہ روایات ناقابلِ قبول ہیں۔

شیخین رضی اللہ عنہما اور حضرت علی کے قول پر ابن عباس کا اعتماد

متعہ کے مسئلہ میں ہم نے قبل ازیں منع اور عدم جواز کی مرفوع روایات ذکر کی ہیں اور اس میں اکابر صحابہ کرام مثلاً حضرت علی المرتضیٰ، حضرت عمر فاروق و ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہم کے اقوال بھی نقل کیے ہیں۔ ان تمام میں متعہ کا عدم جواز صریحاً ثابت ہو چکا ہے۔

اور اس مسئلہ میں معارضہ کے طور پر جو ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اقوال پیش کیے جاتے ہیں۔ ان پر حسب قواعد نقد و جرح کر دی ہے اور ان کے عدم قبول کی نوعیت واضح کر دی ہے۔

اب بحث ہذا کے آخر میں جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا مسائل شرعی میں طریق کار ہم نقل کرتے ہیں جو علماء نے ان سے بطور ضابطہ کے ذکر کیا ہے۔ امام بیہقی سنن الکبریٰ میں لکھتے ہیں کہ

... عن عبداللہ بن ابی یزید قال سمعت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالی عنہما انا سئل عن شئی ھو فی کتاب۔ قال بہ وانا لم یکن فی کتاب اللہ وقالہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال بہ وان لم یکن فی کتاب اللہ ولم یقلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقالہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما قال بہ

اس کا مفہوم یہ ہے کہ جناب ابن عباس رضی اللہ عنہ سے جب کسی مسئلہ کو دریافت کیا جاتا، وہ اگر کتاب اللہ میں ہوتا تو کتاب اللہ سے بیان کرتے تھے، اگر کتاب اللہ میں نہ ہوتا اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پایا جاتا تو حدیث سے بیان کرتے اور اگر کتاب و سنت میں نہ موجود ہوتا تو اسے حضرات شیخین (ابوبکر و عمر) رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے بیان کیا ہوتا تو ابن عباس رضی اللہ عنہ ان کے قول کے مطابق بتلاتے۔ اور اگر یہ صورت بھی نہ ہوتی تو اس کے بعد اپنی مجتہدانہ رائے

والا اجتھد رایہ۔ سے مسئلہ ذکر کرتے۔

(السنن الکبریٰ للبیہقی ص۱۱۵، ج۱۰، جلد عاشر، کتاب ادب القاضی، طبع دکن، جامع بیان العلم وفضلہ لابن عبدالبر، ص ۵۸-۵۷، جلد ثانی، طبع مصر)

یہاں سے ابن عباس کا شرعی مسائل میں طریق کار واضح ہوا کہ وہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہ کے اقوال کے ساتھ استدلال کرتے تھے اور مسائل میں ان سے رہنمائی حاصل کرتے اور ان پر اعتماد کرتے تھے۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایام خلافت میں متعہ کے مسئلہ میں اس کے عدم جواز اور منع کے ساتھ فیصلہ ہوچکا تھا پس ابن عباس رضی اللہ عنہ بھی اسی فیصلہ کے مطابق عمل پیرا تھے، ان کے خلاف نہیں تھے۔

اسی طرح ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں مسائل میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو فیصلہ شدہ چیز ثابت ہو جاتی تو اس پر اعتماد کر کے اس کو اخذ کرتے تھے۔ جناب ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اس طرز عمل کو ابن عبدالبر نے اپنی تصنیف جامع بیان العلم و فضلہ میں ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں کہ

... عن میسرہ عن المنھال عن سعید بن جبیر عن ابن عباس قال کنا انا اتانا الثبت عن علی لم نعدل بہ۔

(جامع بیان العلم و فضلہ لابن عبدالبر ص ۵۸ تحت باب اجتھاد الرای علی الاصول عند عدم النصوص)

یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک فیصلہ شدہ اور ثابت شدہ چیز ہمارے پاس پہنچ جائے تو ہم اس کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے۔

اور واضح بات ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے متعہ کے بارہ میں متعہ کے عدم جواز کا فیصلہ دے دیا ہوا ہے۔ (جیسا کہ قبل ازیں گزر چکا ہے) تو معلوم ہوا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ بھی اسی فیصلہ کے موافق قول کرتے تھے، اس کے خلاف نہیں تھے۔

اور لوگوں نے جو روایات ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کے خلاف نقل کی ہیں، وہ ان کے قول و عمل کی روشنی میں مرجوح و متروک قرار دی جائیں گی اور قابل التفات نہ ہوں گی۔

جوازِ متعہ کی روایات کے عدمِ قبول پر قرائن

ناظرین کرام کے افادہ کے لیے اس بحث کے آخر میں یہ چیز مختصراً پیش کی جاتی ہے کہ جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جو اقوال جواز متعہ کے متعلق بطور اعتراض کے پیش کیے جاتے ہیں، ان کے متعلق چند گزارشات قابل ذکر ہیں، ان کو ملحوظ رکھنا درکار ہے۔

○ ان میں سے بعض چیزیں روایات کے متعلق ہیں۔ ان پر گزشتہ صفحات میں ہم نے حسب قواعد نقد و جرح درج کر دی ہے اور ان کے عدم قبول کی نوعیت واضح کر دی ہے۔

دیگر قابل توجہ یہ بات ہے کہ جناب ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی منقولہ روایات اور مسئلہ ہذا میں ان کے اقوال (ما قبل میں جو بیان کیے گئے ہیں) وہ تمام عدم جواز متعہ کی تائید کرتے ہیں اور جواز اقوال کے بالکل برعکس پائے جاتے ہیں۔ گویا کہ مسئلہ ہذا میں جناب ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کے اقوال باہم متعارض و متقابل پائے گئے۔

تو یہاں مرفوع روایات اور جمہور اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فرمودات کے موافق جو ان کے اقوال ہوں گے، انہی کو اخذ کیا جائے گا اور ان پر ہی اعتماد ہو گا اور اس کے خلاف اقوال غیر معتمد اور متروک ہوں گے۔

○ نیز اس مقام میں کبار علماء نے بعض ہدایات ذکر کی ہیں، ان کو پیش نظر رکھنے سے، روایت کے رد و قبول کے بارے میں مزید رہنمائی ہوتی ہے لیکن اس سے قبل ہم ایک یہ چیز ذکر کرتے ہیں کہ جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے وہ تلامذہ اور شاگرد جو حجاز اور مکہ شریف کے علاقہ میں مقیم تھے، انہوں نے آنموصوف رضی اللہ عنہ کی

طرف سے جواز متعہ کی روایات کی بہت تشہیر کی ہے اور پھیلایا ہے۔

○ اور کبار علماء نے اہلِ حجاز کے بارے میں بطور ضابطہ کے یہ بات ذکر کی ہے کہ اہل الحجاز کی پانچ چیزوں سے اجتناب کیا جائے اور انہیں اخذ نہ کیا جائے۔

...قال سمعت الاوزاعی یقول یحتنب اویترک... ومن قول اھل الحجاز خمس... ومن قول اھل الحجاز استماع الملاھی والجمع بین الصلاتین من غیر عذر والمتعه النساء والدراھم بالدرھمین والدینار بالدینارین...الخ۔

مطلب یہ ہے کہ امام اوزاعیؒ کہتے ہیں کہ اہل حجاز کی مندرجہ ذیل چیزوں سے اجتناب کیا جائے اور ان کو متروک قرار دیا جائے۔ گانے بجانے کا سننا، بلاعذر دو نمازوں کو جمع کر کے پڑھنا، عورتوں کے ساتھ متعہ کے جواز کا قول کرنا، ایک درہم کو دو درہموں کے ساتھ یا ایک دینار کو دو دیناروں کے ساتھ تبدیل کرنے کا قول کرنا...الخ۔

(معرفہ علوم الحدیث للحاکم نیشاپوری، ص۶۵، تحت ذکر نوع العشرین --- الخ)

○ اسی طرح علامہ ابن عبدالبر رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی مشہور تصنیف کتاب التمہید میں بطور ہدایت کے مندرجہ ذیل چیز ذکر کی ہے کہ

...وقد کان العلماء قدیما وحدیثا یحذرون الناس من مذھب المکیین اصحاب ابن عباس رضی اللہ عنہ ومن سلک سبیلھم فی المتعه والصرف۔

یعنی قدیم اور جدید علماء لوگوں کو خوف دلاتے ہوئے اجتناب کی تاکید کرتے تھے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اصحاب جو مکہ والے ہیں، ان کے اقوال جو متعہ النساء اور صرف کے متعلق ہیں، ان کو اخذ نہ کیا جائے۔

(کتاب التمہید لابن عبدالبر ص۱۱۵، ج۱۰، طبع اول، مکۃ المکرمہ)

مختصر یہ ہے کہ جواز متعہ کے متعلق اہلِ حجاز اور اہلِ مکہ کی جو روایات ابن

عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہیں، ان کے رد و قبول کے متعلق علماء کرام کی مذکورہ بالا ہدایات کی روشنی میں عمل در آمد کیا جائے گا اور مندرجہ قرائن کو ملحوظ رکھا جائے گا اور جواز متعہ النساء کی ان روایات کو متروک اور مرجوح قرار دیا جائے گا۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ

شیعہ کی طرف سے یہ بات پیش کی جاتی ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ متعہ کے جواز کے قائل تھے اور اس پر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ روایت پیش کرتے ہیں:

...قال ابن مسعود رضی اللہ عنہ کنا نغزوا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم وليس لنا شيی- فقلنا الا نستخصی فنهانا عن ذالك ثم رخص لنا ان تنكح المراه بالثوب ثم قرا علينا يايها الذين آمنوا لا تحرموا طيبات ما احل الله لكم ولا تعتدوا ان الله لا يحب المعتدين- (بخاری شریف، ص۷۵۹، ج۲، تحت باب ما یکرہ من التبتل والخصاء، طحاوی شریف ص۱۴، ج۲، باب نکاح المتعہ)

مفہوم یہ ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں غزوات میں شامل ہوتے اور ہمارے ہمراہ خواتین نہیں تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ہم نے عرض کیا کہ کیا ہم خصی ہونا اختیار نہ کر لیں؟ تو آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں اس بات سے منع فرمایا۔ اس کے بعد آپ نے ہمارے لیے رخصت دی کہ عورت کے ساتھ کپڑے اور پارچہ کے بدلے میں نکاح کر سکتے ہیں۔ یہ روایت جواز متعہ پر دال ہے۔

الجواب

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مسئلہ متعہ کے متعلق ہماری کتابوں سے جو روایات پیش کی جاتی ہیں، ان کے جوابات علماء کرام نے متعدد طریقہ سے ذکر کیے ہیں۔

○ پیش کردہ روایت اس دور سے تعلق رکھتی ہے، جس دور میں متعہ کی رخصت تھی اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعہ سے منع نہیں فرمایا تھا۔

اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا آیت سے استشہاد اور استدلال کرنا اس بات کی اطلاع دیتا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ جواز متعہ کے قائل تھے درآنحالیکہ انہیں ناسخ نہیں پہنچا تھا۔

پھر جب ان کو متعہ کے متعلق نسخ پہنچا تو انہوں نے جواز متعہ سے رجوع کر لیا--- اور جواز متعہ کے قول کو ترک کر دیا۔

فتح الباری میں حافظ ابن حجر نے یہی چیز بالفاظ ذیل ذکر کی ہے۔

... وظاهر استشهاد ابن مسعود رضی اللہ عنہ بهذه الايه هذا يشعر بانه كان يرى بجواز المتعه- فقال القرطبی لعله لم يكن حينئذ الناسخ- ثم بلغه فرجع بعد... ففعله ثم ترك ذالك... ثم جاء تحريمها بعد... ثم نسخ... الخ-

(فتح الباری شرح بخاری لابن حجر ص۹۷، ج۹، تحت باب ما یکرہ من التبتل والخصاء)

مسئلہ ہذا میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا موقف جو سطور بالا میں ذکر کیا گیا ہے، اس پر قرائن موجود ہیں۔ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

○ ابن مسعود رضی اللہ عنہ متعہ النساء کے مسئلہ میں فرماتے ہیں کہ

... عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ فی متعه النساء قال انما	یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے متعہ النساء کے مسئلہ میں فرمایا کہ غزوات کے موقعہ

رخصت لاصحاب محمد ﷺ فی غزاه لهم شکوا الیه فیها العزوبه ثم نسختها آیه النکاح والمیراث والصداق۔
(کتاب الآثار لابی عبداللہ محمد بن الحسن الشیبانی ص۹۳، باب من تزوج المتعہ روایت نمبر ۴۳۲، طبع کراچی، کتاب الآثار الامام ابی یوسفؒ ص۱۵۲، روایت ۶۹۸، طبع بیروت)

میں صحابہ نے آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں العزوبتہ (بغیر زوجہ) ہونے کی شکایت کی تو ان کے لیے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (متعہ) کی رخصت دے دی۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد نکاح اور میراث اور مہر کی آیت نے متعہ کی رخصت کو ختم کردیا۔

○ نیز کبار محدثین اور فقہاء نے متعہ النساء کے مسئلہ میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے موقف کو بہ عبارت ذیل تحریر کیا ہے:

الف... وکان ابن مسعود رضی الله عنه یقول نسختها ایه الطلاق والعده والمیراث۔
(المبسوط لشمس لائمہ السرخسیؒ ص۱۵۲، ج۵، باب نکاح المتعہ، طبع اول، مصر)

ب... عن اصحاب عبدالله بن مسعود قال المتعه منسوخه نسخها الطلاق والصداق والعده والمیراث۔
(السنن الکبریٰ للبیہقی ص۲۰۷، ج۷، تحت ابحاث متعہ النساء، طبع دکن)

ج... وعن ابن مسعود قال المتعه منسوخه نسخها الطلاق والعده والمیراث۔
(الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ص۱۲۰، تحت الآیۃ فما استمتعتم بہ منھن، پ۵)

مندرجہ بالا حوالہ جات کا حاصل یہ ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ طلاق، عدت اور میراث اور صداق (مہر) کے احکام نے متعہ النساء کو منسوخ کردیا۔ مختصر یہ ہے کہ متعہ کے مسئلہ میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے

موقف کو کبار محدثین اور فقہاء نے اپنی اپنی عبارات میں واضح طور پر درج کر دیا ہے کہ ان کے نزدیک:

متعہ النساء کے جواز کا حکم منسوخ اور متروک ہو چکا ہے۔ اور ان کی وہ روایت سابقاً پیش کی گئی ہے' وہ اس دور کے متعلق ہے جس وقت متعہ مباح تھا' ممنوع نہیں ہوا تھا۔

الحازمی کی تحقیق

بحث ہذا کے آخر میں مشہور محدث حافظ ابوبکر محمد بن موسیٰ الحازمی (المتوفی ۵۸۴ھ) کی متعہ النساء کے مسئلہ میں تحقیق پیش کی جاتی ہے جسے اعاظم علماء نے قبول کیا ہے۔ الحازمی "الاعتبار" میں ذکر کرتے ہیں کہ

...وھذا الحکم کان مباحا مشروعا فی صدر الاسلام وانما اباحه النبی صلی الله علیه وسلم لھم للسبب الذی ذکرہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ وانما کان ذالک یکون فی اسفارھم ولم یبلغنا ان النبی صلی الله علیه وسلم اباحه لھم وھم فی بیوتھم ولھذا نھاھم منه غیر مرہ ثم اباحه لھم فی اوقات مختلفه حتی حرمه علیھم فی آخر ایامه صلی الله علیه وسلم فی

متعہ کی اباحت کا حکم ابتداء اسلام میں مشروع اور مباح تھا اور جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو صحابہ کرام کے لیے اس سبب کی بنا پر مباح فرمایا تھا جس کو ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنی روایت میں ذکر کیا ہے اور متعہ کی اباحت صحابہ کرام کے لیے ان کے اسفار میں مباح تھی اور یہ بات ہمیں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پایہ ثبوت کو نہیں پہنچی کہ ان کے لیے حضر میں اور گھروں میں قیام کے دوران متعہ النساء کو مباح فرمایا ہو۔ فلہذا جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعدد بار متعہ النساء سے منع

حجه الوداع- وكان تحريم تابيد لا تاقيت فلم يبق اليوم في ذالك خلاف بين فقهاء الامصار وائمه الامه الا شياء ذهب اليه بعض الشيعه- (الاعتبار في الناسخ والمنسوخ من الآثار للحازمی ص۱۳۸، ۱۳۹، تحت باب نكاح المتعه، طبع مصر)

فرمایا اور پھر مختلف اوقات میں مباح فرمایا حتیٰ کہ آخری ایام میں حجتہ الوداع کے موقعہ پر آنجناب ﷺ نے متعہ النساء کو حرام قرار دے دیا اور یہ حرمت متعہ وقتی نہیں بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تھی- پس اب ملت کے فقہاء اور ائمہ اسلام کے نزدیک اس کی حرمت میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہا، مگر بعض شیعہ اس کے جواز کے قائل ہیں-

تائید وتوثیق

الحازمی کی مندرجہ بالا تحقیق کی تائید اور توثیق علماء کرام نے مندرجہ ذیل الفاظ میں تحریر کی ہے:

... قال الحازمي انه صلى الله عليه وسلم لم يكن اباحها لهم وهم في بيوتهم واوطانهم وانما اباحها لهم في اوقات بحسب الضرورات حتى حرمها عليهم في آخر سنيه في حجته الوداع- وكان تحريم تابيد لا خلاف فيه بين الائمه و علماء الامصار الا طائفه من الشيعه-

صاحب فتح القدیر (ابن ہمامؒ) اور الزیلعی وغیرہما الحازمی کے کلام کا اختصار ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جناب نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے اوطان اور گھروں میں قیام کے دوران میں انہیں متعہ کی اجازت نہیں دی اور اباحت نہیں فرمائی بلکہ ضرورتوں کے مطابق بعض اوقات سفروں میں اجازت دی تھی حتیٰ کہ آخری سالوں میں حجتہ الوداع کے موقعہ پر متعہ النساء کو حرام قرار دیا اور یہ تحریم ابدی تھی-(وقتی نہیں تھی)

(نصب الرایہ للزیلعی ص۱۸۱ ج۳، بحث متعہ، مجلس علمی ڈابھیل، فتح القدیر شرح ہدایہ ص۳۸۶، ج۴، تحت نکاح المتعہ، طبع مصر، مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ لعلی القاری ص۲۱۴، ج۶، طبع ملتان)

اس مسئلہ میں بعض شیعہ کے ماسوا باقی تمام بلادو امصار کے علماء اور ائمہ متعہ کے حرام ہونے پر متفق ہیں اور اس میں اختلاف نہیں رکھتے۔

قرأت "الیٰ اجل مسمی" کا جواب

دیگر یہ چیز شیعہ کی طرف سے ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق پیش کی جاتی ہے کہ

ابن مسعود رضی اللہ عنہ، آیت "فما استمتعتم به منهن..." الخ (پ۵) میں کلمہ "الی اجل مسمی" کے ساتھ قرأت کرتے تھے اور وہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرح متعہ کی حلت کے قائل تھے۔

(جواز متعہ از سید خادم حسین وزیر آبادی الشیعی ص۳۴، ۳۵)

اس چیز کے متعلق اہل السنت والجماعۃ کے کبار علماء نے اپنی کتابوں میں تشریح اور وضاحت ذکر کر دی ہے۔

ذیل میں ان کی عبارات پیش کرتے ہوئے اعتراض مذکور کا جواب مکمل کیا جاتا ہے۔

(۱) امام النواوی نے شرح مسلم شریف میں لکھا ہے کہ

... وقراه ابن مسعود شاذه۔ لا يحتج به قرانا ولا خبرا ولا يلزم العمل بها۔ (شرح مسلم النواوی ص۴۵۰، ج۱، باب نکاح المتعہ، طبع نور محمد، دہلی)

یعنی "الیٰ اجل مسمی" کا کلمہ قرأت شاذہ ہے (مشہور قرأت نہیں) اس کے ساتھ باعتبار قرآن ہونے کے اور روایت ہونے کے احتجاج اور دلیل پکڑنا درست نہیں اور اس پر عمل در آمد کرنا لازم نہیں۔

(۲) اور اسی طرح ابن العربی نے احکام القرآن میں آیت "کتب علیکم الصیام" (پ۲) مسئلہ نمبر۱۳ کے تحت قرأۃ شاذہ کا حکم بہ عبارت ذیل ذکر کیا ہے:

...والقراہ الشاذہ لا یبنی علیہا حکم لانہ لم یثبت لہا اصل۔ (احکام القرآن لابن العربی المالکی ص۳۴، ج اوّل تحت الآیہ کتب علیکم الصیام، طبع مصر)

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید میں جو قرأۃ شاذہ ہو (یعنی مشہور قرأت کے خلاف ہو) اس پر کوئی حکم مبنی نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ اس کے لیے کوئی اصل ثابت نہیں۔

(۳) اور سید محمود آلوسیؒ نے روح المعانی میں "قرأۃ شاذہ" کا مسئلہ منقح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

... والقراہ التی یتقلونہا عمن تقدم من الصحابہ شاذہ (وما دل علی التحریم کایہ الا علی الزواجہم اور ما ملکت ایمانہم- قطعی فلا تعارضہ) (تفسیر روح المعانی السید محمود آلوسی رحمتہ اللہ علیہ، ص۷، ج۵، تحت الآیہ (الاستمتاع)

مطلب یہ ہے کہ جو قراۃ "الی اجل مسمی" کی بعض صحابہ رضی اللہ عنہ سے نقل کی جاتی ہے (یعنی عام قراۃ میں نہیں پائی جاتی) وہ "شاذ" ہے اور جو حکم آیت "الا علی ازواجھم...الخ" سے حرمت پر دلالت کرتا ہے، وہ قطعی ہے اور قراۃ منقولہ (شاذہ" قطعی حکم کا معارضہ نہیں کر سکتی۔ (فلهذا وہ متروک العمل ہے)

نیز شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلوی نے بھی مسئلہ ہذا کی تشریح و توضیح اسی طرح ذکر کی ہے۔

ملاحظہ ہو تحفہ اثنا عشریہ ص۳۰۴، تحت طعن یازدہم (۱۱) (فاروقی)

تنبیہ

قراۃ شاذہ کے متعلقہ یہی حوالہ جات قبل ازیں ہم نے جناب ابن عباس رضی اللہ عنہ،

کی قراۃ "الی اجل مسمی" کے تحت ذکر کر دیئے ہیں، یہاں ان کا اعادہ مسئلہ کی وضاحت کے لیے کیا ہے۔

آخر کلام

گزشتہ صفحات میں جناب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر طعن کے جوابات روایت کے اعتبار سے ذکر کیے گئے ہیں۔ اب ہم یہاں درایت کے اعتبار سے ایک چیز پیش کرتے ہیں جو اعتراض کے ازالہ کے لیے مفید ہے۔

اکابر علماء احناف نے اپنی سند کے ساتھ یہ چیز ذکر کی ہے کہ

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں باہم فقہی اور علمی مذاکرات ہوتے تھے اور اس مقصد کے لیے دو طرح کے حلقے پائے جاتے تھے۔

ایک حلقہ جناب علی بن ابی طالب ابی بن کعب اور ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا شمار ہوتا تھا۔

اور دوسرا حلقہ جناب عمر بن الخطاب، زید بن ثابت اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر مشتمل تھا۔

مذکورہ بالا چھ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اپنے اپنے مقام پر علمی اور فقہی مسائل پر باہمی گفتگو ہوتی تھی، چنانچہ امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ دونوں حضرات نے مذکورہ بالا علمی و فقہی مذاکرات کے حلقوں کا ذکر ذیل عبارت میں کیا ہے:

> قال محمد اخبرنا ابوحنيفه عن الهيثم عن الشعبى (عامر) قال سته من اصحاب محمد صلى الله عليه وسلم يتذكرون الفقه منهم على بن ابى طالب وابى وابوموسى على حده وعمر وزيد (بن ثابت) وابن مسعود رضى الله عنهم۔

(کتاب الآثار الامام محمد بن الحسن الشیبانیؒ ص۱۹۰ روایت ۸۶۶، طبع کراچی،

کتاب الآثار لامام ابی یوسف" ، ص ۲۱۲، روایت ۹۴۲، طبع بیروت)

یہاں سے واضح ہے کہ جناب عبداللہ بن مسعود، حضرت عمر فاروق اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ مسائل پر علمی گفتگو فرمایا کرتے تھے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں متعہ کے حرام ہونے کا اعلان فرمادیا تھا۔

ان واقعات کی روشنی میں ظاہر ہے کہ متعہ کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا ہوگا۔ پس عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پر مسئلہ ہذا کیسے مخفی رہا؟؟

حاصل مقصد یہ ہے کہ روایت کے اعتبار سے بھی اور درایت کے لحاظ سے بھی متعہ کی حرمت کا مسئلہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پر مخفی نہیں تھا اور وہ اس مسئلہ میں جمہور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ متفق تھے اور ان کے ساتھ مسئلہ ہذا میں اختلاف نہیں رکھتے تھے۔

جناب جابر بن عبداللہ اور سلمہ بن الاکوع (رضی اللہ تعالیٰ عنہما)

اس مقام میں شیعہ نے دونوں مذکورہ اصحاب سے جواز متعہ کے متعلق درج ذیل روایت نقل کی ہے:

... عن جابر بن عبدالله وسلمه بن الاكوع قالا كنا فی جيش فاتانا رسول الله صلى الله عليه وسلم انه قد آذن لكم ان تستمتعوا، فاستمتعوا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جناب جابر و سلمہ بن الاکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہم دونوں اصحاب کا بیان ہے کہ ہم ایک جیش (لشکر) میں تھے۔ ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرستادہ آیا۔ اس نے آکر کہا کہ متعہ کرنے کی تم کو اجازت دے دی گئی ہے، تم متعہ کرسکتے ہو۔

الجواب

یہ بات متعدد بار ذکر کی گئی ہے کہ اسلام میں کچھ مدت تک متعہ کی اجازت تھی، پھر بعد میں اس سے منع کر دیا گیا۔ اسے متعہ کے لیے اباحت کا دور کہا جاتا ہے۔ اس اباحت کے دور کے متعلق کئی روایات حدیث میں موجود ہیں۔ ان کا تعلق اس سابق دور کے ساتھ ہے۔

حضرت جابر اور سلمہ رضی اللہ عنہ کی روایت بھی اسی اباحت کے دور کے متعلق ہے۔ متعہ سے امتناع کا حکم بعد میں فرمایا گیا۔ پس اس روایت کو جواز متعہ کے دلائل میں ذکر کرنا ہرگز صحیح نہیں۔ جن صاحبان نے اسے اباحت کے لیے پیش کیا ہے، انہوں نے چشم پوشی کرتے ہوئے حقیقت واقعہ سے رُوگردانی کی ہے۔

اسی طرح مسلم شریف میں بحث ہذا میں سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ کی روایت مذکور ہے۔ اس میں عام اوطاس میں تین روز کے لیے جواز متعہ کا مسئلہ درج ہے لیکن ساتھ فرمان ہے... ثم نھی عنھا یعنی مذکورہ اجازت سہ روز کے بعد متعہ سے منع فرما دیا۔

مطلب یہ ہے کہ اگر حضرت سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ سے متعہ کی اباحت ہے تو ساتھ ہی انہوں نے منع بھی نقل کر دی ہے تو اس نوع کی روایات معترضین کو مفید نہیں اور ہمارے لیے مضر نہیں۔

نیز جابر رضی اللہ عنہ کے متعلق ایک دیگر روایت نقل کی گئی ہے جس میں مذکور ہے کہ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ مکہ میں عمرہ کے لیے تشریف لائے تو روایت کرنے والا راوی (عطاء) کہتا ہے کہ آنموصوف رضی اللہ عنہ سے لوگوں نے مسائل دریافت کیے اور ان میں متعہ النساء کے بارے میں بھی سوال کیا تو جواب میں حضرت جابر بن عبداللہ نے فرمایا:

... فقال نعم استمتعنا یعنی (حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے) فرمایا کہ

علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکر وعمر رضی اللہ عنہ۔	ہاں! جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہم نے متعہ کیا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ، و عمر رضی اللہ عنہ، کے عہد میں بھی متعہ کیا۔

(رسالہ جواز متعہ از سید خادم حسین بخاری الشیعی، وزیر آبادی، ص۳۶)

اس روایت کے پیشِ نظر معترض اعتراض کرتے ہیں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ، بمع دیگر صحابہ کے عہدِ نبوی اور شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے زمانہ میں متعہ کیا کرتے تھے، فلہذا متعہ کرنا درست ہے۔

الجواب

مندرجہ بالا اعتراض کے جواب میں ہم یہاں چند گزارشات پیش کرتے ہیں۔ ناظرین کرام توجہ فرمائیں:

○ علماء کرام نے مذکورہ روایت کے جواب میں تحریر کیا ہے کہ

(الف)... هذا محمول علی ان الذی استمتع فی عهد ابی بکر وعمر لم یبلغه النسخ۔

(۱) شرح مسلم للنواوی ص۴۵۱، حاشیہ مسلم شریف، جلد اوّل، طبع دہلی۔

(۲) تفسیر رُوح المعانی ص۹، ج۵، تحت الآیہ، پ۵، طبع مصر۔

(ب)... ان یقال لعل جابرا ومن نقل عنه استمرارهم علی ذالک بعده صلی الله علیه وسلم الی ان نهی عنها عمر لم یبلغهم النهی۔

(۱)) فتح الباری شرح بخاری ص۱۴۱، ج۹، تحت بات نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن النکاح المتعہ اخرا۔

(۲) فتح الملہم حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ص۴۴۲، ج۳، تحت باب نکاح المتعہ، طبع اوّل۔

(۳) شرح معانی الآثار للطحاوی ص۹۵ جلد ثانی، باب نکاح المتعہ، طبع دہلی۔

مندرجات بالا کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور ان سے نقل کرنے والے حضرات نے جو متعہ کا استمرار بعد النبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نقل کیا ہے حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے متعہ سے منع کا اعلان فرما دیا۔ تو ان حضرات کو متعہ کا نسخ اور اس کی حرمت نہیں پہنچی تھی، اس بنا پر ان سے یہ قول صادر ہوا۔

نیز اعتراض مذکورہ بالا کے ازالہ کے لیے اکابر علماء نے اس طریقہ سے بھی جواب پیش کیا ہے۔ ابن القیم لکھتے ہیں کہ

... فوجب حمل حدیث جابر رضی اللہ عنہ على ان الذي اخبر عنها بفعلها لم يبلغه التحريم ولم يكن قد اشتهر حتى كان زمن عمر رضي الله عنه فلما وقع فيها النزاع ظهر تحريمها واشتهر۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ والی روایت (جس میں انہوں نے متعہ کرنے کی خبر دی ہے) کا محمل یہ ہے کہ ان کو تحریم متعہ کی خبر نہیں پہنچی تھی۔

(زاد المعاد لابن القیم الجوزیہ" ص۵۶۳-۴۶۴، ج۳، طبع بیروت)

اور یہ منع کا فرمان نبوی پوری طرح مشہور نہیں ہوا تھا حتیٰ کہ فاروقی عہد خلافت آگیا اور پھر جب اس دور میں مسئلہ ہذا نزاع پیش آیا اور بحث و تمحیص ہوئی تو متعہ کی حرمت پوری طرح ظاہر ہوئی اور مشتہر ہو گئی۔

اور اسی مسئلہ کی وضاحت میں حافظ ابن حجر رحمتہ اللہ علیہ عسقلانی نے ایک دوسرے مقام میں حضرت جابر کے قول کے تحت دو چیزوں پر بحث کی ہے۔ ان میں ایک متعہ ہے، دوسری طلاق ثلاثہ کا مسئلہ ہے۔ فرماتے ہیں کہ

... فالراجح في... تحريم المتعه... للاجماع الذي انعقد في عهد عمر على

اس کا مفہوم یہ ہے کہ... راجح اس مقام میں یہ بات ہے کہ متعہ کی تحریم اس اجماع کی بنا پر ہے جو عہد فاروقی میں منعقد

ذالک ولا یحفظ ان احدا فی عہد عمر خالفہ، فی واحدہ منہما۔ قد دل اجماعہم علی وجود ناسخ وان کان خفی عن بعضہم قبل ذالک حتی ظہر لجمعہم فی عہد عمر فالمخالف بعد ہذا لاجماع منا بذلہ والجمہور علی عدم اعتبار من احدث الاختلاف بعد الاتفاق۔ واللہ اعلم۔

ہوگیا تھا اور اس عہد میں اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی صاحب کا مسئلہ ہذا کے متعلق خلاف کرنا منقول نہیں پایا گیا۔ اس اجماع کے ذریعے معلوم ہوا کہ ان حضرات کے پاس تحریم متعہ کے لیے دلیل نسخ موجود تھی۔ اگرچہ بعض حضرات پر قبل ازیں یہ ناسخ مخفی تھا حتیٰ کہ اب عہد فاروقی میں سب کے سامنے نسخ واضح ہوگیا۔ پس اب اس اجماع کے بعد جو شخص اس کا خلاف کرے وہ اس کو گرانے والا ہوگا اور اس نوع کے مسائل میں اتفاق کے بعد اختلاف پیدا کرنا جمہور علماء کے نزدیک قابل اعتبار نہیں۔

(فتح الباری لابن حجر ص۱۴۹، ج۹، تحت من جوز الطلاق الثلاث، بذل المجهود فی حل ابی داؤد السجستانی ص۶۴، ج۳ باب فی نسخ المراجعہ، الخ)

خلاصہ کلام

یہ ہے کہ جناب جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جس قول کو معترض پیش کرتے ہیں، اس کا پس منظر سابق حوالہ جات میں بیان کر دیا ہے۔ یعنی بعض حضرات پر متعہ کی منسوخی کا حکم تاحال مخفی تھا اور مسئلہ منقح ہو کر سامنے نہیں آیا تھا۔

لیکن جب عہد فاروقی میں اس پر بحث ہوئی اور اس کے نسخ پر صحابہ کا اجماع منعقد ہوگیا تو اس کی تحریم واضح ہوگئی۔

اب اس اجماع و اتفاق کے بعد کسی شخص کا اختلاف اور خلاف کرنا معتبر

نہیں۔

مختصر یہ ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کا مذکور قول اس صورت میں واقع ہوا ہے کہ تاحال مسئلہ ہذا کی تفصیلات ان کے سامنے نہیں آئی تھیں۔ جب اس کی تحریم پر اجماع واقع ہوگیا تو جناب جابر رضی اللہ عنہ نے بھی اس میں خلاف نہیں کیا اور اتفاق کرلیا۔ اندریں حالات حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے فرمان کے ساتھ جواز متعہ پر استدلال کرنا صحیح نہیں۔

عمران بن الحصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ

معترض لوگوں نے مشہور صحابی عمران بن حصین سے جواز متعہ کے متعلق درج ذیل روایت پیش کی ہے کہ

... نزلت آیه المتعه فی کتاب الله ولم ینزل بعدها آیه تنسخها وامرنا بها رسول الله صلی الله علیه وسلم وتمتعنا بها ومات ولم ینهنا عنه ثم قال رجل برایه ماشاء۔ (رسالہ جواز متعہ از سید خادم حسین بخاری الشیعی ص ۳۳)

یعنی عمران بن حصین کہتے ہیں کہ آیت متعہ اللہ کی کتاب میں نازل ہوئی۔ اس کے بعد اس کو منسوخ کردینے والی کوئی آیت نازل نہیں ہوئی اور ہمیں جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات کا امر فرمایا۔ ہم نے تمتع کیا، پھر حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتقال ہوگیا تو آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو منع نہیں فرمایا، الخ۔

الجواب

عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی روایت ہذا معترضین نے ہماری تفسیر کی کتابوں سے پیش کی ہے۔

اس کے متعلق علماء نے لکھا ہے کہ اس روایت میں متعہ سے مراد متعہ الحج

ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں حج کو فسخ کر کے عمرہ ادا کرنے اور احرام حج سے نکل کر عمرہ کے افعال میں بغیر عذر داخل ہونے میں اختلاف ہوا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کو سختی کے ساتھ اس طریقہ کو اختیار کرنے سے منع فرماتے تھے۔ صرف تمتع یعنی عمرہ کو اشہر الحج میں ادا کرنے سے منع نہیں فرماتے تھے۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیزؒ نے قاضی عیاضؒ کے حوالہ سے تحفہ اثنا عشریہ میں یہی توجیہ نقل کی ہے:

قال القاضی عیاض ظاهر حدیث جابر و عمران بن حصین و ابی موسی رضی الله تعالی عنهم ان المتعه التی اختلفوا فیها انما هی فسخ الحج الی العمره- قال ولهذا کان عمر رضی الله عنه یضرب الناس علیها ولا یضربهم علی مجرد التمتع ای العمره فی اشهر الحج-

قولہ فسخ الحج الخ یعنی فسخ حج بسوئے عمرہ و خروج از احرام حج بافعال عمرہ بے عذر و بر ہمیں است اجماع امت کہ متعہ الحج بلاعذر حرام است و جائز نیست۔

(تحفہ اثنا عشریہ از شاہ عبدالعزیزؒ ص ۳۰۴، تحت طعن یازدہم، فاروقی)

اب اس چیز پر قرینہ پیش کیا جاتا ہے کہ روایت مذکورہ میں متعہ سے مراد متعہ الحج ہے۔ (متعہ النساء نہیں)

چنانچہ مسند امام احمدؒ میں عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی اپنی مرویات مرفوعہ موجود ہیں۔ فرماتے ہیں کہ

ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قد جمع بین حج وعمره ثم لم ینه عنه حتی مات ولم ینزل القرآن فیه یحرمه... الخ

اسی مقام میں دوسری جگہ عمران بن حصین ذکر کرتے ہیں:

... ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قد جمع بین حجه وعمره ثم لم ینزل فیها کتاب ولم ینه عنها النبی صلی الله علیه وسلم... الخ

(مسند امام احمدؒ ص۴۲۷، ج۴، تحت مسندات عمران بن حصین)

... مندرجہ بالا ہر دو روایات کا مفہوم یہ ہے:

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حج اور عمرہ کو جمع کر کے ادا فرمایا۔ پھر اس سے منع نہیں فرمایا۔ حتیٰ کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا انتقال ہو گیا اور قرآن مجید میں بھی کچھ نازل نہیں ہوا جو اس (متعہ الحج) کو حرام قرار دے۔

مذکورہ بالا روایات کے ذریعہ صاف طور پر ثابت ہوا کہ عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے جو روایت متعہ کے متعلق پیش کی گئی ہے۔ وہاں متعہ الحج مراد ہے۔ (متعہ النساء مراد نہیں)

معترض دوستوں نے مندرجہ بالا قابل اعتراض روایت تفسیر کبیر للرازی اور تفسیر غرائب القرآن نیشاپوری سے نقل کی ہے۔

اصولی طور پر اس کا جواب ہم سطور بالا میں پیش کر چکے ہیں۔ تاہم اس کے متعلق چند ایک امور ذکر کرنا فائدہ سے خالی نہیں۔ ناظرین کرام توجہ فرمائیں۔

تفسیر کبیر للرازی میں روایت مذکورہ بالا کو ذکر کیا گیا ہے، لیکن مأخذ کا حوالہ دیئے بغیر اور بغیر کسی محدث کے حوالہ کے اور بغیر کسی سند کے ایک قول کے درجہ میں عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی روایت کو درج کر دیا گیا ہے اور صاحب غرائب القرآن نیشاپوری نے بھی اس روایت کو تفسیر کبیر ہی سے نقل کیا ہے اور روایت ہذا کا کوئی جدید مأخذ نہیں بتایا۔ تفسیر نیشاپوری تفسیر کبیر رازی کا اختصار اور خلاصہ ہے اور یہ چیز اہلِ علم کو معلوم ہے۔

فلہذا اس کا علیحدہ جواب دینے کی ضرورت اور حاجت نہیں، بالفرض اگر روایت مندرجہ بالا درست ہے تو اس کا محمل وہی ہے جو ہم نے اکابر علماء کے حوالہ

جات کی روشنی میں بیان کر دیا ہے۔

علیٰ سبیل التنزل

اگر بالفرض پیش کردہ روایت کو متعہ النساء کے متعلق تسلیم کر لیا جائے تو یہ روایت مفہوماً صحیح نہیں ہوگی، اور اس کا مضمون (کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا انتقال ہوا اور آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہم کو متعہ النساء سے منع نہیں فرمایا) بالکل واقعات کے برخلاف ہے۔

وجہ یہ ہے کہ سابقہ صفحات میں ہم متعدد بار درج کر چکے ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے چند ایام کی اباحت کے بعد فتح مکہ کے موقع پر اور پھر حجتہ الوداع میں صریحاً عورتوں کے ساتھ متعہ سے منع فرمادیا اور حرام قرار دیا تھا۔ حرمت متعہ کے اس فرمان کو متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بے شمار احادیث میں ذکر فرمایا ہے اور ان روایات میں سے ہم نے چند ایک ماقبل میں ذکر کر دی ہیں جو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ، حضرت سبرۃ بن معبد الجہنی حضرت ابو ہریرہ وغیرہم سے مروی ہیں اور ان کے حوالہ جات سابقاً درج کر دیئے ہیں۔ بنا بریں روایت کو متعہ النساء کے متعلق محمول کرنا قطعاً درست نہیں۔

"الانتباہ"

اہلِ علم کے افادہ کے لیے عرض کر دینا مناسب ہے کہ تفسیر نیشاپوری کے اس مقام (بحث متعہ) کے آخر میں لکھا ہے کہ... واکثر الروایات انہ صلی اللہ علیہ وسلم اباح المتعہ فی حجتہ الوداع وفی یوم الفتح --- الخ۔

(تفسیر غرائب القرآن علی تفسیر الطبری ص۱۸، جلد خامس، تحت الآیۃ تالیف نظام الدین حسن بن محمد بن حسین القمی النیشاپوری المتوفی ۷۱۰ھ)

یعنی حاصل یہ ہے کہ اس مقام کی اکثر روایات اس طرف ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ و سلم نے حجتہ الوداع اور فتح مکہ کے موقعہ پر متعہ النساء کو مباح قرار دیا۔

مصنف نے اس قول کو کسی صحابی یا مشہور تابعی یا دیگر کسی نامور عالم کی طرف نسبت کیے بغیر یہاں درج کر دیا ہے۔

اہلِ علم پر واضح ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر صرف چند روز (غالباً ۳ یوم) متعہ کی اباحت فرمائی گئی لیکن اس کے بعد انہی ایام میں آنجناب صلی اللہ علیہ و آلہٖ و سلم نے کعبتہ اللہ کے پاس متعہ کی حرمت کا اعلان فرمایا اور اسے ممنوع قرار دیا۔

پھر حجتہ الوداع ۱۰ھ میں تو اس کی اجازت فرمائی ہی نہیں بلکہ واضح الفاظ میں اس کو حرام کہا اور منع فرما دیا۔

حیرت کی بات ہے کہ صاحب تفسیرہٰذا نے یہ اکثر الروایات کہاں سے اخذ کی ہیں؟؟ مصنف تفسیر کے مذکورہ کلمات احادیث صحیحہ مشہورہ کے بالکل برخلاف اور واقعات کے برعکس ہیں۔

فلہٰذا یہ عبارت اس مقام کی الحاقی ہے اور کسی صاحب نے یہاں ازخود اضافہ کر دی ہے۔

حضرت اسماء بنت ابی بکر

معترض دوستوں کی طرف سے ایک روایت یہ پیش کی جاتی ہے کہ اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا بنت ابی بکر رضی اللہ عنہ بھی جواز متعہ کی قائل تھیں اور ان سے مندرجہ ذیل روایت منقول ہے:

فقالت (اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہ) فعلناها علی عهد النبی صلی الله علیه وسلم یعنی اسماء کہتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم کے عہد میں ہم نے متعہ کیا اور بعض دیگر روایات میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا قول یہ

ہے کہ قد کان ذالک تو اس میں اس بات کی تصدیق کی ہے کہ یہ فعل اس دور میں ہوا تھا۔ (رسالہ جواز متعہ از سید خادم حسین شیعی بخاری، ص۳۶)

الجواب

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے جو کلمات روایات مذکورہ میں منقول ہیں، ان کا مطلب یہ ہے کہ جس دور میں متعہ کے لیے اباحت تھی، اس دور میں ہم مسلمان عورتوں سے یہ فعل صادر ہوا۔ ان کلمات کا ذکر کرنے سے آئندہ کے لیے متعہ کا جواز لازم نہیں آتا اور اس فعل کے نہ منسوخ ہونے پر یہاں کوئی الفاظ دلالت نہیں کرتے اور ظاہر بات ہے کہ متعہ کے لیے پہلے اباحت تھی لیکن بعد میں یہ فعل منسوخ ہوگیا پھر منسوخ شدہ فعل سے جواز کے لیے استدلال کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟؟

پس اس صورت حال میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے کلمات سے جواز متعہ کے لیے تائید حاصل کرنا بے جا ہے اور درست نہیں۔

ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ

معترضین احباب کہتے ہیں کہ ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ بھی جواز متعہ کے قائل تھے اور ان سے مروی روایت اس طرح ہے کہ

... قال (ابوسعید) کنا نتمتع علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالثوب۔

یعنی ابو سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں ہم ایک کپڑے کے عوض میں متعہ کر لیا کرتے تھے۔

(کنز العمال ص۲۹۵، جلد اوّل)

ایک دوسری روایت میں اس طرح ہے کہ

... عن ابی سعید لقد کان احدنا یتمتع علی القدح سولیقا-

اور اس طرح بھی ابو سعید خدری سے منقول ہے کہ ہمارا ایک آدمی ستو کے ایک پیالہ کے عوض میں بھی متعہ کر لیا کرتا تھا۔

(کنز العمال ص ۲۹۵ ج ۸، بحوالہ (عب) بحوالہ ابن جریر)

الجواب

ناظرین کرام توجہ فرمائیں کہ جناب ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے ان اقوال میں صرف یہ چیز بیان کی گئی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں یعنی جن ایام میں متعہ کے لیے اباحت تھی، اس دور میں ہم لوگوں نے قلیل شے (مثلاً کپڑا، ستو کا پیالہ وغیرہ) کے بدلہ میں متعہ کا فعل کیا تھا۔ یہ دور اباحت متعہ کا تھا، اس میں یہ فعل پایا گیا۔ اب یہ روایات دواماً جواز متعہ کے لیے کیسے پیش کی جا سکتی ہیں؟؟ یہ تو سابق دور کے متعلق روایات ہیں، ان کو بطور اعتراض پیش کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

معترضین کے لیے یہ روایات مفید نہیں اور ہمارے لیے مضر نہیں، پس اس نوع کی روایات کو پیش کرنا بالکل بے فائدہ کارروائی ہے اور ضابطہ کے اعتبار سے درست نہیں۔

خلاصہ

معترض لوگوں نے جواز متعہ (النساء) کے استدلال میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے جن روایات کو پیش کیا ہے۔ ہم نے ان مرویات کا سابقہ صفحات میں بقدر کفایت جواب درج کر دیا ہے۔

عموماً ان مرویات کی صورت حال اس طرح پائی جاتی ہے کہ ان کا تعلق اس دور کے ساتھ ہے جس دور میں متعہ مباح تھا اور تاحال اس سے منع وارد نہیں ہوئی

تھی- یا پھر دوسری صورت یہ ہے کہ صاحب روایت یا صاحب واقعہ کو قبل ازیں امتناع متعہ کا صحیح علم نہیں تھا اور اس کے ممنوع ہونے کی یقینی خبر حاصل نہیں تھی- اس بنا پر وہ اس کی اباحت کے قائل تھے-

پھر امتناع متعہ کا مسئلہ جب واضح طور پر ان حضرات کے سامنے آگیا اور منقح ہوگیا تو انہوں نے اس کو متروک العمل قرار دے کر اس سے اجتناب اختیار کر لیا اور اپنے موقف سے رجوع فرمالیا-

اگر بالفرض والتقدیر ان صورتوں کے علاوہ کوئی اور صورت یا واقعہ پایا گیا تو وہ شاذ کے درجہ میں ہوگا- اس کو جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قول و عمل کے برخلاف ہونے کی بنا پر ترک کر دیا جائے گا-

اور فرمانِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے: "فعلیکم بالجماعہ" یعنی جماعت کے ساتھ رہنا لازم ہے' الخ-

... وایاکم الفرقہ- جماعت سے افتراق مت اختیار کرو...

الخ-

پس ان ہدایات کی روشنی میں دینی مسائل کے معاملہ میں کثیر جماعت کے ساتھ متفق رہنا اسلام کا حکم ہے- ان مسائل میں متعہ بھی ہے اور متعہ کے مسئلہ میں کثیر جماعت کا جو طریقہ ہے' وہی ٹھیک ہے- افتراق سے اجتناب کرتے ہوئے اسی کو اختیار کرنے کا حکم ہے-

امام جعفر صادق رحمتہ اللہ علیہ

ائمہ اربعہ حضرات کے اقوال نقل کرنے سے قبل ہم اس مقام میں جناب امام جعفر صادقؒ بن امام محمد باقرؒ کا فرمان نقل کرنا مناسب سمجھتے ہیں-

محدثین نے اس فرمان کو اپنی سند کے ساتھ نقل کیا ہے- چنانچہ امام بیہقی نے اپنی سند کے ساتھ تحریر کیا ہے کہ

... عن بسام الصیرفی قال سالت جعفر بن محمد عن المتعہ فوصفتھا۔ فقال لی ذالک الزنا۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی ص۲۰۷، ج۷، تحت باب نکاح المتعہ)

اس روایت کا مفہوم یہ ہے کہ بسام الصیرفی نے جناب امام جعفر صادق رحمتہ اللہ علیہ سے متعہ کے متعلق سوال کیا۔ پھر وہ کہتا ہے کہ میں نے جناب امام صاحب کے سامنے متعہ کی تشریح بیان کی تو آنموصوفؒ نے فرمایا کہ یہ تو زنا ہے۔

معلوم ہوا کہ جو مشہور و معروف متعہ ہے، اسے ائمہ حضرات زنا کے درجہ میں شمار کرتے ہیں۔

فقہائے امت کا موقف متعہ کے مسئلہ میں

متعہ کے ممنوع ہونے کے متعلق چند ایک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مرفوع روایات گزشتہ صفحات میں درج کی ہیں جن کے ذریعے متعہ کا امتناع واضح طور پر ثابت کر ہوگیا اور ساتھ ہی بطور طعن پیش کردہ روایات کا جواب بھی احسن طریق سے بیان کر دیا ہے۔

علاوہ ازیں بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال اور اکابر تابعین کے آثار بھی موجود ہیں جن میں متعہ کی حرمت واضح طور پر پائی جاتی ہے لیکن یہ سلسلہ بہت طویل ہے جس کا مفصل ذکر کرنا موجب طوالت ہے۔

فلہذا اختصار کے پیش نظر یہاں صرف فقہ کے ائمہ اربعہ کے چند اقوال ذکر کرنا ہم مناسب سمجھتے ہیں۔ "ائمہ اربعہ" امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ ملت اسلامیہ کے اکابر فقہاء میں شمار ہوتے ہیں۔

ان کا موقف متعہ کے متعلق اختصاراً پیش کیا جاتا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کا موقف

امام ابوحنیفہؒ (نعمان بن ثابت المتوفی ۱۵۰ھ) کے شاگرد امام ابویوسف اپنی تصنیف "کتاب الآثار" میں ذکر کرتے ہیں کہ

... حدثنا یوسف عن ابیه عن ابی حنیفه عمن حدثه عن الزهری انه قال: نهی النبی صلی الله علیه وسلم عن المتعه یوم فتح مکه۔

مطلب یہ ہے کہ امام صاحب کو اس شخص نے بتایا جس کو علامہ الزہری نے بیان کیا کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فتح مکّہ کے دن متعہ کرنے کو منع فرمادیا۔

(کتاب الآثار لامام ابی یوسف ص۱۵۲، روایت نمبر۷۰۱، طبع بیروت، جامع مسانید لامام الاعظم ص۸۶، ج۲، طبع اوّل، حیدر آباد دکن)

روایت ہذا کے ذریعے متعہ کے سلسلہ میں امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا مسلک واضح ہوگیا کہ آنموصوف رحمتہ اللہ علیہ تحریم متعہ کے قائل ہیں۔

تنبیہہ

احناف کے نزدیک اس مسئلہ کے متعلق بہت کچھ تفصیلات ہیں۔ ان حضرات کے موقف کو واضح کرنے کے لیے ہم نے یہاں صرف ایک روایت مذکورہ پر اکتفا کیا ہے اور یہ اثبات مدعیٰ کے لیے کافی ہے۔

امام مالکؒ کا موقف

امام مالک بن انس رحمتہ اللہ علیہ المتوفی ۱۷۹ھ نے اپنے مسلک و مذہب کی مشہور تصنیف الموطاء میں ایک مستقل عنوان "باب نکاح المتعہ" قائم کیا ہے۔ اس میں حرمت متعہ کے لیے درج ذیل روایت نقل کی ہے۔

(الف)... عن علی ان رسول الله صلی الله علیه وسلم نهی عن المتعه النساء یوم خیبر وعن لحوم الحمر الانسیه-

یعنی حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خیبر کے دن متعہ النساء اور پالتو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا-

(موطاء امام مالک ص ۵۰۷، تحت باب نکاح المتعہ، طبع کراچی)

(ب) امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کے مسلک کی مشہور کتاب "المدونہ الکبریٰ" میں بھی آنموصوف نے متعہ کی حرمت کے متعلق ایک سوال کا جواب ارشاد فرمایا کہ

(قلت) ارایت ان قال اتزوجک شهرا ایبطل النکاح ام یجعل النکاح صحیحا ویبطل الشرط؟ (قال) قال مالک النکاح باطل ویفسخ وهذه المتعه- قد ثبت من رسول الله صلی الله علیه وسلم تحریمها- (المدونہ الکبریٰ ص ۱۹۷، جز ثالث (جلد ثانی) فی نکاح الیٰ اجل، طبع مصر)

روایت مذکورہ بالا کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص نے امام مالک رحمتہ اللہ علیہ سے سوال کیا کہ ایک آدمی ایک عورت کو کہتا ہے کہ میں ایک مہینہ کے لیے تیرے ساتھ نکاح کرتا ہوں- کیا یہ نکاح باطل ہو جائے گا یا نکاح صحیح ہوگا؟ اور شرط (شہرا) باطل ہوگی؟؟ یا نہیں؟؟--- اس استفسار کے جواب میں امام مالک رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا: یہ نکاح باطل ہے اور یہ متعہ ہے اور تحقیق جناب اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے متعہ کا حرام ہونا ثابت ہو چکا ہے-

تنبیہہ

مندرجات بالا سے امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک واضح ہو گیا کہ ان کے نزدیک متعہ کا عقد ناجائز اور حرام ہے-

ایک غلط انتساب کا ازالہ

فقہ کی بعض کتب میں یہ قول پایا جاتا ہے کہ امام مالک رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ متعہ کا نکاح جائز ہے۔

نکاح المتعه جائز عند مالك۔

اس کے متعلق ذیل میں چند ایک چیزیں بطور جواب ذکر کی جاتی ہیں۔

(الف) پہلی بات تو یہ ہے کہ مذکورہ قول امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کی طرف سہواً منسوب کیا گیا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ متعہ کے عدم جواز اور ممنوع ہونے کے متعلق امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کا قول آنموصوف کے مسلک وہ مذہب کی مشہور کتب میں امام مالک رحمتہ اللہ علیہ سے منقول ہے۔ جیسا کہ گزشتہ سطور میں موطا امام مالک رحمتہ اللہ علیہ اور المدونہ الکبریٰ سے حوالہ نقل کیا ہے۔

(ب) دوسری گزارش یہ ہے کہ اس فن کے کبار علماء (مثلاً بدر الدین العینی شارح الہدایہ) وغیرہ نے صاف طور پر لکھا ہے کہ امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کی طرف جواز متعہ کی نسبت کرنا سہو ہے۔ کیونکہ مالکیوں کی کتابوں میں نکاح متعہ کی حرمت اور عدم جواز مذکور ہے۔

شرح ہدایہ للعینی کی عبارت میں یہ مسئلہ بالفاظ ذیل درج ہے کہ

...قال مالك رحمة الله عليه هو جائز (ش) اى نكاح المتعه جائز- قال الكاكى هذا سهو فان المذكور فى كتب مالك رحمة الله عليه حرمه نكاح المتعه وقال فى المدونه ولا يجوز النكاح الى اجل قريب او بعيد وان سمى صداقا وهذه المتعه-

(العینی شرح الہدایہ ص۷۸، ج۲، کتاب النکاح، تحت مسئلہ متعہ)

اور ملا علی قاریؒ نے شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ

... قال ابن همام نسبته الی مالک رحمه الله علیه غلط۔

یعنی ابن ہمامؒ کہتے ہیں کہ (متعہ کے) جواز کے قول کی امام مالکؒ کی طرف نسبت کرنا بالکل غلط ہے۔

(۱) مرقاۃ المصابیح لملا علی القاری ص۲۱۳، ج۷، باب اعلان النکاح، طبع ملتان، فتح القدیر (شرح ہدایہ) ص۳۸۵، ج۲، تحت النکاح الموقت۔

(۲) فتح القدیر شرح الہدایہ ج۲ ص۳۸۵، تحت النکاح الموقت۔

نیز تفسیر روح المعانی میں پارہ پنجم کی آیت فما استمتعتم--- الخ کے تحت علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ...

... ونقل الحل عن مالک رحمه الله علیه غلط لا اصل له۔

یعنی (متعہ کے) حلال ہونے کے قول کی امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کی طرف نسبت کرنا بالکل غلط ہے اور اس کی کوئی بنیاد نہیں اور بے اصل ہے۔

علی سبیل التنزل

جواز متعہ کا انتساب جو امام مالک کی طرف کیا گیا ہے، اسے اگر بالفرض تسلیم کر لیا جائے تو بھی یہ بات امام مالک کے اپنے فرمودات کے خلاف اور ان کے اپنے بیان کردہ قواعد کے برعکس ٹھہرے گی۔ وہ اس طرح ہے کہ ابن عبدالبر المالکی نے امام مالک کا قول اپنی سند کے ساتھ درج کیا ہے کہ

... حدثنا معن بن عیسی قال سمعت مالک بن انس یقول انما انا بشر اخطی واصیب فانظروا فی رایی

یعنی امام مالک فرماتے ہیں کہ میں ایک بشر ہوں، خطاء و صواب کر سکتا ہوں، پس میری رائے کی طرف نظر کرو جو کتاب اللہ و سنت نبوی ﷺ کے موافق پائی جائے،

فکلما وافق الکتاب والسنہ فخذوا بہ وکلما لم یوافق الکتاب والسنہ فاترکوہ۔

اس کو قبول کرلو، اور جو میری رائے کتاب وسُنّت کے خلاف ہو اور موافق نہ ہو تو اس کو ترک کردو۔

(جامع بیان العلم وفضلہ لابن عبدالبر ص۳۲، ج۲، تحت القول بالرای فی دین اللہ)

حاصل یہ ہے کہ اس ضابطہ کی روشنی میں یہ چیز ثابت ہوئی کہ امام مالک کا جو قول کتاب و سنت کے خلاف پایا جائے وہ قابلِ قبول نہیں۔

اسی سلسلہ میں متعہ کا مسئلہ بھی ہے کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق ممنوع ہے اور خود امام مالک کے فرمودات کی بناء پر (جیسا کہ ماقبل میں بیان کر دیئے گئے ہیں) ناجائز اور باطل ہے، فلہذا امام مالک کی طرف جواز متعہ کا انتساب غلط ہے۔

امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کا موقف

متعہ کے متعلق امام محمد بن ادریس شافعی المتوفی ۲۰۴ھ نے اپنی کتابوں میں بالوضاحت تحریر کیا ہے کہ متعہ کی حلت اور تحلیل قرآن و سنت اور قیاس کے دلائل کے ساتھ ساقط ہو چکی ہے اور ہم نے اس مسئلہ کو اس وقت ذکر کر دیا ہے جب اس کے متعلق ہم سے سوال کیا گیا۔

چنانچہ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کی تصنیف اختلاف الحدیث میں مذکور ہے کہ

... سقط تحلیلھا بدلائل القرآن والسنہ والقیاس۔ وقد ذکرنا ذالک حیث سئلنا عنہ۔

(کتاب اختلاف الحدیث للشافعی رحمتہ اللہ علیہ بھامش علی کتاب الام ص۲۵۵، ج۷، باب نکاح المتعہ)

تنبیہہ

مسئلہ ہذا کے متعلق شوافع کی کتابوں میں بہت کچھ مواد موجود ہے لیکن ہم

نے یہاں امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کی صرف ایک کتاب سے حوالہ پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے جس میں متعہ کے جواز کا ساقط ہونا آنموصوف رحمتہ اللہ علیہ نے صاف طور پر لکھا ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ (المتوفی ۲۴۰ھ) کا موقف

ائمہ اربعہ میں امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ کا آخری دور ہے۔ ان کے مسلک کی مشہور تصنیف میں عقد متعہ کے متعلق لکھا ہے کہ

...القسم الثالث-- ما يبطل النكاح من اصله مثل ان يشترطا تاقيت النكاح ونكاح المتعه او ان يطلقها في وقت بعينه او يعلقه على شرط مثل ان يقول زوجتك ان رضيت امها... فهذه شروط باطله في نفسها ويبطل بها النكاح-

جو چیزیں نکاح کو دراصل باطل کر دیتی ہیں مثلاً نکاح میں وقت کی شرط لگانا۔ متعہ کی صورت میں نکاح کرنا... پس فی نفسہ یہ شرائط باطل ہیں اور ان شرطوں کی وجہ سے نکاح فاسد اور باطل ہو جاتا ہے۔

(المغنی لابن قدامہ ص۱۶ ج۷، تحت ابحاث النکاح)

(۲) ابن قدامہ حنبلی اپنی اسی تصنیف "المغنی" میں آگے چل کر مستقل عنوان کے تحت متعہ کی تعریف اور توضیح کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

... فهذا نكاح باطل- نص عليه احمد رحمته الله عليه فقال نكاح المتعه حرام-

یعنی یہ نکاح باطل ہے اور امام احمد رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ متعہ کا نکاح حرام ہے۔

(المغنی لابن قدامہ ص ۶۰۳ ج۷، تحت عنوان ولا یجوز نکاح المتعہ، طبع مصر)

سطور بالا میں ائمہ اربعہ کے فرمودات حرمت متعہ کے متعلق ذکر کیے گئے

ہیں۔

اب اس بحث کے آخر میں علامہ ابن عبدالبر رحمتہ اللہ علیہ کا فرمان ذکر کیا جاتا ہے۔ جس میں انہوں نے متعہ کے متعلق اکابر فقہاء کے موقف کو یکجا ذکر کیا ہے۔

علامہ ابنِ عبدالبر کا قول ابن قدامہ حنبلی ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

... قال ابن عبدالبر وعلی تحریم المتعه مالکؒ واهل مدینه وابوحنیفه فی اهل کوفه والاوزاعی فی اهل الشام واللیث فی اهل مصر والشافعی وسائر اصحاب الاثار۔

یعنی ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ مندرجہ ذیل تمام مشاہیر حضرات متعہ کے حرام ہونے پر متفق ہیں: امام مالک رحمتہ اللہ علیہ اور اہلِ مدینہ، امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اہلِ کوفہ میں، امام اوزاعی رحمتہ اللہ علیہ اہلِ شام میں، لیث بن سعدؒ اہلِ مصر میں، امام شافعیؒ اور باقی اصحاب آثار۔

(۱) المغنی لابنِ قدامہ ص ۶۴۳ ج ۷، تحت عنوان ولا یجوز نکاح المتعہ، طبع مصر۔

(۲) کتاب التمہید لما فی الموطاء من المعانی والاسانید ص ۱۲۱ ج ۱۰ تحت روایت ابنِ شہاب عن عبداللہ والحسن ابنِ محمد بن الحنیفہ، طبع مراکش۔

مطلب یہ ہے کہ یہ تمام حضرات متعہ کے حرام ہونے کے قائل ہیں اور اسی پر اتفاق رکھتے ہیں۔

اہلِ ظواہر کا موقف

اسی طرح اہلِ ظواہر حضرات کا بھی متعہ کے متعلق یہی فیصلہ ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حزم الظاہری اپنی مشہور تصنیف "المحلی" میں تحریر کرتے ہیں کہ

...ولا یجوز نکاح المتعه وهو نکاح الی اجل وکان حلا لا علی عهد رسول الله صلی الله علیه۔ ثم نسخها الله

تعالی علی لسان رسوله صلی الله علیه وسلم نسخا باتا الی یوم القیامه۔

(المحلی لابن حزم (ابو محمد علی بن احمد بن سعید بن حزم المتوفی ۴۵۶ھ) ص۵۱۹، ج۹، تحت مسئلہ نمبر۱۸۵۴ احکام النکاح، جلد تاسع)

روایت بالا کا مفہوم یہ ہے کہ متعہ کا نکاح ناجائز ہے۔ وہ نکاح ایک وقت معین تک ہوتا ہے۔

اور یہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں (بعض اوقات) حلال تھا پھر اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک کے ذریعے قطعاً تاقیامت منسوخ کر دیا۔

گزشتہ سطور میں حرمت متعہ کے متعلق فقہائے امت کے اکابرین کا موقف مختصراً بیان کیا گیا ہے۔

اس میں ملت اسلامیہ کے نامور علماء کرام کا مسلک و مذہب واضح ہوگیا اور متعہ کے حرام ہونے کے متعلق کوئی خفاء باقی نہیں رہا۔

تحریم متعہ کا اہم واقعہ

مامون خلیفہ عباسی کے دور میں ایک واقعہ اس طرح پیش آیا کہ ایک شخص محمد بن منصور کہتا ہے کہ سفر شام میں ہم لوگ مامون کی معیت میں تھے۔ ایک مقام میں مامون نے اعلان کرایا کہ متعہ النساء حلال ہے۔ قاضی یحییٰ بن اکثم ساتھ تھے۔ انہوں نے مجھے اور ابو العیناء کو کہا کہ تم دونوں کل مامون کے ہاں حاضر ہونا۔ اگر تم لوگ اس پر کچھ کلام کر سکتے ہو تو ٹھیک ہے اگر نہیں کر سکتے تو خاموش رہنا یہاں تک کہ میں خود خلیفہ کے پاس حاضر ہوں گا۔ (دوسرے روز) جب ہم خلیفہ موصوف کے ہاں حاضر ہوئے تو وہ مسواک کر رہا تھا۔ غصہ کی کیفیت میں کہنے لگا کہ عہد نبوی اور عہد ابوبکر میں دو عدد متعہ جاری تھے۔ (عمر رضی اللہ عنہ نے) آکر کہا "میں ان دونوں کو منع

کرتا ہوں۔" کون ہو تم منع کرنے والے؟... (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں خلیفہ مامون کے یہاں سخت کلمات ہیں) اس چیز سے جس کو رسول خدا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جائز رکھا ہے، تم کون ہو منع کرنے والے؟؟

محمد بن منصور اور اس کے ساتھی کچھ بات کرنے سے رک گئے کہ خلیفہ غیظ و غضب میں ہے۔ اس اثناء میں قاضی یحییٰ بن اکثم آئے اور مجلس میں بیٹھ گئے۔

مامون قاضی صاحب کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا کہ چہرہ متغیر ہے، کیا بات ہے؟

تو قاضی یحییٰ نے کہا کہ یا امیر المومنین! اسلام میں ایک حادثہ پیش آگیا ہے، اس وجہ سے مغموم ہوں۔ خلیفہ مامون نے کہا کہ وہ کیا واقعہ ہے؟ تو قاضی یحییٰ نے کہا کہ زنا کے حلال ہونے کی منادی کرائی گئی ہے۔ خلیفہ نے کہا کہ زنا کی منادی؟ تو قاضی صاحب نے کہا کہ متعہ زنا ہے، اس کی حلت کی منادی کرائی گئی ہے۔

مامون نے کہا، کیسے زنا ہے؟ اور آپ کیسے اس کو زنا قرار دے رہے ہیں؟؟ تو قاضی یحییٰ نے کہا کہ قرآن مجید اور سنت نبوی کے فرمان سے!!

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قد افلح المومنون... الی والذین هم لفروجهم حافظون الا علی ازواجهم او ما ملکت ایمانهم فانهم غیر ملومین - فمن ابتغی وراء ذالک فاولئک هم العادون-

(ابتداء پارہ نمبر ۱۸، سورہ مومنون)

یعنی فلاح یافتہ ہیں وہ لوگ جو اپنی شرم گاہوں کو نگاہ رکھتے ہیں، مگر اپنی عورتوں پر یا اپنی لونڈیوں پر تو ان پر کچھ الزام اور ملامت نہیں۔ پس جو کوئی طلب کرے اس کے ماسوا، سو وہ لوگ حد سے بڑھنے والے اور حدودِ شریعت سے تجاوز کرنے والے ہیں۔

قاضی صاحب نے کہا: اے امیر المومنین متعہ والی عورت کیا ملک یمین کے (باندی و لونڈی) حکم میں ہے؟

تو مامون نے کہا کہ نہیں!!

پھر قاضی نے کہا کہ یہ ممتوعہ عورت زوجہ منکوحہ کے حکم میں ہے؟ جو (بوقت موت) بحکم خدا وارث ہوتی ہے اور وارث بنائی جاتی ہے اور اپنی شرائط کے ساتھ اولاد اس کے ساتھ لاحق ہوتی ہے۔ امیرالمومنین نے کہا نہیں!!

اس بناء پر قاضی یحییٰ نے کہا کہ جب دونوں صورتوں میں (متعہ والی) عورت داخل نہیں تو متعہ کرنے والا شخص العادین یعنی حدود شرع سے تجاوز کرنے والا ہو گا۔

اے امیرالمومنین! یہ الزہری ہیں جنہوں نے محمد بن حنیفہ کے فرزندوں (عبداللہ و حسن) سے نقل کیا ہے اور دونوں نے اپنے والد محمد بن الحنیفہ سے اور ابن الحنیفہ نے اپنے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں منادی کر دوں کہ متعہ کی پہلے اجازت فرمائی تھی لیکن اب آنجناب نے اس سے منع فرما دیا ہے اور حرام کر دیا ہے۔

اس وقت مامون ہماری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا کہ یہ حدیث الزہری سے محفوظ طریقہ سے مروی ہے؟ ہم نے کہا کہ بالکل صحیح ہے اور اس کو ایک جماعت نے ذکر کیا ہے، ان میں امام مالک بھی ہیں۔ یہ بات سن کر مامون استغفار کرنے لگا اور وہیں حکم دیا کہ متعہ کے حرام ہونے کا اعلان کر دو۔ پس اس وقت متعہ کی حرمت کا اعلان کر دیا گیا۔

ذیل میں ابن خلکان کی عبارت ذکر کی گئی ہے اور خطیب بغدادی اور علی بن ابراہیم الحلبی نے بھی یہ واقعہ درج کیا ہے:

وهذا الزهری یا امیرالمومنین روی عن عبداللہ والحسن ابنی محمد بن الحنیفه عن ابیهما عن علی ابن ابی طالب رضی الله عنه قال امرنی رسول الله صلی الله علیه وسلم ان انادی النهی عن المتعه وتحریمها بعد ان کان قد امر بها- فالتفت الینا المامون فقال

امحفوظ هذا من حديث الزهری؟ فقلنا نعم یاامیرالمومنین رواه جماعه منهم مالک رضی الله عنه فقال استغفر الله نادوا بتحریم المتعه فنادوا بها۔

(۱) تاریخ بغدادی للخطیب جلد نمبر۱۴، ص۱۹۹۔۲۰۰، تحت تذکرہ قاضی یحییٰ بن اکثم التمیمی۔

(۲) تاریخ ابن خلکان ص۲۱۸، ج۲ تحت تذکرہ ابو محمد یحییٰ بن اکثم التمیمی حکیم العرب، طبع قدیم مصری۔

(۳) سیرتِ حلبیہ ص۵۳، ج۳، تحت احوال خیبر۔

آخر بحث

مختصر یہ ہے کہ یہ ایک مباحثہ بھی ہے اور تاریخی واقعہ بھی ہے۔۔۔ جو مامون خلیفہ عباسی (المتوفی ۲۱۸ھ) کے عہد میں پیش آیا۔ اس میں مسئلہ متعہ کے متعلق فیصلہ کر دیا گیا کہ یہ فعل اسلام میں منع ہے اور امتناع کی دلیل جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرمان کو قرار دیا۔

اور حضرت مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات گرامی شیعہ و سنی دونوں طبقات کے لیے لائق اعتماد ہے اور ان کا قول و فعل قابل استدلال ہے۔

نیز دوستوں کے ہاں ایک ضابطہ بھی ہے کہ "الحق مع علی رضی اللہ عنہ" تو اس صورت میں اب مزید کسی بحث کی حاجت نہیں۔ اہلِ اسلام کو خداوند کریم ہدایت بخشے اور آنموصوف رضی اللہ عنہ کے قول اور فعل پر عمل پیرا ہونے کی توفیق نصیب فرمائے۔ واللہ الھادی۔



طلاقِ ثلاثہ کا مسئلہ

(اسلامی روایات کی روشنی میں)

اسلام کے فقہی مسائل میں سے ایک مسئلہ طلاق ثلاثہ کا ہے۔ اس مسئلہ میں اختلاف یہ ہے کہ

اگر ایک شخص اپنی منکوحہ کو ایک مجلس میں یکبارگی تین طلاق دے دے تو کیا وہ طلاق تینوں واقع ہو جاتی ہیں؟ یا وہ تین طلاق ایک ہی طلاق شمار ہوگی اور ایک طلاق واقع ہوگی؟؟ اور کیا بغیر تحلیل کے اسی عورت سے دوبارہ نکاح کرنا جائز ہے یا ناجائز؟؟

مسئلہ ہذا میں شیعہ کہتے ہیں کہ

ایک مجلس میں یکبارگی تین طلاق دی جائے تو وہ ایک ہی طلاق شمار ہوگی۔

اور بعض شیعہ یہ بھی کہتے ہیں کہ

تین طلاق بیک وقت دینے سے طلاق واقع ہی نہیں ہوتی۔

هکذا فی کتاب شرائع الاسلام۔

(شیعہ ص۵۷، ج۲، کتاب الطلاق تحت النظر الثانی فی اقسام الطلاق، طبع بیروت)

اور اس مسئلہ میں اہل الظواہر کا بھی یہی مسلک ہے کہ بیک وقت اور بیک بار طلاق ثلاثہ دینے سے ایک طلاق واقع ہو جاتی ہے اور بغیر تحلیل کے اسی عورت کے ساتھ نکاح کر لینا جائز ہے۔

موجودہ دور میں شیعہ اس مسئلہ کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر بہ عبارت ذیل طعن قائم کرتے ہیں:

چنانچہ ڈاکٹر نور حسین جھنگوی نے لکھا ہے کہ

"زمانہ نبوت میں طلاق ثلاثہ ایک طلاق شمار ہوتی تھی... سیاست جمانے کے واسطے حضرت عمر نے اپنا حکم جاری کر دیا کہ جو شخص ایک ہی وقت میں تین دفعہ عورت کو طلاق دے گا' عورت مطلقہ (مغلظہ) ہو جائے گی- اس رواج سے مسلمانوں کے کئی خاندان ویران ہوگئے اور کئی عیال و اطفال تباہ ہوگئے- حضرت عمر کا یہ حکم خلاف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے-"

("آئینہ مذہب سنی" از ڈاکٹر حاجی نور حسین صابر جھنگوی شیعی ص۱۴۹' تحت عنوان طلاق ثلاثہ' طبع چہارم' لاہور)

"طلاقِ ثلاثہ" کے مسئلہ کی وضاحت جمہور صحابہ کرام اور کبار علمائے ملت کے فرمودات کی روشنی میں

مسئلہ ہذا کی وضاحت میں یہ صورت اختیار کی جاتی ہے کہ پہلے اس مسئلہ میں جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مسلک اور ائمہ اربعہؒ کے موقف پر دلائل پیش کیے جائیں گے-

اس کے بعد ان روایات کا جواب ذکر کیا جائے گا جن سے معترضین حضرات اپنے موقف پر استدلال پیش کرتے ہیں اور اس طریقہ سے شبہات کا ازالہ بھی ہو جائے گا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر طعن کرنے والوں کا جواب بھی پورا ہو جائے گا-

جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس مسئلہ میں موقف یہ ہے کہ

اگر کوئی شخص ایک مجلس میں بیک وقت اپنی منکوحہ کو تین بار طلاق دے دے تو طلاق مغلظہ واقع ہو جاتی ہے اور بغیر تحلیل کے طلاق دہندہ کے ہاں وہ عورت واپس نہیں ہو سکتی-

اور ائمہ اربعہ (امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہم) اور دیگر کبار علمائے امت کا بھی مسلک و مذہب یہی ہے کہ طلاق ثلاثہ مجتمعاً واقع ہوں تو وہ تین طلاق ہی شمار ہوں گی، ایک نہ ہوگی اور منکوحہ عورت مطلقہ مغلظہ ہو جائے گی اور مغلظہ طلاق کے احکام یہاں جاری ہوں گے۔

اگرچہ بعض صحابہ اور تابعین کے بعض اقوال اس مسلک کے خلاف پائے جاتے ہیں لیکن جمہور صحابہ اور اکثر علمائے امت کا مسلک و مذہب وہی ہے جو سطور بالا میں ذکر کر دیا ہے اور اسی پر ان کا اجماع ہے۔ چنانچہ ابنِ ہمام رحمتہ اللہ علیہ نے فتح القدیر میں لکھا ہے کہ

...وذهب جمهور الصحابه والتابعين ومن بعدهم من ائمه المسلمين الى انه يقع ثلاث۔

(فتح القدیر لابنِ ہمام شرح ہدایہ ص ۲۵، ج ۳، تحت قولہ وطلاق البدعہ، طبع مصر)

اور امام نواوی نے شرح مسلم میں یہی مسئلہ کچھ تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے:

...قال الشافعي ومالك وابوحنيفه واحمد وجماهير العلماء من السلف والخلف يقع ثلاث۔

(شرح مسلم النواوی ص ۴۷۸، جلد اوّل، طبع دہلی)

اسی طرح علامہ ابن المنذر النیشاپوری (المتوفی ۳۱۸ھ) نے اپنی تالیف "الاجماع" میں مسئلہ ہذا پر علماء کا اجماع نقل کیا ہے، لکھتے ہیں کہ

۴۱۰ - واجمعوا على ان الرجل اذا طلق امراته ثلاثا انها لا تحل له الا بعد زوج على ما جاء به حديث النبي صلى الله عليه وسلم۔

یعنی اس بات پر علماء نے اتفاق و اجماع کیا ہے کہ جب ایک شخص اپنی زوجہ کو تین طلاقیں دے دے تو وہ اس کے لیے حلال نہیں رہتی مگر کہ وہ دوسرے زوج کے ساتھ نکاح کرے جیسا کہ حدیث نبوی میں ہے۔

(الاجماع لابی بکر محمد بن ابراہیم بن المنذر النیشاپوری ص ۹۲، طبع مکران)

قال طاوس وبعض اهل الظاهر لا يقع بذالك الا واحده۔
(شرح مسلم للنواوی ص۴۷۸، جلد اوّل، طبع نور محمد دہلی)

مذکورہ بالا دونوں حوالہ جات کا حاصل مطلب یہ ہے کہ جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین اور جمہور علمائے امت سلف و خلف اسی طرف ہیں کہ یکجا تین طلاق مجتمعا دینے سے تینوں طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں--- مگر طاؤس اور بعض اہل الظاہر کہتے ہیں کہ اس طرح تین طلاقیں دینے سے ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے۔ (تین نہیں ہوتیں)

ذیل میں ہم حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس مسئلہ میں فرامین ایک ترتیب سے ذکر کرتے ہیں جس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں مسئلہ ہذا کی وضاحت معلوم ہو سکے گی اور اکثر حضرات کا جو فیصلہ ہے، وہ سامنے آجائے گا اور مسئلہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فیصلہ کتاب و سُنّت کے خلاف نہیں ہوتا بلکہ امت کے لیے حجت شرعی ہوتا ہے۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما

ابن عمر رضی اللہ عنہ کے شاگرد اور خادم جناب نافع رضی اللہ عنہ ذکر کرتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

... قال ابن عمر طلق امراته ثلاثا فقد عصى ربه وبانت امراته۔ (المصنف لابن ابی شیبہ ص۱۱، ج۵، کتاب الطلاق تحت من کرہ ان یطلق امراتہ ثلاثا فی مقعد واحد)

اور ابن عمر رضی اللہ عنہ کے فرزند سالم اپنے والد عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ذکر کرتے ہیں کہ

... عن ابن عمر قال من طلق امراته ثلاثا طلقت وعصى ربه۔ (المصنف لعبد الرزاق ص۳۹۵، ج۶، روایت نمبر ۱۱۳۴۳ طبع مجلس علمی)

ان روایات کا مفہوم یہ ہے کہ جناب عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ جس شخص نے اپنی عورت کو تین طلاقیں دیں تو وہ عورت اس سے جُدا ہوگئی۔ (تینوں طلاقیں واقع ہوگئیں) اس صورت میں طلاق دہندہ نے اپنے رب کی نافرمانی کی۔

عمران بن الحصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ

جناب عمران بن الحصین رضی اللہ عنہ سے واقع (بن سحبان) نے سوال کیا:

... عن واقع (بن سحبان) قال سئل عمران بن الحصین عن رجل طلق امراته ثلاثا فی مجلس قال: اثم بربه وحرمت علیه امراته۔ (المصنف لابن ابی شیبہ ص ۱۰، ج ۵، کتاب الطلاق، تحت من کرہ ان یطلق الرجل امراتہ ثلاثا فی مقعد واحد)

مفہوم یہ ہے کہ عمران بن الحصین سے اس شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جس نے اپنی عورت کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دے دی ہیں تو جناب عمران بن الحصین رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا کہ اس شخص نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور اس پر اس کی عورت حرام ہوگئی۔

عبادہ بن الصامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ

داؤد بن عبادہ بن الصامت سے روایت ہے کہ

... عن ابراھیم عن داود بن عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ قال طلق جدی امراہ له الف تطلیقه فانطلق ابی الی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فذکر ذالک له۔ فقال النبی صلی اللہ

داؤد بن عبادہ کہتے ہیں کہ میرے دادا نے اپنی زوجہ کو ایک ہزار طلاق دی۔ پھر میرے والد جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور ہزار طلاق دینے کا واقعہ عرض کیا تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

علیه وسلم اما اتقی الله جدك- اما ثلاث فله واما تسع مائه وسبعه وتسعون فعدوان وظلم ان شاء الله عذبه وان شاء الله غفرله-

نے فرمایا: کیا تیرے جد نے اللہ سے خوف نہیں کیا؟ پھر فرمایا کہ ہزار طلاق میں سے تین تو اس کے لیے واقع ہوگئیں اور باقی نو صد ستانوے (۹۹۷) طلاقیں دینے میں اس نے تجاوز اور ظلم کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو اسے عذاب دے اور اگر چاہے تو معاف فرمادے۔

(۱) المصنف لعبد الرزاق ص ۳۹۳، ج ۶، روایت نمبر ۱۱۳۳۹، مجلس علمی۔
(۲) السنن للدار قطنی ص ۲۰، ج ۴، جلد رابع ابحاث الطلاق، طبع مصر۔
(۳) تفسیر مظہری لقاضی ثناء اللہ پانی پتی ص ۲۸۰، ج ۱، تحت الآیۃ الطلاق مرتان، پ ۲، طبع دہلی۔
(۴) فتح القدیر شرح ہدایہ ص ۲۶، ج ۳، تحت قولہ طلاق البدعۃ، طبع مصر)

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ

○ ... عن علقمه قال جاء رجل الی ابن مسعود رضی اللہ عنہ فقال انی طلقت امراتی تسعه و تسعین وانی سالت فقیل لی قد بانت منی- فقال ابن مسعود رضی اللہ عنہ لقد احبوا ان یفرقوا بینك وبینهما قال فما تقول رحمك الله فظن انه سیرخص له فقال ثلاث

علقمہ کہتے ہیں کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ میں نے اپنی زوجہ کو ننانوے (۹۹) طلاقیں دے دی ہیں اور میں نے لوگوں سے اس بارے میں دریافت کیا ہے تو انہوں نے کہا ہے کہ میری زوجہ مجھ سے جُدا ہوگئی (مجھ پر حرام ہوگئی) تو اس پر ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لوگ تیری زوجہ اور تیرے درمیان تفریق کرنا پسند کرتے ہیں- اور پھر اس

تبینها منك وسائرها عدوان- (۱) المصنف لعبدالرزاق، ص۳۹۵، ج۶، روایت نمبر۱۱۳۴۳، طبع مجلس علمی- (۲) فتح القدیر لابن ہمام شرح ہدایہ ص۲۵، ج۳، تحت قولہ طلاق البدعۃ، طبع مصر) ○... عن علقمه عن عبدالله بن مسعود رضی اللہ عنہ انه سئل عن رجل طلق امراته مائه قال ثلاث تبينها منك وسائرها عدوان- (شرح معانی الآثار للطحاوی ص۳۴، ج۲، باب الطلاقات ثلاثۃ دفعتہ)

شخص نے کہا کہ اللہ آپ پر رحم فرمائے بتایئے آپ کیا حکم فرماتے ہیں؟؟ سائل کہتا ہے کہ مجھے گمان تھا کہ آنموصوف شاید مجھے اس معاملہ میں رعایت دیں گے مگر جناب ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تین طلاقوں سے تیری زوجہ تجھ سے جُدا ہو گئی (تجھ پر حرام ہو گئی) اور زائد طلاقیں تیری طرف سے تجاوز اور عدوان ہے-

تنبیہ

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مندرجہ بالا روایات جو درج کی ہیں، ان میں اس بات کا اجمال ہے کہ یہ حکم عورت غیرمدخولہ کے لیے ہے یا مدخولہ کے لیے ہے-

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی دیگر روایات میں اس بات کی تصریح پائی جاتی ہے کہ

○... عن زر عن عبدالله (بن مسعود رضی اللہ عنہ) قال المطلقه ثلاثا قبل ان يدخل بهاء بمنزله التی قد دخل بها- (السنن الکبریٰ للبیہقی ص۳۳۵، ج۷،

مطلب یہ ہے کہ طلاق ثلاثہ کے حکم کے اعتبار سے عورت مدخولہ اور غیرمدخولہ دونوں میں کوئی فرق نہیں- طلاق ثلاثہ کی صورت میں دونوں کا ایک حکم ہے کہ وہ عورت اس شخص پر حرام ہو جاتی ہے-

تحت کتاب الخلع والطلاق باب امضاء الثلاث وان کن مجموعات)

(اور بغیر تحلیل کے اس شخص کے نکاح میں نہیں آسکتی)

ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کا فرمان

ایک دوسرے مقام میں ابنِ مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ

... وفی الموطاء ایضا بلغه ان رجلا جاء الی ابن مسعود رضی اللہ عنہ فقال انی طلقت امراتی ثمانی تطلیقات فقال ما قیل لک؟ فقال قیل لی بانت منک قال صدقوا هو مثل ما یقولون وظاهره الاجماع علی هذا الجواب۔ (۱) الموطاء الامام مالک"، ص۵۱۰-۵۱۱، کتاب الطلاق ما جاء فی البتۃ، طبع کراچی۔ (۲) فتح القدیر لابن ہمام شرح ہدایہ ص۲۵، ج۳، تحت قولہ وطلاق البدعۃ، طبع مصر)

مطلب یہ ہے کہ ایک شخص جناب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ میں نے اپنی زوجہ کو آٹھ (۸) طلاقیں دے دی ہیں تو ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا کہ اس مسئلہ میں دوسرے حضرات نے تیرے لیے کیا حکم دیا ہے؟ تو اس نے کہا کہ میرے لیے یہ کہا گیا ہے کہ تیری عورت تجھ سے جُدا ہوگئی ہے تو جناب ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان حضرات نے سچ کہا ہے، یہ مسئلہ اسی طرح ہے جس طرح انہوں نے کہا۔ صاحب فتح القدیر کہتے ہیں کہ ظاہریات یہ ہے کہ اس جواب پر اس وقت اجماع ہوگیا تھا۔

ابو ہریرہ وابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما

محدثین نے مسئلہ ہذا پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور کا ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ

معاویہ بن ابی عیاش الانصاری جناب عبداللہ بن الزبیر اور عاصم بن عمر کے

پاس بیٹھا ہوا تھا تو ان کے پاس محمد بن ایاس بن بکیر آیا اور اس نے کہا کہ اہل بادیہ میں سے ایک شخص نے اپنی عورت کو جو غیر مدخولہ ہے، تین طلاقیں دے دیں۔ آپ اس کے متعلق کیا حکم دیتے ہیں؟؟ تو عبداللہ بن الزبیر نے فرمایا کہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کے متعلق ہمارے پاس کوئی قول نہیں پہنچا۔ تم عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، کے پاس چلے جاؤ۔ میں ان کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس چھوڑ آیا ہوں۔ جا کر ان دونوں سے سوال کرو اور پھر ہمارے پاس آنا اور ان کے جواب سے ہمیں مطلع کرنا۔ پس وہ شخص چلا گیا اور جا کر اس نے دونوں حضرات سے مسئلہ دریافت کیا۔

... فقال ابن عباس لابی هريره افته يا اباهريره۔ فقد جاء تک معضله فقال ابوهريره الواحده تبينها والثلث تحريمها حتى تنكح زوجا غيره۔ وقال ابن عباس مثل ذالک... الخ۔

یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ اے ابو ہریرہ! آپ اس مسئلہ کا فتویٰ دیں۔ یہ ایک مشکل چیز آپ کے سامنے آئی ہے۔ تو جواب میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک طلاق عورت کو جُدا کر دیتی ہے اور جو تین ہیں وہ عورت کو مرد پر حرام کر دیتی ہیں حتیٰ کہ وہ عورت ایک دوسرے شخص کے ساتھ نکاح کرے۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس مسئلہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے فرمان کے مطابق حکم دیا۔(اور اس کی تصدیق کی)

(۱) موطا امام مالک ؒ ص۲۰۸، طبع مجتبائی دہلی ص۵۲۱، طبع کراچی تحت طلاق البکر۔ (۲) موطا امام محمدؒ ص۲۵۹، طبع مصطفائی، باب الرجل یطلق امراتہ ثلاثا قبل ان یدخل بھا۔ (۳) السنن الکبریٰ للبیہقی ص۳۳۵، ج۷، ماجاء فی امضاء الطلاق الثلاث، طبع دکن)

واقعہ ہذا سے معلوم ہوتا ہے کہ اصاغر صحابہ رضی اللہ عنہم اپنے اکابر صحابہ

کرام رضی اللہ عنہم سے عندالضرورت مسائل میں رجوع فرمایا کرتے تھے اور ان کی تحقیق کو مقدم رکھتے تھے--- اس موقعہ میں بھی یہی صورت اختیار کی گئی اور اکابر کے فتویٰ پر اعتماد کیا۔

اور اس مقام میں امام بیہقی نے السنن الکبریٰ میں محمد بن ایاس بن البکیر والی روایت کے بعد اس بات کی تصریح کی ہے کہ

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس مسئلہ کو نقل کرنے والے مندرجہ ذیل حضرات ہیں:

(۱) سعید بن جبیر (۲) عطاء بن رباح (۳) مجاہد (۴) عکرمۃ (۵) عمرو بن دینار (۶) مالک بن الحارث (۷) اور محمد بن ایاس بن البکیر وغیرہ۔

یہ تمام حضرات جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ مسئلہ اس طرح نقل کرتے ہیں کہ یکجا و یکبارگی تین طلاق کو آنموصوف رضی اللہ عنہ نے تین طلاقیں ہی قرار دیا اور ان کا امضاء اور اجراء کیا (یعنی تین طلاقوں کو اس صورت میں ایک طلاق قرار نہیں دیا)

...فهذه رواية سعيد بن جبير وعطاء بن رباح ومجاهد وعكرمه وعمر بن دينار ومالك بن الحارث ومحمد بن اياس بن البكير ورويناه عن معاويه بن ابى عياش الانصارى كلهم عن ابن عباس انه جاز الطلاق الثلاث وامضاهن۔

(السنن الکبریٰ للبیہقی ص۳۳۸، ج۷، تحت باب من جعل الثلاث واحدۃ)

ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کا فرمان

اسی سلسلہ میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مزید چند ایک روایات محدثین نے ذکر کی ہیں، جن میں جناب ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی مسئلہ دریافت کیا گیا

تو آنجناب نے جواب میں فرمایا کہ جس شخص نے تین طلاقیں دی ہیں اس سے وہ عورت جُدا ہو چکی ہے۔ جس شخص نے اپنی عورت کو تین یا اس سے زیادہ طلاقیں دیں تو اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور وہ عورت اس سے جُدا ہوگئی۔ چنانچہ سعید بن منصور محدث نے اپنے السنن میں اس روایت کو بہ عبارت ذیل ذکر کیا ہے:

... عن الاعمش عن مالک بن الحارث قال جاء رجل الی ابن عباس رضی اللہ عنہ فقال ان عمه طلق امراته ثلاثا فاکثر فقال عصیت الله عزوجل وبانت منک امراتک ولم تتق الله عزوجل فیجعل لک مخرجا۔

(السنن لسعید بن منصور الخراسانی المکی المتوفی ۲۲۷ھ ص۲۸۵ تحت باب التعدی فی الطلاق، القسم الاول من الجلد الثالث طبع مجلس علمی کراچی)

روایت ہذا میں مدخولہ یا غیر مدخولہ کے لیے (طلاق ثلاث کا) ایک ہی حکم ہے کوئی فرق نہیں کیا گیا۔

ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کا فتویٰ

اسی طرح دیگر محدثین نے بھی جناب ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فتاویٰ اس مسئلہ میں ذکر کیے ہیں۔

چنانچہ ابوداؤد شریف میں ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کے شاگرد مجاہد سے روایت ذکر کی گئی ہے کہ

... عن مجاهد قال کنت عند ابن عباس فجاءه رجل فقال انه طلق امراته ثلاثا قال فسکت حتی ظننت انه رادها الیه ثم قال ینطلق احدکم

روایت ہذا کا مطلب یہ ہے کہ مجاہد کہتے ہیں کہ میں ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کے پاس موجود تھا۔ ان کے ہاں ایک شخص آیا اور اس نے آکر کہا کہ میں نے اپنی عورت کو تین طلاقیں دے دی ہیں تو ابنِ عباس

فیرکب الحموقه ثم یقول یاابن عباس یاابن عباس وان الله قال ومن یتق الله یجعل له مخرجا وانک لم تتق الله فلا اجد لک مخرجا۔ عصیت ربک وبانت منک امراتک... الخ۔ (۱) ابوداؤد شریف ص۳۰۶، تحت بقیہ نسخ المراجعہ بعد التطلیقات الثلاث، طبع دہلی۔ (۲) فتح القدیر شرح ہدایہ ص۲۵، ج۳، تحت قولہ وطلاق البدعۃ، طبع مصری۔

رضی اللہ عنہ خاموش رہے۔ میں نے گمان کیا کہ آپ رضی اللہ عنہ اس کو رد کردیں گے۔ پھر ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک شخص سواری پر سوار ہو کر آتا ہے پھر کہتا ہے کہ اے ابن عباس، اے ابن عباس۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو شخص اللہ تعالیٰ کا خوف کرے اور ڈرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے خروج کی کوئی صورت پیدا کردیتے ہیں اور اے شخص تو نے اللہ سے خوف نہیں کیا، پس میں تیرے لیے کوئی مخرج نہیں پاتا۔ اپنے رب کی تو نے نافرمانی کی ہے اور تیری عورت تجھ سے جُدا ہو چکی ہے۔ (حرام ہو گئی ہے)

یہاں محدث ابوداؤد رضی اللہ عنہ نے مذکورہ روایت میں راوی مجاہد مذکور کے بہت سے متابعات (قریباً چھ سات) ذکر کیے ہیں۔

... کلهم قالوا فی الطلاق الثلاث انه اجازها قال وبانت منک۔ (اے امصاها ولم یقل انها واحده) (ابوداؤد شریف ص۳۰۶، تحت بقیہ نسخ المراجعہ بعد التطلیقات الثلاث، طبع مجتبائی، دہلی)

مطلب یہ ہے کہ ان سب متابعات میں یہ مذکور ہے کہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے تینوں طلاقوں کو جائز رکھا اور فرمایا کہ عورت تجھ سے جُدا ہو چکی ہے (اور یہ حکم نہیں دیا کہ یہ ایک طلاق ہے)

ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کا فرمان

نیز الموطاء لامام مالک میں اور معانی الآثار الطحاوی دونوں میں ابن عباس رضی

اللہ تعالیٰ عنہ کا فتویٰ کلمات ذیل کے ساتھ مذکور ہے:

... مالک انه بلغه ان رجلا قال لابن عباس انی طلقت امراتی مائه تطلیقه فما ذا تری علی- فقال له ابن عباس طلقت منک بثلاث وسبع وتسعون اتخذت بها آیات الله هزوا-

مطلب یہ ہے کہ امام مالک رحمتہ اللہ علیہ اور امام طحاوی رحمتہ اللہ علیہ کی روایت میں مذکور ہے کہ ایک شخص نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں آکر کہا کہ میں نے اپنی عورت کو سو عدد طلاق دی ہے- آپ میرے متعلق کیا حکم دیتے ہیں تو آنجناب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ تین طلاقوں کے ساتھ تجھ سے عورت جُدا ہوگئی اور باقی ستانوے عدد طلاق سے تو نے اللہ کی آیات کا تمسخر کیا-

(۱) (الموطا لامام مالک" ص۱۹۹ کتاب الطلاق ما جاء فی البتہ، طبع مجتبائی دہلی-

(۲) شرح معانی الآثار الطحاوی" ص۳۳، ج۲، باب التطلیقات ثلاث وفعتہ-

(۳) تفسیر مظہری ص۳۸۰، ج۱، تحت الآیتہ الطلاق مرتان، طبع دہلی (از قاضی ثناء اللہ" پانی پتی)

ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول

اب اس کے بعد ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک دوسرے شاگرد عطا سے روایت ذکر کی جاتی ہے کہ

... عن عطا عن ابن عباس رضی الله تعالی عنهما قال اتاه رجل فقال انی طلقت امراتی ثلاثا قال یذهب

اس کا مفہوم یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے شاگرد عطا جناب ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ ان کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ میں نے

احدكم فيتلطخ بالنتن ثم ياتينا اذهب فقد عصيت ربك وقد حرمت عليك امراتك- لا تحل لك حتى تنكح زوجا غيرك- قال محمد وبه ناخذ وهو قول ابى حنيفه رحمه الله تعالى وقول العامه لا اختلاف فيه-

اپنی عورت کو تین طلاقیں دے دی ہیں تو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک تمہارا آدمی بدبو دار چیز کے ساتھ ملوث ہو جاتا ہے پھر ہمارے پاس آتا ہے (ناراض ہو کر فرمایا) چلا جا تو نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور تیری عورت تجھ پر حرام ہو چکی ہے اور وہ تیرے لیے نہیں حلال ہو سکتی حتیٰ کہ وہ عورت تیرے سوا کسی دوسرے زوج کے ساتھ نکاح کرے۔

(کتاب الآثار لامام محمدؒ ص۸۶، طبع انوار محمدی لکھنؤ، ص۱۰۵، طبع کراچی، باب من طلق ثلاثا او طلق واحدۃ وھو یرید ثلاثا)

ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمان

... عن سعيد بن جبير قال: جاء ابن عباس رجل فقال طلقت امراتي الفا... فقال ابن عباس ثلاث تحرمها عليك وبقيتها عليك وزدا اتخذت آيات الله هزوا-

(المصنف لعبد الرزاق ص۳۹۸، ج۶، تحت باب المطلق ثلاثا)

مطلب یہ ہے کہ کہ سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ ایک شخص جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے اپنی زوجہ کو ایک ہزار طلاق دے دی ہے--- تو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تین طلاقوں نے تو تجھ پر تیری عورت حرام کر دی اور بقایا طلاقیں تجھ پر بوجھ ہیں، تو نے اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ تمسخر کیا۔

یہاں بھی آنجناب نے یہی فتویٰ دیا ہے کہ تین طلاق سے وہ عورت طلاق دہندہ پر حرام ہو جاتی ہے لیکن اس کو ایک طلاق نہیں قرار دیا۔

ایک تائید

ماقبل میں ہم نے جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعدد اقوال و فرامین ذکر کیے ہیں اور جناب علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے فرمودات آئندہ سطور میں پیش کر رہے ہیں۔ ان میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا یہی فیصلہ مذکور ہے کہ طلاق دہندہ اگر یکدم ایک مجلس میں تین طلاق دے دے تو وہ تینوں واقع ہو جاتی ہیں (ان کو ایک طلاق قرار نہیں دیا جا سکتا)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ایسے مواقع میں فرمایا کرتے تھے کہ

...عن سعید بن جبیر عن ابن عباس قال کنا اذا اتانا الثبت عن علی رضی اللہ عنہ لم نعدل به۔

مطلب یہ ہے کہ جب ہمیں جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے ایک فیصلہ شدہ اور ثابت شدہ چیز حاصل ہو جائے تو ہم اس کے برابر کسی چیز کو قرار نہیں دیتے۔

(جامع بیان العلم وفضلہ لابن عبدالبر ص۵۸ تحت باب اجتہاد الرای علی الاصول، الخ)

یہاں سے واضح ہوا کہ مسئلہ مذکورہ طلاق ثلاث کے معاملہ میں بھی جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے فیصلہ کو مقدم جانتے تھے۔

مزید تائید

عبداللہ بن عباس کا شرعی مسائل میں طریق کار

علامہ بیہقیؒ نے السنن الکبریٰ میں مسئلہ ذکر کیا ہے کہ

جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ (ہاشمی) سے جب کوئی شخص مسئلہ دریافت کرتا تو آپ اس کا فیصلہ اگر کتاب اللہ میں موجود ہوتا تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے اور اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ میں نہیں ہے اور سنت نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں پایا جاتا تو سنت نبوی کے مطابق قول کرتے اور اگر وہ مسئلہ نہ تو کتاب اللہ میں ہوتا اور

نہ ہی سنت رسول اللہ میں پایا جاتا اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فرمودات میں پایا جاتا تو آنموصوف ان حضرات شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے قول کے مطابق عمل کرتے۔

اور اگر مذکورہ بالا تینوں صورتیں موجود نہ ہوتیں تو پھر اپنی مجتہدانہ رائے پر عمل کرتے تھے۔

...... عن عبيد الله بن ابی يزيد قال سمعت عبدالله بن عباس رضی الله تعالی عنهما اذا سئل عن شيئی هو فی كتاب الله قال به- واذا لم يكن فی كتاب الله وقاله رسول الله صلی الله عليه وسلم قال به- وان لم يكن فی كتاب الله ولم يقله رسول الله صلی الله عليه وسلم وقاله ابوبكر و عمر رضی الله عنهما قال به- والا اجتهد رايه-

(السنن الکبریٰ للبیہقی ص۱۱۵ ج۱۰، کتاب آداب القاضی، طبع قدیم، دکن)

مطلب یہ ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے اس طریق کار کے ذریعہ ثابت ہوا کہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور کے فیصلوں پر عمل درآمد کرتے تھے اور یکبارگی طلاق ثلاثہ کو تین طلاقیں ہی شمار کرتے تھے' ان کو ایک طلاق قرار نہیں دیتے تھے۔

تنبیہہ

ہم نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے فتاویٰ اور فرامین کو گزشتہ صفحات میں متعدد باسند محدثین اور فقہاء کرام کے ذریعے نقل کیا ہے۔

اس میں مقصد یہ ہے کہ جناب ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اس مسئلہ میں فیصلہ یہ ہے کہ عورت مدخولہ ہو یا غیر مدخولہ جب اس کو تین طلاقیں یکجا مجتمعا اپنا

خاوند دے دے تو وہ ایک طلاق نہیں ہوتی بلکہ تینوں طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں اور وہ عورت اس مرد پر حرام ہو جاتی ہے اور بغیر تحلیل کے اس کے نکاح میں نہیں آ سکتی۔

علامہ زاہد الکوثری ؒ نے الاشفاق میں لکھا ہے کہ

... وقد تواتر عن ابن عباس انه یریٰ ان الطلاق الثلاث بلفظ واحد یقع ثلاثا وقد سبق روایته ذالک عنه۔ بطریق عطاء وعمرو بن دینار وسعید بن جبیر ومجاهد وغیرهم۔ بل بطریق طاوس نفسه۔ (الاشفاق علی احکام الطلاق لعلامہ زاہد الکوثری، ص۵۵، طبع کراچی)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ بات بہ تواتر منقول ہے کہ ایک لفظ سے تین طلاق دینے سے تین طلاقیں ہی واقع ہو جاتی ہیں اور یہ مسئلہ جناب ابن عباس سے نقل کرنے والے عطاء عمرو بن دینار، سعید بن جبیر، مجاہد وغیرہم ہیں بلکہ ایک طریق سے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے طاؤس خود بھی اسی مسئلے کے ناقل ہیں۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

محدث عبدالرزاق نے اپنے مصنّف میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مسئلہ ہذا میں ایک روایت ذکر کی ہے کہ

... ابراهیم بن محمد عن شریک بن ابی نمر قال جاء رجل الی علی فقال انی طلقت امراتی عدد العرفج۔ قال تاخذ من العرفج ثلاثا وتدع سائره۔ قال ابراهیم

روایت ہذا کا مفہوم یہ ہے کہ شریک بن ابی نمر کہتے ہیں کہ جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور کہا کہ میں نے اپنی زوجہ کو عرفج کے عدد کے برابر طلاق دے دی ہے۔ (عرفج ایک پودا ہے جو بہت جلدی جلنے والا ہے اور

اخبرنی ابو الحویرث عن عثمان بن عفان مثل ذالک۔ (المصنف لعبد الرزاق ص ۳۹۴، ج ۶، روایت نمبر ۱۱۳۴۱، طبع مجلس علمی، کراچی)

یہاں اس سے مراد کثیر تعداد ہے) اس پر جناب علی المرتضیٰ نے فرمایا کہ اس تعداد میں سے تین طلاق تو نے اخذ کرلی ہیں اور باقی تمام تو نے ترک کردی ہیں۔

ابراہیم کہتے ہیں کہ مجھے ابوالحویرث نے بتایا کہ جناب عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی یہ مسئلہ اسی طرح منقول ہے۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا فرمان

کتاب الکفایہ للخطیب بغدادی میں روایت ہے کہ اعمش کہتے ہیں کہ کوفہ کے ایک شیخ نے ایک تحریر میرے سامنے پیش کی اس میں درج تھا کہ

... فاخرج الی کتابه اذا فیه بسم الله الرحمن الرحیم هذا ما سمعت من علی بن ابی طالب رضی الله عنه یقول اذا طلق الرجل امراته ثلاثا فی مجلس واحد فقد بانت منه (ولا تحل له حتی تنکح زوجا غیره)

روایت ہذا کا مفہوم یہ ہے کہ یہ مسئلہ راوی نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے سنا ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ جب ایک آدمی اپنی عورت کو مجلس واحد میں تین طلاق دے دے تو وہ عورت اس سے جدا ہو جاتی ہے (اور وہ عورت اس شخص پر حلال نہیں ہے جب تک کہ وہ کسی دوسرے شخص سے نکاح کرلے)

(کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ للخطیب بغدادی ص ۱۵۰، تحت باب رو حدیث من عرف، بقبول للتلقین)

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا فرمان دیگر

صاحب فتح القدیر نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ایک دیگر روایت بہ

عبارت ذیل نقل کی ہے کہ

...وروی وکیع عن الاعمش ان حبیب بن ثابت قال جاء رجل الی علی رضی اللہ تعالی عنہ بن ابی طالب فقال انی طلقت امراتی الفا فقال لہ علی بانت منک بثلاث واقسم لسائرھن علی نسائک۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ حبیب بن ثابت کہتے ہیں کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور اس نے کہا کہ میں نے اپنی عورت کو ایک ہزار طلاق دی ہے تو جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے فرمایا کہ تیری عورت تجھ سے تین طلاق سے جُدا ہوچکی ہے اور باقی طلاقوں کو اپنی دوسری عورتوں پر تقسیم کردے۔

(۱) فتح القدیر لابن ہمام شرح ہدایہ ص۲۵۔۲۶، ج۳، تحت قولہ طلاق البدعۃ، طبع مصر۔

(۲) سنن کبریٰ بیہقی ص۳۳۵، جلد سابع میں بھی قلیل تغیر کے ساتھ مذکور ہے۔

مطلب یہ ہے کہ تین طلاق یکجا اور یکبارگی دی جائیں تو وہ تین طلاق ہی واقع ہو جاتی ہیں، ایک طلاق شمار نہیں کی جاتی۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ

نیز اسی مقام میں ابن ہمام نے اس مسئلہ کے متعلق جناب عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرمان کو بہ عبارت ذیل نقل کیا ہے:

...وروی وکیع ایضا عن معاویہ بن ابی یحییٰ قال جاء رجل الی عثمان بن عفان فقال طلقت امراتی الفا۔ فقال بانت منک بثلاث۔

مطلب یہ ہے کہ معاویہ بن ابی یحییٰ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور کہا کہ میں نے اپنی زوجہ کو ہزار طلاق دے دی ہے تو جواب میں جناب

عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تیری زوجہ تجھ سے
تین طلاق سے ہی جُدا ہو گئی۔

(۱) فتح القدیر لابن ہمام شرح ہدایہ ص۲۶، ج۳، تحت قولہ طلاق البدعۃ، طبع مصر۔

(۲) مرقات شرح مشکوٰۃ لعلی القاری ص۲۹۵، ج۶ باب الخلع والطلاق الفصل الثالث، طبع ملتان۔

حسن بن علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا فرمان اور فیصلہ

محدثین نے لکھا ہے کہ حضرت سیدنا حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بعض وجوہ کی بنا پر اپنی ایک بیوی کو تین طلاق دے دی پھر اس کے بعد انہیں اس بات پر افسوس ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے عدم رجوع پر مندرجہ ذیل روایت ذکر فرمائی:

...ثم قال لو لا انی سمعت جدی او حدثنی ابی انه سمع جدی یقول ایما رجل طلق لامراته ثلاثا عند الاقراء او ثلاثا مبهمه لم تحل له حتی تنکح زوجا غیره لراجعتها۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر میں نے اپنے باپ سے یا جد سے یہ بات نہ سنی ہوتی کہ وہ فرماتے تھے کہ جس شخص نے اپنی عورت کو تین طہروں میں تین طلاقیں دے دیں یا یکبار تین طلاقیں دے دیں تو وہ عورت اس کے لیے حلال نہیں رہتی حتی کہ دوسرے زوج کے ساتھ نکاح کرے تو میں رجوع کر لیتا۔

(۱) السنن للدار قطنی ص۴۳۷-۴۳۸، طبع دہلی، ص۳۰، ۳۱، طبع مصر، جلد چہارم۔

(۲) السنن الکبریٰ للبیہقی ص۳۳۶، ج۷، تحت باب امضاء الثلاث وان کن مجموعات

مطلب یہ ہے کہ تین طلاق یکبارگی تین ہی شمار ہوتی ہیں۔ وہ ایک طلاق شمار نہیں ہوتی اور بغیر تحلیل کے زوج اوّل کی طرف نہیں لوٹ سکتی۔

اس بنا پر رجوع کرنے کی اب کوئی صورت نہیں رہی۔

الانتباہ

مسئلہ طلاق ثلاث کے متعلق ہم نے گزشتہ صفحات میں اکابر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اقوال فرامین اور ان کے فتاویٰ درج کیے ہیں۔ ان کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص ایک مجلس میں طلاق ثلاث کو ایک کلمہ کے ساتھ واقع کر دے تو وہ تینوں طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔ (ان کو ایک طلاق نہیں قرار دیا جاتا)

اور ان حضرات کا اس فیصلہ پر اجماع کر لینا ہمارے لیے دلیل اور حجت شرعی ہے۔ چنانچہ اس دور کے نامور عالم کبیر حضرت مولانا محمد تقی عثمانی نے یہی تحقیق بہ عبارت ذیل درج کی ہے:

... فهولاء فقهاء الصحابه امثال عمر و علی وعثمان وابن مسعود وابن عمر و عبدالله بن عمرو وعباده بن الصامت وابی هریره وابن عباس وابن الزبیر وعاصم بن عمر و عائشه (رضی الله تعالی عنهم) کلهم متفقون علی وقوع الثلاث ولو نطق بها الرجل فی مجلس واحد وکفی بهم حجته واستنادا۔

(تکملہ فتح الملہم از حضرت مولانا تقی عثمانی ص۱۵۸ ج اول تحت مسئلہ ہذا، طبع کراچی)

جمہور صحابہ کرام کے مسلک کی تائید

گزشتہ صفحات میں مسئلہ طلاق ثلاثہ کے متعلق جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا موقف بیان کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک مجلس میں ایک کلمہ سے ایک ہی وقت میں اپنی زوجہ کو تین طلاق دے دے تو وہ تین طلاقیں ہی واقع ہو جاتی ہیں۔

(وہ ایک طلاق شمار نہیں کی جاتی)

اس موقف کی تائید میں بعض مرفوع احادیث دستیاب ہوتی ہیں۔ ان احادیث میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ایک مرفوع روایت درج ذیل ہے:

مسلم شریف میں ہے کہ

...عن عائشه قالت طلق رجل امراته ثلاثا فتزوجها رجل ثم طلقها قبل ان يدخل بها- فاراد زوجها الاول ان يتزوجها- فسئل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن ذالك فقال لا- حتىٰ يذوق الاخر من عسيلتها- ما ذاق الاول- (مسلم شریف ص۴۶۳، جلد اوّل، باب لا تحل المطلقة ثلاثا لمطلقها حتیٰ تنکح زوجا غیرہ، دہلی)

اس مرفوع روایت کا مطلب یہ ہے کہ ...ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک شخص نے اپنی زوجہ کو تین طلاقیں دے دیں تو اس نے ایک دوسرے شخص سے نکاح کر لیا مگر اس دوسرے خاوند نے اس عورت کو رخصتی سے قبل ہی طلاق دے دی۔ ان حالات میں اس عورت کے پہلے خاوند نے اس سے دوبارہ نکاح کرنے کا ارادہ کیا۔ جب اس سلسلہ میں جناب نبی اقدس ﷺ سے دریافت کیا گیا تو آنجناب ﷺ نے فرمایا، بالکل نہیں۔ زوج اوّل اس عورت سے اس وقت تک نکاح نہیں کر سکتا جب تک کہ دوسرا زوج اس عورت سے جماع نہ کر لے۔

اس روایت سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ تین طلاقیں (یکبارگی) واقع اور نافذ ہو جاتی ہیں اور تین ہی شمار ہوتی ہیں اور وہ عورت طلاق دہندہ اوّل پر حرام ہو جاتی ہے کیونکہ آنجناب ﷺ نے ان تین طلاقوں پر انکار نہیں فرمایا اور نہ ہی رد فرمایا بلکہ ان کا نفاذ برقرار رکھا اور حکم مذکورہ بالا ارشاد فرمایا۔ اگر تین طلاقیں اجتماعی

طور پر ناجائز اور حرام ہوتیں تو جناب نبی کریم ﷺ اس پر خاموشی اختیار نہ فرماتے۔

نیز اسی مضمون کی ایک روایت بخاری شریف جلد ثانی صفحہ ۷۹۱، باب من اجاز طلاق الثلاث میں موجود ہے اور السنن الکبریٰ للبیہقی جلد سابع، صفحہ ۳۳۴ پر باب ما جاء فی امضاء الطلاق الثلاث--- الخ میں بھی موجود ہے۔ ناظرین کرام تسلی خاطر کے لیے ملاحظہ فرمائیں۔

ازالہ شبہات

بحث ہذا کے سلسلے میں اس مسئلہ میں اختلاف کرنے والے احباب اپنی تائید میں بعض روایات پیش کرتے ہیں اور عہد نبوی ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عہد کے بعض واقعات ذکر کرتے ہیں--- ان کے زعم میں یہ ان کے مؤید ہیں۔ پس ان روایات کے جواب میں رفع شبہات کے طور پر کلام کرنا مناسب خیال کیا ہے۔

اکابر علماء کرام نے جو چیزیں ان روایات کے جوابات کے درجہ میں ذکر کی ہیں ان کو ایک ترتیب کے ساتھ ہم پیش کرنا چاہتے ہیں۔ قابل جواب روایات پہلے ملاحظہ فرماویں۔ چنانچہ طاؤس سے مروی روایات اس طرح ہیں کہ

○ جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعدد شاگرد ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک شاگرد طاؤس بن کیسان ہیں جو ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مسئلہ ہذا کو آنموصوف کے دیگر شاگردوں اور راویوں کے برخلاف بیان کرتے ہیں۔

چنانچہ طاؤس بن کیسان جناب ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یوں ذکر کرتے ہیں کہ ابوالصہباء نے ابن عباس رضی اللہ عنہ پر ایک موقعہ پر بطور سوال کہا کہ آپ جانتے نہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہد کے ابتدائی سالوں میں تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دیا جاتا تھا؟؟ تو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا کہ ہاں یہ بات ٹھیک ہے۔

○ اور ایک دوسری روایت میں طاؤس جناب ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ذکر کرتے ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم اور ابوبکر کے عہد میں اور دو تین سال تک خلافت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں تین طلاق کو ایک طلاق قرار دیا جاتا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "لوگوں نے اس معاملہ میں جلدبازی اختیار کرلی ہے۔" الخ۔

چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے تین طلاقوں کو ایک طلاق شمار کرنے کی بجائے تین طلاق ہی کا نفاذ اور اجراء کر دیا۔

الجواب

اکابر علماء نے طاؤس بن کیسان کی جناب ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ان مرویات کا متعدد طریق سے جواب ذکر کیا ہے۔

چنانچہ ان میں سے چند ایک چیزیں ناظرین کرام کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں، ان پر غور فرمائیں ان شاء اللہ تعالیٰ موجب اطمینان ہوں گی۔

مفسرین میں ایک قدیم عالم ابو جعفر النحاس المتوفی ۳۳۸ھ انہوں نے الناسخ والمنسوخ میں یہ چیز اس طرح لکھی ہے کہ طاؤس اگرچہ صالح شخص ہے لیکن اس کے ہاں بعض منکر روایات بھی ہیں جن کی نسبت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف کر دی ہے اور اہل علم نے ان منکر روایات کو قبول نہیں کیا۔ ان میں سے ایک روایت یہ ہے کہ طاؤس ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کرتا ہے کہ ایک شخص نے اگر اپنی زوجہ کو کہا کہ تجھے تین طلاق ہیں تو اس صورت میں زوجہ کو ایک طلاق پڑے گی۔

طاؤس کے بغیر ابن عباس رضی اللہ عنہ سے دوسرا آدمی اس کو نہیں نقل کرتا۔ حالانکہ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں سے صحیح یہ بات مروی ہے کہ اس عورت کو تین طلاقیں ہوگئی ہیں۔ (ایک طلاق نہیں ہے) جس طرح کہ قرآن مجید میں ہے۔ فان طلقها فلا تحل له من بعد--- الخ

...وطاوس ان كان رجلا صالحا فعنده عن ابن عباس

رضی اللہ عنہ مناکیر یخالف علیها ولا یقبلها اهل العلم منها انه رویٰ عن ابن عباس انه قال فی رجل قال لامراته انت طالق ثلاثا انما تلزمه واحده ولا یعرف هذا عن ابن عباس الا من روایته والصحیح عنه وعن علی بن ابی طالب رضی الله عنه انها ثلاث کما قال الله (فان طلقها فلا تحل له من بعد) الثالثه۔

(الناسخ والمنسوخ لابی جعفر النحاس ص۶۹ تحت باب ذکر الآیہ الثالثہ والعشرین محمد بن احمد بن اسماعیل الصفار)

مندرجہ بالا روایت کے ذریعے واضح ہوگیا کہ طاؤس کے ذریعے جناب ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس مسئلہ میں جو مرویات ہیں، انہیں قدیم زمانہ سے علماء نے قبول نہیں کیا اور ان کے منکر ہونے کا قول کر دیا ہے اور معروف روایات کے مقابلہ میں منکر روایت کو قبول نہیں کیا جاتا بلکہ طاؤس کی روایت کو ثقات کے مقابلہ میں شاذ کہا جائے گا اور الثقه اذا شذ لا یقبل ما شذ فیه۔

○ پانچویں صدی ہجری کے مشہور فاضل ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ

... وروی عن ابن عباس جماعه من اصحابه خلاف ما روی طاوس فی طلاق ثلاث۔ انها لازمه فی المدخول بها وغیر المدخول بها انها ثلاث لا تحل له حتی تنکح زوجا غیره۔ وعلی هذا جماعه العلماء والفقهاء بالحجاز والعراق والشام والمشرق

اس کا مفہوم یہ ہے کہ طلاق ثلاث کے مسئلہ پر طاؤس نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے جو نقل کیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے دیگر شاگردوں کی ایک جماعت نے اس کے خلاف ذکر کیا ہے اور کہتے ہیں کہ عورت مدخولہ ہو یا غیرمدخولہ اس کے حق میں طلاق ثلاثہ تین ہی واقع ہو جاتی ہیں اور وہ دوسرے شخص سے نکاح کیے بغیر طلاق دہندہ کے لیے حلال نہیں ہو سکتی۔ طلاق

والمغرب عن اهل الفقه والحديث وهم الجماعه والحجه... الخ
(التمہید لابن عبدالبر ص۳۷۸، ج۲۳، طبع مکہ مکرمہ)

کے ثلاث ہونے پر حجاز عراق اور شام کے علماء اور فقہاء کی ایک جماعت متفق ہے اور اسی طرح مشرق و مغرب کے اہلِ فقہ اور اہلِ حدیث اس کے قائل ہیں اور وہ ایک جماعت ہیں اور حجت ہیں۔

اور امام بیہقی نے سنن الکبریٰ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کے شاگردوں کی اس جماعت کی تفصیل دی ہے جنہوں نے طاؤس کی روایت کے خلاف ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ مسئلہ نقل کیا ہے، وہ یہ ہیں:

سعید ابن جبیر، عطاء بن رباح، مجاہد، عکرمہ، عمرو بن دینار، ومالک بن الحارث، محمد بن ایاس بن البکیر، معاویہ بن ابی عیاش الانصاری--- کلهم عن ابن عباس انه اجاز الطلاق الثلاث وامضاهن۔

(السنن الکبریٰ ص۳۳۸، ج۷، طبع دکن اور ابن قدامہ نے المغنی ص۳۰۳، جلد سابع میں تحت مسئلہ ہذا کی یہی تحقیق نقل کی ہے) یعنی اب سب حضرات نے جناب ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ بات نقل کی ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ تین طلاقوں کو تین ہی قرار دیتے ہیں اور ان کو نافذ کرتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ طاؤس کے بغیر ابن عباس رضی اللہ عنہ کے باقی شاگردوں کی اس جماعت کثیر نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کا فرمان یہی نقل کیا ہے کہ تین طلاقیں تین ہی شمار جاتی ہیں۔ (ان کو ایک طلاق نہیں بتایا گیا)

گویا کہ جناب ابن عباس رضی اللہ عنہ کے شاگردوں کی جماعت کثیرہ کے مقابلہ میں طاؤس کا یہ بیان متفردانہ ہے اور دوسرے ثقات کے مقابلہ میں انفراد کو شاذ کہا جاتا ہے۔

طاؤس کی روایت کا شذوذ

○ ابن عبدالبر نے اس مقام میں ایک دیگر اہم چیز ذکر کی ہے کہ طاؤس (ابن کیسان) اپنی جلالت شان کے باوجود بعض دفعہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے شاذ روایات بھی ذکر کرتا ہے۔ چنانچہ یہاں اس نے دو عدد روایتیں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے شاذ نقل کی ہیں۔ ایک روایت خلع کے مسئلہ میں ہے اور دوسری روایت اجتماعی طلاق ثلاث کو ایک قرار دینے کے معاملہ میں ہے۔

... ولطاوس مع جلالته روايتان شاذتان عن ابن عباس رضى الله عنه هذه احداهما فى الخلع والاخرى فى الطلاق الثلاث المجتمعات انها واحده۔

(کتاب التمہید لما فی الموطاء من المعانی والاسانید ص۳۷۸، ج۲۳، طبع مکۃ المکرمہ)

معلوم ہوا کہ اس فن کے علماء کے نزدیک اجتماعی طلاق ثلاثہ کو واحد قرار دینے والی طاؤس کی یہ روایت بمنزلہ شاذ کے ہے اور شاذ روایت کے متعلق علماء نے یہ قاعدہ لکھا ہے کہ

...الثقه اذا شذ لا يقبل ما شذ فيه۔ یعنی اگر ثقہ راوی شاذ روایت لائے تو وہ قبول نہیں کی جاتی۔

(مرقات شرح مشکوٰۃ ص۳۲۸، ج۶، طبع ملتان)

دیگر طریقہ

طاؤس کی مذکور روایت کے متعلق علماء نے ایک دوسرے طریقہ سے کلام کیا ہے۔ ابن قدامہ حنبلی نے المغنی میں لکھا ہے کہ

...وافتى ابن عباس رضی اللہ عنہ بخلاف ما رواه عنه طاوس۔

(المغنی لابن قدامہ الحنبلی ص۳۰۳-۳۰۴، ج سابع تحت بحث ہذا، طبع قدیم، مصری)

...فاما حديث ابن عباس رضی اللہ عنہ فقد صحت الروايته عنه

بخلافه وافتی ایضا بخلافه۔

(تفسیر مظہری از قاضی ثناء اللہ پانی پتی، ص۲۷۹، جلد اوّل، تحت الطلاق مرتان، طبع دہلی)

مطلب یہ ہے کہ طاؤس کی روایت کے خلاف خود ابن عباس رضی اللہ عنہ کا فتویٰ موجود ہے۔ اور ان کا قول بھی اس کے برعکس پایا جاتا ہے۔ (جیسا کہ اقوال صحابہ کے مقام میں گزشتہ صفحات میں اس چیز کو تفصیلا درج کر دیا گیا) وہاں حوالہ جات ہم نے درج کر دیئے ہیں۔

پس جبکہ طاؤس کی روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے فتویٰ اور قول کے خلاف پائی گئی تو یہاں ترجیح قائم کرنا متعین ہوگی۔ اس بنا پر کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی چیز انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے پہنچی ہو اور پھر اس کے خلاف کر دیں۔

چنانچہ ابن حجر عسقلانی رحمتہ اللہ علیہ فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ

... عن ابن المنذر انه لا يظن بابن عباس انه يحفظ عن النبي صلى الله عليه وسلم شياء ويفتي بخلافه فتعين المصير الى الترجيح والاخذ بقول الاكثر اولى من الاخذ بقول الواحد اذا خالفهم۔

یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اکثر شاگردوں اور راویوں کے قول کو لیا جائے گا اور ایک راوی کے قول کو (جبکہ وہ اکثر کی مخالفت میں ہے) مرجوح قرار دے کر متروک سمجھا جائے گا۔

(۱) فتح الباری ص۲۹۸، جلد تاسع، تحت من جوز طلاق الثلاث۔

(۲) بذل المجہود (فی حل ابی داؤد) ص۶۳، ج۳، تحت بحث ہذا

حاصل یہ ہے کہ جناب ابن عباس رضی اللہ عنہ کا طاؤس والی روایت کے خلاف فتویٰ کا پایا جانا یہ اس بنا پر ہے کہ ان کے لیے اصل معنی ظاہر اور واضح ہوگیا تھا کیونکہ روایت کا راوی اعلم ہوتا ہے اس چیز کے ساتھ جو اس نے روایت کی ہے۔

صاحب روایت کا اپنی مروی کے خلاف قول و عمل

جب صاحب روایت سے اپنی مروی کے خلاف قول و عمل پایا جائے تو ایسے مواقع میں علمائے اصول اس کو مستقل بحث کی صورت میں ذکر کرتے ہیں۔

چنانچہ شمس الائمہ السرخسی نے یہ چیز اپنے اصول میں بہ عبارت ذیل ذکر کی ہے کہ

... او یکون ذالک منه علی انه علم انتساخ حکم الحدیث- وهذا احسن الوجوه- فیجب الحمل علیه تحسینا للظن براویته وعمله...... وعلم انه منسوخ فافتی بخلافه او عمل بالناسخ دون المنسوخ-

(اصول السرخسی ص۶ ج۲، فصل فی الخبر یلحقه التکذیب... الخ، طبع دکن)

اس کا حاصل یہ ہے کہ راوی کا قول و عمل اپنی مروی چیز کے برخلاف پایا جائے تو اس کو اس چیز پر محمول کرنا واجب ہے کہ راوی کو سابق حدیث کے حکم کے منسوخ ہونے کا علم ہوگیا ہے۔ یہ ایک بہتر توجیہہ ہے کہ راوی کی روایت اور اس کے عمل کے ساتھ حسن ظن رکھتے ہوئے اس طرح روایت کا محمل بنایا جائے۔

تھوڑا سا آگے چل کر پھر یہی مسئلہ تحریر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

جب صاحب روایت کو معلوم ہوگیا کہ اس حدیث کا حکم منسوخ ہوگیا ہے تو اس بنا پر اس نے سابق حکم کے مخالف فتویٰ دے دیا یا یوں کہیے کہ راوی نے ناسخ پر عمل کیا اور منسوخ کو ترک کردیا۔

یہ توجیہ اس مقام میں اس صورت میں کی جائے گی جبکہ یہ تسلیم کرلیا جائے کہ بقول طاؤس ابن عباس سابقاً اس مسئلہ میں ایک طلاق کے جواز کے قائل تھے اور بعد میں انہوں نے اس مسئلہ میں یہ قول اختیار کیا کہ تین طلاق یکبارگی کہنے سے تین طلاقیں ہی واقع ہو جاتی ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ آنموصوف کو سابق قول کے متروک و منسوخ ہونے کا علم ہوا تو اس بنا پر انہوں نے بعد میں یہ صورت اختیار کی اور سابق قول کو ترک کردیا۔

علماء کا کلام

طاؤس کی وہ روایت جس میں الصہباء کا سوال ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ہے---
اس روایت پر کبار علماء کا کلام پایا جاتا ہے۔
چنانچہ صاحب الجوہر النقی نے مندرجہ ذیل عبارت میں اس پر بحث کی ہے۔

...وذکر صاحب الاستذکار ان ھذہ الروایہ وھم وغلط- لم یعرج علیھا احد من العلماء- وقد قیل ابوالصھباء لا یعرف فی موالی ابن عباس وطاوس یقول ان ابوالصھباء مولاہ سالہ عن ذالک- ولا یصح ذالک عن ابن عباس لروایہ الثقات عنہ خلافہ- ولو صح عنہ ما کان قولہ حجہ علی من ھو من الصحابہ اجل واعلم منہ وھم عمر و عثمان و علی و ابن مسعود وابن عمر رضی اللہ تعالی عنھم وغیرھم- (الجوہر النقی لعلی بن عثمان المارديني ص۳۳۷-۳۳۸، ج۷، تحت باب من جعل الثلاث واحدۃ)

فرماتے ہیں کہ صاحب "استذکار" نے یہ بات درج کی ہے کہ اس روایت میں وہم راوی ہے اور اس میں انتساب غلط ہے۔ اور بعض کی طرف سے یہ بات کہی گئی ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے موالی میں ابوالصہباء غیر معروف شخص ہے۔ اور طاؤس کہتا ہے کہ ابو الصہباء ابن عباس کا مولیٰ ہے اور اس نے اس مسئلہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے سوال کیا۔ یہ بات صحیح نہیں اس لیے کہ ابن عباس سے ثقات راوی اس کے خلاف ذکر کرتے ہیں۔ اور بالفرض یہ بات جو طاؤس نے ابن عباس سے نقل کی ہے اگر صحیح ہو تب بھی ان کا قول قابل حجت نہیں ہے۔ ان لوگوں پر جو مرتبے میں ان سے بڑے اور علم میں زیادہ ہیں وہ حضرات یہ ہیں: عمر، عثمان، علی، ابن مسعود اور ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

مختصر یہ ہے کہ ان اکابر حضرات کے قول کو ترجیح ہوگی اور ان کے قول کو مقدم رکھا جائے گا۔

ایک انکشاف

○ اور الفاضل زاہد بن الحسن الکوثری رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ "الاشفاق علیٰ احکام الطلاق" میں مزید ایک عجیب بات کا انکشاف کیا ہے کہ

...قال الحسين بن علی الكرابيسی "فی ادب القضاء" اخبرنا علی بن عبدالله (وهو ابن المدينی) عن عبدالرزاق عن معمر عن ابن طاوس عن طاوس انه قال من حدثك عن طاوس انه كان يروی طلاق الثلاث واحده كذبه۔

دوسرے مقام میں بھی یہ ذکر کیا ہے کہ

... ابن طاوس (عبدالله) راوی هذا الخبر عن ابيه كذب من نسب الی والده ان الثلاث واحده۔

(الاشفاق علی احکام الطلاق ص۳۹، و ص۵۵، طبع کراچی)

فاضل الکوثریؒ کی ان ہر دو عبارات کا حاصل یہ ہے کہ

... "طاؤس کے فرزند (عبداللہ) اپنے مخاطب کو کہتے ہیں کہ جس شخص نے تجھے میرے والد (طاؤس) سے یہ بات نقل کی ہے کہ وہ تین طلاق کو ایک طلاق قرار دیتے تھے تو اس نے جھوٹ کہا ہے اور غلط انتساب کیا ہے۔"

گویا کہ خبرہذا کے راوی نے اس کے انتساب کی تغلیط کر دی کہ طاؤس اس بات کے قائل نہ تھے، بلکہ وہ تینوں کو تین طلاق ہی کہتے تھے۔

یہ چیز نہایت قابل غور ہے کیونکہ اس طریقہ سے تو طاؤس کی ان مرویات کی

بحث ہی ختم ہو جاتی ہے اور اس کی حاجت ہی نہیں رہتی۔

روایات رکانہ پر بحث

جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی مرویات میں سے ایک وہ مرفوع روایت بھی ہے جسے حدیث رکانہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس روایت کا حاصل یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص رکانہ بن عبد یزید نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے عہد میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ پھر وہ اپنے اس فعل پر نادم اور متاسف ہوا۔ اس کے بعد رکانہ نے جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ میں نے اپنی زوجہ کو تین طلاق دے دی ہیں تو آنجناب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے رکانہ سے حلف کے ساتھ استفسار فرمایا کہ تو نے اپنے الفاظ کے ساتھ کیا ارادہ کیا تھا؟ تو رکانہ نے عرض کیا کہ میں نے ایک طلاق کا ارادہ کیا تھا۔ تو اس وقت جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اسے نکاح جدید کے ساتھ رجوع کرنے کی اجازت دے دی۔

اس روایت کی روشنی میں بعض لوگ یہ مسئلہ تجویز کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی زوجہ کو یکبارگی تین طلاق دے دے تو وہ نکاح جدید کے ساتھ رجوع کر سکتا ہے۔ (تحلیل کی ضرورت نہیں)

الجواب

رکانہ کی روایت کے متعلق علماء نے متعدد جوابات ذکر کیے ہیں، ان میں سے امام النواوی کا کلام جو انہوں نے اس روایت پر کیا ہے، وہ پہلے پیش کیا جاتا ہے۔

(ا)

امام النواوی شرح مسلم میں فرماتے ہیں کہ

... واما الراویہ التی رواھا المخالفون ان رکانہ طلق ثلاثا فجعلھا واحدہ فراویہ ضعیفہ عن قوم مجھولین وانما الصحیح منھا ما قدمناہ انہ طلقھا البتہ ولفظ البتہ محتمل للواحدہ وللثلاث ولعل صاحب ھذہ الروایہ الضعیفہ اعتقد ان لفظ البتہ یقتضی الثلاث فرواہ بالمعنی الذی فھمہ وغلط فی ذالک۔ (النواوی شرح مسلم شریف ص۴۷۸، ج اول، تحت روایت مذکورہ باب طلاق الثلاث، طبع نور محمدی، دہلی)

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ رکانہ کی روایت جس میں اس نے تین طلاق دے دی تھیں اور پھر اس نے اس کو ایک طلاق بنایا۔ مخالفین نے اپنی تائید میں یہ روایت پیش کی ہے۔ لیکن یہ روایت ضعیف ہے اور مجہول لوگوں سے منقول ہے--- اس میں صحیح بات یہ ہے جو ہم نے قبل ازیں ذکر بھی کی ہے کہ رکانہ نے اپنی زوجہ کو "البتہ" کے لفظ کے ساتھ طلاق دی تھی۔ البتہ کا لفظ ایک طلاق اور تین طلاق دونوں معانی کے لیے محتمل ہے--- تو اس ضعیف روایت کے راوی نے اعتقاد کیا کہ لفظ "البتہ" تین طلاق کا مقتضی ہے۔ چنانچہ اس نے بالمعنی روایت کرتے ہوئے یہی سمجھا اور اس میں غلطی کی۔

مطلب یہ ہے کہ رکانہ نے تین طلاق نہیں دی تھیں بلکہ البتہ کے لفظ سے طلاق دی اور ایک طلاق کا ارادہ کیا۔



جس طرح امام النواوی رحمتہ اللہ علیہ نے روایت (رکانہ والی) پر کلام کیا ہے اسی طرح صاحب فتح القدیر ابنِ ہمام رحمتہ اللہ علیہ اور دیگر علمائے کبار نے بھی اس پر نقد کیا ہے اور دیگر روایات کی روشنی میں انہوں نے روایت کی عمدہ تشریح کر دی ہے جس سے اصل واقعہ کی حقیقت سامنے آجاتی ہے اور اس کا صحیح موقعہ و محل

واضح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فتح القدیر میں ہے کہ

...واما حدیث رکانه فمنکر والاصح ما رواه ابوداود والترمذی و ابن ماجه ان رکانه طلق زوجته البته فحلفه رسول الله صلی الله علیه وسلم انه ما اراد الا واحده فردها الیه۔ فطلقها الثانیه فی زمن عمر رضی الله عنه الثالثه فی زمن عثمان رضی الله عنه۔ قال ابوداود وهذا اصح۔

(۱) فتح القدیر شرح ہدایہ ص۳۲۶، ج۳، تحت بحث ہذا۔

(۲) تفسیر مظہری ص۲۸۰-۲۸۱، ج۱، تحت بحث الطلاق مرتان، پ۱۔

ابوداؤد شریف میں ہے کہ

...عن نافع بن عجیر بن عبد یزید بن رکانه ان رکانه بن عبد یزید طلق امراته سهیمه البته فاخبر النبی صلی الله علیه وسلم بذالک وقال والله ما اردت الا واحده فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم ما اردت الا واحده فقال رکانه والله ما اردت الا واحده فردها الیه رسول الله صلی علیه وسلم۔ فطلقها الثانیه فی زمان عمر والثالثه فی زمان عثمان۔

(ابوداؤد شریف ص۳۰۷، ج۱، باب فی البتۃ، طبع مجتبائی، دہلی)

اس روایت سے ماقبل ص۳۰۶، ج اول پر نافع بن عجیر کی روایت ہذا کو ابوداؤد رحمتہ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ

...حدیث نافع اصح لانهم ولد الرجل واهله اعلم به ان رکانه انما طلق امراته البته فجعلها النبی

اس کا مطلب یہ ہے کہ رکانہ والی روایت (معروف روایات کے مقابلہ کی بنا پر) منکر کے درجہ میں ہے اور اس واقعہ میں زیادہ صحیح وہ روایت ہے جسے محدث

صلی اللہ علیہ وسلم واحدہ- ابوداوُدؒ اور امام ترمذیؒ اور ابنِ ماجہؒ نے ذکر کیا ہے-

(ابوداوُد شریف ص۳۰۶، ج۱، باب بقیہ نسخ المراجعہ بعد التطلیقات الثلاث، طبع مجتبائی، دہلی)

وہ یہ ہے کہ رکانہ نے اپنی زوجہ کو لفظ "البتہ" کے ساتھ طلاق دی اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت اقدس میں اپنے اس فعل کی اطلاع کی) تو جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے رکانہ کو حلف دے کر دریافت فرمایا کہ اس لفظ "البتہ" سے تیرا ارادہ کیا تھا؟؟ تو اس نے جواب میں حلف کے ساتھ کہا کہ میں نے اس میں صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا تھا تو اس پر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس کی زوجہ کو اس کی طرف لوٹا دیا- (یہ عہد نبوی کا واقعہ تھا) اس کے بعد رکانہ نے عہد عمر رضی اللہ عنہ بن الخطاب میں اس کو طلاق ثانیہ دی اور پھر عہد عثمان رضی اللہ عنہ میں رکانہ نے تیسری طلاق دی-

محدث ابوداوُد کہتے ہیں کہ یہ بات زیادہ صحیح ہے-

تشریح

حاصل مقصد یہ ہے کہ محدث ابوداوُد کی تصریح کے مطابق رکانہ نے اپنی زوجہ کو "البتہ" کے لفظ کے ساتھ طلاق دی تھی جیسا کہ رکانہ کے خاندان کے لوگ بیان کرتے ہیں اور گھر والے بہ نسبت دوسروں کے اصل واقعہ کے ساتھ زیادہ واقف ہوتے ہیں- پھر اس کے بعد "البتہ" کے اس لفظ کو بعض رواۃ نے ثلاث کا "ہم معنی" و "ہم مفہوم" قرار دے کر لفظ "ثلاث" سے تعبیر کر دیا- رکانہ نے طلاق ثلاث نہیں دی تھی-

خلاصہ یہ ہے کہ واقعہ رکانہ کے ساتھ بعض لوگوں کا استدلال کرنا اور اپنے مدعا کے لیے دلیل بنانا صحیح نہیں ہے-

کیونکہ اصل واقعہ میں تین طلاق کا وقوع ہی نہیں ہے بلکہ لفظ "البتہ" کہہ کر

ایک طلاق کا قصد کیا گیا تھا۔

فلہذا اس روایت کو طلاق ثلاثہ مجموعاً کے جواز و نفاذ کے لیے استدلال بنانا اور طلاق ثلاث کے بعد رجوع کر لینے کا حق اس کو دینے پر دلیل کرنا بالکل صحیح نہیں ہے اور بے محل اور بے موقعہ ہے۔

ابنِ حجرؒ کی تحقیق

حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ اپنی مشہور تصنیف "تلخیص الحبیر ص ۲۱۳، ج ۳، کتاب الطلاق میں روایت ہذا البتہ" کے الفاظ سے ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

... واختلفوا هل هو من مسند ركانه او مرسل عنه وصححه ابوداود وابن حبان والحاكم اعله البخارى بالاضطراب۔ وقال ابن عبدالبر فى التمهيد ضعفوه... الخ۔

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ روایت رکانہ کے مسندات میں سے ہے اور بعض کا خیال ہے کہ یہ روایت رکانہ سے مرسل ہے۔ ابوداؤد، ابنِ حبان اور الحاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اور امام بخاریؒ نے اس روایت کے متن میں اضطراب کی وجہ سے اس روایت کو معلول کہا ہے جبکہ علامہ ابنِ عبدالبرؒ نے کہا کہ علماء نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔

حاصل کلام

یہ ہے کہ روایت رکانہ پر علمائے کبار نے جو کلام کر دیا ہے، اسے باحوالہ ہم نے پیش کیا ہے کہ بقول محدثین ضعیف ہے، مجہول رواۃ سے مروی ہے، منکر ہے، باعتبار متن کے معلول ہے وغیرہ۔

تو ایسی روایت کو اثبات مدعا کے لیے دلیل بنانا درست نہیں ہے اور اگر اس نقد و جرح سے صرف نظر کرلی جائے، تب بھی اس سے استدلال ٹھیک نہیں---
وجہ یہ ہے کہ صاحب واقعہ نے "طلاق ثلاث" کے الفاظ کے ساتھ طلاق نہیں دی (البتہ) کے لفظ کے ساتھ طلاق کا ارادہ کیا تھا۔

اب اس چیز کو تین طلاقوں کو ایک قرار دینے پر حجت و دلیل بنانا کسی صورت میں درست نہیں۔ یہ تو ان دوستوں کی غلط فہمی ہی کہی جاسکتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر الزام

بعض لوگوں نے طلاق ثلاثہ کے مسئلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر یہ طعن قائم کیا ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں پھر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں اور ابتدا عہد فاروق رضی اللہ عنہ میں طلاق ثلاثہ کو ایک طلاق شمار کیا جاتا تھا، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی رائے سے اور اپنی سیاست جمانے کے لیے تین طلاقوں کو تین طلاقیں ہونا ہی قرار دے دیا۔

اس اعتراض کے رفع کرنے کے لیے ذیل میں کلام کیا جاتا ہے جس سے یہ طعن زائل ہو جائے گا اور مسئلہ کی اصل حقیقت واضح ہو جائے گی۔

الجواب

اصل بات یہ ہے کہ طلاق کے معاملہ میں شرعی احکام کی رو سے تاخیر اور ترک عجلت کا حکم ہے۔

یعنی حتی المقدور بلاضرورت ایقاع طلاق کی طرف اقدام ہرگز نہ کیا جائے۔
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں لوگوں نے طلاق دینے کے معاملہ میں عجلت سے کام لیا اور تین طلاقیں بیک وقت اور ایک کلمہ کے ساتھ دینے لگے۔ حالانکہ شریعت کی طرف سے اگر مجبوراً طلاق دینا پڑے تو الگ الگ طہر میں ایک ایک طلاق دینے کا

حکم ہے۔ یعنی تین طلاقیں یکبارگی دینے کا کوئی جواز نہیں لیکن اگر کوئی شخص غلطی سے ایسا کر گزرے تو تین طلاقیں ہی واقع ہو جاتی ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں جب لوگوں کو اس مسئلہ میں عجلت اختیار کرتے دیکھا تو آنموصوف نے لوگوں کی ایک جماعت کو خطاب کرتے ہوئے مسئلہ ہذا کی وضاحت فرمائی۔

اس دوران کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایسی جماعت موجود تھی جو جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے عہد کے گزشتہ واقعات سے اچھی طرح باخبر تھے۔ ان کی موجودگی میں یہ حکم جاری کیا گیا اور حاضرین میں سے کسی شخص نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس فرمان کے خلاف کوئی انکار نہیں کیا اور کسی صاحب نے جواب میں مدافعت نہیں کی۔

یہ صورت حال اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ اس سے قبل مسئلہ ہذا کی جو صورت تھی، وہ منسوخ اور متروک ہو چکی تھی۔ (اور وجہ نسخ ان پر ظاہر ہو گئی تھی)

(۱) اسی چیز کو امام الطحاوی ؒ نے بہ عبارت ذیل درج کیا ہے:

... فخاطب عمر رضی اللہ عنہ بذالک الناس جمیعا وفیہم اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و رضی عنہم الذین قدعلموا ما تقدم من ذالک فی زمن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلم ینکر علیہ منہم منکر ولم یدفعہ دافع فکان ذالک اکبر الحجہ فی نسخ ما تقدم من ذالک...

(شرح معانی الآثار للطحاوی ؒ ص ۳۲، ج ۲، تحت باب الطلقات الثلاثۃ دفعتا)

(۲) ماقبل میں اس مسئلہ پر امام طحاوی رحمتہ اللہ علیہ کا ایک حوالہ درج کیا ہے۔ اب اس کے بعد ابنِ حجر عسقلانی کا فتح الباری سے ایک عمدہ بیان تائیداً پیش کیا جاتا

ہے۔

ابن حجر رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تحریم متعہ کے مسئلہ اور ایقاع الثلاث (فی الطلاق) کے مسئلہ پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں اجماع منعقد ہوا تھا اور اس کے بعد میں ان دونوں مسائل پر کسی ایک شخص نے بھی مخالفت نہیں کی تھی۔

یہ چیز اس بات پر دلیل ہے کہ ان مسائل میں وجود ناسخ کے پائے جانے کی بنا پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع و اتفاق ہوا تھا۔ اگرچہ یہ بات قبل ازیں بعض حضرات سے مخفی تھی، حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں آکر تمام حضرات پر یہ بات واضح ہو گئی۔

پس اس اجماع کے بعد جو مخالفت کرنے والا ہے، وہ اس کو گرا دینے والا ہو گا۔

(قاعدہ یہ ہے کہ) جمہور علماء کے نزدیک مسئلہ پر اتفاق کر لینے کے بعد اختلاف کھڑا کرنے کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔ (واللہ اعلم)

... فالراجح فی الموضعین تحریم المتعہ وایقاع الثلاث للاجماع الذی انعقد فی عہد عمر علی ذالک ولا یحفظ ان احدا فی عہد عمر رضی اللہ عنہ خالفہ فی واحدہ منہما و قدول اجماعہم علی وجود ناسخ وان کان خفی عن بعضہم قبل ذالک حتی ظہر لجمیعہم فی عہد عمر رضی اللہ عنہ فالمخالف بعد ھذا الاجماع منا بذلہ والجمہور علی عدم اعتبار من احدث الاختلاف بعد الاتفاق - واللہ اعلم-

(۱) فتح الباری لابن حجر عسقلانی ص۲۹۹، ج۹، تحت من جوز الطلاق الثلاث۔

(۲) بذل المجہود شرح ابی داؤد ص ۶۴، ج ۳، نسخ فی المراجعۃ بعد... الخ۔

(نوٹ) ابنِ حجر العسقلانی نے مسئلہ ہذا میں فتح الباری کے اس مقام میں بڑے مفصل جوابات درج کیے ہیں، اہلِ علم رجوع فرما سکتے ہیں۔

تائید

(۳) جس طرح سابق حوالہ جات میں یہ بات مذکور ہے کہ عہد فاروقی میں ایقاع الثلاث (فی الطلاق) کے مسئلہ میں صحابہ کرام کا اجماع ہو گیا تھا اور وہ ناسخ کے پائے جانے کی بنا پر ہوا۔

اس مضمون کو ابن ہمام نے اپنی تصنیف فتح القدیر میں اور ملا علی القاری نے مرقات شرح مشکوۃ میں درج کیا ہے۔ عبارت ذکر کرنے میں تطویل ہوتی ہے۔ اس بنا پر اہلِ علم کے لیے صرف حوالہ پیش کیا جاتا ہے:

(۱) (فتح القدیر شرح الہدایہ لابنِ ہمام ص۲۵، ج۳، تحت بحث ہذا (طلاق البدعۃ) طبع مصر (معہ العنایہ)

(۲) (مرقات شرح مشکوۃ ملا علی القاری ص۲۹۴، ج۶، طبع ملتان، تحت روایت ابنِ عباس از موطا مالک، باب الخلع والطلاق، الفصل الثالث)

مزید تائید

(۳) جناب قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں یہی بیان درج کیا ہے۔ عبارت ملاحظہ فرمائیں:

... وما ذكر من حديث ابن عباس رضی اللہ عنہ فيه دلاله على ان الحديث منسوخ فان امضاء عمر الثلاث بمحضر من الصحابه وتقرر الامر على

عبارت ہذا کا مفہوم یہ ہے کہ ابن عباس کی روایت جو مذکور ہے، اس میں اس چیز پر دلالت پائی جاتی ہے کہ یہ روایت منسوخ ہے۔ جماعت صحابہ کی موجودگی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طلاق ثلاث کا امضاء و

ذالک یدل علی ثبوت الناسخ عندهم وان كان قد خفی ذالک قبله فی خلافه ابی بکر۔ وقد صح فتوی ابن عباس علی خلاف ما رواه... الخ (تفسیر المظہری ص۲۷۹، ج۱، تحت الآیہ الطلاق مرتان، پ۲)

نفاذ کرنا اور اس امر کا تقرر ہو جانا' یہ بات دلالت کرتی ہے کہ ان کے نزدیک ناسخ کا ثبوت موجود تھا۔ اگرچہ یہ بات قبل ازیں عہد صدیقی میں مخفی تھی' اور پھر ابن عباس رضی اللہ عنہ کے فتویٰ کا اپنی روایت کے خلاف پایا جانا صحیح طریقہ سے ثابت ہو چکا ہے۔(پس ان امور کے پیش نظر واضح ہو گیا کہ ان حضرات کے سامنے ثبوت نسخ موجود تھا)

(۵) اور اہل علم کی تسلی کے لیے یہ بات ذکر کر دینا مفید ہے کہ صحیح مسلم شریف کے حواشی میں علامہ ابوالحسن سندھی رحمتہ اللہ علیہ نے اسی مسئلہ پر (کہ صحابہ کرام کو وجود ناسخ معلوم ہو گیا تھا) نفیس پیرایہ میں بحث کی ہے۔

مسئلہ ہذا کے شائق مقام ذیل کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

(الحاشیہ لابی الحسن السندھی علی مسلم ص۵۴-۵۵، کتاب الطلاق، مطبوعہ ملتان، طبع قدیم)

خلاصہ بحث یہ ہے کہ

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے طلاق ثلاث کے نفاذ کا حکم دیا تو وہ کوئی تفرد نہیں تھا اور نہ ہی وہ کوئی سیاسی حکمرانی تھی' نہ وہ حکم بدعت تھا اور نہ ہی قضاء نبوی کے خلاف تھا۔

وجہ یہ ہے کہ:

کسی صحابی نے (ابن عباس رضی اللہ عنہ سمیت) اس حکم کے خلاف آواز نہیں اٹھائی اور کسی نے انکار نہیں کیا۔

بلکہ سب اس پر رضامند ہو گئے' بس یہی بات حق ہے کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حق کے خلاف کسی چیز پر خاموش نہیں ہوتے اور ناحق بات پر اجماع نہیں کرتے اور ان کا فعل حجت شرعی ہے۔

مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ پر الزام کا دفاع

مخالفین صحابہ کی طرف سے مشہور صحابی حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ پر یہ طعن قائم کیا جاتا ہے کہ وہ زنا کے مرتکب ہوئے تھے اور ان کے اس فعل پر گواہوں نے گواہی دی تھی۔

لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک آخری گواہ کے حق میں دعا مانگی اور ایک طریقہ سے اس کو تلقین بھی کی تا کہ اس کی شہادت نامکمل پائی جائے۔

اس ذریعہ سے انہوں نے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو حد زنا لگنے سے بچا لیا۔

گویا کہ مخالفین صحابہ کی طرف سے دونوں صحابہ کرام رضی اللہ عنہما پر طعن قائم کیا گیا ہے۔ حضرت مغیرہ کو بدکاری کی تہمت کے ساتھ مطعون کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شرعی حد رائیگاں کرنے میں ملوث کیا گیا۔

الجواب

اس سلسلہ میں چند چیزیں قابل وضاحت ہیں، ان کو ایک ترتیب سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس الزام کا جواب تمام ہو گا۔

ایک بات تو یہ ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق یہ

واقعہ مختلف روایات میں پایا جاتا ہے جن کے اسانید پر محدثانہ طریق پر کلام کرنے کے بہت سے مواقع موجود ہیں اور اس کی تفصیلات میں جانا ایک طویل بحث کا موجب ہے۔

بالفرض روایات کے اسناد پر نقد اختیار کرنے سے صرف نظر کرتے ہوئے اگر اس واقعہ کو کسی درجہ میں تسلیم کر بھی لیا جائے تو اس امر کو دیکھنا ہوگا کہ یہ واقعہ کن حالات میں پیش آیا اور اس کا پس منظر کیا تھا؟

مورخین لکھتے ہیں کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ جس دوران حاکم بصرہ متعین تھے، وہاں بعض لوگ ان کے خلاف تھے ان میں ابوبکرۃ آنموصوف کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔

بقول بعض مورخین مثلاً الطبری والبلاذری کے، مخالفین نے مناقشہ اور مخاصمت کی بنا پر آنموصوف پر بدکاری کا الزام لگا دیا۔

اور پھر ان مخالفین نے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے خلاف حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس شہادتیں دیں جو اپنی جگہ پر اس الزام کے ثبوت میں ناکمل تھیں۔ اس وجہ سے آنموصوف رضی اللہ عنہ پر جرم ثابت نہ ہوسکا اور الزام لگانے والوں پر حد قذف لگائی گئی۔

یہ طریقہ شرعی قواعد کے موافق سرانجام پایا اس کو حیلہ بازی پر محمول کرنا اور جانبداری قرار دینا سراسر ناانصافی ہے۔

نیز مخالفین صحابہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر شواہد کو تلقین کرنے کا طعن بھی تجویز کرتے ہیں جو سراسر غلط ہے اور یہ طعن رواۃ کی طرف سے روایات میں ادراج کلمات کی بنا پر تیار کیا گیا ہے۔ فلہذا یہ طعن حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر بہتان صریح ہے۔

چنانچہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

...وتلقین شاهد افتراء محض وبهتان صریح است۔

اور دوسرے مقام پر تحریر کرتے ہیں کہ

... و آنچہ گفتہ اند کہ عمر رضی اللہ عنہ ایں کلمہ گفت (اری وجہ رجل لا یفضح اللہ بہ رجلا من المسلمین) غلط صریح و افتراء قبیح بر عمر رضی اللہ عنہ است۔

مطلب یہ ہے کہ راویوں کی طرف سے روایت میں ایسے کلمات درج کر دیئے گئے ہیں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر بالکل افتراء کے درجہ میں ہیں۔

(تحفہ اثنا عشریہ ص۲۹۷، تحت طعن ششم مطاعن فاروقی، طبع سہیل اکیڈمی لاہور)

اس چیز پر قرینہ یہ ہے کہ یہ واقعہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عدالت میں جب پیش ہوا تو اس وقت وہاں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے علاوہ متعدد کبار صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم موجود تھے اور کسی امر ناحق پر انکار کرنا اور جہاراً اس پر نکیر کرنا ان حضرات کا شیوہ تھا پھر وہ کس طور پر اس معاملہ میں خاموش رہے اور سکوت اختیار کیے رکھا؟؟ اور ناحق بات کو رد نہیں کیا؟؟

یہاں سے معلوم ہوا کہ اس موقعہ پر کوئی خلاف شرع یا خلاف حق بات سامنے نہیں آئی اور نہ ہی کوئی قابل اعتراض چیز پائی گئی۔

ایک توجیہ

اور بعض علماء نے اس واقعہ کے متعلق مندرجہ ذیل توجیہ ذکر کی ہے۔

چنانچہ حافظ ابن حجر العسقلانی نے اپنی تالیف "تلخیص الحبیر" میں البلاذری کے حوالہ سے تحریر کیا ہے کہ

... وافاد البلاذری: ان المراہ التی رمی بھا: ام جمیل بنت محجن بن الافقم الھلالیہ وقیل ان المغیرہ کان تزوج بھا

یعنی البلاذری کہتے ہیں کہ وہ عورت جس کے متعلق حضرت مغیرہ بن شعبہ پر الزام لگایا گیا اس کا نام ام جمیل بنت محجن الھلالیہ تھا اور کہا گیا ہے کہ اس عورت کے

سرا- وكان عمر لا يجيز نكاح السر ويوجب الحد على فاعله- فلهذا سكت المغيره وهذا لم اره منقولا باسناد وان صح كان عذرا حسنا لهذا الصحابي-

ساتھ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے پوشیدہ نکاح کیا ہوا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پوشیدہ نکاح کو جائز قرار نہیں دیتے تھے اور ایسا کرنے والے کو سزا دیتے تھے، اس وجہ سے حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ اس بات کے اظہار سے خاموش رہے اور پوشیدہ نکاح کو ظاہر نہیں کیا۔

(۱) تلخیص الحبیر لابن حجر ص ۶۳، ج ۴، تحت کتاب حد القذف۔

(۲) فیض الباری علی صحیح البخاری از حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری ؒ ص ۳۸۶، ج ۳، باب شہادۃ القاذف، قولہ جلد عمر رضی اللہ عنہ ابابکرۃ... الخ۔

مختصر یہ ہے کہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعہ کو غیر صحاح کے بعض مولفین نے ذکر کیا ہے لیکن حسب عادت مورخین نے زیادہ تفصیلات ذکر کر دی ہیں، پھر رواۃ کے باہم بیانات یہاں بہت کچھ مختلف پائے جاتے ہیں۔

ان پر اعتماد کر کے ایک مشہور صحابی (جو حدیبیہ کے شامل ہونے والوں میں سے ہیں) کو مطعون قرار دینا درست نہیں۔

یہ اعدائے صحابہ کا طریق کار ہے کہ الزام ثابت نہ ہو سکنے کی صورت میں بھی صحابہ کی پوزیشن داغدار کرنے کے درپے رہتے ہیں اور غیر ثابت شدہ بات کے نشر کرنے میں پوری قوت صرف کرتے ہیں یہاں بھی یہی صورت انہوں نے اختیار کی ہے۔

درایت کے اعتبار سے

اس مسئلہ میں درایت کے اعتبار سے بھی نظر کرنے کی ضرورت ہے وہ اس طرح کہ

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اسلام میں ایک اہم مقام و مرتبہ ہے۔ آنموصوف رضی اللہ عنہ عام الخندق ۵ ہجری میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور بعدہ صلح حدیبیہ کے موقعہ پر حاضر تھے۔

چنانچہ جب ذوالقعد ۶ ہجری میں صلح حدیبیہ کے موقعہ پر کفار کی طرف سے عروۃ بن مسعود اہلِ اسلام سے گفتگو کرنے کے لیے جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا تو اس موقعہ پر باہمی گفتگو کے دوران جناب مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ حاضرباش خادم کی حیثیت سے آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جناب میں خود پہنے ہوئے تلوار سے مسلح کھڑے تھے۔

عروۃ بن مسعود اپنی گفتگو کے دوران جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ریش مبارک کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا۔ جناب مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے اپنی تلوار کی نیام سے اس کے ہاتھ کو دور کرتے ہوئے کہا کہ اپنے ہاتھ کو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ریش مبارک سے دور رکھ۔ اس پر عروۃ بن مسعود نے سر اٹھا کر پوچھا کہ یہ کون شخص ہے؟؟ تو حاضرین نے کہا کہ یہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ ہیں--- الخ۔

اسی واقعہ کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بہ عبارت ذیل تحریر کیا ہے:

... وجعل (عروه بن مسعود) يكلم النبى صلى الله عليه وسلم فكلما كلمه اخذ بلحيته والمغيره بن شعبه قائم على راس النبى صلى الله عليه وسلم ومعه السيف وعليه المغفر- فكلما اهوى عروه بيده الى لحيه النبى صلى الله عليه وسلم ضرب يده بنعل السيف وقال اخريدك عن لحيه رسول الله صلى الله عليه وسلم- فرفع راسه فقال من هذا؟ قالوا المغيره بن شعبه...الخ (بخاری شریف ص۳۷۸-۳۷۹، جلد اول، کتاب الشروط،

باب الشروط فی الجہاد والمصالحہ مع اہل الحرب، طبع دہلی)

مقصد یہ ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ، صلح ہدیبیہ کے حاضرین میں یقیناً شامل تھے اور اہلِ حدیبیہ کے حق میں اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام مجید میں بہت سے فضائل اور محامد ذکر کیے ہیں۔

مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

... فانزل اللہ سکینتہ علی رسولہ وعلی المومنین والزمھم کلمہ التقوی وکانوا احق بھاو اھلھا وکان اللہ بکل شی علیما۔ (پ۲۶، الفتح)	یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر اور مومنین پر سکینہ نازل فرمائی اور ان کے لیے کلمہ تقویٰ لازم کر دیا اور وہ اس کلمہ کے زیادہ اہل اور حقدار تھے اور اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز کو جانتے ہیں۔

فلہذا حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ، بھی ان فضائل میں شامل اور محامد کے حامل ہیں اور یہ چیز اس بات کے شواہد میں سے ہے کہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ، کا کردار صحیح تھا، غلط نہیں تھا اور مطاعن کی جو چیزیں ان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں، ان کا انتساب بے جا ہے اور وہ ان کے شایانِ شان نہیں ہیں۔

علاوہ ازیں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے ادوارِ خلافت میں ان کو مناصب دیئے جاتے رہے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، جیسے نقاد، عادل اور منصف خلیفہ کے دورِ خلافت میں بھی ان کو ولایت و امارت کا مرتبہ دیا جاتا رہا، جیسا کہ ان کے تراجم میں مذکور ہے اور مذکورہ الزام (جو صحیح ثابت نہ ہوا) کے بعد بھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، نے ان کو کوفہ پر والی اور حاکم قائم رکھا۔ یہ چیزیں بھی جناب مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ، کے اعمالِ صالحہ اور عمدہ اخلاق کے قرائن میں سے ہیں۔

اگر مغیرہ رضی اللہ عنہ، کا کردار داغدار تھا تو عالی مناصب سے ان کو برطرف کیوں نہیں کر دیا گیا؟؟

پھر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں آنموصوف رضی اللہ عنہ،

امیر و حاکم کے مناصب پر قائم رہے۔

بعدہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں جناب مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کوفہ پر حاکم تھے لیکن جنگ جمل و صفین میں ان باہمی تنازعات سے کنارہ کش ہوگئے تھے اور آنموصوف رضی اللہ عنہ نے فریقین میں سے کسی فریق کی جانب داری نہیں کی اور جمل و صفین میں حصہ نہیں لیا۔ بعد میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں کوفہ کے والی اور حاکم رہے۔

خلفائے راشدین کا مغیرہ بن شعبہ سے تعامل اور باعزت معاملہ اس بات کا قوی قرینہ ہے کہ آنموصوف صحیح کردار کے شخص تھے، غلط کار اور بدعمل ہرگز نہیں تھے۔

دیگر یہ بات بھی اس چیز کا قرینہ ہے کہ روایت حدیث کے باب میں بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اکابر تابعین اپنے اپنے دور میں جناب مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے حدیث نبوی نقل کرتے رہے ہیں، چنانچہ چند ایک کے اسماء بطور مثال ذکر کیے جاتے ہیں:

المسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ، ابو امامہ الباہلی رضی اللہ عنہ، قیس بن ابی حازم رضی اللہ عنہ، مسروق، ابو وائل، عروۃ بن الزبیر عامر الشعبی، ابو ادریس الخولانی وغیرہم۔

مذکورہ بالا حضرات کا حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت حدیث لینے کا یہ معاملہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آنجناب رضی اللہ عنہ صحیح العمل اور نیک کردار کے مالک تھے کیونکہ بداخلاق، بُرے کردار اور بُرے اعمال کے انسان سے دینی روایات نہیں لی جاتیں اور دین کے معاملہ میں بدعمل انسان پر ہرگز اعتماد نہیں کیا جاتا۔

نیز محدثین نے لکھا ہے کہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے ایک سو چھتیس احادیث نبوی منقول ہیں۔ ان میں سے بارہ احادیث نبوی تو صرف صحیحین (بخاری و مسلم) میں موجود ہیں۔

یہ چیز بھی ان کی عدالت و ثقاہت پر دال ہے اور نیک کردار ہونے کا عمدہ

قرینہ ہے۔

مختصر یہ ہے کہ

ان مذکورہ بالا قرائن و شواہد کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اپنے مقام میں صاحب کردار صاحب دیانت اور باوقار صحابی تھے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں کوفہ کی ولایت کے دوران ۵۰/۵۱ ہجری میں فوت ہوئے۔

جن لوگوں نے غیر ثابت شدہ واقعہ کے اعتبار سے ان پر بداعمالی کا طعن قائم کیا ہے اور ان کو بدنام کرنے کی سعی نامشکور کی ہے، وہ سراسر غلط ہے اور وہ اس دور کے واقعات کے برخلاف ہونے کی بنا پر قابل رد ہے، کوئی ہوش مند اور صاحب رائے شخص اس کو باور نہیں کر سکتا۔

ناظرین کرام مندرجات بالا کے حوالہ کے لیے درج ذیل مقامات کی طرف رجوع کر سکتے ہیں:

(۱) بخاری شریف جلد اوّل، ص۳۷۸، ۳۷۹ کتاب الشروط۔

(۲) سیر اعلام النبلاء للذہبیؒ، جلد ثالث، تحت ترجمہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ۔

(۳) تہذیب الاسماء للنواویؒ، جلد اوّل، تحت ترجمہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ۔

(۴) البدایہ والنہایہ لابن کثیرؒ، جلد ثامن، تحت ترجمہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ۔

(۵) تاریخ الاسلام للذہبیؒ، جلد ثانی، تحت ترجمہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ۔

الحاق

جس طرح سابقہ اوراق میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صفائی کے طور پر چند معروضات پیش کیے ہیں، اسی طرح ایک دیگر مشہور صحابی جناب عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق بھی چند گزارشات یہاں ذکر کی جاتی ہیں۔

جناب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے حق میں بھی مخالفین لوگ کئی قسم کے اعتراضات قبیح الفاظ کے ساتھ تحریر کرتے ہیں۔ ان کی طرف سے دفاع کے طور چند کلمات تحریر کیے گئے ہیں، قارئین کرام ان کو بغور ملاحظہ فرمائیں۔



حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اسلام کی نظروں میں

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اکابر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے جناب عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک اہم شخصیت، اسلام کے نامور مجاہد اور فہم و فراست کے اعتبار سے باکمال زیرک بزرگ ہیں۔ فروغ اسلام میں ان کے عظیم کارنامے پائے جاتے ہیں۔

سطور ذیل میں جناب عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی کے حالات اور ملی خدمات بالاختصار ہم ناظرین کرام کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

بعض لوگ اکابر صحابہ کرام کے خلاف

اپنے دیرینہ شیوہ کے تحت ان کی خامیوں اور کوتاہیوں کو ذکر کرتے ہوئے تنقیص شان میں کوشاں رہتے ہیں اور خلاف واقعہ چیزوں کو ان کی طرف منسوب کر کے عوام الناس کو ان سے متنفر اور بدظن کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

چنانچہ اس سلسلہ میں مخالفین صحابہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی بہت کچھ غلط اور بے سروپا چیزیں نشر کر کے ان کے خلاف بدظنی پھیلانے کی کوشش کی ہے۔

فلہذا یہ لوگ اپنی عبارات میں آنموصوف رضی اللہ عنہ کو دغاباز، مکار اور فریب کار

وغیرہ جیسے قبیح الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

مخالفین صحابہ جناب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے خلاف جو کچھ ذکر کرتے ہیں، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

آنموصوف رضی اللہ عنہ مال و دولت کے حریص، طمع و لالچ کے مریض تھے اور دجل و فریب کے عادی تھے اور مالی مفاد حاصل کرنے کی خاطر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حامی ہوگئے تھے اور اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس چیز پر ندامت اور اظہار افسوس کرتے تھے وغیرہ۔

...فلك النجاة فی الامامة والصلوة۔ (۹۳/ ۹۴ جلد اول، طبع ثانی از مولوی علی محمد شیعہ و امیردین صاحب حکیم شیعہ جھنگوی)

مذکورہ بالا حالات کے پیش نظر ہم ذیل میں جناب عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ضروری احوال بالاجمال ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ ان پر نظر انصاف کرنے سے آنموصوف رضی اللہ عنہ کا اسلام میں مقام و مرتبہ واضح ہوگا اور طاعنین کے عائد کردہ الزامات کا دفاع بھی بہتر طریق سے ہو سکے گا۔ (بعونہ تعالیٰ)

نام ونسب

اسم گرامی عمرو بن العاص بن وائل القریشی السہمی ہے اور ان کی کنیت ابو عبداللہ اور بعض کے نزدیک ابو محمد بھی ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کی والدہ کا نام النابغہ بنت حرملہ سبیہ ہے۔

عمرو بن العاص کے خاندان کو بنو سہم کہتے تھے اور دور جاہلیت میں یہ بڑا معزز اور باوقار خاندان سمجھا جاتا تھا اور مقدمات کے فیصلہ کرنا ان لوگوں کا منصب تھا۔

قبل از اسلام ان کا کردار

عمرو بن العاص جب تک اسلام نہیں لائے، اسلام کی مخالفت اور عداوت میں

پیش پیش رہتے تھے۔

اسلام کے ابتدائی دور میں جب اہل مکہ کی مخالفت زوروں پر تھی، اس وقت جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت کے مطابق چند مسلمانوں کا ایک قافلہ ہجرت کر کے حبشہ میں النجاشی کے ہاں گیا تھا۔

اس قافلہ کے سرگروہ عمرو بن امیہ الضمری رضی اللہ عنہ اور جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے۔ یہ لوگ حبشہ میں چند ایام کے لیے مقیم ہوئے تو اس دوران قریش مکہ کی طرف سے ایک وفد عمرو بن العاص کی سربراہی میں شاہ حبشہ النجاشی کے پاس اس مقصد کے لیے پہنچا کہ مسلمانوں کے اس قافلہ کہ حبشہ سے نکال دیا جائے اور انہیں ان کے سپرد کر دیا جائے۔

چنانچہ اس کام کے لیے عمرو بن العاص جو سرگرم رکن تھے۔ انہوں نے النجاشی کے پاس پہنچ کر حبشہ سے مسلمانوں کے اخراج کی پوری سعی کی اور ساتھ ہی شاہ حبش کی خدمت میں رنگے ہوئے چمڑے کے چند تحائف پیش کیے اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ مسلمانوں کو یہاں پناہ نہ دی جائے اور ان کا اخراج کر دیا جائے۔

چنانچہ اس سلسلہ میں عمرو بن العاص کی النجاشی کے ساتھ جو باہمی گفتگو ہوئی، اس کی وضاحت میں سیرۃ لابن ہشام سے ایک حوالہ درج ذیل ہے اور اس کی تائید بعض دیگر کتب میں بھی دستیاب ہے۔

یاد رہے کہ یہ مذاکرات ناکام ہو گئے تھے، النجاشی ناراض ہو گیا تھا اور عمرو بن العاص کی تمام مساعی بے سود ٹھہریں، ابن ہشام نے لکھا ہے کہ

... ثم قلت (عمرو بن العاص) له ایها الملکا والله لو ظننت انك تکره هذا ما سالتکه قال اتسالنی ، ان

مندرجہ بالا عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ عمرو بن العاص کہتے ہیں کہ میں نے نجاشی کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اے بادشاہ! واللہ! اگر مجھے یہ گمان ہوتا کہ آپ

اعطيك رسول رجل ياتيه الناموس الاكبر الذى كان ياتى موسى لتقتله قال قلت ايها الملكا كذالك هو؟ قال ويحك يا عمرو اطعنى واتبعه فانه والله لعلى الحق وليظهرن على ما خالفه كما ظهر موسى على فرعون و جنوده' قال قلت افتبا يعنى له على الاسلام؟ قال نعم فبسط يده فبايعته على الاسلام ثم خرجت الى اصحابى وقد حال رائى عما كان عليه و كتمت اصحابى اسلامی۔ (۱) السیرۃ النبویہ لابنِ ہشام ج۲، ص۲۷۷، تحت اسلام عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔ (۲) سیر اعلام النبلاء للذہبی ج۳، ص۴۰-۴۱، تحت ترجمہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔ (۳) اسد الغابتہ لابنِ اثیر الجزری ج۴، ص۱۱۶، تحت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔

اس بات کو مکروہ اور ناپسند جانتے ہیں تو میں آپ سے اس کا تقاضانہ کرتا۔ نجاشی نے کہا کہ کیا تم مجھ سے اس شخص کے قاصد کے متعلق سوال کرتے ہو (کہ میں اس کو تمہارے حوالے کر دوں) جس شخص کے پاس وہی الناموس (فرشتہ) آتا ہے جو جناب موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا کرتا تھا۔ عمرو بن العاص نے کہا کہ اے بادشاہ! یہ بات اسی طرح ہے جس طرح آپ نے بیان کی ہے؟؟ النجاشی بولا کہ ویحک یا عمرو! (یہ کلمہ ترحم و شفقت ہے) تم میری بات مان لو اور تابعداری اختیار کرو۔ اللہ کی قسم! (یہ پیغمبر) حق پر ہیں اور جو ان کی مخالفت کرے گا اس پر یہ غالب آ جائیں گے۔ جس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام فرعون اور اس کے لشکر پر غالب آ گئے تھے اس کے بعد میں نے حقانیت اسلام کو تسلیم کر لیا، پھر میں اپنے ساتھیوں کے پاس واپس آ گیا۔ اس وقت میری رائے تبدیل ہو چکی تھی، مگر میں نے اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھا۔

ہجرت حبشہ کے واقعہ میں بڑی تفصیلات پائی جاتی ہیں، لیکن یہاں ہم نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے متعلقہ امور کے ذکر پر اکتفا کیا ہے۔

قبولِ اسلام

جناب عمرو بن العاص، شاہ حبشہ سے ملاقات کے بعد واپس ہوئے۔

قریش مکہ سے مسلمانوں کی مصالحت کے دور میں فتح مکہ سے چھ ماہ قبل ماہ صفر ۸ھ میں عمرو بن العاص جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس موقعہ پر خالد بن ولید اور عثمان بن طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہ بھی اسلام کے مقصد سے ان کے ساتھ ہی حاضر ہوئے تھے۔

پہلے خالد بن ابولید نے اسلام قبول کیا اور اس کے بعد عمرو بن العاص نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی یا حضرت آپ اپنا دایاں ہاتھ پھیلایئے تاکہ میں آپ سے بیعت کروں لیکن جب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنا دایاں ہاتھ مبارک پھیلایا تو عمرو نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا اور عرض کی کہ میں جناب کی خدمت میں قبول اسلام سے پہلے شرط لگانا چاہتا ہوں تو آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ کیا شرط ہے؟ تو عمرو بن العاص نے عرض کی کہ میرے سابق معاصی سب معاف ہوجائیں تو اس وقت جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

... اما علمت یاعمرو! ان الاسلام یھدم ماکان قبلہ وان الھجرہ تھدم ماکان قبلھا وان الحج یھدم ماکان قبلہ۔

یعنی اے عمرو! کیا تجھے معلوم نہیں کہ اسلام لانا ماقبل کی سب چیزوں (معاصی) کو گرا دیتا ہے اور ہجرت کرنا ماقبل کی سب خطاؤں کو گرا دیتا ہے اور حج کرنا ماقبل کی سب غلطیوں کو گرا دیتا ہے۔

(۱) اسد الغابہ لابن اثیر الجزری ج ۴، ص۱۱۶، تحت ترجمہ عمرو بن العاص۔

(۲) مسلم شریف ج۱، ص۷۶، تحت باب کون الاسلام یھدم ماکان قبلہ۔

(۳) تہذیب الاسماء واللغات للنواوی ص۳۰، جلد اوّل، تحت عمرو بن العاص۔

اس باہمی گفتگو کے بعد جناب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سمیت

اسلام قبول کرلیا۔

اسلام لانے کے بعد عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے قلب میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت اور محبت اس قدر جاگزیں ہوئی کہ آنموصوف کہتے ہیں کہ

... وما كان احد احب الی من رسول الله صلی الله علیه وسلم ولا اجل فی عینی منه وما كنت اطیق ان املاء عینی منه اجلالا له ولو سئلت ان اصفه ما اطقت لانی لم اكن املاء عینی منه... الخ (مسلم شریف ج۱، ص۷۶، تحت باب کون الاسلام یھدم ما قبلہ۔۔۔الخ)

یعنی آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر مجھے کوئی شخصیت محبوب نہیں رہی۔ میری نظروں میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر کوئی جلیل القدر نہیں رہا حتیٰ کہ میں جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جلالت کی وجہ سے انہیں آنکھ بھر کر دیکھنے کی قدرت نہیں رکھتا اور اگر مجھے آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان صفت کے متعلق سوال کیا جائے تو میں بیان کی طاقت نہیں رکھتا۔

ایمان کی شہادت

جناب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اسلام لائے اور ان کا اسلام لانا آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں قبول ہوا، اور ان کا شمار مخلصین مومنین میں ہوا۔

چنانچہ اس چیز پر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے شہادتیں پائی جاتی ہیں۔

محدثین نے لکھا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرمان نبوت نقل کرتے ہیں کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عاص بن وائل کے دونوں فرزندوں کے متعلق ارشاد فرمایا کہ یہ مومن ہیں: ہشام بن العاص اور عمرو بن العاص (رضی اللہ تعالیٰ

عنہما)

...عن ابی ھریرہ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابنا العاص مومنان ھشام وعمرو۔

(۱) المستدرک للحاکم ص۴۵۲، ج۳، ذکر مناقب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔

(۲) سیر اعلام النبلا للذہبی ص۳۸، ج۳، تحت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔

ایک دیگر شہادت

اسی طرح محدثین کرام نے ایک دیگر واقعہ ذکر کیا ہے جس میں عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مخلص مومن ہونے کی توثیق پائی جاتی ہے۔ امام نسائی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی مشہور تصنیف ”السنن الکبریٰ“ میں اپنے اسناد کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ ایک بار مدینہ منورہ میں ایک قسم کا خوف و ہراس طاری ہوا اور لوگ متفرق ہوگئے۔ اس وقت میں نے جناب سالم (موالی ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ) کو دیکھا کہ وہ اپنی تلوار لگائے مسجد نبوی میں بیٹھے تھے۔ جب میں نے انہیں اس حالت میں دیکھا تو میں نے بھی تلوار لگالی اور ان کے ساتھ مسجد میں بیٹھ گیا۔

اس دوران جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور انہوں نے مجھے اور سالم کو اس حالت میں دیکھا۔ پھر آپ لوگوں کے پاس تشریف لے گئے اور آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم گھبراہٹ اور خوف کی صورت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف کیوں نہیں آئے اور تم نے ایسا کیوں نہیں کیا جیسا کہ ان دو مومن شخصوں نے کیا ہے۔

... فخرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرانی وسالما واتی الناس فقال یایھا الناس الا کان مفزعکم

الی اللہ ورسولہ الا فعلتم کما فعل ہذان الرجلان المومنان۔ (السنن الکبریٰ للنسائی ص۸۱-۸۲، ج۵، کتاب المناقب، طبع ملتان، سیر اعلام النبلاء للذہبی ص ۴۳، ج ۳، تحت ترجمہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ)

صلاح ونیکی کی شہادت

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اسلام لانا قبول ہوا اور وہ اسلام میں بڑے احترام کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ عزت بخشی کہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے ان کے حق میں صلاح اور نیکی کی شہادت پائی گئی۔

چنانچہ مشہور صحابی حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے حاضرین سے فرمایا کہ میں تمہیں وہی بات سناتا ہوں جو میں نے جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنی ہے۔

آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عمرو بن العاص قریش کے صالح افراد میں سے ہیں۔

اور ایک دیگر روایت میں آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ ابوعبداللہ (عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ) ام عبداللہ اور عبداللہ (بن عمرو بن العاص) یہ تینوں عمدہ اور بہترین گھرانہ ہے۔

... قال طلحہ لا حدثکم عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شیاء الا انی سمعتہ یقول عمرو بن العاص من صالحی قریش وفی روایہ نعم اھل البیت ابو عبداللہ ام عبداللہ وعبداللہ۔

(۱) فضائل الصحابہ الامام احمد" ص۹۱۱، ج۲، روایت نمبر۱۷۴۲-۱۷۴۳ تحت فضائل عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔

(۲) سیر اعلام النبلاء للذہبی ص۳۸، ج۳، تحت ترجمہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔

بعض دیگر خصائل

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق کبار تابعین بعض فضیلت کی چیزیں ذکر کرتے ہیں۔ ان میں سے یہاں قبیصہ بن جابر کا بیان ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ جس میں آنموصوف رضی اللہ عنہ کے عمدہ خصال ذکر کرنے کے ساتھ ان کے اعلیٰ کردار کی نشاندہی کی گئی ہے۔

چنانچہ علامہ الشعبی نقل کرتے ہیں کہ

قبیصہ بن جابر کہتے ہیں کہ میں نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی صحبت اختیار کی۔ وہ قرآن مجید کے ساتھ ذوق رکھتے تھے اور میں نے قرآن مجید کو واضح بیان کرنے والا، کریمانہ اخلاق کا حامل اور ایسا شخص جس کا باطن اس کے ظاہر کے ساتھ زیادہ مشابہ اور یکساں ہو، ان سے بہتر کسی شخص کو نہیں دیکھا۔

...عن الشعبی، عن قبیصہ بن جابر صحبت عمرو بن العاص فما رایت رجلا ابین قرانا ولاکرام خلقا ولا اشبہ سریرۃ بعلانیہ منہ۔

(۱) الاصابہ لابن حجر ص۲، ج۳، تحت ترجمہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، معہ الاستیعاب۔

(۲) سیر اعلام النبلاء للذہبی ص۳۸، جلد ثالث تحت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔

روایت حدیث

علماء حدیث نے جس طرح دیگر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے سید الکونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث و مرویات کی تعداد بیان کی ہے۔ اسی طرح حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث

کی تعداد بھی نقل کی ہے۔

چنانچہ علامہ الخزرجی نے تذہیب تہذیب الکمال میں آنموصوف رضی اللہ عنہ کی روایات کی تعداد (۳۹) انتالیس ذکر کی ہے۔

......لہ تسعۃ وثلاثون حدیثا۔

(خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال للخزرجی ص۲۸۸، ج۲، تحت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، طبع مکتبہ الاثریہ، سانگلہ ہل، للامام صفی الدین احمد بن عبداللہ الخزرجی)

مقصد یہ ہے کہ جناب عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جس طرح ملکی فتوحات میں حصہ وافر لیا اور جنگی خدمات سرانجام دیں۔ اس طرح انہوں نے نشر حدیث کے معاملہ میں بھی قابل قدر دینی خدمات بجالائیں اور امت کو فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے آگاہ کیا۔

حربی امور میں صلاحیت

جناب عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ طبعاً حربی امور میں بہترین صلاحیت کے حامل تھے۔

چنانچہ جب آنموصوف رضی اللہ عنہ اسلام لائے تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ان کی اس فطری صلاحیت کی قدردانی فرمائی۔ جناب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ

...عن عمرو بن العاص قال: ما اعدل بی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وبخالد بن الولید احدا من اصحابہ فی حربہ منذ اسلمنا۔

یعنی جب سے میں نے اور خالد بن ولید نے اسلام قبول کیا ہے تو آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگی معاملات میں کسی کو ہمارے برابر قرار نہیں دیا۔ (گویا کہ اس معاملہ میں ہماری یہ عزت افزائی فرمائی)

(۱) المستدرک للحاکم ص۴۵۵، ج۳، تحت ذکر مناقب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔

(۲) سیر اعلام النبلاء للذہبی ص ۴۴، ج ۳، تحت ترجمہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔

تائید

علمائے تاریخ و تراجم کی عبارات میں حضرت عمرو بن العاص کے مذکورہ بالا اعزاز کی تائید پائی جاتی ہے۔ چنانچہ مورخین اور اہلِ تراجم نے آنموصوف کی قابلیت اور صلاحیتوں کو مندرجہ ذیل الفاظ میں ذکر کیا ہے:

...وکان من رجال قریش رایا ودھاء وحزما وکفاءہ وبصیرا بالحروب۔ ومن اشراف ملوك العرب۔ ومن اعیان المہاجرین۔ (۱) سیر اعلام النبلاء للذہبی"، ص ۴۰، ج ۳، تحت ترجمہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔ (۲) تاریخِ اسلام للذہبی"، ص ۳۹، ج ۲، تحت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ جناب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ قریش کے صاحب الرائے، زیرک اور عقل مند افراد میں سے تھے اور حزم و احتیاط کے حامل تھے اور (اپنے ہم عصروں کے ساتھ) مساوات اور برابری قائم رکھنے والے تھے اور جنگی معاملات میں صاحب بصیرت بزرگ تھے۔ عرب کے اشراف میں شمار ہوتے تھے اور اکابر مہاجرین حضرات میں سے تھے۔

غزوۃ ذات السلاسل

اس سلسلہ میں جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جانب سے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو ذات السلاسل نامی غزوہ کے لیے امیر جیش بنا کر بھیجا گیا۔ وہاں آپ کے والد عاص بن وائل کے ماموں کا خاندان آباد تھا۔ آپ وہاں دعوت اسلام کے لیے پہنچے اور اسلام کے بعد انہیں جہاد فی سبیل اللہ کے لیے نکلنے کی دعوت دی۔

علماء نے لکھا ہے کہ یہ اسلامی لشکر قریباً تین سو مجاہدین پر مشتمل تھا۔ جب یہ

مجاہدین ان کے علاقے میں داخل ہوئے تو انہیں مزید کمک کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس وقت جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اکابر مہاجرین کی ایک جماعت کو ان کی معاونت اور امداد کے لیے روانہ فرمایا۔ اس دستہ میں جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ جیسے اکابر صحابہ کرام بھی شامل تھے اور اس دستہ کے امیر حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مقرر فرمایا گیا تھا۔

... ثم امره رسول الله صلی الله علیه وسلم فی غزوه ذات السلاسل علی جیش هم ثلثمائه۔ فلما دخل بلادهم استمده بجیش من المهاجرین الاولین فیهم ابوبکر وعمر رضی الله عنه وامیرهم ابوعبیده بن الجراح رضی الله عنهم۔

(۱) تہذیب الاسماء وللغات للنواوی، ص۳۰، ج۱، القسم اول تحت ترجمہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔

(۲) اسد الغابہ لابن اثیر الجزری ص۱۱۶، ج۴، تحت ترجمہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔

(۳) سیرۃ النبویہ لابن ہشام ص۶۲۳، ج۲، تحت غزوہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، ذات السلاسل کے تحت بھی مضمون ہذا دستیاب ہے)

اخلاص فی الدین اور محبت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک بار ایک جنگی مہم درپیش تھی۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میری طرف فرمان دے کر قاصد بھیجا کہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے کہو کہ وہ تیاری کے ساتھ اپنے ہتھیار اور جنگی لباس پہن کر ہمارے پاس پہنچے۔ ہم نے ان کو ایک مہم میں روانہ کرنا ہے۔

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب میں حسب فرمان حاضر خدمت ہوا تو

آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت وضو فرمارہے تھے۔ میرے حاضر ہونے پر ارشاد فرمایا کہ ہم تجھے ایک خاص مہم پر بھیجنا چاہتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس میں تجھے سلامت رکھے گا اور مال غنیمت بھی ملے گا۔ ہم اس مال سے تجھے عنایت کریں گے۔

تو عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے جواباً عرض کیا کہ یارسول اللہ! ﷺ میں نے مال کے لیے نہیں بلکہ جہاد کی رغبت اور آنجناب کی معیت حاصل کرنے کے لیے اسلام قبول کیا ہے تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: پاک اور حلال مال نیک صالح شخص کے لیے عمدہ ہے۔

...وقال یاعمرو! انی اریدان ابعثک وجھا فیسلمک اللہ ویغنمک ارغب لک من المال رغبہ صالحہ قال قلت یارسول اللہ! انی لم اسلم رغبہ فی المال انما اسلمت رغبہ فی الجھادوالکینونہ معک۔ قال یاعمرو! نعمابالمال الصالح، للمرالصالح۔

(۱) فضائل الصحابہ لامام احمدؒ ص ۹۱۲، ج۲، روایت نمبر ۱۷۴۵، تحت فضائل عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، طبع مکہ مکرمہ۔

(۲) مسند لامام احمدؒ ص ۱۹۷، ج۴، تحت بقیہ حدیث عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔

(۳) مسند لامام احمد ص ۲۰۲، ج۴، تحت بقیہ حدیث عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔

(۴) سیرۃ المعاویہ از مولف کتاب ہذا ص ۲۳۹، جلد اوّل، طبع اوّل۔

بُت شکنی

۸ ہجری میں جب مکہ فتح ہوگیا تو سیّد دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف علاقوں میں بُت شکنی کے لیے کئی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو روانہ فرمایا۔

چنانچہ قبیلہ ہذیل میں ایک سواع نامی بُت نصب شدہ تھا۔ اس کے گرانے کے

لیے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کے ساتھیوں سمیت جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے روانہ فرمایا۔

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب میں وہاں پہنچا تو وہاں ایک سادن (مجاور) بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کہنے لگا تم کس ارادہ سے یہاں آئے ہو؟ تو جناب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے اس بُت کے گرانے کا حکم فرمایا ہے۔ تو وہ کہنے لگا کہ تو اس چیز پر قادر نہیں ہو سکتا۔ میں نے پوچھا' کیوں؟ تو اس نے کہا کہ یہ بُت خود مانع ہوگا۔ میں نے کہا کہ تو اب تک باطل گمان میں ہے اور کیا یہ بُت سنتا ہے یا کچھ دیکھ سکتا ہے؟؟

اس کے بعد عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں اس بُت کے قریب گیا اور اسے پاش پاش کر دیا۔ اس کے بعد میں نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ اس کے خزانہ کے کمرہ کو بھی گرا دو لیکن اس میں سے کوئی چیز برآمد نہ ہوئی۔ پھر میں نے اس سادن سے کہا کہ تو نے کیا دیکھا (بُت کی طاقت کے متعلق) تو اس نے کہا کہ اسلمت للہ اور وہ مسلمان ہو گیا۔

... قال فدنوت منہ فکسرتہ وامرت اصحابی فھدموا بیت خزانتہ فلم یجدوا فیہ شیا ثم قلت للسادن کیف رایت؟ قال اسلمت للہ۔

(طبقات لابن سعد ص۱۰۵' ۱۰۶' ج۲' تحت سریہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ الی سواع' طبع لیدن)

طبعی صلاحیت اور دینی اعتماد

اس سلسلہ میں محدثین کرام نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ ایک دفعہ سردار دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی خدمت میں دو شخص اپنا ایک باہمی تنازع لے کر حاضر ہوئے۔ اتفاقاً حضرت عمرو

بن العاص رضی اللہ عنہ وہاں موجود تھے۔ آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں ارشاد فرمایا کہ ان دو متنازعین کے درمیان تم فیصلہ کرو۔ تو عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ اس معاملہ میں مجھ سے زیادہ فائق اور حقدار ہیں تو آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگرچہ میں زیادہ اولیٰ ہوں (پھر بھی تم ہی فیصلہ کرو) اس کے بعد جناب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے بطور استفادہ کے اور حصول وضاحت کے طور پر عرض کیا کہ اگر ان کے مابین متنازع کا میں فیصلہ کروں تو یہ میرے لیے کس طرح سودمند ہوگا تو ان کی اس گزارش پر بطور قاعدہ کے ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہوا۔

... قال ان انت قضيت بينهما فاصبت القضاء فلك عشر حسنات وان انت اجتهدت فاخطات فلك حسنه۔

یعنی اگر تم نے ان کے مابین درست اور صحیح فیصلہ کیا تو تمہارے لیے دس نیکیاں ہوں گی اور اگر تم نے اپنے اجتہاد میں خطا کی تو پھر بھی تمہارے لیے ایک نیکی ہے۔

(مسند امام احمدؒ ص۲۰۵، ج۴، تحت بقیہ حدیث عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، طبع مصر)

اس سے واضح ہوا کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہ نبوت میں عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک نہایت باصلاحیت، مخلص اور دیانت دار شخص تھے اور ان کی طبعی صلاحیت پر آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اعتماد تھا اسی بنا پر ان کو اس واقعہ میں فیصل قرار دیا۔

نوٹ: واقعہ ہذا قبل ازیں سیرت امیر معاویہ جلد اوّل، ص۲۴۰-۲۴۱ پر ہم ذکر کر چکے ہیں۔

مکتوب نبوی اور عمان کی امارت

اہلِ سیرت نے لکھا ہے کہ ذوالقعدہ ۸ ہجری میں سید الکونین صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم نے جناب عمرو بن العاص کو ایک دعوتی مکتوب دے کر عمان کے دو بادشاہوں (جیفر و عبد) کی طرف روانہ فرمایا۔

یہ دونوں الجلندی کے فرزند تھے اور قبیلہ "ازد" سے تھے اور عمان پر دونوں برادران میں سے جیفر بادشاہ حکمران تھا۔

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، ان دونوں کو اسلام کی طرف دعوت دینے کے لیے روانہ کیے گئے۔ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں بھائیوں کی طرف ایک دعوتی مکتوب لکھوایا اور اس پر مہر نبوی تھی۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، کہتے ہیں کہ میں عمان پہنچا۔ دونوں بھائیوں میں زیادہ حلیم اور نرم اخلاق عبد تھا۔ اس کی طرف قصد کیا اور میں نے کہا کہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے تم دونوں کے پاس پیغام رساں بن کر آیا ہوں۔

تو اس نے کہا کہ میرا برادر بڑا ہے اور بادشاہ ہے۔ میں اس سے تیری ملاقات کراتا ہوں، وہ آپ کا مکتوب پڑھے گا۔

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، کہتے ہیں کہ کئی ایام میں وہاں ان کے مقام پر ٹھہرا رہا، پھر انہوں نے مجھے دعوت دی، میں ان کے پاس داخل ہوا اور میں نے دعوتی مکتوب ان کے ہاں پیش کیا، مہر لگی ہوئی تھی اس نے اس کو کھولا اور خط پڑھا اور تمام پڑھا۔

پھر اس نے یہ خط اپنے بھائی کو دیا تو اس کے برادر نے بھی تمام خط پڑھا۔

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، کہتے ہیں کہ میں نے معلوم کیا کہ اس کا برادر زیادہ نرم طبع کا آدمی ہے۔ اس نے کہا کہ آپ ٹھہریئے، کل آ جانا۔ پھر دوسرے روز میں ان کے پاس پہنچا تو اس نے کہا کہ میں نے اس دعوت میں خوب غور و فکر کیا ہے اور میں عرب میں کمزور آدمی ہوں گا، اگر اپنے تمام ملک کو ایک شخص کی ملکیت میں دے دوں، پھر میں نے کہا کہ کل میں واپس ہو جاؤں گا۔ جب اس کو میری واپسی کا یقین ہوگیا تو اس پر دونوں بھائیوں نے اسلام قبول کر لیا اور پیغمبر اسلام کی تصدیق کی اور مجھے اس علاقہ سے صدقہ وصول کرنے کی رخصت دے دی اور مانع نہیں ہوئے۔

اور اگر کسی نے اس کام میں میری مخالفت کی تو وہ دونوں حضرات اس مسئلہ میں میرے معاون ہوئے۔

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس علاقہ کے اغنیاء لوگوں سے صدقات وصول کیے اور وہاں کے فقراء اور حاجت مند لوگوں میں تقسیم کر دیئے۔

اس سلسلہ میں وہاں مقیم رہا حتیٰ کہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال کی خبر موصول ہوئی۔

...فلما ایقن بمخرجی اصبح فارسل الی فدخلت علیه فاجاب الی الاسلام هو واخوه جمیعا وصدقا بالنبی صلی الله علیه وسلم وخلیا بینی وبین الصدقه وبین الحکم فیما بینهم وکانالی عونا علی من خالفنی فاخذت الصدقه من اغنیاء هم فردوتها فی فقراء هم فلم ازل مقیما فیهم حتی بلغنا وفاه رسول الله صلی الله علیه وسلم۔

(۱) الطبقات لابن سعد ص۱۸ جلد۱، ق ثانی تحت ذکر بعثت رسول اللہ الرسل بکتبہ، طبع قدیم، لیدن۔

(۲) سیرت ابن ہشام جلد۲، ثانی ۶۰۷ میں بھی واقعہ ہذا اپنی عبارت میں مذکور ہے۔

صدیقی اور فاروقی عہد میں فتوحات اور شام میں ملی خدمات

ما قبل میں جناب عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ملی خدمات جو عہد نبوت میں پیش آئیں، ان کا بالاختصار ذکر کیا گیا ہے۔

اس کے بعد صدیقی عہد خلافت میں بھی ان کے بہت وقیع کارنامے اسلامی خدمات کے سلسلہ میں پائے جاتے ہیں۔

مثلاً جس وقت جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۱۳ ہجری میں حج ادا کرنے کے بعد واپس تشریف لائے تو اس وقت علاقہ شام میں اسلامی افواج بھیجنے کی ضرورت پیش آئی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے شام (فلسطین) کی طرف عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو امیر بنا کر بھیجا۔ اس وقت متعدد حضرات یزید بن ابی سفیان، ابوعبیدہ بن الجراح اور شرجیل بن حسنہ وغیرہم رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بھی اپنے اپنے دستہ فوج پر امیر بنا کر روانہ فرمایا اور ان تمام امراء کو بلقاء کے مقام کی طرف پہنچنے کی ہدایت فرمائی۔

... لما قفل ابوبکر (الصدیق رضی اللہ عنہ) عن الحج (۱۳ ھجری) بعث عمرو بن العاص قبل فلسطین ویزید بن ابی سفیان وابا عبیدہ بن الجراح شرجیل بن حسنہ۔ وامرھم ان یسلکوا علی البلقاء۔

(تاریخ خلیفہ بن خیاط ص۸۶، ج۱، تحت سنہ ۱۳ ہجری)

اور خلیفہ بن خیاط نے ابن اسحاق کے حوالہ سے مزید اس مقام میں یہ وضاحت ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرمان کے مطابق یہ تمام حضرات فلسطین کی طرف روانہ ہوگئے اور اجنادین کے مقام پر جمع ہوئے اور ہر ایک امیر اپنے اپنے دستہ پر نگران تھا۔

اور بعض مورخین اس طرح بھی ذکر کرتے ہیں کہ ان تمام پر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ امیر الامراء تھے۔ اس میں دیگر اقوال بھی پائے جاتے ہیں۔

ان کے مقابل رومیوں کے لشکر کا امیر تیقلاء تھا۔ وہ اس جنگ میں قتل ہوا اور اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو شکست دی (اور اہلِ اسلام کو فتح نصیب ہوئی) یہ جمادی الاولیٰ ۱۳ ہجری کا واقعہ ہے۔

خلیفہ ابنِ خیاط نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اجنادین کی اس جنگ میں حضرت عمرو

بن العاص رضی اللہ عنہ کے برادر ہشام بن العاص السہمی رضی اللہ عنہ بھی شہید ہوئے تھے۔

... قال ابن اسحق ثم ساروا جميعا قبل فلسطين۔ فالتقوا باجنادين... والامراء كل على جنده يزعم بعض الناس ان عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ كان عليهم جميعا۔ وعلى الروم القيقلاء فقتل القيقلاء، وهزم الله المشركين وذالك يوم السبت الثلاث يقين من جمادى الاولى سنه ثلاث عشر۔

(تاریخ خلیفہ بن خیاط ص ۸۷، ج ۱، تحت سنہ ثلاث عشر، طبع اوّل)

جناب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جنگ یرموک میں شریک و شامل ہوئے اور بڑی مشکلات اور آزمائشوں میں مبتلا رہے، مگر اللہ تعالیٰ نے مخالفین کے مقابلہ میں مسلمانوں کو فتح نصیب فرمائی۔

...وشهد عمرو يوم اليرموك وابلى يومئذ بلاء حسنا۔

(سیر اعلام النبلاء للذہبی ص ۴۶، ج ۲، تحت ترجمہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ)

اور بعض مورخین نے اس طرح لکھا ہے کہ بعد میں حضرت ابوعبیدہ بن الجراح نے آپ رضی اللہ عنہ کو حلب رے انطاکیہ وغیرہ کی طرف بھیجا اور انہوں نے صلح کر لی۔

اس کے بعد جناب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر قنسرین کے علاقے کو فتح کیا۔

...وقيل: بعثه ابوعبيده (بن الجراح) فصالح اهل حلب وانطاكيه وافتتح سائر قنسرين عنوه۔

(۱) سیر اعلام النبلاء للذہبی ص ۴۶، ج ۳، تحت ترجمہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔

(۲) الاصابہ لابن حجر معہ الاستیعاب ص ۲، ج ۳، تحت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔

خلیفہ ابن خیاط نے لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عمرو

بن العاص رضی اللہ عنہ کو فلسطین اور اردن کے علاقہ جات کا والی بنایا۔

...... وولی عمر رضی اللہ عنہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فلسطین والاردن۔

(۱) تاریخ خلیفہ ابن خیاط ص۱۲۹ ج۱ تحت الشامات۔

(۲) سیر اعلام النبلاء للذہبی ص۴۶، ج۳ تحت ترجمہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔

علاقہ مصر میں ملی خدمات

پھر اس کے بعد اہلِ تاریخ ذکر کرتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عمرو بن العاص کی طرف مکتوب ارسال فرمایا کہ آپ رضی اللہ عنہ مصر کی طرف اقدام کریں، چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ مصر کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کی امداد کے لیے حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بھی مصر کی طرف روانہ کیا گیا اور ان حضرات کی مساعی سے مصر فتح ہوا اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت تک مصر کے والی اور حکمران رہے۔

... وکتب الی عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فسارَ الی مصر فافتتحہا فلم یزل والیا حتی مات عمر۔

(۱) تاریخ خلیفہ ابن خیاط ص۱۳۰ ج۱ تحت الشامات (۲۳ ہجری) ص۱۱۴، ج۱ تحت ۲۰ ہجری فتح مصر۔

(۲) سیر اعلام النبلاء للذہبی ص۴۶، ج۳ تحت ترجمہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔

مورخین کی تصریحات کے مطابق جناب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے ۲۱ ہجری میں اسکندریہ فتح کیا اور اس سے قبل ۲۰ ہجری میں الیون نامی علاقہ کو فتح کیا۔

اس کے بعد آپ طرابلس کی طرف متوجہ ہوئے اور ۲۳، ۲۴ ہجری میں اسے فتح کر کے سلطنت اسلامی میں شامل کیا۔

... فتح عمرو بن العاص الاسکندریہ سنہ احدی

وعشرین... وقال النسوی کان فتح لیون سنه عشرین وامیرها عمرو- وقال خلیفه افتتح عمرو طرابلس الغرب سنه اربع وعشرین وقیل سنه ثلاث-

(۱) سیر اعلام النبلاء للذہبی، ص ۴۶-۴۷، ج ۳، تحت ترجمہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔

(۲) تاریخ خلیفہ ابن خیاط ص ۱۲۵، ج ۱، تحت عنوان فتح طرابلس والاسکندریہ۔

امام النواوی نے اپنی تصنیف تہذیب الاسماء میں لکھا ہے کہ فتح مصر کے بعد حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، وہاں مصر کے والی اور حاکم رہے، حتیٰ کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہوگئے۔

بعدہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے چار سال تک والی مصر رہے۔

اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، نے انہیں ولایت مصر سے معزول کر دیا تو آنموصوف فلسطین میں مقیم ہوگئے اور وقتاً فوقتاً مدینہ طیبہ میں تشریف لایا کرتے تھے۔

... ثم ارسله عمر رضی اللہ عنہ، فی جیش الی مصر ففتحها ولم یزل والیا علیها حتی توفی عمر ثم اقره عثمان علیها اربع سنین ثم عزله- فاعتزل عمرو بفلسطین وکان یاتی المدینه احیانا-

(۱) تہذیب الاسماء واللغات للنواوی ص ۳۰، جلد اوّل، القسم الاول ترجمہ عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

(۲) اسد الغابہ لابن اثیر الجزری ص ۱۱۷، ج ۴، تحت ترجمہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔

الانتباہ

ماقبل کے صفحات میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، کے متعلق حربی امور کا ذکر اختصاراً پیش کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیلات مفصل تاریخوں میں دستیاب ہو سکتی

ہیں، ان کے جنگی کارنامے اور متعدد علاقوں کی فتوحات میں ان کی مساعی بہتر طریقہ سے صفحات تاریخ پر پائی جاتی ہیں، اس سے اشاعت اسلام میں ان کا مقام واضح ہوتا ہے اور فروغ دین میں ان کا کردار آشکارا ہوتا ہے۔

واقعہ تحکیم

مؤرخین لکھتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں ولایت مصر سے معزولی کے بعد جناب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ عموماً فلسطین یا بعض دیگر مقامات میں مقیم رہے۔ جس وقت حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان جنگ صفین واقع ہوئی تو اس وقت دونوں فریقین نے اپنے اپنے حالات کے تقاضوں کے تحت مصالحت کے لیے حکمین تجویز کیے۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی طرف سے حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ حکم منتخب ہوئے اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی جانب سے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ حکم منتخب کیے گئے۔

صفر ۳۷ھ میں ملک شام کی سرحد پر دومتہ الجندل کے قریب اذرح کے مقام پر حکمین کا اجتماع ہوا۔ وہاں فریقین کے درمیان مصالحت کے موضوع پر باہم گفتگو ہوئی۔ (جس کی تفصیلات تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں اور ہم نے بھی سیرۃ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور سیرۃ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جلد اوّل میں بحث ہذا کے تحت ذکر کی ہیں) اور دونوں حکمین حضرات کی رائے میں اختلاف واقع ہوا اور وہ کسی متفقہ فیصلہ پر مجتمع نہیں ہو سکے۔ اس وجہ سے تحکیم میں ناکامی ہوئی۔

خلیفہ بن الخیاط لکھتے ہیں کہ

... وفیھا (صفر ۳۷ھ) اجتمع الحکمان ابوموسی الاشعری رضی اللہ عنہ من قبل علی رضی اللہ عنہ وعمرو بن العاص رضی اللہ عنہ من قبل معاویہ رضی اللہ عنہ بدومۃ الجندل فی شھر رمضان ویقال

باذرح وهی من دومة الجندل قریب- فبعث علی ابن عباس ولم یحضر وحضر معاویه- فلم یتفق الحکمان علی شیئی... الخ-

(تاریخ خلیفہ بن خیاط جلد اوّل، ص ۱۷۴ تحت سنہ سبع و ثلاثین)

مختصر یہ ہے کہ واقعہ تحکیم میں کسی مخادعت اور شاطرانہ طریقہ کو دخل نہیں تھا (جیسا کہ مؤرّخین مثلاً طبری متوفی ۳۱۰ھ نے واقعہ ہذا میں طول طوال چیزیں بڑھا چڑھا کر ذکر کی ہیں) بلکہ اس میں حکمین کے مابین اختلاف رائے ہوگیا تھا یعنی ایک صاحب کی رائے دوسری شخصیت کی رائے سے متعارض ہوئی، اس بنا پر مسئلہ کا کوئی متفقہ حل سامنے نہ آسکا اور جانبین کی مصالحانہ مساعی ناکام ہوگئیں-

اس چیز پر ہم نے طبری سے قدیم تر مورخ خلیفہ ابن خیاط المتوفی ۲۴۰ھ کا مندرجہ بالا فیصلہ بلفظہ ذکر کر دیا ہے جو نہایت قابل توجہ ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شانِ دیانت اور شانِ عدالت کے پیشِ نظر یہی چیز درست اور صحیح ہے-

قاتلانہ حملہ

واقعہ صفین کے بعد جناب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، کے دورِ خلافت میں مصر میں مقیم تھے اور وہاں کے والی اور حاکم بنائے گئے تھے-

جنگ نہروان کے بعد رمضان المبارک ۴۰ھ میں بعض خارجی افراد (عبدالرحمٰن بن ملجم المرادی، عمرو بن بکیر، برک بن عبداللہ) حرمِ کعبہ میں مجتمع ہوئے اور انہوں نے باہم فیصلہ کیا کہ--- ان تین اشخاص (حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، اور جناب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ) کو قتل کر دینا چاہیے تاکہ لوگوں کو ان کے مظالم سے نجات مل سکے اور یہ کام ایک ہی تاریخ میں پورا کیا جائے-

عبدالرحمٰن بن ملجم المرادی نے کہا کہ علی ابن طالب رضی اللہ عنہ، کے قتل کا میں ذمہ

لیتا ہوں اور برک بن عبداللہ نے کہا کہ معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو میں قتل کروں گا اور عمرو بن بکیر نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے قتل کا عہد کیا۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ حملہ کے واقعات قبل ازیں ہم سیرۃ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور سیرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جلد اوّل میں بحث ہذا کے تحت ذکر کر چکے ہیں۔

ابن ملجم المرادی کے حملہ سے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تھے اور برک بن عبداللہ نے حملہ کیا مگر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ زخمی ہوئے اور قتل ہونے سے بچ گئے تھے۔ اب اس مقام میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ حملہ کا واقعہ بالاختصار ذکر کیا جاتا ہے۔

(عمرو بن بکر) یا عمرو بن بکیر اس مقصد کے لیے مصر پہنچا اور اس کا ارادہ تھا کہ صبح کی نماز کے موقعہ پر حملہ کیا جائے۔ چنانچہ اس روز حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اپنی پیٹ کے مرض کے باعث فجر کی نماز پڑھانے کے لیے مسجد میں تشریف نہیں لا سکے اور اپنے قائم مقام کے طور پر اپنے پولیس افسر خارجہ بن ابی حبیبہ (یا خارجہ بن حذافہ) کو نماز پڑھانے کے لیے بھیجا۔

عمرو بن بکیر مسجد میں پوشیدہ ہو کر بیٹھا تھا تاکہ جب آنموصوف نماز کے لیے پہنچیں تو ان پر حملہ کیا جائے۔ چنانچہ جب خارجہ نماز کے لیے پہنچے تو اس نے ان پر حملہ کر کے قتل کر دیا اور اسے گمان تھا کہ یہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ہیں۔ جب یہ خارجی پکڑا گیا تو کہنے لگا کہ میں نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا ارادہ کیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے خارجہ کی موت کا ارادہ کیا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ قول حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اس موقعہ پر فرمایا تھا۔ اس کے بعد اس خارجی برک بن عبداللہ کی گردن اُڑا دی گئی۔

...فحمل عليه الخارجي فقتله وهو يعتقد عمرو بن العاص فلما اخذ الخارجي قال اردت عمرواً واراد الله

خارجہ- فارسلها مثلا وقتل قبحه الله- وقد قيل ان الذی قالها عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ و ذالک حين جئی باالخارجی فقال ما هذا؟ قالوا قتل نائبک خارجه- ثم امر به فضربت عنقه-"

(۱) البدایہ لابن کثیرؒ ج۷، ص۳۲۹ تحت مقتل علی رضی اللہ عنہ۔

(۲) مجمع الزوائد للہیثمی ج۹، ص۱۴۲-۱۴۱ باب آخر احوال علی رضی اللہ عنہ۔

(۳) کتاب المحبر لابی جعفر بغدادی ص۲۹۴ طبع دکن۔

آخری احوال

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ایک مدت تک مصر کے والی رہے اور اس علاقہ میں عمدہ انتظام قائم رکھا اور اسلام کے فروغ اور بقا کے لیے مساعی جاری رکھیں۔ ان کی عمدہ صلاحیتوں کی بنا پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں معزول کرنے یا انہیں تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور ان کی عمر کا بیشتر حصہ مصر میں ہی پورا ہوا۔

آخر میں عمر رسیدہ ہو کر طبعاً علیل ہو گئے۔ ان اوقات میں ایک صاحب ابن شماسۃ المہدی آنموصوف رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ شدت مرض کی وجہ سے پریشانی کی حالت میں تھے۔

○ ابن شماسہ کہتے ہیں کہ اس وقت آپ بہت روئے اور گریہ کی حالت میں دیوار کی طرف رُخ کر لیا۔

○ آپ رضی اللہ عنہ کے فرزند عبداللہ بن عمرو اس وقت موجود تھے، وہ کہنے لگے: اے والد! آپ کو جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں فلاں بشارت نہیں فرمائی؟؟ تو آنموصوف اپنے فرزند کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: سب سے بہتر چیز جو میں شمار کرتا ہوں وہ توحید و رسالت کی شہادت ہے۔ (جو مجھے حاصل ہے)

میری عمر کے تین دور گزرے ہیں:

○ میری حالت قبول اسلام سے قبل یہ تھی کہ میں جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سخت عداوت رکھتا تھا اور آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا متمنی تھا۔ اگر اس وقت مجھے موت آجاتی تو یقیناً اہلِ جہنم میں سے ہوتا۔

○ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام کی صداقت ڈال دی اور میں نے جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر قبول اسلام کے لیے اپنے سابقہ معاصی کی مغفرت کی شرط پیش کی۔ (اس موقعہ کی باہمی گفتگو کی تفصیلات مسلم شریف وغیرہ میں مذکور ہیں اور ہم نے قبل ازیں "قبولِ اسلام" کے عنوان کے تحت اسے مختصراً ذکر کیا ہے)...... اس حالت میں اگر میری موت واقع ہو جاتی تو میں یقیناً اہلِ جنت میں شمار ہوتا۔

○ اس کے بعد کئی امور کا مجھے والی بنایا گیا۔ میں نہیں جانتا کہ ان امور کا انجام میرے حق میں کس طرح رہا؟؟... الخ۔

(۱) مسلم شریف ج۱، ص۷۶، تحت کتاب الایمان باب کون الاسلام یھدم... الخ۔

(۲) حاشیہ تہذیب الاسماء واللغات للنواوی ص۳۱، ج۱، ق۱، تحت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔

روایت مندرجہ بالا کے علاوہ بھی علماء کرام نے بعض چیزیں ذکر کی ہیں۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت جب قریب آیا تو آنموصوف اپنی پریشانی کی حالت میں اپنے مالک حقیقی کی جناب میں عجز و انکسار کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ

اللھم امرت بامور ونھیت عن امور- ترکنا کثیرا مما امرت ورتعنا فی کثیر مما نھیت- اللھم لا الہ الا انت ......فلم یزل یھلل حتی فاض رضی اللہ عنہ-

(۱) سیر اعلام النبلاء للذہبی ج۳، ص۵۱، تحت ترجمہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔

(۲) تہذیب الاسماء واللغات للنواوی جلد اوّل، ص۳۰، القسم الاول تحت عمرو بن

العاص رضی اللہ عنہ میں اسی مفہوم کی روایت درج ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ اے اللہ! تو نے ہمیں کئی امور کا حکم دیا اور کئی امور سے ہمیں منع فرمایا۔ ہم نے بہت سے احکام کو چھوڑ دیا اور بہت سے ممنوعات کے ہم مرتکب ہوئے۔ اے اللہ! تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ آنموصوف لا الہ الا اللہ کا ذکر بار بار کرتے رہے حتیٰ کہ آپ کا انتقال ہو گیا۔

چنانچہ حدیث شریف میں یہ مسئلہ مذکور ہے کہ:

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کا آخری کلام لا الہ الا اللہ ہو وہ جنت میں جائے گا۔

...... عن معاذ رضی اللہ عنہ (بن جبل) قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کان آخر کلامہ لا الہ الا اللہ دخل الجنہ۔ رواہ ابوداود والحاکم وقال صحیح الاسناد۔

(ریاض الصالحین ص ۳۷۶، تحت باب تلقین المحتضر لا الہ الا اللہ)

فلہذا جناب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا کلمہ توحید کا ورد کرتے ہوئے انتقال ہونا خاتمہ بالخیر کی واضح دلیل ہے اور اُخروی نجات اور دخول جنت کی علامت ہے۔

تاریخ وفات

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال قریباً ستر برس کی عمر میں ہوا اور آنموصوف عیدالفطر کی شب میں فوت ہوئے۔ آپ کی نمازِ جنازہ عیدالفطر ۴۳ھ کی نماز کے بعد آپ کے فرزند عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے پڑھائی اور مقطم میں سپردِ خاک کیے گئے۔

(۱) تہذیب الاسماء واللغات للنواوی جلد اوّل، ص ۳۰، القسم الاول تحت ترجمہ عمرو بن العاص

رضی اللہ عنہ۔
(۲) اسد الغابہ لابن اثیر الجزری ج ۴، ص ۱۱۷ تحت ترجمہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔

ایک اشتباہ

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے آخری اوقات میں پریشانی اور اضطراب کے بعض کلمات صادر ہوئے ہیں مثلاً بعض روایات کے اعتبار سے آنموصوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

(۱) ... اللھم امرت باموروںھیت عن امور- ترکنا کثیرا مما امرت ورتعنا فی کثیر مما نھیت-

(۲) ... ثم ولیت اشیاء ما ادری ما حالی فیھا-

مذکور بالا کلمات کی بنا پر بعض لوگ اعتراض قائم کرتے ہیں کہ یہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے آخری اوقات کے کلمات ہیں جن میں انہوں نے اپنی غلطیوں اور قصور کا اعتراف کیا ہے اور مغفرت سے مایوسی کا اظہار کیا ہے اور آنموصوف اپنی زندگی کے آخری اوقات میں اپنے افعال و اعمال پر ندامت اور پشیمانی کا اظہار کرتے تھے۔ یہ چیز سوء انجام کی طرف نشاندہی کرتی ہے۔

رفع اشتباہ

اس سلسلے میں چند چیزیں درج ذیل ہیں، ان پر نظر انصاف کرنے سے مذکورہ بالا اعتراضات دُور ہو جائیں گے اور شبہات رفع ہو سکیں گے۔

قاعدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں پر بعض اوقات فکر آخرت کا غلبہ ہوتا ہے اور وہ اپنے مالک حقیقی کے سامنے عجز و انکسار کا اظہار کرتے ہوئے مغفرت کے طالب ہوتے ہیں۔ ایسی کیفیت میں ان حضرات سے جو کلام صادر ہوتا ہے اسے تواضع اور انکساری پر محمول کیا جاتا ہے اور یہ چیز خشیت الٰہی کے غلبہ کی وجہ سے

پیش آتی ہے۔

اس مسئلہ پر چند نظائر قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں جن میں ہماری مندرجہ بالا گزارش کی تصدیق موجود ہے۔ چنانچہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے کلام میں یہی مضمون بہ عبارات ذیل منقول ہے:

(۱) ایک دفعہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد اس امت کے سب سے بہترین افراد ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں، پھر فرمایا:

...انا قد احدثنا بعدهم احداثا يقضي الله تعالى فيها ما شاء۔

(مسند امام احمدؒ جلد اول، ص ۱۱۵ تحت مسندات علی رضی اللہ عنہ)

یعنی ...... ان کے بعد ہم سے کئی جدید چیزیں صادر ہوئیں، اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں جو چاہے گا فیصلہ فرمائے گا۔

(۲) ابو نعیم الاصفہانی اپنی سند کے ساتھ نقل کرتے ہیں کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک بار خطبہ دیا۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: اے لوگو! جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس امت کے سب سے خیر اور افضل تھے، پھر ان کے بعد امت کے بہترین شخص ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں اور پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد عمر رضی اللہ عنہ ہیں...... آگے فرمایا:

...ثم احدثنا امورا يقضي الله فيها ما شاء۔

(اخبار اصفہان لابی نعیم اصفہانی جلد اول، ص ۳۳۵، طبع لیدن)

یعنی ..... پھر ہم نے کئی نئے امور سرانجام دیئے، اللہ تعالیٰ ان میں جو چاہیں گے فیصلہ فرمائیں گے۔

(۳) خطیب بغدادی نے اپنی تصنیف میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک ارشاد نقل کیا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ سید الکونین صلی اللہ علیہ

وسلم کے بعد اس امت میں سب سے بہتر ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ پھر فرمایا:

...واحدثنا احداثا بعدھم یفعل اللہ مایشاء۔

(موضح اوہام الجمع والتفریق للخطیب بغدادی ج ۲، ص ۹، تحت ذکر خالد بن علقمہ)

یعنی فرمایا...... پھر ان حضرات (شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کے بعد ہم سے کئی چیزیں صادر ہوئیں، ان کے حق میں اللہ تعالیٰ جو چاہیں گے معاملہ فرمائیں گے۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مذکورہ بالا تمام اقوال کا مفہوم یہی لیا جاتا ہے کہ انہوں نے خشیت الٰہی کے غلبہ کے تحت یہ کلمات ادا فرمائے اور خطایا اور کوتاہیوں کو ان الفاظ کے ساتھ تعبیر کیا۔ لہٰذا ان کلمات کو جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے معاصی اور عیوب پر محمول کرنا ہرگز درست نہیں ہے۔

اسی طرح ایک دیگر مشہور صحابی حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی طرح کا کلام منقول ہے۔

چنانچہ بخاری شریف میں روایت ہے کہ

... العلاء بن المسیب عن ابیہ قال لقیت البراء بن عازب رضی اللہ عنہ فقلت طوبی لک۔ صحبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وبایعتہ تحت الشجرۃ۔ فقال یاابن اخی انک لاتدری مااحدثنا بعدہ (صلی اللہ علیہ وسلم)

(بخاری شریف ج ۲، ص ۵۹۹، باب غزوۃ حدیبیہ، طبع دہلی، نور محمدی)

یعنی المسیب کہتے ہیں کہ میں نے ایک بار براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی اور میں نے عرض کیا کہ آپ کے لیے عمدہ خوشخبری حاصل ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہے اور آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم سے شجرہ کے نیچے بیعت کی۔ تو اس کے جواب میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے برادر زادے! تُو نہیں جانتا کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہم نے کیا کچھ نئے کام کر ڈالے۔

اس کلام میں بھی حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے اپنے عجز و انکسار کے پیشِ نظر یہ کلمات فرمائے اور اپنے اضطراب کا اظہار فرمایا۔ لیکن ان کلمات سے آنموصوف رضی اللہ عنہ کے خدا و رسولؐ کے نافرمان ہونے اور معاصی کے مرتکب ہونے کا مفہوم نہیں لیا جا سکتا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مندرجات بالا کے پیشِ نظر یہ چیز واضح ہوئی کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا آخری اوقات میں اس نوع کے کلمات ادا کرنا ان کے فکرِ آخرت اور خشیت الٰہی کے غلبہ کی وجہ سے تھا۔

فلہذا ان مضطربانہ کلمات کی بنا پر آنموصوف رضی اللہ عنہ پر نقد کرنا اور اعتراض قائم کرنا بے جا ہے اور ہرگز درست نہیں بلکہ یہ چیز تو ان کی شانِ اتقاء اور شانِ دیانت کی اعلیٰ صفت ہے جو ان سے صادر ہوئی۔ یہ چیز خاتمہ بالخیر اور حُسنِ انجام کی علامات میں سے ہے۔

اختتامی کلمات

ناظرین کرام کی توجہ اس چیز کی طرف دلائی جاتی ہے کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ پر نقد کرنے والے لوگوں نے جو اعتراضات آپ کی شخصیت پر وارد کیے ہیں (جیسا کہ ان کا اجمال اوّل بحث میں درج کیا گیا ہے) ان کو پیشِ نظر رکھئے اور پھر جناب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے احوالِ زندگی اور ان کی ملی خدمات کو ملحوظ رکھئے اور ان کی سرگزشت کے ایک ایک عنوان پر منصفانہ نظر کیجئے۔ (جو صفحات بالا میں بالاختصار پیش کیے گئے ہیں) بشرط انصاف اس طرح موازنہ کرنے سے اعتراضات کا جواب بہ آسانی حل ہو سکے گا اور مزید کوئی بحث ذکر کرنے کی حاجت نہ رہے گی۔

آنموصوفؓ کے اوّل دور کے حالات پھر اس کے بعد اسلامی دور کے واقعات پھر ان کے اختتامی ایام کے کوائف ان سب ادوار کے نشیب و فراز سامنے رکھنے کے بعد کسی دیگر صفائی پیش کرنے اور دفاع ذکر کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

بعد از اسلام ان کی پوری زندگی کا کردار تمام سوالوں کا جواب ہے اور اگر ان تمام چیزوں کو پسِ پشت ڈال کر اعتراض کرنا ہی مقصود ہے تو پھر یہ صرف کینہ و عناد کی وجہ سے ہوگا جس کا کوئی علاج نہیں- واللہ الہادیٰ اللہ یہدی من یشاء الی صراط مستقیم-



فصل سوم

عثمانی مطاعن کے جوابات

تمہیدی کلمات

سید دو عالم نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم، حضرات انبیاء علیہم السلام کے بعد "خیر امتہ" ہیں اور بہترین قوم ہیں۔ ان کی توصیف و مدح کلام اللہ میں بے شمار مقامات میں مذکور ہے۔

اور نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے ان حضرات کی فضیلت صحیح روایت میں بے شمار مرتبہ منقول و مروی ہے۔

اس کے باوجود لوگ اس بہترین جماعت کے متعلق طعنہ زنی کرتے ہیں اور شکوہ و شکایت اور اعتراضات و مطاعن کی ایک طویل فہرست تیار کرتے ہیں اور یہ ان کا قدیمی شیوہ ہے۔

پھر ہر دور میں علمائے حق ان کے جوابات دیتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے، ختم نہیں ہوا۔

اس دور میں بھی مخالفین صحابہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے یہی وطیرہ برابر چلا آ رہا ہے، چنانچہ حضرت سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر قدیم و جدید طعن وارد کیے گئے ان کے جوابات کے لیے ہم نے اپنے مقدور کے مطابق کچھ حقیری کوشش

کی ہے جو پیش خدمت ہے۔ البتہ یہاں یہ بات ذکر کر دینا فائدہ سے خالی نہیں کہ حضرت سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فضائل و کمالات اور ملی خدمات کا مفصل تذکرہ یہاں ذکر نہیں کیا۔ اس وجہ سے کہ وہ ایک مستقل کتاب اور مبسوط تصنیف کا متقاضی ہے۔

تاہم آنموصوف رضی اللہ عنہ کے فضائل اور کمالات اور دینی و قومی خدمات کا اجمالی خاکہ بالاختصار پیش کر دینا مفید خیال کیا ہے۔ اس طریقہ سے آنجناب رضی اللہ عنہ کے رفیع مقام کا نقشہ سامنے آسکے گا اور عظیم المرتبہ ہونا واضح ہو گا۔

اسمِ گرامی، قرب قرابت داری، فضائل ومناقب اور ملی خدمات

نام مبارک عثمان بن عفان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ہے اور لقب "ذوالنورین" ہے اور کنیت ابو عبداللہ ہے۔ سلسلہ نسب پانچویں پشت میں سردار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مشترک ہے۔ (عثمان بن عفان بن ابی العاص بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف)--- عبد مناف دادا مشترک ہے۔

اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی والدہ کی طرف سے بھی خاندان نبوت کے ساتھ قریب تر ہیں اور آپ کی والدہ بنی ہاشم کی نواسی ہے۔

اس طرح کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی والدہ کا نام اروی بنت کریز ہے اور اروی کی والدہ امِ حکیم بنت عبدالمطلب ہیں جو جناب نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کی عمہ محترمہ ہیں اور جناب کے والد شریف (عبداللہ) کے ساتھ توام پیدا ہوئی تھیں اور امِ حکیم البیضاء کے نام سے مشہور ہیں۔

(ا) حاصل یہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں حضرات کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پھوپھی زاد بہن کے فرزند ہیں اور عمہ زاد برادر ہیں۔

تنبیہہ

اس قرابت داری کی مزید تفصیل مطلوب ہو تو ہماری تصنیف رحماء بینھم حصہ عثمانی، ص ۲۴ سے ۳۰ تک ملاحظہ فرماویں۔

(۲) اعلان نبوت کے ابتدائی دور میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رہنمائی سے مشرف باسلام ہوئے اور قبیلہ کی ایذاؤں سے دین اسلام کو ترک نہیں کیا بلکہ اس پر ثابت قدم رہے۔

(۳) حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا شمار اسلام کے السابقون الاولون میں ہے اور ان کی فضیلتیں ان کو حاصل ہیں اور مشہود لہ بالجنتہ ہیں (یعنی زبانِ نبوت سے ان کے لیے جنت کی بشارت حاصل ہے) اور عشرۂ مبشرہ میں ان کا شمار ہے۔

(۴) نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی صاحبزادی رقیہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کردیا۔ پھر ان کے انتقال کے بعد دوسری صاحبزادی ام کلثوم ان کے نکاح میں دے دی۔ اس بناپر حضرت عثمانؓ کو لقب ذوالنورین حاصل ہوا۔

(۵) کفار مکہ نے جب مسلمانوں کو سخت ایذاء رسانی کی تو ہجرت حبشہ (ملک حبش کی طرف) پیش آئی۔ حضرت عثمان نے اپنی اہلیہ رقیہ رضی اللہ عنہا سمیت ہجرت اختیار کی۔

پھر اس کے بعد جب ہجرت مدینہ منورہ کی طرف ہوئی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حبش سے واپس ہوکر مدینہ طیبہ پہنچ گئے۔ اس طریقہ سے آنجناب رضی اللہ عنہ دو ہجرتوں کی فضیلت سے مشرف ہوئے۔

(۶) غزوۂ بدر (۲ھ) میں پیش آیا۔ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بیمار تھیں۔ بحکم آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تیمارداری کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ غزوہ میں شریک نہ ہوسکے، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو بدریوں میں شمار فرما کر غنائم بدر سے حصہ عنایت فرمایا اور اجر و ثواب میں شریک قرار دیا۔

(۷) کاتب وحی ہونے کی سعادت ان کو حاصل تھی اور اس کے علاوہ آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خطوط تحریر کرنا بھی ان کے متعلق تھا۔

(۸) ۶ھ میں واقعہ حدیبیہ پیش آیا' اس کا اختصار ذکر کیا جاتا ہے۔

قریش مکہ نے جب مسلمانوں کو مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے روکا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کے ساتھ گفتگو کرنے کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو سفیر بنا کر مکہ روانہ کیا۔

اندریں حالات آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں خبر پہنچی کہ عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے تو آنجناب نے عثمان کے قتل کا انتقام لینے کے لیے صحابہ کرام سے ایک شجر کے تحت موت کی بیعت لینی شروع کی۔

پھر اثنائے بیعت میں خبر ملی کہ عثمان زندہ ہیں البتہ ان کو قید کر لیا گیا ہے۔ اس وقت نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک کو عثمان کا ہاتھ قرار دیا اور اسے اپنے دوسرے ہاتھ مبارک پر رکھ کر ارشاد فرمایا کہ یہ عثمان کی طرف سے بیعت ہے۔

گویا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں یہ "عظیم فضیلت" ثابت ہوئی' انہوں نے رسول خدا کے ہاتھ مبارک سے رسول خدا کے ہاتھ مبارک پر بیعت کی۔

اس بیعت کا نام اسلام میں "بیعت الرضوان" ہے۔ خداوند کریم نے قرآن مجید میں اس بیعت سے مشرف ہونے والوں کے حق میں فرمایا ہے کہ "پختہ بات ہے کہ ان مومنین سے اللہ راضی ہو گیا جنہوں نے شجر کے تحت آپ کے ساتھ بیعت کی... الخ۔" (پ۲۶' سورۃ الفتح)

(۹) غزوۂ تبوک ۹ھ میں ہوا تھا۔ ان ایام میں اہلِ اسلام پر سخت افلاس اور معیشت کی تنگی تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہمیشہ مسلمانوں کی مالی امداد کیا کرتے تھے۔ اس موقعہ پر بھی آنموصوف نے بے مثل ایثار کرتے ہوئے مالی خدمات سرانجام دیں۔

سردار دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جیش ہذا کی تیاری کے لیے مسلمانوں کو متعدد بار مالی تعاون کی خاطر ارشاد فرمایا۔ تو اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ

نے تین صد اونٹ بمع ساز و سامان کے پیش کیے اور مزید برآں ایک ہزار اشرفیاں جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے دامن میں لا کر رکھ دیں۔

آنجناب ﷺ نہایت مسرور ہوئے اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں تحسین و بشارت کے کلمات ارشاد فرمائے۔

"ماضر عثمان ما عمل بعد الیوم۔"

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر بالفرض عثمان سے آج کے بعد کوئی فعل سرزد ہو جائے تو وہ اس کو نقصان نہ دے گا۔

(۱۰) حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے انتخاب خلافت اس طرح ہوا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے آخری اوقات میں چھ حضرات (حضرت عثمان غنی، حضرت علی، عبدالرحمٰن بن عوف، طلحہ بن عبید اللہ، زبیر بن العوام، سعد بن ابی الوقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے حق میں فرمایا تھا کہ ان میں سے جس شخص پر اتفاق ہو جائے، اس کو خلیفہ منتخب کر لیں لیکن یہ فیصلہ تین یوم کے اندر کیا جائے، چنانچہ ان حضرات کی باہم گفت و شنید کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو بغیر کسی نزاع و اختلاف کے منصب خلافت کے لیے منتخب کر لیا گیا اور باقی حضرات نے جناب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت خلافت کر لی۔ پس آنموصوف اسلام کے تیسرے خلیفہ راشد قرار پائے۔

عثمانی خلافت ابتدا محرم الحرام ۲۴ھ سے شمار ہوتی ہے اور اس کا اختتام ۱۸ ذوالحجہ ۳۵ھ پر ہے۔

(۱۱) خلافت عثمانی کے ایام میں بڑے بڑے عظیم ملی کارنامے پائے جاتے ہیں۔ اس عہد کا ایک اہم اور بے مثال کارنامہ یہ ہے کہ ۲۴ھ کے اواخر اور ۲۵ھ کے اوائل میں آرمینیہ اور آذر بائیجان کے علاقوں میں کفار کے خلاف اہلِ اسلام کی جنگیں جاری تھیں، افواج میں مختلف قبائل شامل تھے، وہاں قرآن مجید میں اختلاف فی القراۃ کا مسئلہ پیدا ہوا۔ حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ (مشہور صحابی) کو یہ بات

شدت سے محسوس ہوئی- معاملہ ہذا کی اہمیت کے پیش نظر وہ فوراً مدینہ شریف واپس پہنچے اور امیرالمومنین عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں الفاظ ذیل کے ساتھ اپنی پریشانی کا اظہار کیا کہ یاامیرالمومنین!!

ادرک ھذہ الامہ قبل ان یختلفوا فی الکتاب اختلاف الیھود والنصاری- (مشکوٰۃ شریف ص ۱۹۳، تحت فضائل القرآن، الفصل الثالث، طبع دہلی)

مطلب یہ ہے کہ پیشتر اس کے کہ لوگ کتاب اللہ میں اختلاف کرنے لگیں، اس امت کو سنبھال لیجئے ایسا نہ ہو جیسا کہ یہود و نصاریٰ اپنی آسمانی کتب میں اختلاف کرنے لگ گئے- (اور اصل دین سے برگشتہ ہوگئے) پھر یہ اختلاف ان کے مذاہب میں فساد و افتراق کا باعث ہوا-

مختصر یہ ہے کہ جناب سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان حالات کے پیش نظر مسئلہ ہذا کے حق میں کبار صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مشورہ کیا (جن میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ شامل تھے) ان حضرات کے فیصلہ کی روشنی میں یہ صورت کی گئی کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور میں قرآن مجید کا جو نسخہ جمع شدہ تھا، وہ حضرت ام المومنین حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس محفوظ تھا- ان سے وہ نسخہ عاریتاً حاصل کر کے (لغت قریش پر) ایک نسخہ قرآن مجید کا مرتب کرایا اور حرف واحد پر مصحف ہذا کو لکھوایا گیا- باقی قرأت مختلفہ کو متروک قرار دے کر تلف کر دیا گیا-

حافظ الذہبی نے اس چیز کو اس طرح تعبیر کیا ہے کہ

... من جمع الامہ علی مصحف واحد بعد الاختلاف- (تذکرۃ الحفاظ للذہبی جلد اوّل، ص ۸، تحت امیرالمومنین عثمان رضی اللہ عنہ، طبع بیروت)

یعنی اختلاف واقع ہونے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے امت مسلمہ کو ایک مصحف پر جمع کر دیا اور اختلاف فی الکتاب سے ملت اسلامیہ کو بچالیا-

تنبیہہ

مسئلہ ہذا کی مزید تفصیل آئندہ "احراق مصاحف" طعن کے جوابات کے تحت آ رہی ہے، انتظار فرمائیں۔

(۱۲) جس طرح عہد فاروقی میں ملکی فتوحات کا سلسلہ بڑی کوشش سے جاری تھا۔۔ اسی طرح عہد عثمانی میں فروغ اسلام کی خاطر یہ سلسلہ قائم تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد بعض مفتوحہ ممالک نے بغاوت اختیار کی تھی (مثلاً ہمدان، ری، آذر بائیجان، آرمینیہ وغیرہ) تو خلافت عثمانی میں ان ممالک کو دوبارہ فتح کیا گیا اور بغاوتیں فرو کر دی گئیں۔

اور مزید برآں مشرق میں خراسان، طبرستان، بیہق، نیشاپور، ہرات، بلخ وغیرہ وغیرہ ممالک مفتوح ہوئے۔

اور مغرب کی طرف مراکش و طرابلس (اندلس) وغیرہ میں اسلام کا غلبہ ہوا اور یہ علاقے اسلامی حکومت کے تحت آ گئے۔

اور افریقہ میں "حرب العبادلہ" کے نام سے ایک بڑی جنگ لڑی گئی۔ اس کے ذریعہ افریقہ کے بہت سے علاقے اسلام کے ماتحت ہو گئے۔

اور خاص طور پر بحری جنگوں کا آغاز عہد عثمانی میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مساعی سے ہوا۔ ان کے ذریعہ متعدد جزائر مفتوح ہوئے (جزیرہ قبرص وغیرہ) اور رومیوں کو شکستیں ہوئیں۔ قیصر روم کا اقتدار ختم ہوا۔

مختصر یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں مغرب میں مراکش سے لے کر مشرق میں کابل تک حجاز، یمن، مصر، شام، عراق، (فارس) وغیرہ وغیرہ تمام ممالک پر حکومت اسلامی قائم ہوئی۔

احیائے اسلام اور فروغ دین کے لیے آنموصوف کے یہ ملی کارنامے کتب حدیث و تاریخ میں بالتفصیل درج ہیں۔ ہم نے یہاں ان کا اجمال و اختصار پیش کیا ہے۔

اب اس کے بعد آنجناب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر مشہور اعتراضات کے جوابات پیش کیے جاتے ہیں۔ اس تحریر سے کوئی بحث و مباحثہ کھڑا کرنا مقصد نہیں ہے بلکہ نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کے صحابہ کرام اور رفقائے عظام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی طرف سے ان کی صداقت و عدالت اور صفائی بیان کرنا اور ان کی جانب سے دفاع کرنا مطلوب ہے تاکہ اہلِ اسلام ان اعتراضات پر نظر کرنے کی وجہ سے ان حضرات کے متعلق سوء ظنی اور بدگمانی کا شکار نہ ہوں اور اپنی عاقبت خراب نہ کریں۔ واللہ علیٰ ما نقول وکیل۔



غزوۂ بدر میں عدم شرکت کے اعتراض کا جواب

خلیفہ ثالث سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق ان کے مخالفین یہ طعن قائم کرتے ہیں کہ

اسلام میں غزوۂ بدر بہت بڑی فضیلت اور اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ شریک نہیں ہوئے اور اس طرح فضائل غزوۂ بدر اور اس کے فوائد سے محروم رہے۔

الجواب

غزوۂ بدر کے موقعہ پر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا (جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ تھیں) بیمار تھیں۔ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سمیت غزوۂ بدر کے لیے تشریف لے جانے لگے تو آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حضرت رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی تیمارداری کے لیے مدینہ منورہ میں قیام کا ارشاد فرمایا۔ اتفاق قدرت سے حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا اسی دوران انتقال ہوگیا۔ جب زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ فتح بدر کی خوشخبری مدینہ شریف لائے تو لوگ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے دفن سے فارغ ہو چکے تھے۔

اس کے بعد جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ و آلہٖ و سلم نے فاتحین بدر کے لیے جب غنائم تقسیم فرمائے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو فاتحین بدر کے مساوی حصہ عطا کیا اور اس کی فضیلت میں بھی آپ کو شریک فرمایا۔

اسی بنا پر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شاہدین بدر میں شمار کیا جاتا ہے۔

اس مسئلہ پر تراجم اور سیرۃ کے دو عدد حوالہ جات پیش کیے جاتے ہیں:

(۱) ... عن عبداللہ بن مکنف بن حارثہ الانصاری قال لما خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی بدر خلف عثمان علی ابنتہ رقیہ وکانت مریضہ فماتت رضی اللہ عنہا یوم قدم زید بن حارثہ المدینہ بشیرا بما فتح اللہ علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ببدر۔ وضرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعثمان بسھمہ واجرہ فی بدر فکان کمن شھدھا۔

(طبقات ابن سعد ص ۳۸، ج ۳، تحت ذکر اسلام عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، طبع لیدن)

(۲) ... عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تخلف علی امراتہ رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکانت مریضہ فتوفیت وجاء ت البشری بالفتح حین دفنت۔ فضرب لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بسھمہ من الغنیمہ وباجرہ من المشھد فھو بدری۔

(جوامع السیرۃ لابن حزم الاندلسی ص ۱۱۵، تحت تسمیہ من شھد بدرا من المسلمین مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

فلہذا حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگرچہ بذات خود غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہوئے تاہم جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ و سلم کے فرمان کے مطابق وہ فضائل بدر سے محروم نہیں ہیں اور انہیں غنائم بدر اور اس کے اجر میں سے برابر کا

حصّہ عطا فرمایا گیا اور آں موصوف رضی اللہ عنہ اہلِ بدر کے فضائل میں شریک ٹھہرے۔

ایک فہمائش

اس مقام میں معترض احباب کی فہمائش کے لیے یہ بات ذکر کی جاتی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا غزوۂ بدر میں عدم شمولیت کا مسئلہ اسی طرح ہے جس طرح غزوۂ تبوک میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عدم شمول ہے۔ جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فرمان کے تحت مدینہ منورہ میں ٹھہرائے گئے تھے اور غزوۂ تبوک میں شریک نہیں ہوسکے تھے۔ اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فرمان کے تحت غزوۂ بدر میں شریک نہ ہوسکے بلکہ آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صاحبزادی کی تیمارداری کے لیے مدینہ طیبہ میں ٹھہرائے گئے تھے۔

یہ دونوں واقعات یکساں حکم رکھتے ہیں اور دونوں حضرات رضی اللہ تعالیٰ عنہما پر غزوات میں عدم شرکت کا طعن قائم کرنا صحیح نہیں ہے اور آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کو حق پہنچتا تھا کہ اپنے ہر داماد کو اپنے گھر کے کاموں کے لیے، وہ بدر ہو یا تبوک، خدمت پر مامور فرمادیں۔

مزید اس مسئلہ کی تفصیل اور حوالہ جات کے لیے ہماری درج ذیل تالیفات کی طرف رجوع فرما سکتے ہیں۔ ہم نے قبل ازیں اس مسئلہ کو ذیل مقامات میں بقدر ضرورت ذکر کر دیا ہے۔

(۱) بنات اربعہ رضی اللہ عنہن ص ۱۹۴ تا ۱۹۷۔

(۲) رحماء بینھم (حصّہ عثمانی) ص ۳۴-۳۵۔



غزوۂ احد سے فرار کا جواب

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر طعن کرنے والوں نے ایک یہ طعن بھی شمار کیا ہے کہ احد میں جو صحابہ میدان جنگ کو چھوڑ کر فرار ہوگئے تھے، ان میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے اور اسلام میں میدان جنگ سے فرار ہونا ممنوع ہے۔

الجواب

سیرت کے اکابر علماء نے ذکر کیا ہے کہ غزوۂ احد میں جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے احد پہاڑ کے ایک درہ پر مسلمان تیراندازوں کی ایک جماعت کو متعین فرمایا اور انہیں کسی صورت میں بھی اس مقام کو نہ چھوڑنے کا حکم صادر فرمایا لیکن ابتداء میں مسلمانوں کی فتح کو دیکھ کر اس جماعت صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے مقررہ مقام کو چھوڑ دیا اور غنائم اکٹھے کرنے میں شریک ہوگئے۔ ان حالات میں پشت کی طرف سے کفار نے اہلِ اسلام پر زبردست حملہ کر دیا۔ ان نازک حالات میں بعض مسلمانوں کے قدم اُکھڑ گئے اور وہ میدانِ جنگ سے نکل کھڑے ہوئے۔ ان لوگوں میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اسی واقعہ کو بالاختصار قرآن مجید میں ذکر فرمایا اور ان لوگوں کی

اس لغزش کو معاف فرمادیا:

... قولہ تعالیٰ' انما استزلھم الشیطن ببعض ما کسبوا- ولقد عفا اللہ عنھم- ان اللہ غفور حلیم- (آل عمران:۵۵' پ۴)

یعنی ان لوگوں کو شیطان نے (اس معاملہ میں) پھسلا دیا اور یہ ان کے پہلے بعض اعمال کی وجہ سے تھا' تحقیق اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف فرما دیا- اللہ تعالیٰ مغفرت فرمانے والے بُردبار ہیں-

مختصر یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سمیت جن مسلمانوں سے یہ فروگزاشت ہوگئی تھی' اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف فرما دیا- اب ان حضرات پر اس کا کوئی گناہ نہ رہا- حق تعالیٰ کلیتاً ان کی تقصیر معاف فرما چکا' اب کسی کو ان پر طعن کرنے کا کوئی حق نہیں اور نہ ملامت کرنے کا کوئی جواز ہے-



بیعت رضوان میں عدم شمولیت کے اعتراض کا جواب

طاعنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر تیسرا طعن یہ کرتے ہیں کہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بیعت رضوان میں شامل نہیں ہوئے تھے فلہذا وہ اس اہم فضیلت سے محروم رہے۔

الجواب

یہ اعتراض عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہی حضرت عثمان پر لوگ کرنے لگ گئے تھے اور اس کا جواب بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے خود ہی دے دیا ہے۔

چنانچہ احادیث کی کتابوں میں واقعہ درج ہے کہ اہلِ مصر سے ایک شخص حج کے موقعہ پر مکہ مکرمہ میں آیا اس نے کچھ لوگوں کا ایک جگہ اجتماع دیکھا تو دریافت کیا کہ یہ لوگ کون ہیں؟؟ تو جواب دیا گیا کہ یہ قوم قریش سے ہیں اور ان کے درمیان مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ تشریف فرما ہیں۔ تو وہ شخص حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آں موصوف رضی اللہ عنہ سے بعض چیزوں کے متعلق سوالات کیے، کہنے لگا کہ

(۱) مجھے بتایئے کہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ احد سے فرار ہو گئے تھے؟ تو ابنِ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں؟

(۲) پھر کہنے لگا کہ آپ جانتے ہیں کہ عثمان رضی اللہ عنہ بدر میں حاضر نہیں ہوئے تھے،

غائب رہے تھے؟ تو ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں۔

(۳) پھر وہ کہنے لگا کہ وہ بیعت رضوان میں غائب تھے اور اس بیعت میں شامل نہیں تھے؟؟ تو ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ بات بھی درست ہے۔

اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ان تینوں سوالات کے جواب ارشاد فرمانے کے لیے اسے قریب بلایا اور فرمایا کہ میں ان کے جواب ذکر کرتا ہوں، غور سے سن لو۔

○ یوم احد سے فرار جو تو نے ذکر کیا ہے تو اس کے متعلق میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس لغزش کو معاف فرما دیا ہے۔

(ولقد عفا اللہ عنہم۔۔۔ الخ، آل عمران آیت ۵۵، پ ۴)

○ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے یوم بدر سے غائب رہنے کی وجہ یہ ہوئی کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی (حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا) ان کی زوجیت میں تھیں اور وہ ان دنوں شدید بیمار تھیں۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرمایا کہ تم اس کی تیمارداری میں رہو۔ تمہارے لیے حاضرین بدر جیسا غنائم اور اجر دونوں میں حصہ ہو گا۔

○ باقی رہا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بیعت رضوان میں غیر حاضر تھے تو اس کے متعلق تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ

...اما تغیبه عن بیعه الرضوان فلو کان احدا عز ببطن مکه من عثمان بعثه مکانه۔ فبعث رسول الله ﷺ عثمان وکانت بیعه الرضوان بعد ما ذهب عثمان الی مکه۔ فقال رسول الله ﷺ

یعنی حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیعت رضوان سے غائب رہنا اس وجہ سے تھا کہ اگر وادی مکہ میں اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زیادہ کوئی اور باعزت شخص ہوتا تو جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بجائے اسے بھیجتے (لیکن اس کام کے

بیدہ الیمنی ھذہ ید عثمان- فضرب بھا علی یدہ فقال ھذہ لعثمان- (۱) مشکوۃ شریف ص۵۶۲، تحت مناقب عثمان رضی اللہ عنہ، الفصل الثالث بحوالہ بخاری شریف- (۲) بخاری شریف ص۵۲۳، جلد اول تحت مناقب عثمان رضی اللہ عنہ، طبع دہلی- (۳) بخاری شریف ص۵۸۱، ۵۸۲، جلد ثانی باب غزوہ احد تحت آیت ان الذین تولوا منک یوم التقی الجمعان، الخ- (۴) المستدرک للحاکم ص۹۸، جلد ثالث تحت ذکر بعض خصوصیات عثمان رضی اللہ عنہ، طبع حیدر آباد دکن- (۵) الاستیعاب لابن عبدالبر (معہ الاصابہ) ص۷۱، جلد ثالث، تحت تذکرہ عثمان رضی اللہ عنہ- (۶) تاریخ یعقوبی الشیعی ص۱۶۹، جلد ثانی، تحت ایام عثمان رضی اللہ عنہ، طبع بیروت- (۷) روضہ کافی مع فروغ کافی ص۱۵۱، تحت غزوۂ حدیبیہ، طبع قدیم لکھنؤ-

لیے اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بہتر کوئی موزوں شخص نہیں تھا) پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار مکہ کی طرف حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجا اور آنموصوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکہ مکرمہ چلے جانے کے بعد بیعت رضوان پیش آئی- تو اس موقعہ پر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بیعت ہذا میں شامل کرنے کے لیے) فرمایا کہ یہ میرا دایاں ہاتھ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہاتھ ہے اور اس کو اپنے دوسرے ہاتھ پر رکھ کر بیعت فرمائی اور فرمایا کہ میں عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے بیعت کر رہا ہوں-

یہ جوابات ارشاد فرمانے کے بعد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے معترض مخاطب سے فرمایا کہ تمہارے سوالات کے یہ جوابات ہیں اور اب تم جا سکتے ہو-

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی مذکورہ بالا روایت میں تینوں اعتراضات کے یکجا جوابات موجود ہیں- اہل السنہ اور شیعہ کے اکابر علماء نے ان ہر سہ جوابات کو بالوضاحت درج کر دیا ہے، اب مزید کسی جواب کی حاجت نہیں-

منیٰ میں چار رکعت نماز ادا کرنے کے اعتراض کا جواب

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ حج کے موقع پر آں موصوف رضی اللہ عنہ نے منیٰ کے مقام پر چار رکعت نماز ادا کی حالانکہ مسافر کے لیے چار رکعت کی بجائے دو رکعت نماز ادا کرنے کا حکم ہے۔

الجواب

یہ ایک قدیم اعتراض ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس عمل پر کیا جاتا ہے۔

اس مقام میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ علماء کرام نے لکھا ہے کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ احکام حج کے معاملہ میں مسائل حج کے زیادہ واقف تھے اور ان کے بعد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ حج کے مسائل میں زیادہ معلومات رکھتے تھے۔ گویا آپ ان مسائل میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے دوسرے نمبر پر ہیں، چنانچہ طبقات ابن سعد میں مذکور ہے کہ

...کان اعلمهم بالمناسک ابن عفان وبعده ابن عمر۔

(طبقات ابن سعد ص ۴۱، جلد ثالث تحت ذکر لباس عثمان رضی اللہ عنہ)

اس کے بعد محدثین نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ پر اس اعتراض کے جواب میں خود حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اپنا بیان بسند ذکر کیا ہے جسے معلوم

کر لینے کے بعد اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

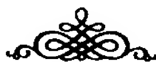
چنانچہ مسند الحمیدی میں ہے کہ

... عن عثمان (بن عفان) رضی اللہ عنہ انہ قال: صلی باھل منی اربعا فانکر الناس علیہ ذالک فقال: انی تاھلت بھا لما قدمت۔ وانی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اذا تاھل الرجل فی بلد فلیصل بہ صلاہ المقیم۔ (۱) مسند الحمیدی ص۳۱، ج۱، تحت احادیث عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔ (۲) مسند ابی یعلی الموصلی ص۱۵۷، مسند احمد ج۱، تحت مسندات عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔ (۳) المصنف لعبد الرزاق ص۵۱۶، جلد ثانی، تحت باب الصلوۃ فی السفر۔ (۴) قرۃ العینین از شاہ ولی اللہ دہلوی ص۲۷۴، تحت جوابات مطاعن عثمانی)

یعنی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منیٰ کے مقام میں لوگوں کو چار رکعت کے ساتھ نماز پڑھائی تو اس پر لوگوں نے اعتراض کیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے متعرضین کے جواب میں فرمایا کہ میں جب سے مکہ میں آیا ہوں تو میں نے مکہ میں اقامت کا قصد کر لیا ہے اور اس مسئلہ کے متعلق میں نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی شخص کسی شہر میں اقامت کا ارادہ کر لے تو وہ وہاں مقیم کی نماز (چار رکعت) ادا کرے، چونکہ میں نے یہاں اقامت کا قصد کر لیا تھا اس لیے میں نے چار رکعت نماز ادا کی ہے۔

مختصر یہ ہے کہ اس مسئلہ میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اپنے بیان کے بعد کسی دیگر جواب کی حاجت نہیں اور اعتراض ساقط ہو جاتا ہے۔

علماء کرام نے اس مسئلہ میں توجیہات بھی ذکر کی ہیں تاہم مذکورہ بالا دلیل کے بعد ہم نے ان کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔



جمعہ میں اذانِ ثانی کے ایزاد کرنے کا جواب

معترضین نے اس مقام میں عبارت ذیل نقل کی ہے:

...فی هذه السنه (۳۰ھ) زاد عثمان النداء الثالث علی الزوراء...الخ۔

یعنی حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ۳۰ھ میں الزوراء کے مقام پر ندائے ثالث کا ایزاد کیا۔

(تاریخ طبری ص۶۸ جلد خامس آخر سنہ ثلاثین، طبع قدیم مصر)

یہاں سے معترض لوگ اعتراض قائم کرتے ہیں کہ جمعہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی طرف سے ایک اور اذان کا اضافہ کیا، حالانکہ اس سے قبل یہ اذان نہیں پڑھی جاتی تھی اور مسائل شرعی میں اپنی طرف سے اضافہ کرنا مذموم ہے۔

الجواب

اس مسئلہ کی تفہیم کے لیے یہ مختصر سی بات تمہیداً معلوم ہونی چاہیے کہ خلیفہ اسلام اپنی جگہ صاحب اجتہاد ہوتا ہے اور اس کے لیے اسلامی مسائل میں اجتہاد کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں لوگوں کی تعداد کثیر ہو گئی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس دور میں دعوت الی الصلوۃ کی خاطر اس اذان کو اجتہاداً--- اختیار فرمایا تاکہ لوگ اذان کے ذریعے جمعہ کے لیے جلد پہنچنے کی سعی کریں اور یہ اضافہ وقت کی ملی و شرعی ضرورت کے تحت کیا گیا۔

اس دور میں بے شمار صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم موجود تھے اور ان حضرات نے اذان ہذا کے اضافہ کے مسئلہ پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ اتفاق کیا اور کوئی اختلاف کھڑا نہیں کیا۔

علماء فرماتے ہیں کہ یہ اجماع سکوتی ہے اور یہ اس اذان کے جواز کے لیے صحیح دلیل ہے۔　(حواشی البخاری ص ۱۲۴ ج ۱ باب لاذان یوم الجمعہ، طبع دہلی)

دیگر اہم بات یہ ہے کہ یہ واقعہ ۳۰ھ کا ہے، اس کے بعد اواخر ۳۵ھ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت واقعہ ہو گئی اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ خلیفہ رابع منتخب ہوئے اور ۳۶ھ تا ۴۰ھ تک مسند خلافت پر متمکن رہے۔ اب اس تمام عرصہ میں یہ ایزاد شدہ اذان جاری رہی۔ اسی طرح حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت (تقریباً چھ ماہ) یہ اذان ثانی دواماً کہی جاتی رہی۔

ان اکابر ہاشمی حضرات کا یہ تعامل اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ عمل شرعاً درست تھا اور قابل عمل تھا، بدعت نہیں تھا۔

اگر یہ اذان شرعاً ناجائز تھی تو یہ حضرات اس مسئلہ کی برملا مخالفت کرتے اور اس کو اپنے دور خلافت میں روک دیتے۔

اسلام میں اصل عبادت نماز ہے اور اذان نماز کی طرف بلانے کا ایک عمل ہے۔ جو اعمال ذرائع کے درجہ میں ہوں، ان میں مجتہد کے لیے نظر و فکر کی بہت وسعت ہوتی ہے بشرطیکہ اسے دوسرے مجتہد حضرات بھی قبول کر لیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس اذان کے اجراء سے لے کر آج تک اس پر اہلِ اسلام عمل درآمد کرتے آئے ہیں اور کسی نے اسے ترک نہیں کیا۔ پس اس مسئلہ پر تواتر طبقاتی پایا گیا ہے۔

نیز جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ

... لا تجتمع امتی علی الضلالہ۔ یعنی میری امت کسی گمراہی پر مجتمع اور متفق نہیں ہوگی۔

فلہذا اس مسئلہ پر امت کا اجماع ہوچکا ہے اور یہ شرعاً درست ہے، بدعت اور گمراہی نہیں ہے کئی مسائل تعامل امت سے ثابت ہوتے ہیں اور یہ مسئلہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔



مدینہ کی چراگاہیں مخصوص کر لینے کا جواب

قدیم مورخین نے یہ تصریح کی ہے کہ جس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بعض مفسد مصر کوفہ اور بصرہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے آکر دار عثمان رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کر لیا تو اس موقعہ پر ان فتنہ پردازوں کی طرف سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر بے جا اعتراض اٹھائے گئے۔

ان اعتراضات کا جواب بعض دفعہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے دیا اور بعض اوقات خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جوابات ارشاد فرمائے۔ ان اعتراضوں میں سے ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مدینہ طیبہ کے قرب و جوار میں ایک چراگاہ کو صرف اپنے اونٹوں کے لیے مخصوص اور متعین کر دیا ہے اور یہ کام شرعاً جائز نہیں ہے۔

الجواب

معترضین کے اس اعتراض کے جواب میں حضرت علی المرتضیٰ اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے یہ جواب ذکر کیا ہے کہ

> "یہ چراگاہ عثمان رضی اللہ عنہ نے صرف صدقہ کے جانوروں اور بیت المال کے اونٹوں کے لیے متعین کی ہے (ذاتی جانوروں کے لیے نہیں) اور اس سے قبل حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی صدقہ کے اونٹوں کے لیے ایک چراگاہ متعین کی تھی۔"

چنانچہ قدیم مورخ خلیفہ ابن خیاط نے اس اعتراض کا جواب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی زبانی بہ عبارت ذیل نقل کیا ہے۔

حضرت عثمان نے فرمایا:

... فاما الحمی فان عمر رضی اللہ عنہ حماہ قبلی لابل الصدقہ فلما ولیت زادت ابل الصدقہ فزدت فی الحمی لما زاد من ابل الصدقہ۔

(۱) تاریخ خلیفہ ابن خیاط ص۱۴۶، ج۱، تحت سنہ ۳۵ھ، فتنہ زمن عثمان۔

(۲) تاریخ طبری ص۱۰۷، جلد خامس تحت روایت مناظرۃ القوم عثمان رضی اللہ عنہ و سبب حصارہم، طبع قدیم، مصر۔

○ اور حافظ ذہبیؒ نے اسی جواب کو بہ عبارت ذیل نقل کیا ہے:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

... فاما الحمی فواللہ ما حمیتہ لا بلی ولا لغنمی وانما حمیتہ لابل الصدقہ۔

(تاریخ الاسلام للذہبیؒ ص۱۲۱، جلد ثانی، تحت سنہ ۳۵ھ)

اسی طرح اس اعتراض کا جواب حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے جو ارشاد فرمایا تھا، اسے حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بہ عبارت ذیل نقل کیا ہے:

... واما الحمی فانما حماہ لابل الصدقہ لتسمن ولم یحمہ لابلہ ولا لغنمہ قد حماہ عمر رضی اللہ عنہ قبلہ۔

(البدایہ والنہایہ لابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ ص۱۷۱، ج۷، تحت سنہ ۳۵ھ)

حاصل کلام

یہ ہے کہ ان قدیم مورخین کے بیانات کی روشنی میں یہ چیز ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے جانوروں کے لیے اس چراگاہ کو

مخصوص و متعین نہیں کیا تھا، سو یہ طعن بالکل بے جا اور بے اصل ہے۔

صدقات کے جانور اونٹوں وغیرہ کی تعداد کثیر ہو گئی تو اس وقتی ضرورت کے تحت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان چراگاہوں میں اضافہ بھی کیا اور تخصص بھی کر دیا تھا لیکن یہ چراگاہیں ان کے ذاتی جانوروں کے لیے ہرگز نہیں تھیں۔

نیز یہ بات بھی مورخین نے واضح کر دی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس معاملہ میں خود ابتداء کرنے والے نہیں تھے بلکہ ان سے قبل حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی بیت المال کے جانوروں کے لیے مدینہ منورہ کے قرب و جوار میں چراگاہیں مخصوص کی تھیں، فلہذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر یہ اعتراض کرنا کسی طرح بھی درست نہیں۔



حکم رضی اللہ عنہ بن العاص کی جلاوطنی کے اعتراض کا جواب

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراض کنندگان آنموصوف کے چچا حکم بن ابی العاص کے متعلق یہ اعتراض قائم کرتے ہیں کہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم کو بعض خطاؤں کی بنا پر مکہ مکرمہ سے طائف کی طرف جلاوطن کر دیا تھا اور حکم مذکور عہدِ صدیقی اور عہدِ فاروقی میں بھی وہیں رہے لیکن عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ جب خلیفہ منتخب ہوئے تو انہوں نے اپنے چچا مذکور طرید رسول کو واپس مدینہ بلا لیا۔ اس طرح انہوں نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کی۔

الجواب

یہاں چند ایک چیزیں قابلِ وضاحت ہیں جو اعتراض ہذا کے ازالہ کے لیے مفید ہیں:

(۱) کبار علماء نے تصریح کر دی ہے کہ حکم کی جلاوطنی کا قصہ احادیث صحاح کی کتابوں میں نہیں پایا جاتا اور نہ ہی اس کے ثبوت کے لیے کوئی (صحیح اسناد) کے ساتھ معروف اور مشہور روایت ملتی ہے جس پر اعتماد کیا جا سکے۔

(۱) منہاج السنہ لابن تیمیہ ص۱۹۶ جلد ثالث، بحث طرد الحکم بن ابی العاص۔

(۲) المنتقی للذہبی" ص۳۹۵ الفصل الثالث تحت بحث نفی الحکم بن ابی العاص۔

(۲) اگر جلاوطنی کا یہ واقعہ درست تسلیم کر لیا جائے تو اس کے متعلق علماء نے یہ تصریح کر دی ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حاصل کردہ اجازت سے ہی حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکم کو واپس بلا لیا تھا۔ (از خود یہ کام نہیں کیا تھا)

(۱) تاریخ طبری ص۱۰۲-۱۰۳، ج۵، تحت آمد وفود مصری و عراقی بر مدینہ تحت سنہ ۳۵ھ۔

(۲) تاریخ طبری ص۱۳۵، ج۵، تحت ذکر بعض سیر عثمان رضی اللہ عنہ۔

(۳) البدایہ والنہایہ لابن کثیرؒ، ص۱۷۱، ج۷، در ابتداء ۳۵ھ۔

(۴) کتاب التمہید والبیان فی مقتل الشہید عثمان رضی اللہ عنہ، ص۸۳-۸۴، طبع بیروت۔

مذکورہ بالا مقامات میں اس مسئلہ کے جوابات مکمل طور پر موجود ہیں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، اس معاملہ میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کی خلاف ورزی کرنے والے ہرگز ثابت نہیں ہوتے۔

تنبیہ

اس مسئلہ کے مالہ وما علیہ کو قبل ازیں ہم نے اپنی تالیف "مسئلہ اقربا نوازی" میں ص۲۷۲ تا ۲۷۹ مفصل بیان کر دیا ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو وہاں ملاحظہ فرمائیں، حوالہ جات کی بلفظہ عبارتیں وہاں ذکر کر دی ہیں۔



احراقِ مصاحف کے طعن کا جواب

خلیفہ راشد حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ان کے مخالفین یہ اعتراض بھی قائم کرتے ہیں کہ آنموصوف رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کو جلوا دیا تھا اور یہ فعل کلام اللہ کے حق میں استخفاف اور اہانت کا باعث ہے جو شریعت میں منع ہے۔

الجواب

اس اعتراض کے جواب سے قبل مسئلہ کی تفہیم کے لیے واقعہ ہذا کا پس منظر معلوم ہونا ازبس ضروری ہے۔ جس دور کا یہ واقعہ ہے اس دور میں مختلف علاقوں کے مختلف قبائل اسلام میں داخل ہوچکے تھے اور ابتدائے اسلام میں قرآن مجید کو قبائل کی اپنی اپنی لغت میں ادا کرنے کی اجازت تھی۔ جو بعد میں ختم کردی گئی تھی اور تمام مسلمانوں کو ایک ہی لغت قریش پر قرات کرنے کا حکم دے دیا گیا تھا۔

یہ چیز ہم نے قبل ازیں اپنی تالیف "سیرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ" میں "عہد عثمانی میں جمع قرآن کے مسئلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تعاون" کے عنوان کے تحت ذکر کردی ہے۔ اس کی متعلقہ تفصیلات وہاں مذکور ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ خلافت ۲۴ھ اور ۲۵ھ میں مسلمانوں کی افواج میں عرب کے مختلف قبائل جمع ہوئے اور لوگ اپنے اپنے قبائل کی لغت کے لحاظ سے قرآن مجید کی قرات میں اختلاف کرنے لگے۔ آرمینیہ اور آذر بائیجان کے علاقہ میں یہ واقعہ پیش آیا۔

مشہور صحابی حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ وہاں موجود تھے، انہوں نے قرات کے باہمی اختلاف کو نہایت ناپسند کیا اور محسوس کیا کہ اگر یہ اختلاف قائم رہا تو جیسے یہود و نصاریٰ نے آسمانی کتابوں میں اختلاف کیا تھا اسی طرح اہل اسلام قرآن مجید میں اختلاف نہ پیدا کر لیں اور امت میں افتراق و انتشار کا باعث نہ بن جائے۔

چنانچہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اس مقام سے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس واپس تشریف لائے اور خلیفہ وقت کو ان الفاظ کے ساتھ اس مسئلہ کی طرف توجہ دلائی۔

... یا امیر المومنین! ادرک ھذہ الامہ قبل ان یختلفوا فی الکتاب اختلاف الیہود والنصاری۔

(مشکوۃ شریف ص ۱۹۳، تحت فضائل قرآن، الفصل الثالث، طبع دہلی)

یعنی اے امیرالمومنین! اس امت کو اس سے پیشتر کہ وہ کتاب اللہ میں اختلاف کرنے لگیں، سنبھال لیجئے، ایسا نہ ہو جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے اپنی اپنی آسمانی کتب میں اختلاف کر لیا (اور اس وجہ سے ان کے بہت سے فرقے بن گئے)

ان حالات کے پیشِ نظر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اکابر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم بشمول سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا اور اس کے بعد یہ تدبیر اختیار فرمائی کہ خلیفہ اول سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور کا مدون شدہ قرآن مجید کا نسخہ جو ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا[1] کے پاس تھا وہ عاریتاً منگوایا اور اس کے قریباً سات عدد نسخے (نقول) لغت قریش پر مدون کرائے اور وہ مصاحف اہلِ شام، اہلِ مصر، اہلِ بصرہ، اہلِ کوفہ، اہلِ مکہ مکرمہ اور اہلِ یمن کی طرف ارسال کروائے اور ایک نسخہ مدینہ طیبہ میں محفوظ رکھا۔

(۱) البدایہ والنہایہ لابن کثیرؒ ص۲۱۶، جلد سابع، فصل فی مناقب عثمان رضی اللہ عنہ۔

(۲) فتح الباری شرح بخاری ص۹۷ جلد تاسع، تحت باب جمع القرآن۔

اور شیعہ علماء نے اس مقام میں اس مسئلہ کی تفصیل اس طرح درج کی ہے:

... وبعث بمصحف الی الکوفه ومصحف الی البصره ومصحف الی المدینه ومصحف الی المکه ومصحف الی المصر ومحصف الی الشام ومصحف الی البحرین ومصحف الی الیمن ومصحف الی الجزیره- وامر الناس ان یقرا وعلی نسخه واحده وکان سبب ذالک انه بلغه ان الناس یقولون قرآن آل فلان- فاراد ان یکون نسخه واحده- (تاریخ یعقوبی الشیعی ص۱۷۰، جلد ثانی، تحت ایام عثمان بن عفان، طبع بیروت، سن طباعت ۱۳۷۹ھ / ۱۹۶۰ء)

مطلب یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نو عدد مصاحف کے نسخے تیار کروا کر کوفہ، بصرہ، مدینہ، مکہ، مصر، شام، بحرین، یمن اور الجزیرہ کے اہالیان کی طرف ارسال فرمائے اور لوگوں کو حکم دیا کہ اس مرتب شدہ نسخہ کے مطابق تلاوت کریں اور اس کا سبب یہ ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ بات پہنچی تھی کہ لوگ آل فلاں کا قرآن، آل فلاں کا قرآن (الگ الگ) کہنے لگے ہیں- پس ان حالات میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارادہ فرمایا کہ (تمام مسلمانوں کے لیے) قرآن مجید کا ایک ہی نسخہ ہونا چاہیے تاکہ آل فلاں کے قرآن آل فلاں کے نام سے تفریق و تقسیم پیدا نہ ہوسکے-

ناظرین کرام کی معلومات میں اضافہ کے لیے یہ بات تحریر کی جاتی ہے کہ کبار علماء نے ذکر کیا ہے کہ اس مصحف کی متعدد نقول تیار کروانے پر ۲۵ھ سے ۳۰ھ تک قریباً پانچ سال صرف ہوئے- پھر ان مصاحف کو اہل اسلام کے مختلف شہروں کی طرف ارسال کیا گیا (جیسا کہ سطور بالا میں مذکور ہوا) ان میں سے ایک مصحف اہل مدینہ کے لیے اور ایک مصحف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے لیے محفوظ رکھا- ان مصاحف کی تدوین مشہور اور ماہرین قراء حضرات کی نگرانی میں ہوئی تھی اور امت مسلمہ نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس عظیم کارنامہ پر ان کا شکریہ ادا

کیا۔

تاریخ الاسلام للذہبی کے حواشی میں منقول ہے کہ

...وقد استمر علی الجماعه فی نسخ المصاحف مده خمس سنین من سنه خمس وعشرین الی سنه ثلاثین فی التحقیق- ثم ارسلوا المصاحف المکتوبه الی الامصار- وقد احتفظ عثمان بمصحف منها لاهل المدینه بمصحف لنفسه- وکانت تلک المصاحف تحت اشراف قراء مشهورین فی الاقراء والمعارضه بها فشکرت الامه صنیع عثمان رضی الله تعالی عنه-

(حواشی تاریخ الاسلام للذہبی ص ۱۰۳ جلد ثانی تحت احوال عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ)

اور مشہور عالم بدر الدین زرکشی نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس عظیم کارنامے کو بالفاظ ذیل نقل کیا ہے:

...ولقد وفق لامر عظیم ورفع الاختلاف وجمع الکلمه واراح الامه- (تفسیر البرہان فی علوم القرآن للزرکشی ص ۲۳۹، جزو اول، تحت نوع نمبر ۱۳، طبع اول)

یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے اس عظیم خدمت سرانجام دینے، رفع اختلاف کرنے اور امت کو ایک کلمہ پر جمع کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور آنموصوف رضی اللہ عنہ نے اہل اسلام کو (افتراق وانتشار کی مصیبت سے) راحت پہنچائی اور امت مسلمہ کو یکسوئی نصیب ہوئی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس عظیم کارنامے پر مخالفین لوگ معترض ہوتے ہیں کہ عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید جلوا دیئے تھے اور اس طرح کلام اللہ کے ساتھ استخفاف وحقارت کا معاملہ کیا۔ یہ بات اسلام میں ممنوع ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ اعتراض حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف باغیوں نے پہلے

اٹھایا تھا اور بعد والے طاعنین اسی کو دہراتے اور بڑھاتے چلے آ رہے ہیں۔ اس اعتراض کا جواب صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے دور میں ہی دے دیا گیا تھا اور واضح کر دیا گیا تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو چیزیں جلوا دی تھیں، وہ قرآن مجید کے ساتھ تفسیری الفاظ تھے یا آیت کے معنی و مفہوم کے لیے ذاتی یادداشتیں تھیں۔ علاوہ ازیں بعض لوگوں نے اپنے اپنے مصاحف میں منسوخ التلاوۃ آیات قرآن مجید کی آیات کے ساتھ ملا کر لکھ لی تھیں۔

اس وقت تو ان لوگوں کو کسی قسم کے اشتباہ کا اندیشہ نہ تھا لیکن اگر وہ مصاحف باقی رہ جاتے تو آئندہ نسلوں کو بہت اشتباہ ہوتا۔ پتا نہ چلتا کہ اصل الفاظ قرآنی کون سے ہیں؟ اور تفسیری الفاظ کون سے ہیں؟؟

منسوخ التلاوۃ کون سی آیات ہیں اور غیر منسوخ آیات کون سی ہیں؟؟؟ فلہذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جمہور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مشورہ سے (جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے) ان چیزوں کو تلف کروا دیا اور معدوم کر ڈالا اور وہ متن قرآن کے الفاظ نہیں تھے۔

حافظ ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ نے البدایہ میں مسئلہ ہذا کو بالاختصار بالفاظ ذیل ذکر کیا ہے:

...واما المصاحف فانما حرق ما واقع فيه اختلاف وابقى لهم المتفق عليه كما ثبت في العرضه الاخيره۔ (يعني التي درسها جبريل عليه السلام على رسول الله صلى الله عليه وسلم في اخر سني حياته)

(البدایہ والنہایہ لابن کثیرؒ ص۲۱۷، ج۷، تحت سنہ ۳۵ھ)

نیز اس مسئلہ کی تائید احادیث کی روایات سے بھی ہوتی ہے جیسا کہ بخاری شریف میں ہے:

...وامر عثمان بما سواه من القرآن فی کل صحیفه او مصحف ان یحرق... الخ۔

یعنی حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرآن مجید کے ماسوا جو کچھ صحیفوں اور مصاحف میں لوگوں نے لکھا ہوا تھا، اسے جلانے کا حکم فرمایا۔

(بخاری شریف، ص۷۴۶، جلد ثانی، باب جمع القرآن، طبع دہلی)

نیز خلیفہ رابع حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں لوگوں کے اس شبہ کو رفع کرنے کے لیے اس مسئلہ کی وضاحت بالفاظ ذیل ارشاد فرمائی:

...یقول یایها الناس! لا تغلوا فی عثمان رضی الله تعالی عنه ولا تقولوا له الا خیرا فی المصاحف واحراق المصاحف فوالله ما فعل الذی فعل فی المصاحف الا عن ملامنا جمیعا۔

یعنی (سوید بن غفلہ) کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا۔ آپ فرماتے تھے اے لوگو! عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے حق میں غلو نہ کرنا اور ان کے متعلق خیر و بہتر چیز کے بغیر کوئی بات نہ کہنا۔ مصاحف کے معاملہ میں اور احراق مصاحف کے متعلق جو کچھ انہوں نے کیا وہ ہم لوگوں کی جماعت کے مشورہ کے بغیر ہرگز نہیں کیا۔

(کتاب المصاحف للحافظ ابی بکر عبداللہ بن ابی داؤد السجستانی ص۲۲-۲۳، تحت عنوان اتفاق الناس مع عثمان علی جمع المصاحف)

فلہذا اس کام کی وجہ سے ان کی طرف کوئی طعن منسوب نہ کیا جائے۔

روایت ہذا میں تھوڑا سا آگے چل کر سوید بن غفلہ نے پھر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان بھی ذکر کیا ہے کہ

...سمعت علیا یقول رحم الله عثمان لو ولیته لفعلت ما فعل فی المصاحف۔

یعنی حضرت علی المرتضیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عثمان رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے، اگر میں والی و حاکم ہوتا تو مصاحف

(کتاب المصاحف لابن لابی داؤد السجستانی ص ۲۳) کے متعلق میں بھی وہی معاملہ کرتا جو عثمان رضی اللہ عنہ نے کیا۔

اسی طرح مشہور عالم بدرالدین زرکشی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ: حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ امامِ عادل تھے، ان میں بالکل عناد نہ تھا۔ تدوین قرآن میں انہوں نے کوئی سرکشی اور بے راہ روی اختیار نہیں کی۔ جن چیزوں کی سوخت لازم تھی، وہی کی۔ اسی وجہ سے ان پر کسی نے انکار نہیں کیا بلکہ اس فعل کو پسند کیا اور اس چیز کو ان کے مناقب میں شمار کیا حتیٰ کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

... لو ولیت ما ولی عثمان لعملت بالمصاحف ما عمل۔ (تفسیر البرہان فی علوم القرآن، ص ۲۴۰، ج۱) یعنی حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس چیز کے والی عثمان رضی اللہ عنہ ہوئے اگر میں اس کا والی ہوتا تو میں بھی مصاحف کے بارے میں وہی عمل درآمد کرتا جو عثمان رضی اللہ عنہ نے کیا۔

مذکورہ بالا بیانات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو چیزیں تلف کرائی تھیں، وہ قرآن کے ماسوا چیزیں تھیں (قرآن مجید نہیں جلوایا تھا) اور اس معاملہ میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سمیت اکابر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے موید و معاون تھے اور ان حضرات کی رائے کے مطابق مصاحف سے متعلق یہ عمل کیا گیا اور امت مسلمہ کو افتراق فی الکتاب سے بچانے کے لیے یہ اہم کام سرانجام دیا گیا۔

فلہذا حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس معاملہ میں کلام اللہ کی تحقیر اور استخفاف کے مرتکب نہیں ہوئے اور انہیں موردِ الزام ٹھہرانے کا کوئی جواز نہیں۔

ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کا رجوع

یہاں قابلِ وضاحت ایک یہ چیز ذکر کی جاتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود

رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پہلے پہلے مصاحف کے اس مسئلہ میں اختلاف کیا تھا اور اپنی مخالفانہ رائے پر اصرار کیے ہوئے تھے (جیسا کہ بعض روایات میں ہے) لیکن بعد میں جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو باقی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اتباع کی طرف رغبت دلائی اور جماعت کے ساتھ رہنے کی دعوت دی تو آنموصوف رضی اللہ عنہ نے اپنے موقف سے رجوع کرتے ہوئے جمہور صحابہ کرام کی متابعت اختیار کرلی تھی اور اس مسئلہ میں مخالفت ترک کردی تھی۔

چنانچہ ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ نے البدایہ میں یہ تفصیل بہ عبارت ذیل نقل کی ہے:

...فکتب الیہ عثمان رضی اللہ عنہ یدعوہ الی اتباع الصحابہ فیما اجمعوا علیہ من المصلحہ فی ذالک وجمع الکلمہ وعدم الاختلاف فاتاب واجاب الی المتابعہ وترک المخالفہ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

حاصل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس دعوت پر لبیک کہا اور مخالفانہ رائے سے رجوع کر کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس مسئلہ میں اتفاق کرلیا اور اختلاف ترک کردیا اور جماعت صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عمل کے ساتھ متفق ہوگئے۔

(البدایہ والنہایہ لابن کثیرؒ ص۲۱۷، جلد۷، تحت مناقبہ اکبار... الخ)

مصحف عثمانی پر صحابہ کرام کا اجماع

مالکی علماء میں مشہور عالم ابن عبدالبر ہیں۔ انہوں نے اپنی معروف و مشہور تالیف کتاب التمہید لما فی الموطاء من المعانی والاسانید کے جلد چہارم میں مصحف عثمانی پر امت کے علماء کا اجماع ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ اقطار الارض میں جو مصحف مسلمانوں کے پاس آج تک موجود ہے وہ مصحف عثمانی ہے۔ اور یہی قرآن مجید محفوظ

ہے اور کسی ایک شخص کے لیے بھی جائز نہیں کہ وہ اس سے تجاوز کرے اور کسی مسلمان کی نماز اس مصحف کی قرأت کے بغیر ادا نہیں ہو سکتی۔

مصحف عثمانی کو جو یہ (مقبولیت کا) مقام و مرتبہ حاصل ہوا ہے تو یہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور امت مسلمہ کے اس اجتماعی عمل کی بدولت ہے اور اس کے ماسوا پر اجماع نہیں ہو سکا۔ وباللہ التوفیق۔

ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ

... واجمع العلماء ان ما فی مصحف عثمان بن عفان وهو الذی بایدی المسلمین الیوم فی اقطار الارض حیث کانوا- هو القرآن المحفوظ الذی لا یجوز لاحد ان یتجاوزه- ولا تحل الصلاة لمسلمٍ الا بما فیه-...انما حل مصحف عثمان رضی الله عنه هذا المحل لاجماع الصحابه وسائر الامه علیه- ولم یجمعوا علی ما سواه وبالله التوفیق- الخ-

(کتاب التمہید لما فی الموطاء من المعانی والاسانید لابن عبدالبر ص۲۷۸-۲۷۹، ج۴، تحت حدیث نمبر۲۱ لزید بن اسلم، طبع مکہ مکرمہ)

تنبیہہ

اس مقام میں یہ بات نہایت قابل توجہ ہے کہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بعد جناب امیرالمومنین علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی خلافت حقہ قائم ہوئی تو آں موصوف رضی اللہ عنہ نے ان سابق خلفاء کے اعمال اور کارناموں کو بعینہٖ قائم رکھا۔ ان میں یہ بات بھی تھی کہ آں موصوف رضی اللہ عنہ نے مصحف عثمانی کو اپنی ہیئت پر قائم رکھا اور اپنی خلافت کے تمام بلاد و امصار میں اس کی تلاوت کو جاری رکھا اور ہر سال رمضان المبارک میں اسی مصحف عثمانی کو ہی تراویح میں پڑھا اور سنا جاتا رہا اور کسی دیگر

قرآن کی تلاوت حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے دور میں نہیں کی گئی۔ پس اس وجہ سے صدر اول میں اہلِ اسلام کا اس مصحف عثمانی پر اجماع منعقد ہوگیا اور اسے تواتر طبقاتی حاصل ہوگیا۔ علماء کرام فرماتے ہیں کہ

...وقد تولی الخلافہ بعد ھولاء الشیوخ الثلاثہ امیرالمومنین علیؓ - فامضی عملھم واقر مصحف عثمانؓ برسمہ وتلاوتہ فی جمیع امصار ولایتہ وبذالک انعقد اجماع المسلمین فی صدر الاول...الخ۔

(حواشی العواصم من القواصم از محب الدین الخطیب ص۶۹، تحت بحث المصاحف، طبع لاہور)

مندرجات بالا کی روشنی میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت کا یہ اجتماعی عمل اس بات کا قوی قرینہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کے متعلق جو عمل درآمد کیا ہے، وہ بالکل صحیح تھا گویا مرتضوی دورِ خلافت کا یہ عمل اس مسئلہ کی صحت کی بین دلیل ہے اور اس پر شہادت کاملہ کا درجہ رکھتا ہے۔ اس سے بڑھ کر مصحف عثمانی کے درست اور صحیح ہونے پر کسی گواہی کی حاجت نہیں رہتی۔

چنانچہ اسی سلسلہ میں ایک مشہور عالم محمد بن یحییٰ بن ابی بکر نے اپنی تصنیف میں ذکر کیا ہے کہ

... فعل ذالک عثمان ولو کان منکرا لکان علی رضی اللہ عنہ غیرہ لما صار الامر الیہ۔ فلما لم یغیرہ علم ان عثمان کان مصیبا فی ما فعل۔ (کتاب التمہید والبیان فی مقتل الشہید عثمان رضی اللہ عنہ لمحمد بن یحییٰ الاشعری المالکی ص۱۸۵، تحت ذکر

یعنی (مصحف کے بارہ میں) حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو معاملہ کیا اگر وہ منکر اور غلط ہوتا تو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب خلافت حاصل ہوئی تھی تو وہ اس (مصحف) کو تبدیل کر دیتے اور جب حضرت علی مرتضیٰ نے اسے متغیر اور تبدیل نہیں فرمایا تو معلوم ہوا کہ

الاسباب التی نقموھا علی عثمان رضی اللہ عنہ، والجواب عنہا، طبع بیروت) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، اس معاملہ میں مصیب تھے اور صحیح العمل تھے۔

حاصل کلام

یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یہ ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا اور امت مسلمہ کو اختلاف فی الکتاب کے فتنہ سے بچانے کی مفید ترین تدبیر کی اور کتاب اللہ کی حفاظت کے بارے میں اہم کردار ادا کیا اور یہ تمام کام اس عہد کے اکابر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے تعاون اور اتفاق سے بجا لائے (جیسا کہ مندرجہ بالا حوالہ جات میں ذکر کیا گیا ہے) اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس عمل کو صحیح قرار دیا، غلط نہیں کہا اور اس کے ساتھ اختلاف نہیں کیا۔ پس یہ بات تعامل صحابہ میں داخل ہے اور اس چیز کو تواتر طبقاتی سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ فلہذا تعامل صحابہ اور تواتر طبقاتی کی بنا پر یہ مسئلہ اجماعی قرار دیا گیا اور فرمانِ نبوت ہے کہ

...لا تجتمع امتی علی الضلالہ۔ یعنی گمراہی اور غلط کام پر میری امت جمع نہیں ہوگی۔

اس اعتبار سے بھی یہ فعل صحیح ہے، قبیح نہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، پر اعتراض ہذا کی متعلقہ چیزیں ہم نے بقدر ضرورت ذکر کر دی ہیں اور مسئلہ ہذا پر ہم نے قبل ازیں "سیرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ،" میں ص ۱۹۱ تا ۲۰۴ مفصل بحث کر دی ہے۔

اندریں حالات قارئین کرام سے گزارش ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس عظیم کام کے مالہ وماعلیہ پر نظر غائر کریں اور خود فیصلہ کریں کہ معترضین کا یہ اعتراض کہاں تک درست ہے؟؟ کہیں اس مقولہ کا مصداق تو نہیں کہ

ہنر بچشم عداوت بزرگ تر عیب است

اللہ تعالیٰ اہل اسلام کو ہدایت نصیب فرمائے اور متفق علیہ مسائل پر اتفاق قائم رکھنے کی توفیق بخشے۔ واللہ الھادی۔



صحابہ سے بدسلوکی و مظالم کے اعتراضات کا جواب

خلیفہ ثالث امیرالمومنین حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق معترضین نے یہ مشہور کیا ہوا ہے کہ انہوں نے مشاہیر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر مختلف قسم کے مظالم کیے اور ان کے ساتھ کئی قسم کی بدسلوکی روا رکھی جبکہ ان کا یہ رویہ شرعاً صحیح نہیں تھا۔

ان ستم رسیدہ حضرات میں حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابوذر غفاری اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہم کے اسماء نمایاں طور پر ذکر کیے جاتے ہیں۔

پس اس سلسلہ میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی طرف سے صفائی کے بیانات اور دفاع کے لیے چند ایک چیزیں پیش کی جاتی ہیں جن سے اصل واقعہ کی حقیقت حال معلوم ہوسکے گی اور ان اعتراضات کا خلاف واقعہ اور بے جا ہونا واضح ہوسکے گا۔

(ا) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق اہل تاریخ یہ ذکر کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ بعض مسائل میں اختلاف کیا چنانچہ اس کی

وجہ سے انہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم سے زدو کوب کیا گیا اور کوفہ میں ان کے منصب سے معزول کر دیا نیز بیت المال سے ان کا وظیفہ روک لیا۔

اور منہاج الکرامہ میں ابن مطہر الحلی شیعی نے لکھا ہے کہ ضربہ حتی مات۔ یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن مسعود کو شدید زدو کوب کیا حتیٰ کہ ان کی موت واقع ہو گئی۔

الجواب

مذکورہ بالا اعتراضات کی صفائی میں ہم کبار علماء کے بیانات ذکر کرتے ہیں۔ ان پر نظر کر لینے سے واقعہ کی حقیقت واضح ہو جائے گی اور معترضین کے اعتراضات کا بے جا ہونا معلوم ہو سکے گا۔

(الف) چنانچہ ابوبکر ابن عربی اپنی تصنیف "العواصم من القواصم" میں لکھتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو زدوکوب کرنا اور ان کا وظیفہ روک دینا بالکل جھوٹ ہے اور خلاف واقعہ ہے...

...واما ضربه لابن مسعود ومنعه عطاء فزور۔

(العواصم من القواصم لابن عربی ص ۶۳، تحت مسئلہ ہذا)

(ب) اور فاضل الذہبی اپنی تصنیف المنتقی میں تحریر کرتے ہیں کہ... ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مارنا پیٹنا حتیٰ کہ ان کی موت واقع ہو جانا۔ یہ خالص دروغ اور واضح جھوٹ ہے۔

...واما قولك ضرب ابن مسعود حتى مات فهذا من اسمج الكذب المعلوم۔

(۱) المنتقی للذہبی ص ۳۹۴، تحت مسئلہ ہذا۔

(۲) الصواعق المحرقہ لابن حجر المکی ص ۱۱۴ تحت جواب مطاعن عثمانی۔

(ج) اور مورخ دیار بکری نے اسی مسئلہ کو اپنی تالیف "تاریخ الخمیس" میں لکھا

ہے کہ مورخین جو یہ ذکر کرتے ہیں کہ عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی غلام کو حکم دیا کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو زد و کوب کیا جائے' یہ بالکل بہتان ہے اور خودساختہ داستان ہے۔ اس میں کچھ صحت نہیں۔ جاہل مورخین جو یہ بات روایت کرتے ہیں' اس میں جھوٹ سے بچاؤ نہیں کرتے اور اپنی اغراض کے موافق اس کو روایت کر دیتے ہیں اور ان میں کچھ دیانتداری نہیں ہے جو ان کو اس بات سے روک دے۔

... اما ما رووه مما جری علی عبدالله بن مسعود رضی اللہ عنہ من عثمان رضی اللہ عنہ وامره غلامه بضربه الی اخر ما قرروه فکله بهتان واختلاق- لا یصح منه شئی- هولاء الجهله لا یتحامون الکذب فیما یروونه موافقا- لاغراضهم اذ لا دیانه تردهم لذالک- (تاریخ الخمیس لدیار بکری ص۲۷۰ ج۲ تحت بحث ہذا)

اور علماء نے لکھا ہے کہ بالفرض اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بعض امور کی بنا پر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو یا حضرت عمار بن یاسر کو تنبیہہ یا زجرو توبیخ کی ہو تو وہ خلیفتہ المسلمین اور امام وقت تھے' ان کے لیے اپنے اجتہاد کی بنا پر ان پر تعزیر جاری کرنے کا اختیار تھا۔

اور اسی طرح بالفرض انہوں نے اگر ان میں سے کسی صاحب کو اپنے منصب سے معزول کر کے دوسرے مناسب شخص کو والی اور حاکم بنا دیا ہو تو یہ بھی ان کی صوابدید کی ایک بات ہے اور وہ ان امور کے شرعاً مجاز ہیں اور اپنی مجتہدانہ بصیرت کی بنا پر عزل و نصب کا حق رکھتے ہیں۔

چنانچہ اس مسئلہ کو کبار علماء نے بطور قاعدہ کے تحریر کیا ہے کہ

...ان من طعن علی عثمان رضی اللہ عنہ انما کان لعزله ایاه و تولیه غیره وقطع عطایاه و ذالک سائغ للامام اذا ادی اجتهاده الیه- (تاریخ الخمیس لدیار بکری ص۲۷۱ ج۲ تحت مسئلہ ہذا)

اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے اس مسئلہ کو بالفاظ

ذیل نقل کیا ہے:

... قولہ امیر گردانید ایشانرا بر امصار۔ میگویم نصب و عزل مفوض است برائے خلیفہ اگر اجتہاد خلیفہ مودی شود بانکہ از فلاں شخص کار امت سرانجام می یابد لازم می شود بروی نصب او۔ (قرۃ العینین از شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ ص ۲۷۲، تحت مسئلہ ہذا)

مندرجہ بالا عبارات کا مفہوم یہ ہے کہ خلیفہ وقت کو عزل و نصب کا اختیار ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کے وظائف دینے اور روکنے کا مجاز بھی خلیفہ ہوتا ہے۔ اگر خلیفہ کا اجتہاد اس بات کی طرف رہنمائی کرے کہ فلاں شخص سے امت کا کام بہتر طریقہ سے سرانجام پا سکتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ اس شخص کو اس کام پر نصب کرے۔

فلہذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اگر کسی صاحب کو عزل یا نصب کیا ہے یا کسی کو تنبیہ کی ہے تو یہ ان کی مجتہدانہ رائے کے موافق تھا اور وہ اس کے شرعاً مجاز تھے۔ اس معاملہ میں کسی کو ان پر اعتراض کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

تنبیہ

مورخین مندرجہ بالا اشیاء کو ان حضرات کے مابین مناقشہ کے طور پر ذکر کرتے ہیں اور ان اعتراضات میں افراط و تفریط سے کام لیتے ہیں۔ پھر بدسلوکی کی یہ چیزیں جس درجہ کی ہیں، ان کے جوابات علماء نے دے دیئے ہیں، جن کا خلاصہ ہم نے مندرجہ بالا سطور میں پیش کر دیا ہے۔

اب ہم ان حضرات (حضرت عثمان اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کے درمیان بہتر تعلقات اور خیر سگالی کی چند چیزیں مختصراً درج کرنا چاہتے ہیں تاکہ واضح ہو سکے کہ ان حضرات کا انجام کار ایک دوسرے کے ساتھ بہتر سلوک تھا اور اسی پر ان کا خاتمہ بالخیر ہوا۔

بالفرض سابقہ ایام میں اگر کوئی نزاع یا مناقشہ کا معاملہ پیش آیا بھی تھا تو یہ وقتی

تقاضوں کے تحت تھا اور وہ ان حالات کے گزر جانے پر ختم ہوگیا۔ یہ کوئی دوامی منازعات نہیں تھے جو مدت العمر جاری رہے ہوں۔

ذیل میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا تعلق بالاختصار ذکر کرنا مفید ہے جس سے ان دونوں حضرات رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے ایک دوسرے کے حق میں بہتر نظریات واضح ہو سکیں گے۔

------ (ا) ------

جس وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت واقع ہوئی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے انتخاب کا مسئلہ پیش آیا تو اس موقعہ پر حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

... انا اجتمعنا اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم فلم نال عن خیر ناذی فوق فبایعنا امیر المومنین عثمان فبایعوہ---"

(طبقات ابن سعد، ص ۴۳، ج ۳، قسم اول تحت ذکر بیعت عثمان رضی اللہ عنہ، طبع لیدن)

نیز محدث طبرانی نے نزال بن سبرہ سے روایت ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

... قال لما استخلف عثمان رضی اللہ عنہ قال عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ امرنا خیر من بقی ولم نالوا۔

(مجمع الزوائد للہیثمی ص ۸۸، ج ۹، بحث فضائل عثمان، باب افضلیتہ)

مندرجہ بالا ہر دو روایات کا مفہوم یہ ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے مخاطبین کو فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت واقع ہوئی تو نبی اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اصحاب ہم مجتمع ہوئے۔ پس ہم نے اپنی جماعت میں سے فائق اور بہترین شخصیت کے انتخاب کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ پس ہم سب نے امیرالمومنین عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیعت کرلی۔ اے مخاطبین تم بھی عثمان

رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لو۔

اس واقعہ سے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے نظریات واضح ہوگئے کہ باقی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان کے نزدیک فائق شخصیت تھے اور اس منصب خلافت کے صحیح اہل تھے۔

------ (۲) ------

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حج کے موقعہ پر منیٰ میں قصر کرنے کے بجائے چار رکعت نماز ادا کی۔

حالانکہ ان سے قبل خلفاء حضرات منیٰ میں دو رکعت نماز ادا کرتے تھے۔

اس موقعہ پر جناب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی چار رکعت نماز پڑھی۔

تو بعض لوگوں نے کہا کہ آپ تو اس مسئلہ میں اس بات کے خلاف تھے۔

تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں خلیفہ وقت کی مخالفت کو ناپسند کرتا ہوں یا یہ فرمایا کہ خلیفہ کا خلاف کرنا شر ہے۔

... فقال ابن مسعود رضی اللہ عنہ انی اکرہ الخلاف۔ وفی روایۃ---الخلاف شر۔

(البدایہ لابن کثیر جلد سابع، ص۲۱۷، طبع اول، مصری تحت فصل جمع الناس علی قراۃ واحدۃ)

واقعہ ہذا سے واضح ہوا کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف نہیں تھے--- بلکہ مسائل میں بعض دفعہ اپنی رائے ترک کر دیتے اور خلیفہ اسلام کی اقتداء کو ترجیح دیتے تھے۔

------ (۳) ------

یہاں یہ چیز واضح کرنے کے لائق ہے کہ خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ

تعالیٰ عنہ کے عہدِ خلافت میں جمع مصاحف کا معاملہ پیش آیا تو اس مسئلہ میں جناب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی رائے مختلف تھی۔

تاہم اس مسئلہ میں بھی بالآخر آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عمل کے ساتھ موافقت کرتے ہوئے اپنی رائے کو ترک کر دیا تھا۔

فلہذا مسئلہ مصحف میں بھی حضرت عثمان اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے درمیان مناقشہ اور اختلاف ختم ہوگیا تھا۔

ہم نے قبل ازیں "احراق مصاحف" کے عنوان کے تحت اس مسئلہ کو بالوضاحت تحریر کر دیا ہے۔

------ (۴) ------

اور اس مقام میں مورخین نے دیگر چیز بھی ذکر کی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وقتی تقاضوں کے تحت کسی وجہ سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیت المال سے وظیفہ بند کر دیا تھا۔

اس مسئلہ کی صحیح تفصیلات تو معلوم نہیں ہوسکیں۔ مورخین نے اس معاملہ میں بہت افراط و تفریط کی ہے کہ ان کا وظیفہ کس بنا پر روکا گیا؟ اور کیا حالات اس وقت پیش آئے تھے؟؟ یہ سب باتیں تحقیق طلب ہیں۔ تاہم یہ بات اہلِ تاریخ نے درج کی ہے کہ وظیفہ کے یہ بقایا جات جناب ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ان کے ورثاء کو ادا کیے گئے اور جناب زبیر بن العوام کے ذریعہ ان وظائف کو اہلِ حق کی طرف پہنچایا گیا۔

(۱) طبقات ابنِ سعد ص ۱۱۳-۱۱۴، تحت تذکرہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ۔

(۲) تاریخ الاسلام للذہبی ص ۱۰۴، ج ۲، تحت سنہ ۳۲ھ، تذکرہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ۔

------ (۵) ------

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ خلافت میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کوفہ میں اقامت پذیر تھے اور ایک مدت تک وہاں اشاعت اسلام میں مصروف اور دینی کاموں میں مشغول رہے اور بعض روایات کے مطابق کوفہ کا بیت المال ان کی نگرانی اور تحویل میں تھا لیکن بعد میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو بیت المال کوفہ سے الگ کر دیا اور ان کی جگہ عقبہ بن عمرو کو متعین فرمایا اس کے بعد ان کو کسی کام پر والی اور حاکم نہیں بنایا گیا لیکن آپ وہاں بغیر کسی منصب کے مقیم تھے اور لوگوں کو دینی تعلیم دیتے تھے۔

اندریں حالات ایک مدت کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے لوگوں کی طبائع میں تشرد اور تمرد معلوم کیا اور فتنہ فساد کے حالات پیدا ہونے لگے تو اہلِ کوفہ سے دل برداشتہ ہو کر مدینہ شریف کی طرف واپسی کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اجازت طلب کی۔ اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پہلے تو واپسی کی اجازت نہیں دی لیکن بعد میں وقتی تقاضوں کے تحت مدینہ منورہ میں واپسی کی اجازت دے دی۔

چنانچہ بقول مورخین آپ رضی اللہ عنہ اپنی وفات سے چند ماہ قبل مدینہ طیبہ واپس پہنچے اور یہیں ۳۲ھ میں آں موصوف کا انتقال ہوا اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

(التمہید والبیان فی مقتل الشہید عثمان لمحمد بن یحییٰ بن ابی بکر الاندلسی، تحت ذکر خروج ابن مسعود رضی اللہ عنہ من الکوفہ، ص۶۵)

ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کے آخری اوقات

اور اہلِ تاریخ اس طرح بھی ذکر کرتے ہیں کہ جناب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے آخری ایام میں کوفہ سے واپس آ کر مدینہ طیبہ میں مقیم ہو گئے تھے۔ ان ایام میں آپ پر بیماری کا حملہ ہوا۔

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو آپ رضی اللہ عنہ کی ناسازی طبع کا علم ہوا تو آپ رضی اللہ عنہ

ان کے پاس عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور ان کی بیمار پرسی کی۔ چنانچہ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ

...ثم قدم الی المدینہ فمرض بھا فجاء ہ عثمان بن عفان عائدا۔

(البدایہ والنہایہ لابن کثیرؒ، ص ۱۶۳، ج ۷، تحت تذکرہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ)

اور ابن سعد نے اپنے طبقات میں ذکر کیا ہے کہ

... صلی علیہ عثمان بن عفان واستغفر کل واحد منھما لصاحبہ قبل موت عبداللہ (بن مسعود رضی اللہ عنہ) قال وھو اثبت عندنا ان عثمان بن عفان صلی علیہ۔" (طبقات ابن سعد ص ۱۱۳، ج ۳، قسم اول تحت وصایا ابن مسعود رضی اللہ عنہ، طبع لیدن)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ دونوں حضرات نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی وفات سے پہلے پہلے) ایک دوسرے کے حق میں استغفار کیا اور معاف کر دیا۔ اس کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوگیا اور ان پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

اور ابن سعد کہتے ہیں کہ بعض لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ جناب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ پڑھائی تھی۔ وہ بات قابلِ اعتماد نہیں بلکہ زیادہ صحیح اور درست بات یہ ہے کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ پڑھائی۔

اور اس قول کی وجہ صحت اور وجہ ترجیح یہ ہے کہ اسلام کا مسلمہ قاعدہ یہ ہے کہ خلیفۃ المسلمین احق بالصلوۃ ہوتا ہے جبکہ خلیفہ وقت موجود ہو تو نماز کا حقدار وہی ہوتا ہے الا کہ وہ کسی دیگر شخص کو اپنی طرف سے اجازت دے دے۔

مذکورہ بالا مندرجات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ ان دونوں بزرگواروں کا آخری اوقات میں مناقشہ ختم ہوگیا تھا (جیسا کہ روایت مذکورہ بالا میں

منقول ہے) پس یہ دونوں حضرات ایک دوسرے کے مقام و مرتبہ کو ملحوظ رکھتے تھے۔
اب ظاہر بات یہی ہے کہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ وقت نے جناب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں ان کا دفن ہوا اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو زد و کوب کرنے حتیٰ کہ اس سے موت واقع ہو گئی' یہ محض جھوٹا پروپیگنڈہ ہے' اس میں کوئی صداقت نہیں۔ ان کے آخری اوقات کے صحیح حالات ہم نے ذکر کر دیئے ہیں جو ان کی باہمی صلح جوئی اور عدم کدورت پر دلالت کرتے ہیں۔

(۲) جناب ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ

ان کا اسم گرامی جندب بن جنادہ ہے۔ غفاری قبیلہ کی طرف نسبت ہے اور سابقین اولین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ بڑے عابد زاہد تھے اور صاحب العلم والفضل تھے۔ لیکن طبیعت پر صفت زہد اور ترک دنیا کا غلبہ تھا جیسا کہ بعض حضرات کے مزاج پر بعض مسائل کا غلبہ ہوتا ہے۔ ان کی بھی وہی کیفیت تھی اور یہ ایک فطری اور طبعی چیز ہے۔ اور اہل ایمان کی صفت "ولا یخافون لومه لائم" کے صحیح مصداق تھے۔ نیز مسئلہ میں اپنی تحقیق کے خلاف بات برداشت نہیں کرتے تھے اور طبیعت مغلوب الغضب تھی اور "جمع مال" کے مسئلہ میں ان کا یہ مسلک علماء نے لکھا ہے کہ

... وکان مذهبه بذل ما فضل عن الحاجه وان امساكه كنزيكوى به صاحبه- ويتلوا آيه والذين يكنزون الذهب والفضه ولا ينفقونها فى سبيل الله

اس کا حاصل یہ ہے کہ جمع مال کے مسئلہ میں ان کا مذہب یہ تھا کہ جو مال انسان کی حاجت و ضرورت سے زائد پایا جائے اس کو صرف کر دینا چاہیے (جمع کر کے نہیں رکھنا چاہیے) اور ضرورت سے وافر مال کو روک کر رکھنا (ان کے نزدیک) کنز

فبشرھم بعذاب الیم---الخ- اور خزانہ کے حکم میں تھا جس پر وعید شرعی ہے کہ اس مال کو (آخرت میں) گرم کرکے مالک مال کو داغا جائے گا... الخ۔

(المنتقی للذہبی" ص۳۹۶، تحت جوابات مطاعن عثمانی)

اور آپ اپنے مسئلہ کی تائید میں اسی قرآنی آیت والذین یکنزون للذھب والفضہ... الخ سے استدلال کرتے تھے۔

چنانچہ اسی مسئلہ میں ان کے متعلق متعدد واقعات پائے جاتے ہیں، ان میں سے صرف دو یہاں تحریر کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے خاص طور پر ربذۃ کا واقعہ ہے جس کی وجہ سے طاعنین نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر سخت اعتراضات وارد کیے ہیں۔

ایک واقعہ

جناب ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق ان کی منفردانہ رائے کا ایک واقعہ اس طرح منقول ہے کہ

جس وقت آنموصوف بلادِ شام میں مقیم تھے اور اس علاقہ کے امیر حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ تھے۔ ۳۰ھ میں ایک فقہی اختلاف رونما ہوا کہ جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ سیم و زر ہو یا دیگر اموال ہوں، ان کو جمع کرنا اور جمع رکھنا ناجائز اور منع ہے۔ فرماتے تھے کہ ضرورت سے زائد مال کو صدقہ کر دیا جائے اور جمع نہ کیا جائے اور استدلال میں قرآن کریم کی آیت والذین یکنزون الذھب والفضہ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم---الخ تلاوت کرتے تھے اور عوام میں اس مسئلہ کو اعلانیہ بیان فرماتے تھے۔

جبکہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات کی رائے یہ تھی کہ مال سے صدقات واجبہ ادا کرنے کے بعد اموال کو جمع رکھنا جائز ہے اور مباح ہے۔

ان حالات میں عام لوگوں کے لیے پریشانی رونما ہونے لگی اور شدید اضطراب

پیدا ہو گیا تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ طیبہ میں امیرالمومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف یہ تمام حالات و کوائف لکھ کر حکم طلب کیا۔ اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو واپس مدینہ منورہ بھیج دیا جائے اور جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو بھی مکتوب ارسال فرمایا کہ آپ واپس مدینہ منورہ آ جائیں (تاکہ اس طرح وہاں عام لوگوں میں اضطراب و انتشار پیدا نہ ہو)

چنانچہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو مدینہ طیبہ روانہ کر دیا گیا۔ جب آں موصوف رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پہنچے تو آپ رضی اللہ عنہ نے بتقاضائے وقت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو مقام ربذۃ میں رہائش پذیر ہونے کا مشورہ دیا اور آپ رضی اللہ عنہ نے اسے بخوشی قبول کر لیا۔

(۱) المصنف لابن ابی شیبہ ص ۱۱۰-۱۱۱ جلد یازدہم، طبع کراچی تحت کتاب الامراء۔

(۲) طبقات ابن سعد ص ۱۶۶، ج ۴، قسم اول، تحت ابی ذر غفاری رضی اللہ عنہ، طبع لیدن۔

اس مقام میں حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ

...... وامره (عثمان لابی ذر رضی الله تعالی عنه) ان یتعاهد المدینه فی بعض الاحیان حتی لا یرتد اعرابیا بعد هجرته ففعل۔ (البدایه والنهایه لابن کثیرؒ، ص ۱۵۵-۱۵۶، ج ۷، تحت سنہ ۳۰ھ)

یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ بعض اوقات آپ کو مدینہ منورہ میں آمد و رفت رکھنی چاہیے تاکہ آپ میں بدویت اور اعرابیت کے آثار لوٹ کر نہ آ جائیں۔ انہوں نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور قیامِ ربذۃ کے دوران مدینہ طیبہ میں بعض اوقات آمد و رفت جاری رکھی۔

ایک دیگر واقعہ

جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے قیامِ ربذۃ کے دوران جب حضرت عبدالرحمٰن

بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مدینہ منورہ میں انتقال ہوگیا تو آپ اس موقعہ پر یہاں تشریف لائے۔ اس موقعہ پر حافظ الذہبی رحمتہ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ

...ولما توفی عبدالرحمن بن عوف وخلف ما لا عد ذالک ابوذر رضی اللہ عنہ من الکنز الذی یعاقب علیہ و عثمان یناظرہ فی ذالک حتی دخل کعب (احبار) فوافق عثمان فضربہ ابوذر رضی اللہ عنہ۔

یعنی جب مشہور صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ۳۲ھ میں فوت ہوئے تو انہوں نے اپنے ترکہ میں بہت کچھ اموال چھوڑے۔ ان متروکہ اموال کے حق میں جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ یہ کنز اور خزانہ کے حکم میں ہیں جن کے متعلق وعید شرعی موجود ہے۔

(۱) المنتقی الذہبی ص۳۹۶، ۳۹۷ تحت بحث جوابات مطاعن عثمانی۔

(۲) مسند ابی یعلی الموصلی ص۱۵۷-۱۵۸، جلد اوّل، تحت مسندات عثمان رضی اللہ عنہ۔

خلیفہ وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اس مسئلہ پر ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے ساتھ گفتگو ہوئی اور جناب کعب رضی اللہ عنہ بھی اس موقعہ پر اتفاقاً آ گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رائے جناب ابوذر رضی اللہ عنہ کے خلاف تھی اور فرماتے تھے کہ یہ اموال کنز کے حکم میں داخل نہیں بلکہ یہ اموال حسب قاعدہ میراث ان کے وارثوں میں تقسیم ہوں گے۔ اس بحث میں جناب کعب رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رائے کی تصدیق و تائید کی تو جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ طیش میں آ گئے اور مغلوب الغضب ہو کر کعب رضی اللہ عنہ کو اپنی (لاٹھی) دے ماری۔

اس مقام میں مورخین لکھتے ہیں کہ

...... ونزل الربذہ وبنی بہا مسجدا واقطعہ، عثمان رضی اللہ تعالی عنہ صرمہ من الابل واعطاہ مملوکین

مفہوم یہ ہے کہ (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ مقام ربذہ میں فروکش ہوئے اور وہاں ایک مسجد تعمیر کی۔ امیرالمومنین

واجری علیہ رزقا وکان یتعاھد المدینہ وبین المدینہ والربذہ ثلاثہ امیال۔

(۱) تاریخ ابن خلدون ص۱۰۲۹، جلد ثانی، تحت عنوان بدا الانتقاض علی عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ، طبع بیروت۔ (۲) التمہید والبیان فی مقتل الشہید عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ص ۷۴ تا ۷۶، تحت بحث ہذا)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے چند شتر (اونٹوں کا ایک گلہ) ان کو دے دیا گیا (اور بروایت طبری انہیں بھیڑ بکریوں کا ایک گلہ بھی دیا گیا) اور ساتھ ہی دو خادم (ایک غلام اور ایک خادمہ) بھی عطا کیے گئے۔ نیز بقدر کفایت ان کے لیے بیت المال سے باقاعدہ وظیفہ جاری کر دیا گیا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ وقتاً فوقتاً مدینہ منورہ میں آمد و رفت رکھتے تھے۔ (یعنی مرکز کے ساتھ رابطہ قائم رکھے ہوئے تھے) مقام ربذہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان قریباً تین میل کا فاصلہ تھا۔

علماء کی طرف سے نقد و تنقید

تاریخ کے راویوں نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ربذہ کے مقام پر تشریف لے جانے اور وہاں مقیم ہونے کے واقعہ میں بڑی رنگ آمیزی کی ہے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پوزیشن کو خراب کرنے کی خاطر یہاں امور شنیعہ اور قبیحہ ذکر کئے ہیں۔ ساتھ ہی حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے حق میں بھی اس واقعہ کے متعلق بہت سی غلط چیزیں منسوب کی ہیں۔ چنانچہ:

(الف) رطب و یابس ہر قسم کی روایات لانے والا مورخ الطبری بھی اس واقعہ کے تحت لکھتا ہے کہ

....واما الاخرون فانھم رووا فی سبب ذالک اشیاء کثیرہ

یعنی (حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے ربذۃ کی طرف خروج کے واقعہ میں) لوگوں نے

وامورا شنیعه کرهت ذکرها---الخ- بہت سی چیزیں اور بُری باتیں ذکر کردی ہیں جن کے بیان کرنے کو میں مکروہ جانتا ہوں-

(تاریخ الطبری ص ۶۷، ج ۵، تحت اخبار ابی ذر، ۳۰ھ، طبع قدیم، مصر)

(ب) اور صاحب کتاب التمہید والبیان نے تحریر کیا ہے کہ

...واما ما ذکر فی سبب اخراجه من الامور الشنیعه وسب معاویه ایاه و تهدیده بالقتل وحمله من الشام الی المدینه بغیر وطا و نفیہ فلا یصح النقل به بل هوا من اکاذیب الرافضه قبحهم الله تعالی - (کتاب التمہید والبیان فی مقتل الشہید عثمان لمحمد بن یحییٰ بن ابی بکر الاشعری ص ۴۷، طبع بیروت)

یعنی جناب ابوذر رضی اللہ عنہ کو ربذہ کی طرف اخراج کرنے میں بہت سی بری چیزیں مذکور ہیں اور جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کا جناب ابوذر رضی اللہ عنہ کو سب و شتم کرنا اور قتل کی دھمکی دینا اور ان کو بلادِ شام سے مدینہ طیبہ کی طرف بغیر سواری کے نکال دینا وغیرہ الخ چیزوں میں کوئی صحیح روایت منقول نہیں بلکہ یہ باتیں روافض کے اکاذیب میں سے ہیں اور زیب داستان کے طور پر ایزاد کی گئی ہیں-

کبار علماء امام بخاری وغیرہ نے اس مقام میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے دفاع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک بار غالب القطان نے حسن بصری سے سوال کیا کہ کیا حضرت عثمان نے ابوذر رضی اللہ عنہ کا مدینہ سے اخراج کر دیا تھا؟ قال معاذ اللہ! (یعنی اللہ کی پناہ! ایسا ہرگز نہیں ہوا)

(تاریخ الکبیر للبخاری ص ۱۰۰، جلد ۴، ق اول، تحت غالب الخ)

مورخین کے مذکورہ بالا بیانات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی کہ اس واقعہ میں مورخین نے بہت کچھ غلط سلط روایات بڑھا دی ہیں اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مخالفین خصوصاً روافض نے ان چیزوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے خلاف خوب نشر کیا ہے-

حالانکہ بات اس طرح نہ تھی اور واقعہ کے خلاف چیزیں انہوں نے پھیلا دیں۔

نوٹ

واقعہ ہذا کو ہم نے قبل ازیں اپنی تالیف "سیرت حضرت امیر معاویہ" جلد اوّل میں "ایک فقہی اختلاف" کے عنوان کے تحت ص ۱۷۹ تا ۱۸۳ مفصل درج کر دیا ہے۔ اس مقام پر واقعہ ہذا کے متعلق حوالہ جات بھی درج کر دیے ہیں۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے آخری اوقات

جیسا کہ سطور بالا میں بیان کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رائے سے جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ مقامِ ربذۃ میں مقیم ہو گئے تھے اور ان کی ضروریات کے موافق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے سہولتیں فراہم کر دی تھیں اور وظیفہ بھی جاری کر دیا تھا۔ کچھ مدت کے بعد حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے انتقال کے اوقات قریب آ پہنچے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ ۳۲ھ میں ان کا مقامِ ربذۃ میں انتقال ہوا۔ اس وقت آنموصوف رضی اللہ عنہ کے پاس اپنی اولاد اور اہلیہ کے علاوہ اتفاقاً کوئی دیگر شخص موجود نہیں تھا۔ اندریں حالات حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ عراق کی طرف سے اتفاقاً وہاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ آ پہنچے اور انہوں نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے غسل اور کفن و دفن کا انتظام کیا۔ اس کے بعد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو جب جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے انتقال کی خبر ملی تو انہوں نے آنموصوف کے اہل و عیال کی کفالت اپنے ذمہ لے لی اور ان کو اپنی تحویل میں لے لیا۔

......وقد ارسل عثمان بن عفان رضی اللہ تعالی عنہ الی اھلہ فضمھم مع اھلہ۔

(۱) البدایہ والنہایہ لابن کثیر ج ۷، ص ۱۶۵ تحت تذکرہ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ، ۳۲ھ۔

(۲) التمہید والبیان فی مقتل الشہید عثمان ص ۷۹، تحت واقعہ ہذا۔

مختصر یہ ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلقہ حالات و کوائف جو اصل واقعہ کے مطابق ہیں وہ ہم نے تاریخ کے صفحات سے ناظرین کرام کی خدمت میں پیش کر دیئے ہیں۔

اس صورت میں ان دونوں حضرات (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، اور ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ،) کے درمیان کوئی مناقشہ باقی نہ رہا تھا اور نہ ہی یہ دونوں حضرات آپس میں ایک دوسرے کے مخالف تھے۔

مخالفین صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، کے خلاف جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ، کے متعلق جو قابل طعن روایات چلائی ہیں وہ ہرگز صحیح نہیں۔

(۳) حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ رضی اللہ عنہ، کے متعلق تاریخ کے راویوں نے ایک طویل داستان تالیف کی ہے۔ اس میں انہوں نے ظاہر کیا ہے کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ، کو ان کی حق گوئی پر خود انہوں نے اور ان کے خدام نے سخت زد و کوب کیا اور وہ شدید مضروب ہوگئے حالانکہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ، بڑے جلیل القدر قدیم صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے ہیں اور بہت سے فضائل و مناقب کے حامل ہیں اور ان کا اسلام میں بڑا اعلیٰ مقام و مرتبہ ہے۔

الجواب

اس فن کے کبار علماء نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ، کے مضروب ہونے کے واقعہ کے متعلق جو صحیح حالات بیان کیے ہیں وہ سطور ذیل میں پیش خدمت ہیں اور جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، کے مخالفین نے اس واقعہ کے متعلق خلاف واقعہ داستان چلائی ہے وہ سراسر جھوٹ اور دروغ گوئی پر مشتمل ہے۔

اصل واقعہ اس طرح ہے کہ ایک بار حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں تشریف لائے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف پیغام بھیجا کہ آپ ہمارے پاس تشریف لائیں، ہم آپ کے ساتھ بعض امور میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواباً کہلا بھیجا کہ آج میں چند دیگر امور میں مصروف و مشغول ہوں اس لیے آپ واپس تشریف لے جائیں اور فلاں دن پھر آئیں۔ اس معذرت پر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ واپس چلے گئے لیکن حضرت عمار رضی اللہ عنہ وہیں ٹھہرے رہے اور دوبارہ اور پھر سہ بارہ حضرت عثمان کو باہر تشریف لانے کا پیغام بھیجا لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی کسی مصروفیت کی بنا پر تشریف نہیں لائے اور معذرت کر دی۔ اس پر حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے اصرار کیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی معذرت قبول نہیں کی اور واپس جانے سے انکار کر دیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خدام نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے بار بار اصرار کرنے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے معذرت قبول نہ کرنے اور واپس تشریف لے جانے سے انکار پر برہم ہو کر انہیں زدو کوب کیا اور مسجد سے باہر نکال دیا۔

اس کے بعد جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس معاملہ کی خبر ہوئی تو خود حضرت عثمان تشریف لائے اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے معذرت کی اور فرمایا:

...... واللہ ما امرتہ ولا رضیت بضربہ وھذہ یدی لعمار فلیقتص منی ان شاء۔ ھذا ابلغ ما یکون من الانصاف --- الخ (تاریخ الخمیس للشیخ حسین لدیار بکری ص ۲۷۲، ج ۲، تحت جوابات مطاعن عثمانی نمبر ۱۲)

یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ کی قسم میں نے اپنے خدام کو انہیں زدو کوب کرنے کا حکم ہرگز نہیں دیا (انہوں نے یہ فعل از خود کیا ہے) اور نہ ہی میں اس فعل پر راضی ہوں اور فرمایا کہ یہ میرا ہاتھ حاضر ہے۔ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ اگر چاہیں تو مجھ سے قصاص لے لیں۔ میں اس پر آمادہ ہوں اور یہی بات انصاف کے

قریب تر ہے۔

نیز اس مقام میں شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے مزید لکھا ہے کہ جناب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور راضی ہو گئے۔

... ایں است دست من برائے عمار رضی اللہ عنہ پس گو قصاص بگیرد از من اگر بخواہد۔ عمار دست او بوسید و راضی شد۔

(تحفہ اثنا عشریہ ص ۳۲۲ تحت جوابات مطاعن عثمانی، قصہ عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، طبع لاہور)

اور صاحب تاریخ الخمیس مذکورہ بالا صحیح واقعہ بیان کرنے کے بعد اس کی صحت کے بارے میں ایک دلیل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

جب آخری اوقات میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کی دار میں باغیوں کی طرف سے محصور کر دیا گیا اور پانی کی ترسیل بھی باغیوں نے روک دی تو حضرت عمار رضی اللہ عنہ محاصرین کے پاس گئے اور فرمایا: "سبحان اللہ یہ وہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے بئر رومہ خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا تھا اور اب تم اس کنوئیں کا پانی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روکتے ہو۔ ایسا نہ کرو اور ان تک پانی پہنچنے دو"--- اور جب باغیوں نے ان سے کوئی تاثر نہیں لیا تو آپ رضی اللہ عنہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے اور ان کے تعاون سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاں پانی بھجوانے کی سعی کی۔

...ومما یوید ذالک ویوھی ما رووا انہ روی ابو الزناد عن ابی ھریرہ ان عثمان لما حوصر و منع الماء قال لھم عمار۔ سبحان اللہ! قد اشتری بئر رومہ وتمنعونہ ماءھا خلوا سبیل الماء۔ ثم جاء الی علی رضی اللہ عنہ وسالہ انفاذ الماء الیہ فامر برو ایہ ماء۔ وھذا یدل علی رضاہ وقد روی رضاہ عنہ لما انصفہ بحسن الاعتذار... الخ۔

(تاریخ الخمیس للشیخ حسین بن محمد الدیار بکری ص۲۷۲، ج۲، تحت جوابات مطاعن عثمانی رضی اللہ عنہ، الثانی عشر)

مقصد یہ ہے کہ ایسے نازک اوقات میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف پانی پہنچانے کی سعی کی تھی۔ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مابین اگر کوئی مناقشہ کا معاملہ پیش آیا بھی ہو تو وہ ختم ہوچکا تھا اور یہ دونوں بزرگ باہم راضی ہوگئے تھے اور ان کے مابین کسی قسم کی کدورت اور منازعت باقی نہیں تھی۔

فلہذا ان کے درمیان تنازعات اور مناقشات نشر کرنا درست نہیں اور ان کے درمیان نفرت پھیلانے کا کوئی جواز نہیں۔

(۴) محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق ان کے مخالفین نے اعتراض قائم کیا ہے کہ انہوں نے غدر کیا اور بدعہدی کر دی اور اپنے وعدے کے خلاف کیا، وہ اس طرح کہ جب لوگوں نے ان کے عامل مصر عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے متعلق شکایات کیں اور اس کی تبدیلی کا شدید تقاضا کرتے ہوئے محمد بن ابی بکر کو اس کی جگہ عامل مصر بنانے پر اصرار کیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ مطالبہ تسلیم کرتے ہوئے محمد بن ابی بکر کو اپنی طرف سے والی مصر بنا کر روانہ کیا لیکن بقول مورخین ساتھ ہی ایک دوسرا خفیہ خط دے کر ایک شخص کو سابق عامل مصر کی طرف ارسال کر دیا۔ اس میں درج تھا کہ جس وقت محمد بن ابی بکر تمہارے پاس پہنچے تو اس کو قتل کر دو۔

الجواب

اس مسئلہ کے متعلق کبار علماء نے جواب دیا ہے کہ وہ خفیہ مکتوب جو سابق

عامل مصر کی طرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے لکھا گیا وہ جعلی تھا اسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نہیں لکھوایا تھا اور نہ ہی انہیں اس کا علم تھا۔

......فحلف عثمان رضی اللہ تعالی عنہ انہ ما فعل ذالک وما امر بہ...الخ۔

(ا) تاریخ الخمیس للشیخ محمد بن یحییٰ دیار بکری ص۲۵۹، ج۲، تحت ذکر مقتل عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

(۲) العواصم من القواصم لابن العربی ص۱۰۹-۱۱۰، تحت نمبر۱۸، طبع لاہور۔

(۳) تاریخ خلیفہ ابن خیاط ص۱۴۶، ج۱، تحت الفتنہ فی زمن عثمان رضی اللہ عنہ۔

نیز شیخ دیار بکری نے اپنی اسی تالیف میں مطاعن عثمانی کے جوابات میں لکھا ہے کہ

......وقد حلف علی ذالک لھم...الخ۔

(تاریخ الخمیس ص۲۷۴، ج۲ تحت جوابات مطاعن عثمانی، طعن نمبر۱۹)

مطلب یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس مکتوب کے متعلق حلف اٹھایا، مجھے اس کا کچھ علم نہیں اور نہ ہی میں نے اس کا حکم دیا ہے۔

یہ مکتوب جعلی تھا اور اسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ایک سازش کے تحت مخالفین اور مفسدین نے خود مرتب کر کے ان کی طرف منسوب کر دیا تھا تاکہ ان کے خلاف شورش برپا کی جاسکے۔

تفصیلات کے لیے ہماری تالیفات کے درج ذیل مقامات کی طرف رجوع فرمائیں:

(ا) کتاب "مسئلہ اقربا نوازی" ص۲۸۴-۲۸۵، تحت عنوان "ایک مصنوعی خط۔"

(۲) کتاب "سیرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ" ص۲۱۸، ۲۱۹، تحت عنوان "جعلی خطوط سے برأت۔"

حاصل کلام یہ ہے کہ معترضین نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر غادر ہونے اور وعدہ خلافی کرنے کا الزام جس واقعہ کی بنا پر وارد کیا ہے' وہ سرے سے غلط ہے اور خط جعلی تھا۔ فلہذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف اس بنا پر اعتراض قائم کرنا کسی صورت میں درست نہیں اور یہ طعن بناء الفاسد علی الفاسد کے قبیل سے ہے۔



اجرائے حدود میں کوتاہی کاالزام

خلیفہ ثالث حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر طعن کرنے والے لوگ یہ طعن بھی بڑی آب و تاب سے ذکر کرتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کی حدود کے نفاذ میں تغافل سے کام لیا اور شرعی حدود جاری کرنے میں کوتاہی کی۔

چنانچہ عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے والد حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قتل میں ملوث ہرمزان اور جفینہ وغیرہ کو قتل کر دیا تھا مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سے قصاص نہیں لیا۔ اس طرح آنموصوف رضی اللہ عنہ نے شرعی حد قائم کرنے میں کوتاہی کی اور غفلت اختیار کی۔

الجواب

جب خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ابولولو فیروز نامی مجوسی نے شہید کیا تو آنموصوف کے فرزند عبید اللہ بن عمر نے مغلوب الغضب ہو کر ابولولو کے ساتھیوں ہرمزان اور جفینہ وغیرہ کو قتل کر دیا۔ اس بناء پر کہ یہ لوگ بھی آنجناب رضی اللہ عنہ کے قتل کے منصوبہ میں شریک کار تھے۔

جس وقت امیرالمومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ پر اچانک قاتلانہ حملے کا حادثہ فاجعہ پیش آیا اور تین روز کے بعد آنموصوف رضی اللہ عنہ کا ابتدا محرم الحرام ۲۴ھ میں انتقال ہوگیا تو آنجناب رضی اللہ عنہ کی قائم کردہ مجلس شوریٰ کے فیصلہ کے مطابق

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان خلیفہ ثالث منتخب ہوئے تو آنجناب رضی اللہ عنہ کے سامنے ابتداء میں یہ مسئلہ پیش ہوا کہ عبید اللہ بن عمر نے جو ہرمزان اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا ہے، اس کا کس طرح فیصلہ کیا جائے؟

بعض حضرات کی رائے یہ تھی کہ قتل ہذا کی بنا پر عبید اللہ بن عمر سے قصاص لیا جائے جبکہ بعض دیگر حضرات کی یہ رائے نہ تھی اور وہ کہتے تھے کہ کل ان کے والد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کر دیا گیا اور آج ان کے فرزند کو قتل کر دیا جائے، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔

اس مسئلہ میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے درمیان سخت اضطراب اور شدید پریشانی واقع ہوگئی اور حالات بہت کشیدہ ہوگئے اور قبائل میں عظیم فتنہ کھڑا ہونے کے آثار نظر آنے لگے۔ اسی کیفیت کو الشیخ حسین الدیار بکری نے اپنی تصنیف تاریخ الخمیس میں مختصراً اس طرح ذکر کیا ہے کہ

...فلما رای عثمان ذالک اغتنم تسکین الفتنه وقال امره الی سارضی اهل الهرمزان منه- (تاریخ الخمیس ص ۴۷۲، ج ۲، تحت جوابات مطاعن عثمانی نمبر ۱۶)

یعنی حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب حالات کشیدہ دیکھے تو فتنہ ہذا کی تسکین کو غنیمت سمجھا اور فرمایا کہ یہ معاملہ میرے سپرد ہے اور میں اہل ہرمزان کو اس معاملہ میں راضی کروں گا۔

چنانچہ ان نازک حالات کے متعلق دیگر علماء نے بھی تحریر کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان مقتولین کے ورثاء کو اپنے مال سے دیت ادا کرنے کا فیصلہ کیا، اس لیے کہ ان کا معاملہ خلیفہ وقت کے سپرد تھا اور خلیفہ وقت پیش آمدہ معاملہ میں بہتر فیصلہ کرنے میں بااختیار ہوتا ہے۔ فلہذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مقتولین کے وارثوں کو مال دے کر اس فتنہ کو فرو کرنے کی تدبیر اختیار کی اور عبید اللہ بن عمر کو چھوڑ دیا گیا۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس مقام میں تحریر کیا ہے کہ

...... فودی عثمان رضی اللہ عنہ اولئک القتلی من مالہ لان امرھم الیہ اذ لا وارث لھم الا بیت المال والامام یری الاصلح فی ذالک وخلی سبیل عبید اللہ۔

(البدایہ والنہایہ لابن کثیرؒ، ص۱۴۹، جلد سابع، تحت سنہ ۲۴ھ)

اور اسی مسئلہ کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بالفاظ ذیل ذکر کیا ہے:

... میگوئیم راضی کرد اولیاء مقتول را بمال۔ و دریں صورت قصاص ساقط شد و فتنہ مضمحل گشت و ایں یکے از فضائل ذی النورین است۔"

(قرۃ العینین از شاہ ولی اللہ دہلوی ص۲۷۴، تحت جوابات مطاعن عثمانی، طبع مجتبائی، دہلی)

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس چیز کو اس طرح تحریر کیا ہے:

...عثمان رضی اللہ عنہ خود ورثہ ھرمزان را باموال خطیرہ راضی ساخت کہ اصلا باز شکایت، نکردند۔

پس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عمدہ تدبیر کے ساتھ ایک عظیم فتنہ کھڑا ہونے سے قوم کو بچا لیا اور مقتولین کے وارثوں کو اموالِ کثیرہ دے کر راضی کر لیا۔

(تحفہ اثنا عشریہ از شاہ عبدالعزیزؒ، ص۳۲۴، تحت جوابات مطاعن عثمانی، طعن ششم، طبع لاہور)

نیز مسئلہ شرعی پر صحیح طور پر عمل درآمد ہوگیا کیونکہ ضابطہ شرعی یہ ہے کہ مقتول کے وارثین اگر بطور دیت کے مالی معاوضہ لے کر راضی ہو جائیں تو قاتل سے قصاص ساقط ہو جاتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس معاملہ میں کسی شرعی قاعدہ کی خلاف ورزی بالکل نہیں ہوئی اور کسی شرعی حد کو ضائع نہیں کیا

اور بہتر اسلوب کے ساتھ مسئلہ ہذا کو طے کر دیا۔

تنبیہہ

بعض روایات میں پایا جاتا ہے کہ اس مسئلہ میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے مخالفت کی اور وہ چاہتے تھے کہ ہرمزان وغیرہ کے قتل کے عوض میں عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو قتل کیا جائے۔ اسی لیے جب حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ منتخب ہوئے تو عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ آنموصوف رضی اللہ عنہ کا نظریہ معلوم کر کے ملک شام کی طرف بھاگ گئے تھے۔۔۔ الخ

ناظرین کرام پر واضح ہو کہ روایات کا باب بہت وسیع ہے۔ اس میں ہر نوع کی روایات مل جاتی ہیں اور ان میں صحیح و سقیم ضعیف اور قوی رطب و یابس ہر قسم کی روایات موجود ہوتی ہیں، چنانچہ مندرجہ بالا قسم کی روایات بھی اسی زمرہ میں سے ہیں۔

اور مورخین نے یہ اپنے اپنے انداز میں درج کی ہیں۔ اس سلسلہ میں ضابطہ یہ ہے کہ روایت کے ساتھ ساتھ درایت سے بھی کام لیا جائے۔

اب توجہ فرمائیں کہ حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت بارہ یوم کم بارہ سال قائم رہی ہے اور اس کے ابتدائی ایام میں عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے قصاص لینے کا مسئلہ پیش آیا تھا اور اکابر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اپنی اپنی آراء بھی اس وقت سامنے آگئی تھیں جو باہم متعارض تھیں اور رائے میں شدید اختلاف بھی موجود تھا۔

لیکن ان نازک حالات کے پیش نظر تمام حضرات کی موجودگی میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خلیفہ وقت ہونے کی حیثیت سے جو تدبیر اختیار فرمائی (یعنی مقتولین کے ورثاء کو بطور دیت اموالِ کثیرہ دے دیئے اور ان کو راضی کر لیا اور اس طرح قاتل سے قصاص ساقط ہوگیا اور عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ قصاص سے بچ گئے) یہ فیصلہ

شرعاً صحیح تھا اس لیے اکابر حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے کسی نے بشمول حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ پر اعتراض نہیں کیا اور معاملہ ہذا ختم ہو گیا۔

اتنی قدر بات صحیح ہے اور درایت کے اعتبار سے بھی یہی درست ہے لیکن حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانب سے قریباً بارہ برس کے بعد گزشتہ فیصلہ شدہ قضیہ کو از سر نو کھڑا کرنے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی، اور نہ ہی کوئی داعیہ پایا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ایام میں جو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اپنے فرمودات و معمولات کبار علماء نے ذکر کیے ہیں، یہ واقعہ ان کے بھی بالکل خلاف پایا جاتا ہے۔ مثلاً

(۱) ... محمد بن سیرین نے علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے متعلق ذکر کیا ہے کہ آنجناب رضی اللہ عنہ اپنے دورِ خلافت میں اپنے قاضیوں کو حکم دیتے تھے کہ جس طرح تم سابق خلفاء کے عہد میں فیصلے صادر کیا کرتے تھے، اب بھی اسی کے مطابق فیصلے کرو، تاکہ جماعتی نظم قائم رہے اور فرمایا کرتے کہ میں باہمی اختلاف سے خائف ہوں یعنی سابق اصحاب کے ساتھ اختلاف کرنے کو ناپسند کرتا ہوں۔

...ان علیا قال اقضوا کما کنتم تقضون حتی تکونوا جماعہ فانی اخشی الاختلاف۔

(۱) المصنف لعبد الرزاق ص۳۲۹، ج۱۱ تحت باب القضاۃ طبع مجلس علمی، کراچی۔

(۲) بخاری شریف ص۵۲۶، جلد اول، تحت باب مناقب علی رضی اللہ عنہ، طبع دہلی۔

(۲) ...اسی مسئلہ کو مشہور عالم ابن حزم الاندلسی نے اپنی تصنیف کتاب "الفصل فی الملل" میں اس طرح درج کیا ہے کہ

...ثم ولی علی رضی اللہ عنہ فما غیر حکما من احکام ابی بکر وعمر وعثمان (رضی اللہ

یعنی حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب خلافت کے والی ہوئے تو انہوں نے خلفاء ثلاثہ کے کسی حکم کو تبدیل نہیں

تعالی عنهم) ولا ابطل عهدا من عهودهم- ولو كان ذالك عنده باطلا لما كان فی سعه من ان يمضى الباطل وينفذه- وقد ارتفعت التقيه منه- فرمایا- (اور ان کے احکام کو بحال رکھا) (الفصل فی الملل والاهواء والنحل ص۹۷، ج۴، طبع بغداد)

اور ان حضرات رضی اللہ عنہ کے معاہدہ جات میں سے کسی معاہدہ کو باطل قرار نہیں دیا- جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے نزدیک اگر یہ چیز باطل ہوتی تو وہ ایک باطل چیز کے اجراء و نفاذ کے حق میں نہیں تھے حالانکہ ان کے اپنے دورِ خلافت میں "تقیہ" مرتفع ہوچکا تھا اور آپ تقیہ کے حیلہ کے محتاج نہیں تھے-

نوٹ: یہ مسئلہ قبل ازیں ہم اپنی تالیف "سیرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ" کے ص۴۲۵ تا ۴۲۸ میں "عہد علوی کا عملی نظم" کے عنوان کے تحت درج کر چکے ہیں-

یہاں سے معلوم ہوگیا کہ ہرمزان وغیرہ والے عثمانی فیصلہ کو بھی علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے تبدیل نہ فرمایا اور اس کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا-

اور جن روایات میں ہرمزان وغیرہ کے قتل کے دوبارہ قصاص لینے کا ذکر ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے قصاص لینا چاہتے تھے (حالانکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس قضیہ کا فیصلہ پہلے فرما چکے تھے) تو وہ روایات مرجوح ہیں بلکہ خلافت مرتضوی کے دور کے فیصلوں کے بھی برخلاف ہیں- جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں کبار علماء کی تصریحات پیش کر دی ہیں، پس اس بنا پر وہ روایات متروک ہیں اور قابل اعتناء نہیں-

(۳) ... یہ چیز بھی بطور یاددہانی یہاں ذکر کی جاتی ہے کہ قبل ازیں ہم اسے رحماء بينهم حصہ سوم، ص۱۲۰، تحت عنوان "اجرائے احکام میں عملی تعاون" ذکر کر چکے ہیں کہ شیعہ علماء نے لکھا ہے کہ خلفاء ثلاثہ کے دور میں حدود اللہ جاری کرنے اور نافذ کرنے کے فرائض حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے سپرد تھے اور اس

منصب کا تعین آنموصوف رضی اللہ عنہ کے حق میں فیصلہ شدہ امر تھا۔

چنانچہ امام جعفر صادق فرماتے ہیں کہ

...جعفر بن محمد عن آباء ان ابابکر وعمر وعثمان کانوا یرفعون الحدود الی علی بن ابی طالب... الخ۔

(جعفریات بمع قرب الاسناد، ص ۱۳۳ طبع طہران)

ائمہ کے ان فرمودات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حدود کے اجراء کا مسئلہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں تمام ہوتا تھا اور آنموصوف اس صیغہ کا اعلیٰ منصب رکھتے تھے۔ سو یہ ظاہر بات ہے کہ ہرمزان وغیرہ کے قصاص کا مسئلہ بھی ان کے پیش نظر آیا ہوگا اور اگر بالفرض خلیفہ وقت کی رائے اس مقدمہ میں دوسری تھی اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی رائے اس کے خلاف تھی تاہم اس کا فیصلہ ابتدائے خلافت عثمانی میں ہوگیا اور اس پر عمل درآمد بھی ہو چکا تھا۔ اس موقعہ پر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا اس فیصلہ کے خلاف کوئی اقدام نہ کرنا اس بات کا قوی قرینہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ والا فیصلہ شرعاً صحیح تھا ورنہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اپنے اختیارات منصبی کے تحت اس کو ناجائز اور غلط قرار دے سکتے تھے۔

حاصل بحث یہ ہے کہ واقعہ ہذا میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فیصلہ درست تھا اور شرعاً صحیح تھا اور آپ رضی اللہ عنہ نے شرعی حدود کو ضائع نہیں کیا اور ان کے نفاذ میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔



"فجوۃ" کے اعتراض کا جواب

بعض حلقوں کی طرف سے خلیفہ ثالث سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت پر ایک شدید اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کے عہد خلافت میں نظام اسلام صحیح طور پر قائم نہیں تھا اور اسلام کے قواعد و ضوابط پر عمل درآمد نہیں ہوتا تھا۔ آنموصوف رضی اللہ عنہ کے عہد میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طبعی کمزوری کی وجہ سے مروان بن الحکم کی حکمرانی رہی اور اس عہد میں دینی و شرعی نظام معطل رہا۔

چنانچہ عہد عثمانی پر ان معترض لوگوں نے طعن ہذا عبارت ذیل کے ساتھ وارد کیا ہے:

... وان عہد عثمان رضی اللہ عنہ الذی تحکم فیہ مروان کان فجوہ بینہما... الخ۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرات شیخین (حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما) اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافتوں کے درمیان عہد عثمانی ایک فراخ جگہ خالی پڑی ہے۔ گویا خلافت عثمانی قوانین اسلام کی ترویج اور قواعد شرعی کے نفاذ سے یکسر خالی تھی اور اس عہد کے ہر دو جانب اسلام کی صحیح حکومت مقاصد اسلام کے مطابق قائم تھی لیکن درمیانی عہد (یعنی خلافت عثمانی) میں قوانین اسلام اور قواعد شرعی مفقود ہوگئے تھے۔ ان ایام میں مروان بن الحکم کی حکمرانی تھی۔ اس مفہوم کو معترضین نے "فجوۃ" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور "فجوۃ" دو ٹیلوں کے درمیان کی فراخ خالی جگہ کو کہتے ہیں۔

اعتراض مذکور جن لوگوں نے بھی اٹھایا ہے، بڑا سنگین نوعیت کا ہے اور ایک مختصر سے جملہ مذکورہ میں عجیب طریقہ سے طعن کے تمام پہلوؤں کو مرکوز کر دیا ہے۔ اور اہلِ اسلام میں مسلمہ "خلافت راشدہ" کے ایک اہم اور زریں عہد یعنی بارہ سالہ خلافت عثمانی کو دینی و شرعی نظام سے معطل اور بیکار قرار دیا ہے اور یہ اعتراض معترضین کی طرف سے جس طرح حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات گرامی پر وارد ہو رہا ہے، اسی طرح اس عہد کے عمال، حکام، معاونین اور کارکنان پر بھی قائم ہوتا ہے جن میں ایک کثیر تعداد صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی ہے اور تابعین بھی شامل ہیں۔ ان سب حضرات پر بھی یہ اعتراض وارد ہوتا ہے اور وہ اس سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔

طعن کرنے والوں نے اس موقعہ پر نہ "خلافت راشدہ" کا لحاظ کیا ہے، نہ اکابر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا اور نہ ہی اکابر تابعین کا۔ چشم بند کر کے سب پر ایک ہی لاٹھی سے ضرب لگا دی ہے اور ان سب کی دینی حیثیت کو مجروح کر ڈالا ہے۔
(فیا اسفا!!!)

الجواب

آئندہ سطور میں ہم اس طعن کو بطور اختصار کے "فجوۃ" کے نام سے تعبیر کریں گے۔

عہد عثمانی کے متعلق "فجوۃ" کا نظریہ جو اعتراض میں پیش کیا گیا ہے، اس کے غلط ہونے اور خلاف واقعہ ہونے پر ہم بطریق ذیل کلام چلانا چاہتے ہیں۔ قارئین کرام اس پر غور فرمائیں اور انصاف کے ساتھ نتائج خود قائم کریں:

(۱) ایک تو یہ نظریہ آیات قرآنی کے تقاضوں کے خلاف پایا جاتا ہے۔

(۲) دوسرا یہ تخیل فرامین نبوی (علی صاحبہا الصلوٰہ والسلام) کے متعارض ہے اور ان کے ساتھ اس کی کوئی مطابقت نہیں پائی جاتی۔

(۳) تیسرا یہ نظریہ دور عثمانی کے دوسرے تاریخی حقائق کے بھی متضاد ہے اور اس دور کے واقعات برملا اس کی تکذیب اور تردید کرتے ہیں۔

(۴) چوتھا۔ امت مسلمہ کے اکابر علماء کے صفائی کے بیانات جو خلافت عثمانی کی صحت کے حق میں موجود ہیں وہ "فجوۃ" والے نظریات کے برعکس ثابت ہوتے ہیں، ان کے ساتھ کوئی موافقت کی صورت نہیں ہو سکتی۔

مندرجہ بالا چیزیں ہم ایک ترتیب سے ناظرین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں جو مسئلہ ہذا حل کرنے میں مفید ہوں گی۔

تنبیہہ

جن احباب کو علم نہیں ہے، ان کی آگاہی کے لیے واضح کیا جاتا ہے کہ مصر میں جماعت "اخوان المسلمین" کے رئیس وامیر سید قطب مرحوم نے "العدالتہ الاجتماعیہ" میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد پر تبصرہ کرتے ہوئے مندرجہ بالا جملہ درج کیا ہے، چونکہ یہ تبصرہ واقعات کے اعتبار سے غلط ہے، اس بناء پر یہ چند سطور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے حق میں بطور صفائی کے اور دفاع کے مرتب کی ہیں۔ (مؤلف)

آیاتِ قرآنی

اس سلسلہ میں قرآن مجید کی بہت سی آیات ذکر کی جا سکتی ہیں، لیکن فی الحال ہم آیات ذیل سامنے رکھتے ہیں:

... والزمھم کلمہ التقوی وکانوا احق بھا واھلھا... الخ

(سورۃ فتح، پ۲۶)

واقعہ حدیبیہ میں جو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم شامل و شریک تھے، ان میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا شمول یقینی ہے اور مسلمات میں

سے ہے۔ حق تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور شاملین حدیبیہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے حق میں اس موقعہ پر اپنی سکینہ اور اطمینان نازل فرمایا اور ان صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے لیے پرہیزگاری کا کلمہ (کلمتہ التقویٰ) ثابت کر دیا اور اس نے ان کو تقویٰ کا اہل بنا دیا۔ پس وہ صحیح طور پر اس کے سزاوار و حقدار تھے۔

چنانچہ آیت ہذا سے یہ بات واضح ہوئی کہ شاملین حدیبیہ کی صفات میں اللہ تعالیٰ نے پرہیزگاری لازم کر دی تھی اور یہ اصحاب پرہیزگاری کی صفت کے زیادہ حقدار اور اہل تھے تو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی صفات میں بھی پرہیزگاری اور تقویٰ کا پایا جانا ثابت ہوا اور یہ صفات ان حضرات کے لیے دائمی تھیں وقتی نہیں تھیں۔

اب اگر کوئی شخص ان اکابر کے حق میں یہ تاثر قائم کرے کہ ان لوگوں نے اپنی زندگی کے کسی مرحلہ میں پہنچ کر ضوابط شرعی اور اسلامی قواعد کو ترک کر دیا اور دین کے برخلاف ایک بے دین معاشرت اختیار کر لی تھی تو یہ نظریہ مندرجہ بالا قرآنی آیت کے تقاضوں کے برعکس ہو گا' کیونکہ یہ حضرات کسی مرحلہ میں بھی تقویٰ اور پرہیزگاری کی صفات سے دست کش نہ ہوئے اور انہوں نے اپنی زندگیاں ہرگز خلاف شریعت نہیں گزاریں بلکہ اس پر ہمیشہ ثابت قدم رہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت فرمودہ صفت "کلمہ التقویٰ" اسی چیز کی متقاضی ہے۔

فلہذا ان حضرات کے متعلق دینی احکام و شرعی نظام سے اعراض کرنے اور اسے عملی زندگی میں ترک کر دینے کا نظریہ صفت تقویٰ کے زائل ہو جانے کے مترادف ہے' حالانکہ فرمان خداوندی کی روشنی میں ان حضرات سے صفت اتقاء کا زوال ہرگز درست نہیں۔ اس وجہ سے کہ یہ ان کی دائمی صفت ہے۔ کوئی وقتی و عارضی صفت نہیں۔

(۲) نیز اللہ تعالیٰ نے واقعہ حدیبیہ کے دوران جو ارشادات فرمائے ہیں' ان میں اس نے اپنے پیغمبر کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی صفات اور ان کے اصحاب رضی

اللہ تعالیٰ عنہم اور ساتھیوں کی صفات اس طرح ذکر کی ہیں۔

...محمد رسول الله والذین معه اشداء علی الکفار رحماء بینهم تراهم رکعا سجدا یبتغون فضلا من الله ورضوانا... الخ۔
(سورۃ فتح، پ۲۶)

یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں، وہ کافروں پر سخت ہیں اور اپنوں کے درمیان مہربان ہیں۔ تو دیکھئے گا ان کو رکوع کرنے والے اور سجدہ کرنے والے۔ پھر ان کے کمال اخلاص کا بیان فرمایا اور ریا و نمود کی ان سے نفی کرتے ہوئے فرمایا کہ (یہ لوگ) اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی خوشنودی اور رضامندی کو طلب کرتے ہیں اور یہ چیز ان کا شیوہ ہے۔

آیت ہذا کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور خصوصاً وہ حضرات جو واقعہ حدیبیہ میں شامل تھے، وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور رضامندی طلب کرتے ہیں۔ گویا خداوند کریم نے ریا و نمود و نمائش کی نفی کرتے ہوئے ان کے خلوص نیت کی گواہی دی ہے اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ مذکورہ حضرات (والذین معه) میں یقیناً داخل ہیں۔ فلہذا آنموصوف رضی اللہ عنہ ہمیشہ ان صفات کے ساتھ موصوف تھے اور اپنی زندگی کے تمام مراحل میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی طلب کرتے تھے۔ پھر یہ اپنی خلافت کے دوران میں بھی اس آیت کے مصداق تھے اور ان صفات حمیدہ کے حامل تھے۔

بناء بریں حالات انہوں نے اپنے عہد خلافت میں خداوند کریم کی رضا کے برعکس اور جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمودات کے خلاف کوئی عمل درآمد نہیں کیا اور نظام شرعی کو ہرگز ترک نہیں فرمایا۔ بلکہ خدا تعالیٰ اور جناب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے احکامات کے تحت تمام نظم خلافت قائم رکھا۔

لہٰذا "فجوۃ" کا اعتراض آنموصوف رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت پر وارد کرنا کسی صورت میں صحیح نہیں کیونکہ یہ اعتراض تو اس شہادت اور گواہی کے برخلاف ہے جو قرآن مجید نے ان کے حق میں مخلصانہ اعمال و مومنانہ کردار پر دی ہے۔ معترض لوگوں نے اعتراض کرتے وقت اس قرآنی گواہی کو پس پشت ڈال دیا ہے اور اس کا کچھ لحاظ نہیں کیا ہے۔ (ترجیح)

(۳) مفسرین کے عام قول کے مطابق مندرجہ ذیل آیت اہل حدیبیہ کے حق میں وارد ہے اور اس میں فرمایا کہ

... کزرع اخرج شطاه فازره فاستغلظ فاستویٰ علی سوقه... الخ۔ (سورۃ الفتح، پارہ ۲۶)

اس فرمانِ خداوندی میں دینِ اسلام کی ترقی کے مسئلہ کو کھیتی کے ساتھ تشبیہ دے کر سمجھایا گیا ہے یعنی وہ مثل ایک کھیتی کے ہے جس نے اپنا اکھوا نکالا پھر اس کو مضبوط کیا اور پھر وہ موٹا ہوا اور ڈنڈی کے بل کھڑا ہو گیا۔ الخ۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ

(۱) صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی دینی ترقی یقیناً ہو گی اور بتدریج ہو گی جس طرح کہ کھیتی کی نشوونما بتدریج ہوتی ہے۔

(۲) اور یہ ترقی منتہائے کمال تک پہنچے بغیر نہیں رکے گی۔

(۳) نیز یہ ترقی علی الاتصال ہو گی، درمیان میں سکون یا وقفہ نہیں ہو گا اور نشوونما کا تسلسل نہیں ٹوٹے گا۔ جس طرح کہ کھیتی کی ترقی کی حالت اپنے کمال تک پہنچنے میں مسلسل ہوتی ہے۔

اندریں حالات معترض احباب کے نظریات کو اگر پیش نظر رکھا جائے اور عہد عثمانی کو اسلامی نظام سے یکسر خالی تسلیم کر لیا جائے اور ان کے ایامِ خلافت میں قوانین اسلامی کو مفقود اور قواعد شرعی کو نابود مان لیا جائے تو قابل غور بات یہ ہے کہ دینِ اسلام کی تدریجاً ترقی کی تمثیل جو ارشادات خداوندی میں ذکر کی گئی ہے، اس کی

مثال اور ممثل لہ میں مشابہت کس طرح صحیح ہو گی؟؟ اور مماثلت کس طرح قائم ہو گی؟؟

معترض دوست فرماتے ہیں کہ صدیقی و فاروقی ادوار میں اور مرتضوی عہد خلافت میں صحیح اسلامی نظام تھا لیکن درمیان میں عہد عثمانی میں شرعی نظام اور قواعد اسلامی ختم کر دیئے گئے تھے، حالانکہ قرآنی تمثیل جو کھیتی کے ساتھ دی گئی ہے' اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی تدریجاً ترقی مسلسل و لگاتار پائی جائے' اس میں فطور اور وقفہ نہ آنے پائے۔

فلہذا عہد عثمانی کے متعلق "فجوۃ" کا نظریہ قائم کرنا ہرگز درست نہیں' اس وجہ سے کہ سابق تمثیل کے ساتھ اس کی مطابقت قائم نہیں رکھی جا سکتی اور مفسرین نے اس مثال کے متعلق اس طرح بیان کیا ہے کہ

... وھذا مثل ضربہ اللہ تعالی لبدا الاسلام وترقیہ فی الزیادہ الی ان قوی و استحکم...الخ۔

یعنی اسلام کی ابتدائی حالت پھر اس کا ترقی کرنا اور زیادہ ہو جانا یہاں تک کہ وہ قوی اور مضبوط ہو جائے' اس کی مثال خداوند کریم نے بیان فرمائی ہے۔

(تفسیر مدارک التنزیل ص ۶۴' جلد خامس تحت الآیہ' سورۂ فتح' طبع لاہور)

اور جب عہد عثمانی میں اسلام کی ترقی کو مفقود مان لیا جائے تو اس کا قوی ہونا اور مستحکم ہونا تو نہ پایا گیا' پس اس وجہ سے تمثیل ہذا درست نہیں بن سکتی تو معلوم ہوا کہ "فجوۃ" کا نظریہ قرآنی ارشادات کے مطابق قطعاً صحیح نہیں ہے' اس کو درست تسلیم کر لینے سے آیات خداوندی کی (معاذ اللہ) تکذیب لازم آتی ہے۔

احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اگرچہ اس سلسلہ میں بیشتر احادیث پائی جاتی ہیں' تاہم اس مقام میں صرف چند روایات پیش کی جا رہی ہیں' جن کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جائے گی کہ جو

اعتراض بعض لوگ "فجوۃ" کے کلمہ سے عہد عثمانی پر وارد کرتے ہیں وہ حقیقتاً درست نہیں اور اعتراض کرنے والوں نے اپنے زعم و گمان سے اسے تجویز کیا ہے اور یہ ان کا نظریہ روایات صحیحہ کے بالکل متعارض ہے۔

(۱) چنانچہ احادیث میں مروی ہے کہ --- حضرت انس رضی اللہ عنہ (بن مالک) کہتے ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب بیعت رضوان کا حکم دیا تو اس وقت حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ آں جناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے قاصد کی حیثیت سے مکہ مکرمہ گئے ہوئے تھے۔ جب لوگ بیعت کرنے لگے تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عثمان رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کام میں گئے ہوئے ہیں (اور ان کا بھی بیعت رضوان میں شامل ہونا لازم ہے) اس لیے جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا ایک ہاتھ مبارک اپنے ہی دوسرے ہاتھ مبارک پر رکھتے ہوئے فرمایا کہ یہ بیعت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے ہے۔

پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہاتھ مبارک جو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے بیعت کے لیے تھا، وہ دوسرے لوگوں کے ہاتھوں سے جو اپنے لیے تھے، بدرجہا بہتر تھا۔

...عن انس قال لما امر رسول الله صلى الله عليه وسلم ببيعه الرضوان كان عثمان رسول رسول الله صلى الله عليه وسلم الى مكه- فبايع الناس- فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان عثمان رضی اللہ عنہ فى حاجه الله وحاجه رسوله فضرب باحدى يديه على الاخرى- فكانت يد رسول الله صلى الله عليه وسلم لعثمان رضی اللہ عنہ خير امن ايديهم لانفسهم-

(۱) رواہ الترمذی۔

(۳) مشکوٰۃ شریف ص ۵۶۲' بحوالہ بخاری از ابن عمر رضی اللہ عنہ، تحت مناقب عثمان رضی اللہ عنہ، الفصل الثالث۔

روایت ہذا کو متعدد محدثین نے ذکر کیا ہے۔ اس میں مندرجہ واقعہ بالکل صحیح ہے۔ اس روایت سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوئی کہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے دست مبارک کو عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ قرار دیا۔ یہ چیز جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں کمال فضیلت اور برکت کی چیز ہے۔ پس اس ہاتھ سے دین کے خلاف احکام کا صدور و نفاذ کیسے ہو سکتا ہے؟؟

نیز سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا بیعت رضوان میں شامل و شریک ہونا بھی بالیقین پایا گیا۔ پھر شاملین بیعت کے لیے خداوند کریم کی طرف سے جو بشارتیں رضوان وغیرہ (لقد رضی اللہ عن المومنین... الخ سورۃ فتح) کی مذکور ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی اس کے صحیح مصداق ہیں اور ان کے اہل ہیں۔

فلہذا جس شخصیت کے حق میں یہ فضائل اور بشارتیں پائی جائیں' اس کے متعلق اس طرح کے نظریات قائم کرنا کہ اس نے اپنے دور خلافت میں اسلام کے قواعد ترک کر دیئے اور دینی ضوابط کو چھوڑ دیا اور ان کے ایام خلافت اسلامی قانون سے یکسر خالی پائے گئے--- بالکل غلط ہیں اور نصوص سے ثابت شدہ بشارتوں اور فضیلتوں کے برعکس ہیں۔ ایسے نظریات کو کوئی عقل مند اور ذی ہوش آدمی تسلیم نہیں کر سکتا۔

جس نے اس نوع کے تصورات حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسی شخصیت کے حق میں قائم کیے ہیں' وہ یقیناً حسد و کینہ و عناد کا شکار ہے اور ان حضرات سے سوء ظنی رکھنے کا مریض ہے۔

(۴) اور مشہور صحابی حضرت جابر بن سمرۃ کہتے ہیں کہ

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک موقعہ پر خطبہ میں دیگر فرمودات کے علاوہ ایک یہ بات بھی بطور پیش گوئی کے ارشاد فرمائی کہ: یہ ہمارا دین

منقضی اور ختم نہیں ہوگا، حتیٰ کہ اس میں بارہ خلیفے گزریں گے--- الخ۔

...ان ھذا الامر لا ینقضی حتی یمضی فیھم اثنی عشر خلیفہ---الخ-

اور بعض دیگر روایات میں اس طرح منقول ہے کہ: یہ دین اسلام ہمیشہ غالب اور مضبوط رہے گا حتیٰ کہ بارہ خلیفے گزریں--- اور وہ سب قبیلہ قریش سے ہوں گے--- الخ۔

...لا یزال ھذا الدین عزیزا منیعا الی اثنا عشر خلیفہ... کلھم من قریش... الخ-

(مسلم شریف ص ۱۱۹ جلد ثانی، کتاب الامارۃ باب الناس تبع لقریش)

اس فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں یہ چیز واضح ہوتی ہے کہ قریش سے متعدد خلیفے یقیناً آئیں گے اور ان کے دورِ خلافت میں دینِ اسلام غالب رہے گا اور منقضی و منقطع نہیں ہوگا۔

اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یقیناً قریش کے ان خلفاء میں سے تیسرے خلیفہ راشد ہیں۔ پس ان کے دورِ خلافت میں بشارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق دینِ اسلام یقیناً غالب اور مضبوط رہے گا اور اس میں نظامِ اسلام جاری رہے گا۔

بنابریں خلیفہ ثالث سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں دینِ اسلام کے قواعد و ضوابط یقیناً قائم تھے اور یہ دور نظامِ اسلام سے ہرگز خالی نہیں تھا۔

پس جن لوگوں نے آنموصوف رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کے متعلق "فجوة" کا نظریہ قائم کیا ہے۔ وہ ہرگز صحیح نہیں کیونکہ احادیث صحیحہ کے تقاضوں کے اعتبار سے اس دور میں دین اسلام غالب رہنے اور نظام اسلام قائم رہنے کی صحیح بشارت موجود ہے۔

(۳) اور حدیث شریف کی بعض صحیح روایات میں یہ فرمان نبوت اس طرح موجود ہے کہ

...عن عرباض بن ساریہ (مرفوعا)... وسترون من بعدی اختلافا شدیدا، فعلیکم لبسنتی وسنہ الخلفاء الراشدین المھدیین وعضوا علیھا بالنواجذ... الخ-

(۱) السنن للدارمی ص۲۵، تحت باب اتباع السنہ، طبع نظامی، کانپور-

(۲) المستدرک للحاکم ص۹۶، جلد اوّل، طبع اوّل دکن-

(۳) السنن الکبریٰ للبیہقی ص۱۱۴، جلد عاشر، طبع اوّل، دکن-

ان روایات کا مفہوم یہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میرے بعد تم شدید اختلاف دیکھو گے اور میرے خلفاء الراشدین کے طریقہ کو لازم پکڑنا اور اپنی داڑھوں کے ساتھ اس کو مضبوطی سے پکڑ رکھنا-

ان فرمودات نبوی ﷺ سے یہ بات واضح ہوئی کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے خلفاء کی اتباع اور اقتداء اہل اسلام پر لازم ہے اور ان کے طریق کو مضبوطی سے پکڑنے کے لیے ارشاد نبوی ﷺ ہے-

ان ارشادات نبوت کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خلفائے نبوی کی خلافت اسلام کے تقاضوں کے عین مطابق ہوگی اور اسلامی شرعی قواعد کے موافق ہوگی- پس ان کی اتباع کرنا اسلام میں لازم ہے اور ان کے طریقوں پر چلنا عین مقتضائے دین ہے- بالفرض اگر ان خلفائے راشدین میں سے ایک خلیفہ (مثلاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان) کے دور میں اسلامی نظام کا ختم ہونا اور اس کا شریعت کے قواعد سے یکسر خالی ہونا تسلیم کر لیا جائے تو اس دور کو لزوم اتباع سے مستثنیٰ کرنا ضروری تھا تاکہ لوگ گمراہی میں نہ پڑ جائیں، مگر ایسا نہیں کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ دور بھی اپنے مقام پر صحیح اور قابلِ اتباع رہا ہے-

(۴) حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کی حقانیت اور صداقت کے حق میں بیشتر روایات پائی جاتی ہیں- ان میں سے ایک روایت یہ بھی ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے:

...عن عائشہ ان النبی ﷺ قال لعثمان یاعثمان ان اللہ مقمصک قمیصا فان ارادک المنافقون علی خلعہ فلا تخلعہ حتی تلقانی' وھذا من الاحادیث الظاھرہ فی خلافتہ الدالہ دلالہ واضحہ علی حقیتھا لنسبہ القمیص فی الحدیث المکنی بہ عن الخلافہ الی اللہ تعالی- (اخرجہ احمد والترمذی وابن ماجہ والحاکم)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ اے عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ! آپ کو اللہ تعالیٰ ایک قمیص پہنائیں گے، اگر منافق لوگ اس قمیص کو تجھ سے اتارنے کا ارادہ کریں تو اسے ہرگز نہ اتارنا حتیٰ کہ تم (آخرت میں) مجھ سے آکر ملاقات کرو۔

(۱) الصواعق المحرقہ لابن حجر المکی ص۱۰۹، تحت الفصل الثانی فی فضائلہ۔

(۲) البدایہ والنہایہ لابن کثیر ص۲۰۷-۲۰۸، ج۷، تحت فضائل عثمانی۔

یہ روایت ان ظاہر روایات میں سے ایک ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کی حقانیت و صداقت پر واضح دلالت کرتی ہیں۔ کیونکہ حدیث مذکور میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے قمیص کا پہنایا جانا مذکور ہے جو خلافت سے کنایہ ہے اور ساتھ ہی حکم ہے کہ اس کو نہ اتارنا۔

مندرجہ بالا روایت کے ذریعے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کی حقانیت برملا ثابت ہوتی ہے اس خلافت حقہ صحیحہ کے حق میں اگر کوئی شخص یہ تخیل قائم کرے کہ یہ خلافت اسلامی قواعد اور شریعت کے ضوابط سے خالی تھی تو یہ تخیل قطعاً غلط ہوگا اور ان روایات صحیحہ کے تقاضوں سے متعارض اور خلاف ہوگا۔

فلہذا "فجوۃ" کے نظریہ کے اعتبار سے جو اعتراض قائم کیا گیا ہے، وہ ان

احادیث صحیحہ کے مفہوم سے متصادم ہے' اس لیے ہرگز درست نہیں۔

عہدِ عثمانی کے چند تاریخی واقعات

اس مقام میں سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت کے چند ایک تاریخی واقعات بھی ہم ناظرین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں' جن سے آنموصوف رضی اللہ عنہ کے عہد کی کیفیت واضح ہوتی ہے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اپنے عوام کے ساتھ برتاؤ اور سلوک معلوم ہوتا ہے' پھر یہ بھی واضح ہو گا کہ اس وقت کس نوع کا انتظام مروج تھا؟؟ اور دینی مسائل کی رعایت کس طرح کی جاتی تھی؟ اور عوام کی اس دور میں کیا حالت تھی؟؟ اور خلیفہ اسلام کا رابطہ ان سے کس طرح کا تھا؟

عمال کے نام ایک مکتوب

(ا) ایک دفعہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عمال (کار پردازوں) کی طرف ایک سرکاری مکتوب ارسال کیا' اس میں لکھا کہ

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو تدبیر حق کے ساتھ پیدا فرمایا۔ پس اللہ تعالیٰ حق بات کے بغیر قبول نہیں کرتا (جس سے) حق لینا ہو۔ حق ہی حاصل کرو اور (جس کو) حق عطا کرنا ہو' حق ادا کرو۔ (کمی بیشی نہ کرو) امانت داری کا خیال رکھو۔ (اس پر قائم رہو--- وفاداری کا خیال رکھو۔ وفا کرو۔ یتیم پر ظلم مت کرو۔ اور معاہد (جس کے ساتھ معاہدہ ہو چکا ہے) کے ساتھ ظلم نہ کرو۔ کیونکہ ظلم کرنے والے کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ خود خصم اور (مقابل) بن جاتے ہیں۔

...اما بعد فان اللہ خلق الخلق بالحق فلا یقبل الا الحق خذوا الحق واعطوا الحق به والامانه الامانه قوموا علیها ولا تکونوا اول من یسلبها فتکونوا شرکاء من

بعدکم الی ما اکتسبتم والوفاء الوفاء لا تظلموا الیتیم ولا المعاھد فان اللہ خصم لمن ظلمھم۔

(تاریخ لابن جریر الطبری ص ۴۴-۴۵، ج ۵، تحت کتب الی عمالہ و ولاۃ والعامۃ سنہ ۲۴ھ، طبع قدیم مصری)

عوام سے خطاب

(۲) ایک دوسرے مقام میں سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی پبلک کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

اے لوگو! جو ترقی اور فروغ تم کو حاصل ہوا ہے، یہ اقتداء اور اتباع کے ذریعے ملا ہے، پس تم کو اس بات سے دنیاداری پھیر نہ ڈالے اور موڑ نہ دے... الخ۔

...اما بعد فانکم انما بلغتم ما بلغتم بالاقتداء والاتباع فلا تلفتنکم الدنیا عن امرکم... الخ۔

(تاریخ لابن جریر الطبری ص ۴۵، ج ۵ تحت کتب عثمان الی عمالہ و ولاۃ والعامۃ سنہ ۲۴ھ، طبع قدیم مصری)

مکتوب مذکور--- اور خطاب ہذا سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے حکام اور عمال کو خصوصی ہدایات فرماتے تھے کہ دوسروں کے حقوق کی ادائیگی اور امانت کی رعایت کی جائے، ان کو ضائع نہ کیا جائے۔ وعدوں کی وفا کی جائے۔ یتامیٰ پر ظلم نہ کیا جائے۔ جن سے معاہدہ ہوچکا ہے، ان سے بدعہدی نہ کی جائے بلکہ وفا کریں۔ کسی شخص سے ظلم کا معاملہ نہ کیا جائے اور تمہیں تمام ترقی اور یہ فروغ اتباع شریعت سے حاصل ہوا ہے۔ اس بات کو ملحوظ رکھیں اور دنیاداری میں پڑ کر اس کو بھلا نہ دیں۔

عمال کے نام ایک دیگر مکتوب

ایک دیگر موقعہ پر سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عمال اور حکام کی طرف ایک مکتوب میں ہدایات تحریر کیں اور اس میں پبلک کی رعایت، حقوق کی ادائیگی اور اس کی خبرگیری کا مضمون لکھا کہ

امابعد! حکام کے لیے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ وہ لوگوں کے حق میں راعی اور نگران ہوں اور یہ حکم نہیں دیا کہ وہ ان کو کاٹنے والے بنیں۔

اور اس امت کے ابتدائی دور کے لوگ محافظ و نگران بنائے گئے ہیں۔ تراش کرنے والے اور کاٹ کھانے والے نہیں بنائے گئے۔ عنقریب زمانہ آئے گا کہ حکام و عمال لوگ کاٹنے والے ہو جائیں گے اور راعی و محافظ نہ رہیں گے۔ جب وہ اس طرح کے ہو جائیں گے تو اس وقت حیاء امانت اور وفا ختم ہو جائے گی۔

نہایت عادلانہ سیرت یہ ہے کہ مسلمانوں کے معاملات اور ان کے حقوق و فرائض پر تم نظر رکھو۔ جو چیزیں ان کے حق میں قابل ادا ہوں، وہ عطا کرو اور جو چیزیں ان سے قابل وصول ہوں ان کو ان سے اخذ کرو۔ پھر اپنی ذمہ داری کی طرف توجہ کرو۔ جو چیز ان کے لیے دینے کی ہے، اس کو دے دو اور جو چیز ان سے لینے کی ہے، وہ وصول کر لو۔ پھر جو دشمن تمہارے سامنے آئے، اس کے ساتھ بھی وفا کا معاملہ کرو۔ (بدعہدی نہ کرو)

...الا وان اعدل السیرہ ان تنظروا فی امور المسلمین وفیما علیھم فتعطوھم مالھم وتاخذوھم بما علیھم ثم تثنوا بالذمہ فتعطوھم الذی لھم وتاخذوھم بالذی علیھم۔ ثم العدو الذی تنتابون فاستفتحوا علیھم بالوفاء۔

(تاریخ لابن جریر الطبری ص۴۴، ج۵، تحت کتب عثمان الی عمامہ و ولاۃ والعامہ، سنہ ۲۴ھ، طبع قدیم، مصری)

فوجی افسروں کے نام مکتوب

(۴) سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہد کے فوجی حکام کے نام جب مکتوب ارسال کیا تو اس میں انہیں ان کی ذمہ داری اور فرائض کا احساس دلاتے ہوئے تحریر فرمایا کہ

امابعد--- تم لوگ اہلِ اسلام کے محافظ و حامی اور مدافعت کرنے والے ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ لوگوں کی خاطر جو (حقوق و فرائض) وضع کیے تھے، وہ ہم سے مخفی نہیں ہیں بلکہ وہ ہمارے جماعتی مشورہ سے ہی متعین ہوئے تھے۔ تم میں سے کسی کی جانب سے بھی اس میں تغیر و تبدل کی اطلاع مجھے نہ ملے ورنہ اللہ تعالیٰ تمہیں متغیر فرما دے گا اور تمہیں تبدیل کر ڈالے گا۔ پس تم اپنے حالات پر نظر رکھو کہ تم کیسی حالت پر ہو؟؟ اور جن باتوں کے متعلق نظر رکھنا اور خیال کرنا اللہ تعالیٰ نے میرے ذمہ کیا ہے، ان کا میں خیال رکھوں گا۔

...اما بعد فانكم حماه المسلمين وزادتهم وقد وضع لكم عمر ما لم يغب عنا بل كان عن ملاء منا ولا يبلغني عن احد منكم تغيير ولا تبديل- فيغير الله ما بكم و يستبدل بكم غيركم- فانظروا كيف تكونون فاني انظر فيما الزمني الله النظر فيه والقيام عليه-

(تاریخ لابن جریر الطبری ص ۴۴، ج۵، تحت کتب عثمان رضی اللہ عنہ ان عمالہ و ولاتہ والعامتہ، ۲۴ھ، طبع قدیم مصری)

(۵) علامہ ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ نے سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے تذکرہ کے تحت لکھا ہے کہ ایک دفعہ آنموصوف رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں شہروں کے والیوں، اسلامی لشکر کے سرداروں، نماز کے اماموں اور بیت المال کے نگرانوں کی طرف ایک سرکاری مکتوب ارسال فرمایا جس میں یہ مضمون درج تھا کہ

خلیفہ وقت تمہیں بہتر کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے منع کرتے ہیں

اور اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کریم کی اطاعت و فرمانبرداری پر برانگیختہ کرتے ہیں اور اتباع سنت کرنے اور بدعات کو ترک کرنے پر ابھارتے ہیں۔

...ثم کتب عثمان بن عفان (رضی اللہ عنہ) الی عمالہ علی الامصار، امراء الحرب والائمہ علی الصلوٰۃ، والا مناء علی بیوت المال یامرھم بالمعروف وینھاھم عن المنکر ویحثھم علی طاعہ اللہ وطاعہ رسولہ یحرضھم علی الاتباع وترک الابتداع۔

(البدایہ والنہایہ لابن کثیرؒ ص۱۴۹، ج۷، تحت تذکرہ خلافۃ امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ، طبع اوّل، قدیم مصری)

قابلِ غور

مندرجہ بالا چند ایک تاریخی حقائق ہیں۔ مورخین نے انہیں عہد عثمانی میں اپنے اپنے موقعہ پر درج کیا ہے اور یہ چند واقعات بطور نمونہ پیش کیے ہیں۔ اس نوع کے تمام واقعات کا استیعاب مقصود نہیں۔ ان پر نظر انصاف کرنے سے صاف طور پر واضح ہو رہا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں مندرجہ ذیل امور پر توجہ کی جاتی تھی اور ان پر عمل درآمد کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔

- مثلاً حق داروں کے حقوق کی رعایت، امانتوں کی رعایت، یتامیٰ کے حقوق کی رعایت۔ جن اقوام سے معاہدہ ہوچکا ہو، ان سے وفا کرنا، بدعہدی نہ کرنا۔
- اتباع شریعت کی ترغیب۔
- حکام اور حکومت کے کارندوں کو ذمہ داری کا احساس دلانا کہ آپ لوگ دین اسلام کی حمایت کریں اور اس کی حفاظت میں مستعد رہیں اور اپنے اپنے فرائض میں کوتاہی نہ کریں۔
- مختصر یہ ہے کہ عہد عثمانی میں اسلامی احکام کا پورا پورا لحاظ رکھا جاتا تھا، اتباع

شریعت کی ترغیب و تلقین کی جاتی تھی۔

○ یہ دور اسلامی نظام سے ہرگز خالی نہیں تھا۔

جن لوگوں نے اس دور کو اسلامی نظام سے خالی قرار دیا ہے۔ ان کا یہ نظریہ تاریخی حقائق کے بالکل برعکس اور متصادم ہے اور تاریخی واقعات اس بات کی ہرگز تائید نہیں کرتے بلکہ اس کی تکذیب کرتے ہیں، فلہذا یہ نظریہ قابلِ تسلیم نہیں۔

اکابرین امت کی طرف سے عہدِ عثمانی کے حق میں صفائی کے بیانات

سابقہ سطور میں عہدِ عثمانی کے چند ایک ایسے تاریخی واقعات ہم نے پیش کیے ہیں، جن میں اعتراض "فجوۃ" کا جواب پایا گیا۔

اب اس اعتراض کے جواب کے لیے اکابرین امت کے بعض بیانات ناظرین کرام کی خدمت میں ذکر کیے جاتے ہیں تاکہ قارئین ان پر بہ نظر انصاف غور فرما سکیں۔ اس طریقہ سے ان پر خوب واضح ہو جائے گا کہ ان اکابرین امت کی صفائی کے بیانات کی روشنی میں "فجوۃ" کا اعتراض کہاں تک درست ہے؟؟ اور اس میں فی نفسہ کیا کچھ صداقت ہے؟؟

(ا) ایک مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان پہلے ملاحظہ کریں... حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ایک شخص میرے پاس آیا۔ اس کی زبان میں ثقل تھا، جلدی سے پوری بات نہیں کر سکتا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق اس نے میرے ساتھ طویل گفتگو کی۔ اس کا مقصد تھا کہ میں بھی اس کی ہمنوائی کر کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی عیب چینی کروں--- جب وہ اپنی ناقدانہ کلام تمام کر چکا تو میں نے کہا کہ سید الکونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیات طیبہ میں ہم لوگ یہ کہا کہتے تھے کہ: سردار امت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں۔ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مقام ہے پھر ان کے بعد عمر رضی اللہ عنہ کا درجہ ہے پھر ان کے بعد

عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، کا رتبہ ہے۔

--- ابن عمر فرماتے ہیں کہ اللہ کی قسم! ہمیں نہیں معلوم کہ عثمان رضی اللہ عنہ، نے کسی شخص کو ناحق قتل کیا ہو یا عثمان رضی اللہ عنہ، نے ایسا کام کیا ہو جس کو گناہِ کبیرہ کہا جا سکے... الخ۔

... قال عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جاءنی رجل فی خلافہ عثمان فکلمنی بکلام طویل یرید ان اعیب علی عثمان رضی اللہ عنہ، وھو امرا فی لسانہ ثقل لا یکاد یقضی کلامہ فی سریع۔ فلما قضی کلامہ قلت قد کنا نقول ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حی افضل امہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر رضی اللہ عنہ، ثم عمر رضی اللہ عنہ، ثم عثمان رضی اللہ عنہ، وانا واللہ! ما نعلمْ عثمان قتل نفسا بغیر نفس ولا جاء من الکبائر شیا... الخ۔

(کتاب التمہید والبیان ص ۱۸۴-۱۸۵ از محمد بن یحییٰ بن ابی بکر، طبع اوّل، بیروت)

مطلب یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، پر اس دور کے ایک معترض کو ابن عمر رضی اللہ عنہ، نے جو جوابات ذکر فرمائے ہیں، ان سے واضح ہوتا ہے کہ

(الف) سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقام و مرتبہ خلافت کے اعتبار سے تیسرا ہے۔ یعنی شیخین رضی اللہ عنہ، کے بعد امت مسلمہ میں ان کا مقام فیصلہ شدہ ہے۔

(ب) حضرت عثمان نے اپنے عہد خلافت میں کسی شخص کو ناحق قتل ہرگز نہیں کیا اور کسی کبیرہ گناہ کے مرتکب بالکل نہیں ہوئے۔ یعنی وہ شرعاً مظالم و معاصی کے مرتکب نہیں تھے اور ان کا کردار صحیح تھا، اسلام کے خلاف ہرگز نہیں تھا۔

(ج) یہ گواہی و شہادت ایک مشہور صحابی نے دی ہے جن کی صداقت اسلام میں مسلم ہے۔ امید ہے ناظرین کرام صفائی کے اس بیان پر غور فرمائیں گے اور خود فیصلہ کریں گے کہ اس عہدِ عثمانی پر "فجوۃ" کا اعتراض کس حد تک درست ہے؟؟

(۴) ابن جریر الطبری اور ابنِ خلدون وغیرہ مورخین نے اس مقام میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت کا ایک واقعہ ذکر کیا ہے جسے صفائی کے بیانات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

اس واقعہ کا اختصار یہ ہے کہ: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں حکام سے متعلق پیش آمدہ شکایات کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے مختلف شہروں میں اکابر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بطور وفد روانہ فرمایا۔ مثلاً محمد بن مسلمہ الانصاری رضی اللہ عنہ کو کوفہ کی طرف، اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو بصرہ کی طرف، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو علاقہ شام کی طرف اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو مصر کی طرف روانہ کیا گیا وغیرہ وغیرہ۔

... فقالوا ایها الناس! ما انکرنا شیئا ولا انکره اعلام المسلمین ولا عوامهم وقالوا جمیعا الامر امر المسلمین الا ان امرائهم یقسطون بینهم ویقومون علیهم... الخ۔

(۱) الفتنہ و وقعہ الجمل لسیف بن عمر الضبی الاسدی، ص۴۹-۵۰، تحت دعوۃ عبداللہ بن سبا۔

(۲) تاریخ لابن جریر الطبری ص۹۹، ج۵، ذکر مسیر من سارا الی ذی خشب من اہلِ مصر، ۳۵ھ۔

(۳) تاریخ ابنِ خلدون المغربی ص۱۰۲۷، ج۲، تحت بدالانتقاض علی عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ، طبع بیروت۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اے لوگو! ہم نے کوئی بُری بات وہاں نہیں دیکھی اور نہ خواص اور نہ عوام نے کوئی مکروہ اور ناپسندیدہ چیز بتلائی ہے اور ان سب نے کہا کہ مسلمانوں کا معاملہ ٹھیک چل رہا ہے۔ ان کے حکام ان میں انصاف کرتے ہیں اور ان پر احکام جاری کرتے ہیں۔

تنبیہہ

اس وفد میں عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ، مصر کی طرف تشریف لے گئے تھے اور انہوں نے اپنی واپسی میں تاخیر کی تھی۔ مورخین لکھتے ہیں کہ وہاں آنموصوف رضی اللہ عنہ، مخالفین عثمان رضی اللہ عنہ، کی باتوں سے متاثر ہو کر کچھ ان کی طرف مائل ہو گئے تھے۔

مقصد یہ ہے کہ اکثریت صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی رپورٹ کو قاعدہ (للاکثر حکم الکل) کے مطابق صحیح تسلیم کیا جائے گا اور ایک علاقہ کی رائے کو ساری مملکت کی صورت حال نہ سمجھا جائے گا۔

حاصل یہ ہے کہ: اکابر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اکثریت کی رپورٹ (بیان) سے واضح ہوگیا کہ عثمانی خلافت کے عہد میں منکرات نہیں تھے۔ عوام و خواص اس دور میں کوئی بُرائی نہیں دیکھتے تھے۔ یہ سارا نظام دین اور شریعت کے ماتحت تھا یعنی اسلامی نظام رائج تھا اور لوگوں میں انصاف قائم کیا جاتا تھا اور اس دور کے عمال و حکام ظالم اور جائر نہیں تھے بلکہ عوام کے ساتھ اچھا سلوک کرتے تھے۔

فلہذا خلافت عثمانی کے دور کے متعلق "فجوۃ" کا نظریہ قائم کرنا کسی صورت میں درست نہیں۔

(۳) سالم بن عبداللہ کا بیان

اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے فرزند سالم بن عبداللہ کا بیان ذکر کیا جاتا ہے جسے مشہور مورخین ابن جریر الطبری وغیرہ نے اپنے اپنے مقام میں درج کیا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب خلیفہ ثالث منتخب ہوئے تو اس دور کی کیفیت بیان کرتے ہوئے سالم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ، کہتے ہیں کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ، نے اپنے دورِ خلافت میں ایک آخری حج کے سوا تمام حج خود کرائے تھے۔

... ان کے ایام میں لوگ امن و سلامتی کے ساتھ تھے اور آنموصوف رضی اللہ عنہ،

کا طریقہ کار یہ تھا کہ:

(۱) ہر موسم حج میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے حکام و عمال کو حاضر ہونے کا فرمان جاری کیا جاتا تھا اور جن لوگوں کو ان سے متعلق کوئی شکایت ہوتی تھی انہیں بھی حاضر ہونے کا حکم دیا جاتا تھا تاکہ ہر دو فریق کی شکوہ شکایت سن کر صحیح فیصلہ کیا جاسکے۔

(۲) تمام شہروں میں لوگوں کی طرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تحریری حکم نامہ ارسال کیا جاتا تھا جس میں درج ہوتا تھا کہ نیکی کا حکم کیا کرو اور برائی سے باز رہا کرو۔

(۳) اور کوئی مسلمان اپنے آپ کو عاجز اور ذلیل خیال نہ کرے۔ میں قوی شخص کے مقابلہ میں ضعیف کا معاون ہوں۔ جب تک کہ اس سے ظلم کا ازالہ نہ ہو جائے۔ (انشاء اللہ)

... عن سالم بن عبدالله قال لما ولی عثمان حج سنواته كلها الا آخر حجه... وامن الناس وكتب فی الامصار ان يوافيه العمال فی كل موسم ومن يشكوهم وكتب الی الناس الی الامصار ان اتمروا بالمعروف وتناهوا عن المنكر ولا يذل المومن نفسه فانی مع الضعيف علی القوی مادام مظلوما... (انشاء الله) الخ-

(تاریخ لابن جریر الطبری ص ۱۳۴ ج ۵، تحت ذکر بعض سیر عثمان رضی اللہ عنہ، سنہ ۳۵ھ)

اور یہی مضمون ابن کثیرؒ نے بہ عبارت ذیل ذکر کیا ہے:

... يلزم عماله بحضور الموسم كل عام ويكتب الی الرعايا من كانت له عند احد منهم مظلمه فليواف الی الموسم فانی اخذ له حقه من عامله-

(البدایہ والنہایہ لابن کثیرؒ ص ۲۱۸ ج ۷، تحت فصل و من مناقبہ--- الخ)

جناب سالم بن عبداللہ کے بیان ہذا سے بھی واضح ہوا کہ خلافت عثمانی میں

مظلوموں کی شکایات کے ازالہ کا باقاعدہ انتظام تھا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے احکام جاری ہوتے تھے اور ہر ضعیف کی تکلیف کو رفع کرنے کا حکم حکام کو دیا جاتا تھا۔

مختصر یہ ہے کہ دین اسلام کے نظم و نسق کے مطابق خلافت قائم تھی۔ پس اس دور کو نظامِ اسلامی سے خالی تصور کرنا انصاف کے سراسر خلاف ہے اور بے جا تعصب پر مبنی ہے۔

(۴) امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ کا بیان (المتوفی ۲۵۶ھ)

مشہور محدث امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی تالیف تاریخ صغیر میں اپنی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ امیرالمومنین حضرت عثمان کا فرمان اور حکم بارہ سال چلتا رہا۔ ان کی خلافت و امارت میں لوگوں نے کوئی بُرائی نہیں دیکھی۔ حتیٰ کہ فاسق (بے دین) لوگ آگئے اور اہلِ مدینہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں نرمی سے کام لیا (یعنی انہوں نے شدت اختیار نہ کی) پس وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔

... قال سمعت الحسن يقول عمل اميرالمومنين عثمان بن عفان ثنتى عشره سنه لا ينكرون من امارته شياءحتى جاءفسقه فداهن والله فى امره اهل المدينه۔

(۱) تاریخ صغیر لامام بخاری رحمتہ اللہ علیہ ص ۳۲، تحت ذکر من مات فی خلافت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ، طبع ہند۔

(۲) تاریخ الاسلام للذہبی ص ۱۳۵، ج ۲، تذکرہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، طبع مصر۔

(۵) ابن العربی المالکی رحمتہ اللہ علیہ کا قول (المتوفی ۵۴۳ھ)

مشہور عالم۔۔۔ ابن العربی المالکی رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے

دورِ خلافت پر بحث کرتے ہوئے اس دور کی کیفیت ذکر کی ہے کہ: حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں کوئی بُرائی نہیں تھی، نہ اوّل دور میں نہ آخر میں اور نہ ہی اس موقعہ پر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے کوئی منکر چیز اور بُرائی صادر ہوئی۔ پھر مخاطب کو خطاب کر کے کہتے ہیں کہ تم کو جو اس موقعہ کی بُری خبریں سنائی جاتی ہیں وہ باطل ہیں، ان کی طرف التفات ہرگز نہ کریں۔

...فلم يات عثمان منكر الا فى الاول الامر ولا فى اخره ولا جاء الصحابه بمنكر وكل ما سمعت من خبر باطل اياك ان تلتفت اليه۔

(العواصم من القواصم ص۶۰ طبع لاہور، سہیل اکیڈمی)

(۶) شیخ المشائخ سیدنا عبد القادر جیلانیؒ (المتوفی ۵۶۱ھ) کا بیان

حضرت شیخ موصوف اپنی مشہور تصنیف "غنیۃ الطالبین" میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے دور کی صفائی پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ امام برحق تھے، یہاں تک کہ وہ شہید کر دیئے گئے اور ان کے عہد میں کوئی ایسی چیز نہیں پائی گئی جس کی وجہ سے ان کو مطعون کیا جا سکے یا ان کی طرف فسق کی نسبت کی جا سکے یا ان کے قتل کا سبب قرار دیا جا سکے۔

اور روافض کی ہلاکت ہو کہ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف بہت کچھ کہا ہے۔

...... فكان (عثمان رضی اللہ عنہ) اماما حقا الى ان مات ولم يوجد فيه امر يوجب الطعن فيه ولا فسقه ولا قتله خلاف ما قالت الروافض تباً لهم۔

(غنیۃ الطالبین مترجم ص۱۴۳، فصل و معتقدون اہل السنہ ... طبع لاہور)

حاصل یہ ہے کہ

مذکورہ بالا ہر سہ اکابر حضرات ؒ کے بیانات بھی خلافت عثمانی کے متعلق آپ نے ملاحظہ کر لیے ہیں۔ ان حضرات نے بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کی صفائی مکمل طور پر پیش کر دی ہے اور واضح کر دیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ایام خلافت میں دینِ اسلام کے مطابق نظم قائم تھا اور اس میں شرعاً کوئی بُرائی نہیں پائی جاتی تھی۔

نوٹ ضروری

ناظرین کرام کی خدمت میں اطلاعاً عرض ہے کہ "فجوۃ" کے اعتراض کے جواب میں جو ہم نے اکابرین کے بیانات پیش کیے ہیں، ان میں بیشتر وہ حوالہ جات ہیں جو قبل ازیں ہماری تالیف "اقربا نوازی" کے آخر میں بیان مراحل کے عنوان کے تحت مذکور ہو چکے ہیں، یہاں ایک دوسرے مقصد کے لیے ان کو دوبارہ ذکر کیا ہے۔

"بحث ہذا میں آخری کلمات"

ماقبل میں "فجوۃ" کے اعتراض کے جواب میں ہم نے چند چیزیں تحریر کی ہیں۔ معترضین کی طرف سے "خلافت راشدہ" کے نظام کو ناکام ظاہر کیا گیا۔

اس طعن کی سنگینی کو اہلِ علم اور اہلِ دین حضرات ہی خوب سمجھتے ہیں۔ ایک عام شخص شاید اس طعن کی مضرت اور قباحت کا پوری طرح ادراک نہ کر سکے۔

سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ایامِ خلافت کی صداقت و حقانیت اور ان کی صفائی میں چند کلمات پیش کیے ہیں اور اس سلسلہ میں آیات قرآنی، احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، اس دور کے تاریخی حقائق اور اکابرین امت کے بیانات کو باحوالہ ذکر کیا ہے۔

جن لوگوں نے یہ اعتراض پیدا کیا ہے۔ انہوں نے مذکورہ بالا تمام امور کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے اپنے خالص "قبائلی تعصب" کا اظہار کیا ہے۔

اب ہم ناظرین کرام کو دعوت انصاف دے کر عرض کرتے ہیں کہ پیش کردہ معروضات پر نظر غائر فرمائیں۔ کیا ان امور کی روشنی میں اس اعتراض کے تجویز کرنے کی کوئی گنجائش ہے؟؟ یا اس طعن میں حبہ بھر صداقت کا کوئی پہلو نظر آتا ہے؟؟

"خاندانی عناد اور قبائلی تعصب" سے دُور رہ کر آپ اپنی خداداد فہم و فراست سے خود فیصلہ فرما سکتے ہیں... واللہ یھدی من یشاء الی الصراط المستقیم۔

وفات سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مخالفین روافض وغیرہم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد آنموصوف رضی اللہ عنہ کے جنازہ اور دفن وغیرہ کے متعلق ایسی روایات ذکر کی ہیں جن پر نظر کرنے سے ایک عام آدمی سخت پریشان ہوتا ہے۔

ان روایات میں ان لوگوں نے یہ بات ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کی شہادت کے بعد بغیر حفاظت کے چھوڑ دیا گیا۔ ان کو کسی نے غسل اور کفن نہیں دیا اور انہیں تین دن تک دفن نہیں کیا' ایسے ہی ویرانہ میں پڑے رہے۔ بعد میں بعض لوگوں نے انہیں خون آلود کپڑوں سمیت حش کوکب میں زیر زمین کر دیا۔

الجواب

جواب میں پہلے یہ چیز ذکر کر دینا بہت ضروری ہے کہ دور اول کی تاریخ مرتب کرنے میں بعض مورخین نے بڑا غلط کردار ادا کیا ہے اور اہل اسلام کے اکابر حضرات کے اہم واقعات کو توڑ موڑ کر پیش کیا ہے اور ان کو ایسی صورت میں ذکر کیا ہے کہ ان سے کئی قسم کے مطاعن اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً:

(۱) محمد ابن جریر الطبری (صاحب تاریخِ طبری)
(۲) ابن قتیبہ (صاحب کتاب الامامتہ والسیاستہ)
(۳) احمد بن اعثم کوفی (صاحب تاریخ اعثم کوفی)
(۴) میر خواند صاحب کتاب "روضتہ الصفاء" وغیرہ وغیرہ مورخین نے اپنی تالیفات میں بغیر تحقیق کے ہر قسم کا مواد بھر دیا ہے۔

ان میں سے تاریخ طبری تو رطب و یابس اور صحیح و سقیم ہر قسم کی روایات کا کشکول ہے جبکہ باقی مذکورہ مورخین خالص شیعہ ہیں اور انہوں نے اپنے مسلک رفض و تشیع کی تائید میں ایک جانبدارانہ کردار ادا کیا ہے۔

ان لوگوں نے اکابر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اس مقام و مرتبہ کا کچھ لحاظ نہیں کیا جو انہیں کتاب و سنت کے ذریعہ حاصل ہے اور تاریخ کی روایات میں ایسا مواد بھی موجود ہے جو ان اعتراضات اور مطاعن کے جواب کے لیے کافی ہے لیکن طاعنین اس کو نظر انداز کر کے صرف قابل اعتراض روایات کو پیش نظر رکھتے ہیں اور اس موقعہ کے کوائف کو یہ لوگ اپنے نظریات کے مطابق مرتب کرتے ہیں۔ یہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے خلاف نفرت پیدا کرنے کی ایک قابلِ افسوس سعی ہے۔

اس گزارش کے بعد اب ہم اس کے مقابل میں تاریخ و حدیث سے وہ روایات پیش کرتے ہیں جن میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے متعلق اس موقعہ کے صحیح حالات معلوم ہوسکتے ہیں۔

چنانچہ حضرت عثمان کے سوانح مرتب کرنے والوں نے ذکر کیا ہے کہ: جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوگیا تو اس کے بعد آپ کے گھر والوں میں سے چند لوگ اور مزید چند افراد مثلاً حضرت زبیر بن العوام، حضرت حسن بن علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ، ابو جہم بن حذیفہ، مروان بن الحکم وغیرہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی میت کو اسی روز مغرب اور عشاء کے درمیان گھر سے جنازہ کے لیے باہر لائے اور مقام حش کوکب

(جو مقامِ بقیع کے قریب ایک باغ تھا) کے پاس لائے اور بقول بعض جبیر بن مطعم یا حکیم بن حزام یا مروان بن الحکم نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور ایک قول کے مطابق حضرت زبیر بن العوام نے نماز جنازہ پڑھائی- (اور آپ وہیں دفن کر دیئے گئے)

(۱) کتاب التمہید والبیان فی مقتل الشہید عثمان رضی اللہ عنہ، ص ۱۴۲ طبع بیروت-

(۲) خلیفہ بن خیاط نے بھی جنازۂ عثمانی کا ذکر کیا ہے (تاریخ خلیفہ بن خیاط ص ۱۵۵-۱۵۶ جلد اوّل، طبع اوّل، عراق-

(۳) اور امام احمدؒ نے اس مسئلہ کو اپنے مسند میں اس طرح ذکر کیا ہے کہ

... ثنا عبدالرزاق ثنا معمر عن قتادہ قال صلی الزبیر علی عثمان رضی اللہ عنہ ودفنہ وکان اوصی الیہ-

(مسند لامام احمدؒ بحاشیہ منتخب کنز العمال ص ۷۴، جلد اول، تحت من اخبار عثمان رضی اللہ عنہ)

یعنی قتادہ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور ان کو دفن کیا- کیونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آنموصوف رضی اللہ عنہ کو اس کی وصیت فرمائی تھی- یہ روایت محدثین نے بہتر سند کے ساتھ اپنی حدیث کی کتابوں میں ذکر کی ہے- نیز حافظ ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ نے اس مقام میں درج ذیل روایت ذکر کی ہے کہ

...قیل بل دفن من لیلتہ ثم کان دفنہ ما بین المغرب والعشاء خفیہ من الخوارج وقیل بل استوذن فی ذالک بعض روسائھم- فخرجوا بہ فی نفر قلیل من الصحابہ فیھم حکیم بن حزام و حویطب بن عبدالعزی

یعنی اسی رات (جمعہ و ہفتہ کی درمیانی شب) باغیوں سے بچاؤ کر کے مغرب اور عشاء کے درمیان (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کو دفن کیا گیا- بعض نے کہا ہے کہ باغیوں کے بعض رؤساء سے اذن طلب کر کے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی میت کو لوگ باہر لائے- بعض صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم مثلاً حکیم بن حزام، حویطب بن

وابوجهم بن حذيفه ونيار بن مكرم الاسلمی وجبير بن مطعم وزيد بن ثابت وكعب بن مالك وطلحه والزبير وعلی بن ابی طالب وجماعه من اصحابه ونسائه منهن امراتاه نائله (بنت الفرافصته) وام البنين بنت عبدالله بن حصين وصبيان... وجماعه من خدمه حملوه علی باب بعد ما غسلوه وكفنوه وزعم بعضهم انه لم يغسل ولم يكفن والصحيح الاول-

عبدالعزیٰ، ابو جہم بن حذیفہ، نیار بن مکرم الاسلمی، جبیر بن مطعم، زید بن ثابت، کعب بن مالک، طلحہ، زبیر اور علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس موقعہ پر شامل و حاضر تھے اور ان کے ساتھیوں کی ایک جماعت اور ان کی عورتوں میں سے حضرت نائلہ اور ام البنین اور فرزند بھی شامل تھے... حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خدام کی ایک جماعت آنموصوف رضی اللہ عنہ کو غسل و کفن کے بعد اٹھا کر دروازہ پر لائی اور بعض کا خیال ہے کہ ان کو غسل و کفن نہیں دیا گیا لیکن (یہ بات صحیح نہیں) بلکہ اول بات صحیح ہے (کہ آنموصوف رضی اللہ عنہ کو غسل دیا گیا اور کفن پہنایا گیا)

(البدایہ والنہایہ لابن کثیرؒ ص۱۹۱ ج۷، نیز تاریخ المدینہ المنورہ لابن شبہ ص۱۲۴۰-۱۲۴۱ جلد رابع میں بھی یہ مسئلہ اسی طرح درج ہے)

اور تاریخ طبری جو رطب و یابس اور صحیح و سقیم روایات کا مجموعہ ہے اس میں بھی درج ذیل روایت مذکور ہے کہ

...خرج مروان حتی اتی دار عثمان رضی اللہ عنہ فاتاه زيد بن ثابت و طلحه بن عبيد الله وعلی والحسن وكعب بن مالك وعامه من ثم من اصحابه فتوا

حاصل یہ ہے کہ مروان، زید بن ثابت، طلحہ، علی بن ابی طالب، حسن بن علی، کعب بن مالک اور بھی جو لوگ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھیوں میں سے تھے، عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے

فی الی موضع الجنائز صبیان ونساء فاخرجوا عثمان رضی اللہ عنہ فصلی علیه مروان ثم خرجوا به حتی انتهوا الی البقیع فدفنوه فیه مما یلی حش کوکب۔ (۱) تاریخ طبری ص ۱۴۴، ج ۵، تحت ذکر الخبر عن الموضع الذی دفن فیه عثمان رضی اللہ عنہ۔ (۲) الفتنة ووقعة الجمل تالیف سیف بن عمرو الضبی الاسدی ص ۸۴، تحت دفن عثمان، طبع بیروت)

مکان پر پہنچے اور کچھ لڑکے اور عورتیں بھی (جنازہ کے لیے) آ ملے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گھر سے باہر لائے۔ مروان بن الحکم نے نماز جنازہ پڑھائی اور اس کے بعد یہ تمام احباب جنازہ کو اس مقام میں لائے جو بقیع کے قریب تھا اور وہاں دفن کر دیا (یعنی اس مقام کو حش کوکب کے نام سے ذکر کرتے ہیں)

تاریخ شہادت

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کی تاریخ اٹھارہ ذوالحج ۳۵ھ بروز جمعہ --- موافق ۶۵۵ء ہے۔

رفع اشتباہ

یہاں یہ بات بظاہر محل اشتباہ ہے کہ تاریخ طبری کی اس مقام کی عام روایات جن سے معترضین اعتراض پیدا کرتے ہیں ان کو نظر انداز کر کے مذکور بالا روایات کو لیا گیا ہے تو معلوم ہونا چاہیے کہ اس سلسلہ میں اس قاعدہ کی رعایت مقصود ہے جو علماء نے لکھا ہے کہ

... واذا اختلف کلام امام فیوخذ ما یوافق الادله الظاهره ویعرض عما

یعنی جب ایک مسئلہ میں کسی امام کے کلام میں اختلاف پایا جائے تو جو ظاہر دلائل کے موافق کلام ہو، اس کو اخذ کیا جائے گا

خـالـفـهـا۔ اور جو اس کے خلاف کلام ہو اس سے اعراض کیا جائے گا۔

اس قاعدہ کی روشنی میں طبری کی جو روایات قواعد شرعی سے مطابقت رکھتی ہیں اور دیگر اکابر علماء اور مورخین کے بیانات کے موافق ہیں، ان پر اعتماد کیا جائے گا اور جن روایات سے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر اعتراض پیدا ہو، ان کو ترک کر دیا جائے گا۔

(۱) الزواجر لابن حجر المکی ص ۲۸، تحت الکبیرہ الاولیٰ الشرک بحث ایمان و کفر فرعون، طبع مصر۔

(۲) ردالمحتار للشامی ص ۳۱۷، جلد ثالث، تحت توبہ الباس مقبولہ۔۔۔ الخ باب المرتد)

حاصل بحث یہ ہے کہ

اگرچہ اس مسئلہ میں مورخین نے کئی قسم کی بے سروپا روایات نقل کی ہیں، تاہم بعض احادیث کی روایات اور اہلِ تاریخ کے عمدہ بیانات مسئلہ ہذا کی وضاحت کے لیے موجود ہیں (جیسا کہ سابقہ سطور میں ان کو مختصراً نقل کیا ہے)

ان میں مذکور ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اسی روز دفن کیا گیا یعنی جمعہ کے روز عصر کے وقت باغیوں نے آنجناب رضی اللہ عنہ کو ظلماً شہید کیا تھا اور اپنے ظلم و ستم کے زور کی وجہ سے دفن کرنے سے بھی مانع ہوئے تھے لیکن حالات کی برہمی اور شدید رکاوٹوں کے باوجود بعض اکابر حضرات (مذکورہ بالا) نے اسی روز رات کو (شب ہفتہ) کو دفن کا انتظام کیا۔ غسل و کفن دفن حسب دستور کیا گیا اور صلوٰۃ جنازہ بھی ادا کی گئی اور نمازِ جنازہ میں شامل ہونے والے حضرات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ، وغیرہم کا ذکر روایات میں موجود ہے اور حوالہ جات مندرجہ بالا اس بات پر شاہد ہیں۔ اعتراض پیدا کرنے والے لوگوں نے خیانت سے کام لیا ہے کہ اپنے مطلب کے موافق روایات کو لے لیا اور جن روایات سے دفاع ہو سکتا تھا اور مطاعن کے جواب پر مشتمل تھیں، ان کو ترک کر دیا۔

تنبیہہ

مسئلہ ہذا کو ہم نے قبل ازیں اپنی تالیف (رحماء بینھم حصہ سوم عثمانی) ص ۱۹۰ سے ص ۱۹۴ تک مفصل اور باحوالہ درج کر دیا ہے۔ تفصیلات وہاں ملاحظہ فرما کر اطمینان حاصل کر سکتے ہیں اور یہاں ہم نے بقدرِ ضرورت اسے ذکر کیا ہے۔

اختتامی گزارش!!

...... حضرت سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر معترضین نے متعدد طعن قائم کیے ہوئے ہیں، ان کی ایک طویل فہرست تیار کرتے ہیں۔

(۱) بعض مطاعن تو یہ ہیں کہ حضرت عثمان نے اپنے اقارب (ولید بن عقبہ، سعید بن العاص، عبداللہ بن عامر، عبداللہ بن ابی سرح، مروان بن الحکم وغیرہ) کو والی و حاکم بنایا، یہ لوگ اس منصب کے اہل نہیں تھے، نالائق اور غلط کار تھے۔

(۲) اور اسلامی بیت المال سے اموالِ کثیرہ ناجائز طریقہ سے اپنے اقارب میں تقسیم کر دیئے۔

(۳) اور طرید رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (حکم بن العاص) کو واپس مدینہ بلالیا۔

...... ان کے جوابات ہم نے قبل ازیں اپنی تالیف (مسئلہ اقربا نوازی) میں تفصیلا درج کر دیئے ہیں۔

...... مذکورہ مطاعن کے علاوہ ہم نے بارہ (۱۲) عدد اہم اعتراضات کے جوابات گزشتہ صفحات پر پیش کیے ہیں، ان پر انصاف کی نظر اگر ڈالی گئی تو انشاء اللہ موجب ازالہ شبہات ہوں گے۔ (واللہ المستعان)



فصل چہارم
مختلف مطاعن کے جوابات

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم
"معیارِ حق اور مدارِ دین" ہیں

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے معیارِ حق اور مدارِ دین ہونے کے متعلق بعض لوگوں نے جو اپنی فکر خام اور ناقص رائے کی بنا پر تردد کیا ہے، اس کے متعلق چند چیزیں پیش کی جاتی ہیں۔

ان لوگوں کے خیال میں "معیارِ حق" صرف پیغمبر علیہ الصلوۃ والتسلیم کی ذات ہے اور مدار دین بھی صرف ایک ہی شخصیت ہے لیکن پیغمبر علیہ السلام کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم معیارِ حق نہیں اور نہ ہی تنقید سے بالاتر ہیں۔

اہل علم حضرات کو معلوم ہے کہ اہل السنہ والجماعہ کا اصول اس مقام میں یہ ہے کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم عادل اور ثقہ ہیں۔ مجروح اور غیر عادل نہیں ہیں لہٰذا ان پر جرح و تنقید نہیں کی جاتی جیسا کہ ہم نے قبل ازیں اپنی کتاب

سیرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جلد اوّل کے صفحہ ۴۲-۴۳ پر عنوان عدالت صحابہ رضی اللہ عنہم کے تحت جمہور علمائے امت کا مسلک ذکر کر دیا ہے، چنانچہ مسئلہ ہذا پر متعدد آیات قرآنیہ دال ہیں- ان میں سے درج ذیل آیات پر غور فرمائیں-

... واعلموا ان فیکم رسول اللہ لو یطیعکم فی کثیر من الامر لعنتم ولکن اللہ حبب الیکم الایمان وزینہ فی قلوبکم و کرہ الیکم الکفر والفسوق العصیان- اولئک ھم الراشدون- (سورۃ الحجرات، رکوع اوّل)

حاصل یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کو محبوب اور مزین بنا دیا ہے اور کفر فسق اور نافرمانی (عصیان) سے نفرت ڈال دی ہے- پھر اللہ تعالیٰ نے "صیغہ حصر" کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے راشد اور ہدایت یافتہ ہونے کی بلا استثناء گواہی دے دی ہے- (اولئک ھم الراشدون)

پس آیت ہذا نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کمال ایمان کی توثیق اور ان کے عادل ہونے کی واضح طور پر تصدیق کی ہے-

فلہذا یہ حضرات "معیارِ حق" اور تنقید سے بالاتر ہیں- دوسرے مقام میں رب کریم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان کو ممثل لہ قرار دیا ہے اور ان کے ایمان کے ساتھ تشبیہ دے کر لوگوں کو ایمان لانے کی ترغیب دی ہے، ارشاد فرمایا:

... فان آمنو بمثل ما آمنتم به فقد اھتدوا- (سورۃ بقرہ، پ اوّل، رکوع آخر)	یعنی اے (صحابہ) تمہارے ایمان لانے کی طرح اگر دوسرے لوگ ایمان لائیں تو وہ ہدایت یافتہ اور راہ پانے والے ہوں گے---الخ-

مطلب یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان و تصدیق کو لوگوں کے ایمان لانے کے لیے معیارِ حق قرار دیا ہے- ظاہر بات ہے کہ ان حضرات کا ایمان معیاری تھا، تب ہی تو اس کو لائق تشبیہ بنایا گیا-

یہاں سے واضح ہوگیا کہ ان حضرات کا ایمان حق و صداقت کے لیے معیاری ہے اور یہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تنقید کے لائق نہیں۔

اسی طرح اس مسئلہ پر بہت سی احادیث و روایات دال ہیں، ان میں سے چند ایک درج کی جاتی ہیں۔ یہاں سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا "معیارِ حق" ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

...عن عبداللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم--- وانِ بنی اسرائیل تفرقت علی ثنتین وسبعین ملۃ وتفرق امتی علی ثلث وسبعین ملۃ کلھم فی النار الا ملۃ واحدہ قالوا مِن ھی یارسول اللہ قال ما انا علیہ واصحابی رواہ الترمذی---الخ-

(مشکوۃ شریف ص۳۰، تحت باب الاعتصام بالسنہ، الفصل الثانی، طبع نور محمد دہلی)

مطلب یہ ہے کہ میری امت تہتر ملتوں اور فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی، سوائے ایک طبقہ اور ایک فرقہ کے باقی تمام دوزخ میں جائیں گے۔

عرض کیا گیا: یارسول اللہ! وہ مستثنیٰ کون لوگ ہوں گے؟ تو فرمان ہوا کہ جو لوگ میرے اور میرے اصحاب کے پیروکار ہوں گے، وہ دوزخ سے بچ سکیں گے۔

اس فرمانِ نبوت میں حق و باطل کا معیار صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا طریقہ ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ آنجناب صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ بھی معیارِ حق بتلایا گیا ہے اور پیغمبر کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے اپنے صحابہ کے طریق کو بعینہٖ اپنے طریق کے مطابق بیان کیا ہے اور ان کی پیروی کو نجات کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ یہاں سے صاف طور پر رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے ساتھ صحابہ رسول صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا بھی معیار حق ہونا ثابت ہو رہا ہے۔

(۲) دوسرے مقام میں حدیث میں آیا ہے کہ

عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں صبح کی نماز کے بعد ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس میں بہت سے نصائح اور وصایا ارشاد فرمائے۔ ان میں یہ بھی ذکر فرمایا کہ

...وانه یعیش منکم بعدی فسیری اختلافا کثیرا فعلیکم بسنتی وسنته الخلفاء الراشدین المهدیین عضوا علیها بالنواجد---الخ

حاصل یہ ہے کہ جو شخص تم میں سے میرے بعد زندہ رہے گا وہ بہت سے اختلافات دیکھے گا۔ پس اس وقت میری سُنّت کو لازم پکڑنا اور ہدایت یافتہ خلفاء الراشدین کی سُنّت کو اپنے دانتوں سے مضبوط پکڑے رکھنا۔

(۱) مشکوٰۃ شریف ص۲۹-۳۰ الفصل الثانی، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ رواہ احمدؒ وابوداؤدؒ والترمذیؒ وابن ماجہؒ، طبع دہلی۔

(۲) المستدرک للحاکم ص۹۵-۹۶، جلد۱ تحت فضیلۃ مذاکرۃ الحدیث، طبع دکن۔

(۳) السنن الکبریٰ للبیہقی ص۱۱۴، ج۱۰ تحت باب ما یقضی بہ القاضی... الخ، طبع دکن۔

(۴) اسی طرح عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ، دونوں حضرات کہتے ہیں کہ

...قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر رضی الله عنه و عمر رضی الله عنه، الخ۔

یعنی نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کی اقتداء اور اتباع کرنا---الخ۔

(مسند الامام الاعظم ص۱۸۰ تحت کتاب الفضائل، بحواشی مولانا حسن سنبھلی، طبع نور محمد کراچی)

مندرجہ بالا فرامین نبوت سے درج ذیل چیزیں بین طور پر ثابت ہو رہی ہے کہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی کی سُنّت کو مضبوط طریقہ سے پکڑنے کا حکم ہے اور اس کے ساتھ ہی آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلفاء

الراشدین کے طریقہ پر عمل کرنے کا امت کو تاکیدی فرمان دیا گیا ہے۔

اور پھر خصوصی طور پر اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام لے کر (مثلاً سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ) ان کی اتباع اور ان کی اقتداء کی بطور وصیت کے ترغیب دلائی گئی۔

یہاں سے مسئلہ واضح ہوگیا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم "معیار حق" ہیں۔ اسی بنا پر ان کی اتباع اور اقتداء کو امت پر لازم رکھا گیا۔

اگر بالفرض یہ حضرات معیار حق نہیں بلکہ قابل تنقید ہیں تو پھر یہ نصوص قرآنی اپنے مفہوم کے اعتبار سے بیکار ہوئے اور ان فرمان ہائے نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی عمل نہ کیا گیا بلکہ ان فرمودات کے برعکس خودساختہ نظریہ قائم کر لیا گیا۔ یہ چیز کتاب و سُنّت کے تقاضوں کے برخلاف ہے۔

نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم "مدار دین" ہیں اور یہ حقیقت واقعہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امت مسلمہ کے درمیان رابطہ اور واسطہ ہیں۔ ان ہی کے وسیلہ سے امت کو کتاب اللہ پہنچی ہے اور انہی کے واسطہ سے سُنّت نبوی حاصل ہوئی اور شرعی احکام موصول ہوئے۔

اسی بناء پر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم "مدارِ دین" اور "حصول اسلام" کا ذریعہ ہیں، اگر یہ لوگ معتمد اور بااعتبار شخصیتیں ہیں تو کتاب و سُنّت کی حقانیت پر بھی اعتماد اور یقین ہو گا۔

اور اگر بالفرض دین کے یہ عینی شاہد غیر معتمد، غیر معتبر ہیں اور قابل جرح و تنقیص ہیں اور تنقید سے بالاتر نہیں، تو دین کی تمام عمارت ناپائیدار ہوگی اور مذہب کی حقانیت مخدوش ہو جائے گی اور اسلام کی صداقت باطل ٹھہرے گی۔ (العیاذ باللہ)

اسی وجہ سے کبار علمائے امت نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تنقیص کو ناجائز قرار دیا ہے اور ان پر جرح و تنقید کرنے والوں کو زندیق اور بے دین کہا ہے۔

چنانچہ ابوزرعۃ الرازیؒ، جو امام مسلم کے اجل شیوخ میں سے ہیں، نے اس مسئلہ کو بطور قاعدہ کے ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ

... انا رایت الرجل ینقص احدا من اصحاب رسول الله ﷺ فاعلم انه زندیق وذالک ان الرسول ﷺ عندنا حق والقرآن حق وانما ادی الینا هذا القرآن والسنن اصحاب رسول الله ﷺ وانما یریدون ان یجرحوا شهودنا لیبطلوا الکتاب والسنه والجرح بهم اولی وهم زنادقه۔

یعنی اپنے مخالف کو نصیحت کرتے ہوئے ابوزرعہ رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کے اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے کسی صاحب کی تنقیص شان کرتا ہے تو یقین کرو یہ شخص بے دین اور زندیق ہے۔

(کتاب الکفایہ للبغدادی ص۴۹، طبع دکن، الاصابہ لابن حجر، ص۱۸ (خطبہ الکتاب) معہ الاستیعاب، فتح المغیث شرح الفیتہ الحدیث ص۱۰۰۹۱-۳، ج۳، طبع مدینہ طیبہ)

وجہ یہ ہے کہ پیغمبر کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات بابرکات ہمارے نزدیک برحق ہے اور قرآن کریم بھی حق ہے اور قرآن مجید اور سنن نبوی دونوں چیزوں کو ہماری طرف پہنچانے والے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ اب یہ لوگ ہمارے دین کے عینی گواہوں کو مجروح کرنا چاہتے ہیں تاکہ کتاب و سُنّت کو باطل ٹھہرائیں۔



حدیثِ حوض کے متعلق طعن

مخالفین صحابہ کی طرف سے نبی اقدس صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے عام صحابہ پر اور خصوصاً شیخین حضرات (حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہم) پر (حدیث حوض) کے پیش نظر یہ طعن قائم کیا جاتا ہے کہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے انتقال مبارک کے بعد صحابہ نے دین میں نئی چیزیں پیدا کرلیں۔ دین سے برگشتہ ہوگئے۔ ضروریات دین کو ترک کردیا اور شریعت کے احکام کو متغیر کر ڈالا۔

مذکورہ بالا طعن مخالفین صحابہ نے حدیث حوض کی متعلقہ روایات سے تجویز کیا ہے۔ حدیث حوض میں یہ مضمون مذکور ہے کہ

... قیامت میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم حوض کوثر پر تشریف فرما ہوں گے۔ اس موقعہ پر بعض لوگوں کو حوض کوثر سے دور کیا جائے گا تو آنجناب صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم ارشاد فرمائیں گے کہ یہ میرے اصحاب ہیں تو قدرت کی طرف سے فرمان ہوگا کہ

...انک لا تدری ما احدثوا بعلک فاقول سحقا سحقا لمن غیر بعدی---الخ

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ آپ کو معلوم نہیں انہوں نے جناب کے بعد دین میں احداث اور تغیر کر دیا تھا تو اس وقت میں کہوں گا کہ جنہوں نے میرے بعد دین میں تغیر کر دیا انہیں یہاں سے دور کردو اور ہٹا دو۔

"حوض" کی روایات مختلف الفاظ کے ساتھ مروی ہیں اور مرویات کے الفاظ کے تفاوت کے باوجود قریباً مضمون ایک ہی ہے۔ مذکورہ بالا عبارت مشکوۃ شریف، باب الحوض والشفاعہ، الفصل الاول سے ذکر کی گئی ہے۔

الجواب

ذیل میں "حدیث حوض" سے متعلق چند ایک چیزیں ذکر کی جاتی ہیں جن سے اس حدیث کے مفہوم کی وضاحت ہوگی اور مذکورہ بالا طعن کا جواب پورا ہوگا۔ (بعونہ تعالی)

یہ بات درست ہے کہ "حدیث حوض" کی متعلقہ روایات "صحاحِ ستہ" میں موجود ہیں اور اپنے مقام پر صحیح ہیں۔

لیکن مخالفین صحابہ نے ان روایات کے اصل محمل اور صحیح مفہوم کو ترک کر دیا ہے اور خودساختہ محمل اختیار کرتے ہوئے طعن تجویز کر لیا ہے۔ اس موقعہ پر جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ مقولہ صادق آتا ہے کہ

کلمہ حق ارید بہ الباطل--- 　یعنی بات تو یہ حق ہے لیکن اس سے مراد باطل اور غلط لی گئی ہے۔

"حدیث حوض" کا مفہوم اور محمل علماء کرام نے درج ذیل ذکر کیا ہے---

شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ ذکر کرتے ہیں کہ

> ... "مراد از اشخاص مذکورین مرتدین اند کہ موت آنہا بہ کفر شد۔ وہیچ کس از اہل سُنّت آنجماعت را صحابی نمی گوید۔ و معتقد خوبی و بزرگی آنہا نمی شود۔ اکثر بنی حنیفہ و بنی تمیم کو بطریق وفادت بزیارت آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) مشرف شدہ بودند۔ بایں بلا مبتلا گشتند و خائب و خاسر شدند۔"
>
> (تحفہ اثنا عشریہ از شاہ عبدالعزیز دہلوی" ص۳۲۸-۳۲۹، تحت طعن سوم، باب مطاعن صحابہ کرام عموماً بے تخصیص، طبع لاہور)

مذکورہ بالا عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ ان لوگوں سے مراد وہ مرتدین ہیں جن کی موت کفر پر ہوئی اور اہل سُنّت والجماعہ میں سے کوئی شخص بھی اس جماعت کو صحابی نہیں کہتا اور ان کی خوبی و بزرگی کا معتقد نہیں ہے۔

یہ لوگ اکثر قبیلہ بنی حنیفہ اور بنی تمیم میں سے تھے۔ جو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے آخری ایام میں آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زیارت کے لیے وفد کی صورت میں حاضر ہوئے تھے، مگر جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے انتقال کے بعد ارتداد کی مصیبت میں مبتلا ہو کر دین اسلام سے منحرف ہوگئے اور خائب و خاسر ہوئے۔

چونکہ یہ لوگ بظاہر اسلام لائے تھے اور زیارت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے مشرف بھی ہوئے تھے اس وجہ سے ان کو روایات میں صحابی یا اصیحابی کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن یہ لوگ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کے بعد دینِ اسلام سے برگشتہ اور منحرف ہوگئے۔ اس وجہ سے ان کو حوض کوثر سے ہٹا دینے کا حکم ارشاد فرمایا جائے گا۔

بہرکیف حوض کوثر سے دور کر دینے کی روایات جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کے حق میں وارد نہیں ہے بلکہ مرتدین اور دین سے برگشتہ ہو جانے والوں کے لیے ہیں اور اس چیز پر قرائن موجود ہیں جو اس بات پر شاہد ہیں کہ صحابہ کرام اس روایت کا محمل نہیں۔

○ چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے متعلق تو روایات میں تصریح موجود ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ایک دفعہ حوض سے ہٹائے جانے والے لوگوں کا ذکر فرما رہے تھے تو اس موقعہ پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ یا نبی اللہ! کیا میں بھی ان لوگوں میں ہوں گا تو آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جواب میں فرمایا کہ نہیں۔ تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو بلکہ وہ (حوض سے دُور کی جانے والی) ایک قوم ہوگی جو تمہارے بعد آئے گی اور (دین اسلام سے

منحرف ہو کر) پچھلے قدموں پر لوٹ جائے گی۔

الحاکم نیشاپوری نے المستدرک میں ذکر کیا ہے کہ

...فقال ابوبکر رضی اللہ تعالی عنہ لعلی منھم یا نبی اللہ! لعلی منھم یا نبی اللہ! قال' لا ولکنھم قوم یخرجون بعدکم ویمشون القھقری۔

(المستدرک للحاکم ص۷۷-۷۸' جلد اوّل' کتاب الایمان' باب من خرج من الجماعہ قید شبر)

روایت ہذا سے واضح ہوگیا کہ فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جن کو حوض کوثر سے دُور کیا جائے گا۔

○ اور اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے حق میں حق تعالیٰ نے اپنے کلام میں بیشتر فضائل ذکر کیے ہیں اور ان کے "درجات عظیمہ" بیان فرمائے ہیں اور صحابہ کو "کامل مومن" ہونے کی بشارت دی ہے۔ نیز ان کے حق میں رضامندی اور جنّت میں دخول کا مژدہ اور دوامی نعمتوں کے حصول اور اجر عظیم یافتہ ہونے کے وعدے ذکر فرمائے ہیں۔

اس مضمون پر آیات کثیرہ موجود ہیں' ذیل میں چند ایک آیات ذکر کی جاتی ہیں:

(۱)... والذین آمنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ۔ والذین اووا ونصروا اولئک ھم المومنون حقا لھم مغفرہ ورزق کریم۔ (آخر سورۃ انفال' پ۱۰)	وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنھوں نے ٹھکانہ دیا اور مدد کی۔ یہ جماعت برحق مومن ہے۔ ان کے لیے آمرزش اور مغفرت ہے اور نیک روزی ہے۔

(۲)... والذین آمنوا وهاجروا وجاهدوا فی سبیل الله باموالهم وانفسهم اعظم درجه عند الله واولائك هم الفائزون یبشرهم ربهم برحمه منه ورضوان و جنت لهم فیها نعیم مقیم- خالدین فیها ابدا- ان الله عنده اجر عظیم-
(سورۃ توبہ، رکوع۹، پ۱۰)

وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کیا۔ اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑے درجہ والے ہیں اور یہ لوگ مقصود یافتہ ہیں اور ان کا پروردگار ان کو خوشخبری دیتا ہے اپنی طرف سے رحمت کے ساتھ اور خوشنودی کے ساتھ اور باغات کے ساتھ- ان کے لیے ان باغات میں دائمی نعمت ہوگی اور یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے- تحقیق یہ چیز اللہ کے ہاں اجرِ عظیم ہے-

(۳)... یوم لا یخزی الله النبی والذین آمنوا- معه نورهم یسعی بین ایدیهم وبایمانهم- (سورۃ تحریم، پ۲۸)

جس دن کہ خدا تعالیٰ پیغمبر اور ان لوگوں کو جو پیغمبر کے ہمراہ ایمان لائے رُسوا نہیں کرے گا- ان کا نُور ان کے سامنے اور ان کے دائیں جانب دوڑتا ہوگا-

یہاں علمائے کرام نے تصریح کی ہے کہ

... فامنهم الله من خزیه ولا یامن من خزیه فی ذالك الیوم الا الذین ماتوا والله سبحانه ورسوله عنهم راض- فامنهم من الخزی صریح فی موتهم علی کمال الایمان وحقائق الاحسان وفی ان الله

مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو وہاں کی رُسوائی سے مامون کر دیا اور اس دن کی رسوائی سے صرف وہی لوگ مامون ہوں گے جن سے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم راضی ہو--- پس ان کا رُسوائی سے مامون ہونا اس بات کی تصریح ہے کہ ان کی موت کامل

لم یزل راضیا عنھم وکذالک رسولہ ﷺ۔ (الصواعق المحرقہ حجر المکی ص۲۰۹، تحت الخاتمہ)

ایمان اور حقائق احسان پر ہوئی اور اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان پر راضی رہا۔

اسی طرح شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ نے آیت ہذا کے تحت تحریر کیا ہے کہ:
قولہ تعالی یوم لا یخزی اللہ... الخ دلالت مے کند کہ ایشانرا در آخرت ہیچ عذاب نخواہد شد۔ و بعد از فوت پیغمبر نور ایشاں حبط وزائل نخواہد شد۔ والا نور حبط شدہ و زوال پذیر رفتہ روز قیامت چہ قسم بکار ایشاں می آید؟؟

یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ یوم لا یخزی اللہ --- الخ دلالت کرتا ہے کہ ان لوگوں (صحابہ کرام) کو آخرت میں کچھ عذاب نہیں ہوگا اور پیغمبر کے انتقال کے بعد ان کا نور (ایمان) حبط اور زائل نہیں ہوگا، ورنہ زائل شدہ نور قیامت کے دن ان کے کس کام آسکتا ہے اور کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے؟؟

(۴) لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل اولئک اعظم درجہ من الذین انفقوا من بعد وقاتلوا۔ وکلا وعداللہ الحسنی۔ واللہ بما تعملون خبیر۔
(سورۃ الحدید، رکوع اوّل پ۲۷)

برابر نہیں ہیں تم میں سے وہ جنہوں نے خرچ کیا فتح (مکہ) سے پہلے اور لڑائی کی۔ ان لوگوں کا درجہ اعظم ہے ان لوگوں سے جو خرچ کریں اس کے بعد اور لڑائی کریں اور سب سے وعدہ کیا اللہ تعالیٰ نے خوبی کا اور اللہ کو خبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

اور ساتھ ہی ارشادِ خداوندی ہے کہ:

(۵) ان الذین سبقت لھم منا الحسنی اولئک عنھا مبعدون۔ (آخر سورۃ انبیاء، پ۱۷)

یعنی جن کے لیے ہماری طرف سے "الحسنیٰ" (جنّت) کا وعدہ ہوچکا ہے انہیں دوزخ سے دُور رکھا جائے گا۔

مندرجہ بالا آیات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم (مہاجرین وانصار) کے حق میں

عمدہ فضائل، ان کے کمال ایمان کی تصدیق، مغفرت اور جنت کے وعدے اور رضامندی کی بشارات، اجر عظیم اور دائمی نعمت کے مژدے اور قیامت میں رسوائی و ذلت سے نجات اور نور ایمان کا حاصل ہونا وغیرہ ثابت ہے اور صحابہ کرام کے حق میں ان امور کو بالوضاحت بیان کر دیا گیا ہے۔

نیز--- اسی طرح ان حضرات کے حق میں احادیث و روایات میں بھی بہت سے فضائل بیان کیے گئے ہیں اور بشارات اور اہلِ جنت میں سے ہونے کا مژدہ ذکر فرمایا گیا ہے۔ مثلاً عشرۂ مبشرہ کا جنتی ہونا، اہلِ بدر و احد کے لیے بشارتیں اور بیعت رضوان والوں کے لیے رضامندی کی خوشخبری وغیرہ--- یہ تمام فضائل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حق میں ثابت ہیں اور--- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسلام کی تبلیغ، احیاء اور فروغ دین کے لیے مساعی کیں۔ اسلام کی خاطر ہجرت کی اور اپنے مال و جان کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کا حق ادا کیا۔ قیصر و کسریٰ کی عظیم سلطنتوں کو جہاد کے ذریعے اسلام کے زیر نگیں کیا، ہزاروں لاکھوں لوگوں کو مسلمان کیا اور قرآنِ مجید اور نماز کی تعلیم دی اور شریعت کی راہ پر ڈالا اور بے مثل دینی و ملی خدمات سرانجام دیں۔

ان تمام چیزوں کی بنا پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مقام و مرتبہ عنداللہ و عندالرسول بہت واضح طور پر ثابت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ان قرائن و شواہد کے موجود ہونے اور پائے جانے کے باوجود مخالفین کی طرف سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس جماعت کو "حدیث حوض" کا محمل قرار دینا کسی صورت میں صحیح نہیں، بلکہ ان سے وہی لوگ مراد ہیں جو دینِ اسلام سے منحرف اور برگشتہ ہو کر خائب و خاسر ہوئے۔ (جیسا کہ محدثین کرام نے اس معنی کو تحریر کیا ہے)

مختصر یہ ہے کہ مندرجہ بالا شواہد و قرائن روایات حوض سے صحابہ مراد لینے سے شدید مانع اور معارض ہیں کیونکہ جب جماعت کے حق میں اتنے قدر فضائل و

کمالات اور حصول جنت کے مژدے قرآن و سُنّت کے ذریعہ بالیقین ثابت ہوچکے ہوں، ایسی جماعت کا حوض کوثر سے دُور کیا جانا قطعاً صحیح نہیں۔

فلہذا "حدیث حوض" کے متعلق شیعہ کے مزعومات باطل اور غلط ہیں اور کسی صورت میں درست نہیں ہوسکتے۔

شیعہ کا عجیب استدلال

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے حق میں بے شمار آیات اور احادیث کثیرہ، احیائے دین و اشاعت اسلام کے لاتعداد کارنامے اور فروغ دین کے لیے ان حضرات کی ملی خدمات جب شیعہ بزرگوں کے سامنے رکھی جاتی ہیں کہ یہ سب امور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فضیلت اور حقانیت ثابت کرتے ہیں اور ان کے کامل الایمان والاسلام کے شواہد بنتے ہیں تو جواب میں یہ بزرگ فرمایا کرتے ہیں کہ یہ سب نصوص اور تمام فضائل نبی علیہ السلام کے "اخص الخواص" اور "مخلص" تابعداروں کے لیے ہیں یعنی عام صحابہ رضی اللہ عنہم اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے نہیں اور پھر ان کے زعم میں اخص الخواص اور مخلص تابعداروں کی وضاحت طلب کی جائے تو فرمایا کرتے ہیں کہ وہ ہیں "عترۃ النبی ﷺ" اور حضرت علی رضی اللہ عنہ، اور مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ، عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ، سلمان فارسی رضی اللہ عنہ، اور ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ۔

(مضمون ہذا فلک النجاۃ از مولوی علی محمد و حکیم امیر دین جھنگوی شیعی ص ۱۲۳، جلد اوّل، طبع دوم، لاہور میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے)

گویا ان بزرگوں کے نزدیک صدہا قرآنی آیات اور بے شمار احادیث نبویہ مذکورہ بالا پانچ چھ افراد کے حق میں وارد ہوئیں اور دین اسلام کا احیاء ان کی بدولت ہوا اور اشاعت اسلام ان ہی کی مرہون منت ہے اور معاذ اللہ باقی تمام صحابہ کرام دین سے منحرف ہوگئے اور آخرت میں نبی علیہ السلام ان سب کو حوض کوثر سے دُور کر دیں

گے۔ (استغفر اللہ)

دانش مند حضرات اور فہمیدہ احباب، شیعہ کی اس نرالی منطق کے بوداپن کو خوب سمجھ سکتے ہیں، ہمارے تجزیہ اور تبصرہ کی حاجت نہیں بلکہ یہ کہہ دینا کافی ہے

؎ برایں عقل و دانش بباید گریست

نوٹ: "روایت حوض" کا طعن اور اس کا جواب قبل ازیں سیرۃ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، جلد اوّل کے تمہیدی مضامین میں مختصراً ذکر ہو چکا ہے۔



باسمہ تعالیٰ

الحمدللہ وکفی والصلوہ والسلام علی سید الوری امام الرسل وخاتم الانبیاء-- وعلیٰ آلہ الشرفاء واصحابہ النجباء وعلیٰ اتباعہ الصلحاء صلواہ دائمہ بدوام السماء والدنیا۔

بندۂ ناچیز محمد نافع عفا اللہ عنہ ناظرین کرام کی خدمت میں ذکر کرتا ہے کہ لمعتضد باللہ عباسی خلیفہ الشیعی نے اپنے دورِ حکومت میں اُموی صحابہ (حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ، اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، وغیرہما) کے خلاف موجبات لعن و طعن میں "ایک رسالہ" مرتب کرایا تھا۔

رسالہ ہذا میں اپنی سیاسی و مذہبی عداوت پورا کرنے کا اس نے کردار ادا کیا۔

ہم نے دفاع عن الصحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی خاطر اس مقالہ میں اس کا جواب پیش کیا ہے تاکہ اہلِ اسلام ان صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے حق میں کسی بدگمانی میں مبتلا نہ ہوں اور سوء ظنی کا شکار نہ ہوں۔

(دعاگو ناچیز : محمد نافع عفا اللہ عنہ)



تاریخ طبری میں منقول
معتضد باللہ کے رسالہ کا جواب

رسالہ کا تعارف

مورخین نے لکھا ہے کہ عباسی خلیفہ المامون نے ۲۱۱ھ میں شیعی نظریات اختیار کر لیے تھے۔ چنانچہ اس نے اپنے عہد کے آخری دور میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مخالفت میں دیگر امور کے علاوہ ایک "رسالہ" مرتب کرایا اور اس میں حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ اور ان کے فرزند حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما دونوں حضرات کے خلاف سب و شتم اور لعن طعن کرنے کے جواز میں مواد فراہم کیا اور اس میں موجبات لعن و طعن درج کیے۔

اس مرتب شدہ "رسالہ" کی المامون کے عہد میں کسی وجہ سے نشر و اشاعت نہ ہو سکی لیکن وہ مرتب شدہ مواد حکومت کے دیوان اور دفاتر میں محفوظ چلا آیا پھر معتضد باللہ عباسی خلیفہ کا دور آیا اور وہ بھی شیعی نظریات کا حامل تھا۔ اس نے اپنے عہدِ حکومت میں خلیفہ المامون والے مدون شدہ "رسالہ" کو ۲۸۴ھ میں برآمد کرنے کا حکم دیا اور اس کو مزید اضافہ جات اور حوالہ جات کے ساتھ مدلل کر کے اپنا عناد پورا کیا اور اس نے حکم دیا کہ اس رسالہ کو جمعہ کے عام اجتماعات میں لوگوں کے سامنے پڑھنے اور سنانے کا اہتمام اور انتظام کیا جائے۔ جب یہ صورت حال پیدا ہوئی تو اعیانِ دولت بہت متفکر ہوئے۔

معتضد باللہ کا وزیر ابوالقاسم عبید اللہ بن سلیمان تھا۔ اس نے قاضی وقت یوسف بن یعقوب کے ساتھ اس امر میں گفتگو کی اور اس کام کو رکوانے اور تعویق میں ڈالنے کی تدبیر اور تجویز کی۔

چنانچہ قاضی صاحب مذکور (یوسف بن یعقوب) نے معتضد باللہ کی خدمت میں اس معاملہ کے لیے ایک طریقہ سے بات چلائی۔

اور کہا کہ اے امیرالمومنین! رسالہ ہذا کے مضامین سننے سے عوام مین ایک شدید اضطراب بیدا ہوگا۔ اور مخالفانہ جذبات کی ایک تحریک چلے گی۔ اس طرح ایک عظیم فتنہ کھڑا ہو جانے سے جناب کی سلطنت کو نقصان پہنچنے کا شدید خطرہ ہے۔

خلیفہ کہنے لگا کہ اگر ایسا ہو تو میں عوام کو تلوار سے درست کردوں گا۔

○ قاضی موصوف نے خلیفہ کو بایں طور فہمایش کی کہ ملک کے مختلف علاقہ جات میں آل ابی طالب کثرت سے پھیلے ہوئے ہیں۔ رسالہ ہذا میں بنو امیہ کے اکابر سے تنفر دلانے کے ساتھ ساتھ آل ابی طالب کے مدائح و فضائل بھی سامنے لائے گئے ہیں۔ عوام جب یہ مضامین سماعت کریں گے تو ان کی طرف مائل ہو جائیں گے اور جناب کی طرف سے روگردانی اختیار کرلیں گے۔ اس بات میں آل ابی طالب کا باہمہ وجوہ فائدہ ہے اور خلفیہ کے لیے سراسر خسارہ ہے۔

قاضی صاحب کی یہ گفتگو سننے کے بعد خلیہ معتضد باللہ خاموش ہوگیا اور رسالہ کی تشہیر سے باز آگیا۔

○ مختصر یہ ہے کہ رسالہ مذکور کے مرتب کیے جانے اور نشر کرنے کے یہ دواعی تھے جو محمد بن جریر الطبری نے اپنی مشہور تاریخ میں ۲۸۴ھ کے تحت اس مقام میں ذکر کیے اور ان کا ماحصل ہم نے پیش کر دیا ہے۔

○ اور یہ واضح چیز ہے کہ عباسی خلفاء نے اپنے سیاسی تعصب اور مذہبی عداوت کی بنا پر ان صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ، وغیرہم کے خلاف اس رسالہ میں مواد فراہم کر دیا تھا جس میں جعلی اور وضعی روایات مدون کرائیں۔

گویا اس طریقہ سے انہوں نے اپنے دیرینہ مخالفین کے خلاف تنفر پھیلانے کا فریضہ سرانجام دیا اور معاندانہ کردار ادا کیا۔

الطبری کی حکمت عملی

غور طلب یہ بات ہے کہ صاحب التاریخ محمد ابن جریر الطبری کے لیے عباسیوں کے اس فراہم کردہ غلیظ مواد کو من و عن نقل کر کے اپنی تصنیف میں شامل کرنے کا کون سا داعیہ تھا؟؟ اور اس نے کون سی مجبوری کی بنا پر یہ کارخیر پورا کیا؟؟ گویا الطبری نے اس مواد کو اپنی تاریخ میں درج کر کے آنے والے لوگوں کو اس پر آگاہ کیا اور سب و شتم اور لعن طعن کے جو دلائل عباسیوں نے مرتب کروائے تھے، ان پر آئندہ نسلوں کو مطلع کرنے کا ثواب کمایا۔

چنانچہ شیعہ اور روافض رسالہ مذکورہ میں مندرجہ مواد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی کتب میں ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر مطاعن قائم کرتے ہیں اور شدید اعتراضات پیدا کرتے ہیں۔ درحقیقت الطبری نے اہل اسلام میں انتشار پھیلانے اور افتراق ڈالنے کے لیے بڑی عجیب تدبیر اور حکمت عملی اختیار کی۔ جس سے مخالفین صحابہ کو ایک گونہ رہنمائی حاصل ہوئی اور ان کو عداوت پوری کرنے کے لیے ایک تیار شدہ مواد دستیاب ہو گیا۔

کئی لوگ اس دلائل پر نظر کرنے سے متذبذب ہوں گے۔ کئی ناظرین صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے متنفر ہوں گے اور بعض قارئین دل برداشتہ ہو کر اموی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے منحرف ہو جائیں گے۔

○ الطبری کو اس باطل مواد کا اس تفصیل کے ساتھ ذکر ہی نہیں کرنا چاہیے تھا بلکہ صرف ایک واقعہ تاریخی کی حیثیت سے اجمالاً ذکر کر دینا کافی تھا جیسا کہ باقی مورخین نے واقعہ ہذا کو اجمالاً درج کیا ہے اور دلائل کی تفصیل کی طرف نہیں گئے۔ اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے ذکر کیا تھا تو پھر اس مواد کے بطلان پر کچھ کلام کرنا

لازم تھا تاکہ لوگ اس سے غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں، لیکن الطبری نے ایسا نہیں کیا۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب التاریخ الطبری کی نیت بخیر نہ تھی بلکہ فاسد تھی اور ان صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے حق میں "الطبری" خود سوء ظنی کا مریض تھا۔

(لکل امر ما نوی - جزاہ اللہ تعالی علی حسب مرامہ)

اب ہم آئندہ سطور میں مرتب شدہ رسالہ ہذا کی قابل جواب چیزوں کا جواب عرض کرنا چاہتے ہیں۔

الجواب

○ عام قاعدہ یہ ہے کہ جس چیز کا جواب پیش کرنا منظور ہو اس کا خلاصہ یا ماحصل ناظرین کی خدمت میں پہلے رکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کا رد اور جواب ذکر کیا جاتا ہے۔ اگر یہ صورت اختیار نہ کی جائے تو قاری کے لیے بات سمجھنے میں وقت کا سامنا اور پریشانی کا باعث ہوتا ہے۔

○ چونکہ ہر ایک قاری کے سامنے "تاریخ الطبری" موجود نہیں ہوگی۔ اس بنا پر الطبری کے رسالہ مذکورہ کی قابل تردید چیزوں کو بالاختصار اولاً ذکر کرنا مناسب ہے۔

○ اس سلسلہ میں پہلے وہ "آیات" ذکر کی جاتی ہیں جو اس رسالہ میں اموی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر طعن کے لیے درج کی گئی ہیں اور اس کے بعد ان "روایات" کو پیشِ نظر رکھا جائے گا جنہیں مخالفین نے اپنے دلائل کے طور پر تجویز کرکے "رسالہ مذکور" میں مدون کیا ہے۔

آیات......پہلی آیت

...فمما لعنهم الله به على لسان نبيه صلى الله عليه	یعنی ان چیزوں میں سے جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

وسلم وانزل به كتابا قوله (والشجره الملعونه فی القران و نخوفهم فما يزيدهم الا طغيانا كبيرا) (سورة الاسراء، پ۱۵) ولا اختلاف بين احد انه اراد بها بنی امیه۔

کی زبان پر بنی امیہ پر لعنت کی اور کتاب اللہ کو نازل فرمایا۔ یہ چیز ہے کہ الشجرۃ الملعونہ قرآنِ مجید میں مذکور ہے اور اس سے مراد بلا اختلاف بنی امیہ ہیں۔ فلہذا وہ قرآن کے فرمان کے اعتبار سے ملعون ہوئے۔

رسالہ میں مولف نے پہلے مندرجہ بالا آیت کا آخری نصف حصہ تحریر کیا ہے اور بعدہ اسی آیت کا اوّل نصف (وما جعلنا الرویا التی...) آئندہ درج کر کے مطاعن کا سلسلہ چلایا ہے۔

چنانچہ ہم اسی جملہ (الشجره الملعونه فی القرآن) کا مفہوم اور محمل جو مفسرین نے ذکر کیا ہے، پہلے وہ پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد "مولف رسالہ" نے اپنے مقصد کے لیے جو مفہوم اخذ کیا ہے، اس کا جواب ذکر کریں گے کہ

...عن ابن عباس رضی الله تعالی عنه والشجره الملعونه فی القرآن قال شجره الزقوم۔

(تفسیر الطبری ص۷۸، ج۱۵، تحت الآیہ، پ۱۵)

مطلب یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ شجرۃ الملعونہ سے مراد یہاں زقوم کا درخت ہے۔ ناظرین کرام پر واضح رہے کہ الطبری نے اپنی تفسیر الطبری میں اس مقام میں متعدد تابعین حضرات مثلاً مسروق، عکرمہ، سعید بن جبیر، مجاہد، الضحاک وغیرہم کے اقوال تائیداً ذکر کیے ہیں یعنی یہ تمام حضرات فرماتے ہیں کہ شجرۃ الملعونہ سے مراد یہاں شجرۃ الزقوم ہے جو دوزخیوں کی خوراک ہے، کوئی دوسرا معنی مراد نہیں۔

اور علامہ نسفی نے تفسیر مدارک میں ذکر کیا ہے کہ

○... فانهم حين سمعوا بقوله ان شجره الزقوم طعام

الاثیم جعلوها سخر بة- وقالوا ان محمدا یزعم ان الجحیم تحرق الحجاره- ثم یقول تنبت فیها الشجره...الخ-

(تفسیر مدارک للامام عبداللہ بن احمد مسعود النسفی ص۹۱۵، ج۲، تحت الآیہ پ۱۵)

مذکورہ بالا عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ جب کفار نے قرآن مجید کا یہ جملہ سنا کہ شجرۃ ملعونہ سے مراد زقوم کا درخت ہے جو دوزخ میں اگے گا اور دوزخیوں کی خوراک ہوگا تو بطور تمسخر کہنے لگے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہتے ہیں کہ دوزخ میں یہ درخت اگے گا اور دوزخ کی آگ تو پتھر کو بھی جلا ڈالتی ہے تو یہ کیسے ممکن ہے؟؟

○ اور صاحب جلالین نے اس جملہ کے تحت تحریر کیا ہے کہ

...وھی الزقوم التی تنبت فی اھل الجحیم جعلنا ھا فتنه لهم اذ قالوا النار تحرق الشجره فکیف تنبته-

(تفسیر جلالین ص۲۳۵، تحت الآیہ، پ۱۵)

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ زقوم وہ درخت ہے جو دوزخ کی تہہ میں اُگے گا- اس چیز کو ہم نے کفار کے لیے آزمائش اور امتحان قرار دیا ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ آگ درختوں کو جلا دیتی ہے تو پھر وہ درخت میں کیسے اگ سکتا ہے؟؟

مقصد یہ ہے کہ کفار نے شجرۃ زقوم کی تکذیب اس بنا پر کی کہ زقوم کے درخت کی پیدائش دوزخ کی آگ میں بتلائی جاتی ہے جبکہ دوزخ کی آگ پتھر کو بھی جلا دیتی ہے- فلہذا یہ درخت آگ میں کیسے اگ سکتا ہے؟؟ اگر دوزخ میں یہ درخت ہو بھی تو جل جائے گا-

○ نیز مفسرین نے تحریر کیا ہے کہ

...ای المراد بلعنها لعن طاعمیها من الکفره- (روح المعانی ص۱۰۵، ج۱۵، تحت لایہ، پ۱۵)

یعنی شجرہ زقوم کو شجرۃ الملعونہ اس لیے کہا گیا ہے کہ دوزخ میں اسی شجرہ کو کھانے والے کفار ملعون ہوں گے-

مختصر یہ ہے کہ آیت مندرجہ کے اس کلمہ (شجرۃ الملعونہ) کا معنی اور مفہوم جو مفسرین کے نزدیک ہے، وہ واضح طور پر معلوم ہوگیا اور قرآنی آیت کے مقصود میں کوئی خفاء باقی نہیں رہا۔

اب رسالہ مذکورہ کے قول کو ملاحظہ فرمائیں--- صاحب رسالہ کہتے ہیں کہ...

...ولا اختلاف بین احد انہ اراد بھا بنی امیہ۔

یعنی اس بات میں کسی ایک شخص کو بھی اختلاف نہیں ہے کہ آیت ہذا میں شجرہ ملعونہ سے مراد بنو امیہ کے افراد ہی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی زبان سے ان پر لعنت کی ہے۔

جواباً تحریر ہے کہ

- آیت میں کلمہ "الشجرۃ الملعوانہ" کے معنی کے متعلق عدم اختلاف کا دعویٰ درست نہیں بلکہ بالکل غلط ہے۔ جیسا کہ خود الطبری نے اپنی تفسیر میں اس معنی کی تشریح میں جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے اور گزشتہ سطور میں ہم نے اسے پیش کر دیا ہے: کہ اس سے مراد شجرۃ الزقوم ہے (کوئی دوسرا معنی مقصود نہیں)
- اسی طرح الطبری نے بہت سے کبار علماء تابعین وغیرہم سے نقل کیا ہے کہ یہ تمام حضرات الشجرۃ الملعونہ سے مراد شجرۃ الزقوم لیتے ہیں (اور کوئی دیگر معنی مراد نہیں لیتے)
- حافظ ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر القرآن میں اسی کلمہ (الشجرۃ الملعونہ) کے معنی کی وضاحت میں بعض لوگوں کا قول نقل کیا ہے۔

... قیل المراد بالشجرہ الملعونہ بنو امیہ وھو غریب ضعیف۔ (تفسیر ابن کثیر" ص۴۹، ج ۳، تحت الآیۃ)

یعنی بعض لوگوں نے اس سے مراد قبیلہ بنو امیہ لیا ہے لیکن یہ قول غریب ہے۔ اس کی تائید دیگر اقوال سے نہیں پائی گئی اور ضعیف ہے۔ (پختہ قول نہیں اور

قابلِ اعتماد نہیں)

○ اس کے بعد ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ نے الطبری کے حوالہ سے اس مقام میں دوسری یہ چیز نقل کی ہے کہ

... المراد بذالک... الشجرہ الملعونہ ھی شجرہ الزقوم... لا جماع الحجہ من اھل التاویل علی ذالک (ای فی الرویا والشجرہ- (تفسیر ابن کثیر" ص۴۹، ج ۳، تحت الآیہ، پ۱۵)

یعنی اہل التاویل (علمائے مفسرین) کی طرف سے اس بات پر اجماع اور اتفاق ہے کہ یہاں الشجرۃ الملعونہ سے مراد الشجرۃ الزقوم ہے۔

یہاں سے واضح ہوگیا کہ الشجرۃ الملعونہ سے کوئی دوسرا معنی مراد لینا یہاں صحیح نہیں۔ یہی چیز علماء کے نزدیک صحیح ہے اور متفق علیہ امر ہے۔

○ نیز مشہور مفسر علامہ القرطبی نے اپنی تفسیر میں اسی مسئلہ کو عبارت ذیل میں ذکر کیا ہے اور مسئلہ خوب حل کر دیا ہے:

○ ھذا قول ضعیف محدث والسورہ مکیہ فیبعد ھذا التاویل- الا ان تکون ھذہ الایہ مدنیہ ولم یثبت ذالک-

یعنی ہذہ الشجرۃ سے قبیلہ "بنو امیہ" کا مراد لینا قول ضعیف اور کمزور ہے اور محدث ہے (یعنی اپنی طرف سے ایجاد کردہ قول ہے، سلف میں یہ قول منقول و مقبول نہیں ہے)

دوسری بات یہ ہے کہ یہ آیت جس سورہ میں واقع ہے۔ وہ سورہ مکی دور کی ہے تو اس صورت میں الشجرۃ الملعونہ کا یہ معنی (یعنی قبیلہ بنوامیہ) مراد لینا صواب سے بعید ہے اور صحت سے دُور تر ہے۔ ہاں اگر یہ چیز ثابت ہو جائے کہ آیت ہذا مدنی دور کی ہے تب معنی ٹھیک ہوسکے گا لیکن یہ بات کہ آیت مدنی دور کی ہو بالکل ثابت نہیں۔

○ خلاصہ یہ ہے کہ

آیت میں "الشجرۃ الملعونہ" سے قبیلہ بنوامیہ مراد لینا فن تفسیر کے قواعد کے خلاف ہے اور اس فن کے ضوابط اس کی تائید نہیں کرتے اور مشاہیر علمائے فن کے فرمودات اس کے موید نہیں۔

نیز یہ چیز اس دور کے واقعات و حالات کے ساتھ بھی مطابقت نہیں رکھتی۔ آخر بحث اس کی مزید وضاحت ہوگی۔ انشاء اللہ۔

مولف رسالہ نے اس کلمہ کے معنی بنو امیہ مراد لینے میں لوگوں کے اتفاق اور عدم اختلاف کا جو دعویٰ کیا ہے وہ متعدد وجوہ کی بنا پر بالکل غلط اور بے جا ثابت ہوا جیسا کہ گزشتہ سطور میں اسے بیان کر دیا ہے۔

دوسری آیت

صاحب رسالہ نے اپنے استدلال کے لیے دوسری آیت مندرجہ ذیل درج کی ہے اور اس آیت کے پہلے حصہ کے شانِ نزول کے متعلق رسالہ کے مولف نے ایک روایت درج کرکے اس کو آیت کا محمل و معنی قرار دیا ہے:

... منہ الرویا التی راھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فوجم لھا۔ فماری ضاحکا بعدھا۔ فانزل اللہ وما جعلنا الرویا التی اریناک الا فتنہ للناس۔ الخ۔ فذکر وانہ رای نفرا من بنی امیہ ینزون علی منبرہ۔

یعنی نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خواب میں دیکھا کہ جناب کے منبر پر بنی امیہ کے افراد چڑھ رہے ہیں تو آنجناب غمناک اور پریشان ہوئے۔ اس کے بعد جناب کو خندہ فرماتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔

(تاریخ الطبری ص۵۸، ج۱۰، تحت سنہ ۲۸۴ھ)

تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ وہ رویا جو ہم نے آپ کو دکھایا ہے، وہ لوگوں کے لیے آزمائش و ابتلاء کے درجے میں ہے۔۔۔ الخ۔

مطلب یہ ہے کہ اس آیت کے ساتھ مذکورہ روایت کو ملا کر مولف رسالہ بنوامیہ کی مذمت اور اس کا مبغوض ہونا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

یہ خواب والی روایت کئی طریقوں سے کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس آیت میں جس الرویا کا ذکر آیا ہے اس سے کون سا الرویا مراد ہے؟

تو اس کے متعلق پہلے خود الطبری کے بیانات جو آیت ہذا کی وضاحت میں نقل کیے گئے ہیں، ان کو پیش نظر رکھا جانا زیادہ مفید ہے، اس کے بعد دیگر علماء کے بیانات درج ہوں گے۔

الطبری کے بیانات

آیت میں جس الرویا کا ذکر موجود ہے اس کے متعلق کئی اقوال مفسرین میں پائے جاتے ہیں، لیکن خود الطبری نے اس مقام میں یہ تحریر کیا ہے کہ

... واولی الاقوال فی ذالک بالصواب قول من قال عنی به رویا رسول الله ﷺ ما رای من الایات والعبر فی طریقه الی بیت المقدس، وبیت المقدس لیله اسری به وقد ذکرنا بعض ذالک فی اول هذه السوره۔ (تفسیر الطبری ص ۷۷-۷۸، ج۱۵، تحت الآیہ وما جعلنا الرویا التی، الخ)

یعنی آیت ہذا میں رویا وہی چیزیں ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر معراج کے موقعہ پر اللہ تعالیٰ کی آیات و نشانات بیت المقدس و دیگر مقامات میں ملاحظہ فرمائیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس رویا سے کوئی دوسرا خواب مراد لینا غیر صواب ہے بلکہ بیت المقدس کی طرف اسرا اور سیر جو ہوئی تھی وہی مراد لینا صواب ہے اور یہی ابن جریر الطبری کا اپنا فیصلہ ہے۔

پھر اسی بحث کے تحت الطبری اپنی تفسیر میں اس مسئلہ کو مزید مدلل کر کے لکھتے ہیں کہ

... انما قلنا ذالک اولی بالصواب لاجماع الحجه من اھل التاویل علی ان ھذه الایه انما انزلت فی ذالک وایاه عنی الله عزوجل بھا فاناکان ذالک کذالک- فتاویل الکلام وما جعلنا رویاک التی اریناک لیله اسرینا بک من مکه الی بیت المقدس الا فتنه للناس بقول لابلاء الناس الذین ارتدوا عن الاسلام لما اخبروا بالرویا التی راھا علیه الصلوه والسلام-

یعنی ہم نے اس قول کو اولی بالصواب اس لیے قرار دیا ہے کہ اہلِ تاویل کی طرف سے اس پر اجماع ہے کہ یہ آیت (وما جعلنا الرویا التی اریناک الا فتنه للناس...الخ) سفر معراج کے حق میں نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے آیت میں یہی مراد لیا ہے- پس یہ کلام کہ جس میں آپ کو مکہ سے لے کر بیت المقدس تک سیر کرانے کا ذکر ہے، وہ ان لوگوں کے لیے ابتلاء اور آزمائش ٹھہری- وہ اس طرح کہ کئی لوگ اس کو سن کر اسلام سے پھر گئے- (اور اس امر کو بعید از قیاس سمجھ کر دینِ متین سے منحرف ہوگئے)

(تفسیر الطبری ص۷۸، ج۱۵ تحت الآیہ وما جعلنا الرویا التی...الخ)

حاصل مفہوم یہ ہے کہ اس آیت (وما جعلنا الرویا التی اریناک الا فتنه للناس...الخ) کا صحیح محل و مقصود خود الطبری نے اپنی تفسیر میں برملا واضح کر دیا ہے کہ اس سے مراد سفر معراج شریف میں جو آیات و نشانات قدرت کی جانب سے دکھائے گئے تھے ان کو رؤیا کے الفاظ سے اس آیت میں تعبیر کیا گیا ہے- فلہذا اس آیت کا مفہوم جو "رسالہ" میں لیا گیا ہے وہ کسی طرح صحیح نہیں اور نہ ہی اس رؤیا سے مراد افراد بنوامیہ ہیں-

اصل مسئلہ کے اعتبار سے خود الطبری کے پیش کردہ بیانات بطور جواب کافی

ہیں۔ دیگر کسی جواب کی حاجت ہی نہیں۔ تاہم بعض دیگر لوگوں نے اس آیت کے تحت رویا کی روایات بنو امیہ کے متعلق ذکر کی ہیں۔ ان کے جوابات کے لیے کچھ قدر کلام چلانا مفید ہے۔ وہ ایک ترتیب سے ذکر کیا جاتا ہے تاکہ اس آیت کی متعلقہ روایات کا درجہ جو مفسرین کے نزدیک ہے، وہ ناظرین کے سامنے واضح ہو جائے۔

روایات کا درجہ

رویا مذکور کے متعلق کئی روایات پائی جاتی ہیں، بعض مقام میں سہل بن سعد سے مرسلا ہے۔ اس کی سند میں محمد بن الحسن بن زبالہ راوی ہے اور اس کے حق میں علماء رجال نے لکھا ہے: ثقہ نہیں ہے، کذاب ہے، سارق الحدیث ہے، واضع الحدیث ہے، اس کی روایت نہ لی جائے، وغیرہ وغیرہ۔

(۱) کتاب الضعفاء للعقیلی ص۵۸، ج۴، تحت محمد بن حسن بن زبالہ۔

(۲) تہذیب التہذیب لابن حجر ص۱۱۶ ج۹، تحت محمد بن حسن بن زبالہ۔

(۳) تفسیر ابن کثیرؒ ج۳، تحت الآیہ۔

نیز یہ روایت (ینزون علی منبرہ نزوہ القردہ...الخ) کئی دیگر طریقوں سے بھی مروی ہے۔ مثلاً ابن ابی حاتم، ابن جریر، ابن مردویہ، بیہقی وغیرہ نے اسے ذکر کیا ہے، پھر اس کے حق میں علماء نے ایک اجمالی تجزیہ پیش کر دیا ہے جس سے ان روایات کا بے وزن ہونا اور غیر مقبول ہونا ثابت ہوتا ہے۔

چنانچہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی اپنی تفسیر میں تحت آیت ہذا تحریر فرماتے ہیں کہ

... واسانید هذه الاحاديث ضعیفه۔ یعنی ان روایات کے اسانید ضعیف ہیں۔ (لائق استناد نہیں ہیں)

(تفسیر مظہری ص۴۵۲، ج۵، تحت الآیہ)

اسی طرح مفسر القرطبی نے (بنی امیہ ینزون علی منبرہ...الخ) والی روایت کے تحت تنقید و تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

... قال ابن عطیہ وفی ھذا التاویل نظر--- ولا یدخل فی ھذا الرویا عثمان رضی اللہ عنہ ولا عمرو بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ ولا معاویہ رضی اللہ عنہ- (تفسیر القرطبی ص ۲۸۳، ج ۱۰، تحت الآیہ)

مطلب یہ ہے کہ الرویا میں مذکورہ روایت کی وجہ سے بنو امیہ مراد لے کر ان کی مذمت ثابت کرنا تحقیق کے قابل اور لائق تامل ہے۔ (بغیر تحقیق کے قبول نہیں کی جا سکتی) اور دوسری بات یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ و عمرو بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد کو اس رویا میں داخل نہیں کیا جا سکتا۔

فلہذا یہ تاویل قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ

- مولف رسالہ آیت مذکورہ کی تشریح میں (ینزون علی منبرہ... الخ) والی روایت ملا کر مذمت بنی امیہ اور ان کی تنقیص ثابت کرنا چاہتے تھے، وہ ہرگز ثابت نہیں ہوتی۔
- آیت مذکورہ کے متعلق خود الطبری کے بیانات مقصد تالیف "رسالہ" کے خلاف پائے جاتے ہیں اور الطبری نے یہاں جن اقوال کو ترجیح دی ہے، وہ مضمون "رسالہ" کے متضاد متخالف ہیں جیسا کہ گزشتہ سطور میں واضح کر دیا ہے۔
- آیت کے مفہوم اور محمل بیان کرنے میں علماء کا جو اتفاق و اجماع ہے، وہ مذمت والے معانی کے برعکس پایا گیا ہے اور اس کا ناقل خود الطبری ہے۔
- نیز علمائے مفسرین نے (منبر پر کودنے والی روایات) کو مجروح و ضعیف قرار دے کر رد کر دیا ہے۔ فلہذا وہ روایات، آیت ہذا کی تفسیر و تشریح میں قبول نہیں کی جا سکتیں۔
- اور بالفرض ان مرویات کو کسی درجہ میں تسلیم کر بھی لیا جائے تاہم اکابر علماء القرطبی وغیرہ نے برملا فیصلہ کر دیا ہے کہ حضرت سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ و عمرو بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ایام خلافت اس تنقیص و مذمت میں داخل

نہیں بلکہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔

پس واضح ہوگیا کہ ان ہر سہ حضرات کے ادوار خلافت تنقیص و مذمت کے ہرگز مستحق نہیں بلکہ اپنی بہترین اسلامی خدمات کی وجہ سے صد تحسین کے لائق ہیں۔

تیسری آیت

"رسالہ" مذکور کے مولف نے اپنے مقصد کے اتمام کے لیے یہاں تیسری آیت درج ذیل ذکر کی ہے۔

...ومنه ما انزل الله على نبيه فى سوره القدر ليله القدر خير من الف شهر من ملك بنى اميه۔

ناظرین کرام کو معلوم ہونا چاہیے کہ مولف رسالہ نے اختصار سے کام لیتے ہوئے یہاں اتنا قدر ہی ذکر کیا ہے کہ موجبات لعن میں سے یہ چیز کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر علیہ السلام پر سورۃ القدر نازل فرمائی اس میں لیلتہ القدر ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے اور مولف رسالہ نے کہا کہ وہ ہزار مہینے ملک بنی امیہ ہے۔

پھر ملک بنی امیہ کی مذمت و تنقیص ثابت کرنے کے لیے طعن کرنے والوں نے آیت ہذا میں اس روایت کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں مذکور ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے منبر پر بنوامیہ کو خطبہ دیتے ہوئے اور بعض روایات کی رو سے چڑھتے اترتے ہوئے دیکھا... الخ، تو آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو برا معلوم ہوا۔ چنانچہ اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی تسلی خاطر کے لیے سورۃ الکوثر اور سورۃ القدر نازل فرمائی۔

پھر راویوں نے یہاں مزید بات بڑھائی ہے کہ ہم نے حساب لگایا تو (الف شہر) ہزار مہینہ مملکت بنوامیہ کی مدت کے برابر ثابت ہوا۔

حاصل یہ ہے کہ آیت الف شہر میں بنی امیہ کا دورِ حکومت مراد ہے اور وہ

آنجناب صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے نزدیک مبغوض و مکروہ ہے۔

الجواب

یہاں جواب کے لیے چند چیزیں ایک ترتیب سے ذکر کی جاتی ہیں جو قابل غور ہیں، ان پر توجہ فرمائیں۔

- آیت خیر من الف شھر کی تشریح میں طعن کنندگان نے جو مذکورہ روایت ذکر کی ہے، اس کے حق میں علمائے فن نے کئی طرح سے کلام کیا ہے مثلاً:
- امام ترمذی رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ہم اس روایت کو (القاسم بن الفضل الحدانی) والے طریقہ سے ہی پہچانتے ہیں (دوسرے کسی طریقہ سے معلوم نہیں ہوسکی) فلہذا اس روایت میں غرابت ہے۔ نیز ابن کثیرؒ نے واضح کیا ہے کہ القاسم بن الفضل خود بھی اور اس کا شیخ یوسف بن مازن بھی جو اس روایت کے راوی ہیں، روایت میں مذکور واقعہ میں خود موجود نہیں تھے لہٰذا روایت مرسل ہوئی اور غرابت تو پہلے ہی اس میں پائی گئی ہے۔
- روایت ہذا کے راوی (القاسم بن الفضل الحدانی) نے یہ قول کیا ہے کہ ہم نے دولت بنوامیہ کا حساب لگایا تو... فوجدھا الف شھر لا تزید یوما ولا تنقص۔الخ یعنی دولت بنی امیہ ہزار مہینہ مدت میں تمام ہوئی، ایک یوم بھی زائد یا کم نہ ہوا۔ القاسم کے اس قول کے متعلق علماء نے فرمایا ہے کہ

...فھو غریب جدا وفیہ نظر......

(البدایہ والنہایہ لابن کثیرؒ ص ۲۴۳، ج۶ تحت بحث ہذا)

یعنی القاسم بن الفضل کے ساتھ کوئی دوسرا شخص اس کا ہم نوا نہیں پایا گیا۔ اس وجہ سے یہ قول نہایت غریب ہے اور وجہ نظر یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، اموی کی خلافت بنوامیہ کی دولت و حکومت ہے جو قریباً بارہ برس پر محیط ہے، اس مدت کو ہزار مہینہ میں نہ من حیث الصورت اور نہ ہی من حیث المعنی داخل کیا جاسکتا ہے۔

وہ اس طرح کہ عثمانی خلافت کا دور اور ان کی حکومت ممدوح اور قابل تحسین ہے کیونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلفائے راشدین میں سے ایک مسلم شخصیت ہیں اور آئمہ ہدیٰ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ ایک منصف و عادل خلیفہ المسلمین تھے اور روایت مذکورہ کے الفاظ ...

...انما سیق لذم دولتھم... الخ۔ یعنی بنوامیہ کی حکومت کی مذمت اور برائی کے لیے جاری کیے گئے ہیں۔ (بالکل متضاد ہیں)

فلہذا عثمانی خلافت کا عہد اس میں داخل نہیں کیا جا سکتا۔

(البدایہ والنہایہ لابن کثیرؒ ص ۲۴۴ ج۹ تحت بحث ہذا)

○ نیز مذکورہ روایت کا بنوامیہ کی حکومت کی مذمت اور برائی پر دلالت کرنا بھی غور طلب ہے۔

کیونکہ روایت کا مفہوم یہ ہے کہ لیلتہ القدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے، اگر وہ ہزار مہینے بنوامیہ کی حکومت کا عہد ہے تو اس سے عہد حکومت اموی پر اس رات کی فضیلت ثابت ہوئی کیونکہ لیلتہ القدر بڑی عظیم البرکت چیز ہے۔

لیکن اس تفصیل اور فضیلت سے بنوامیہ کے عہد حکومت کا مذموم اور مقدوح ہونا لازم نہیں آتا۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ روایت کی صحت ہی قابل تامل ہے اس لیے کہ روایت تو ان کے عہد حکومت کی مذمت و تنقیص کے لیے چلائی گئی لیکن وہ اس مقصد کو پورا نہیں کر سکی اور ثابت کرنے سے قاصر رہی۔

... فما یلزم من تفضیلھا علی دولتھم زم دولتھم فلیتامل ھذا فانہ دقیق یدل علی ان الحدیث فی صحتہ نظر لانہ انما سیق لذم ایامھم۔ واللہ تعالی اعلم۔

(البدایہ والنہایہ لابن کثیرؒ ص ۲۴۴ ج۹ تحت ذکر الاخبار عن خلفاء بنی امیہ، الخ)

اور علماء نے اس روایت کا تجزیہ ایک دوسرے طریقہ سے بھی کیا ہے۔ وہ اس طرح ہے کہ

... اگر دولت بنی امیہ کے دور کی ابتدا (حضرت سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی مصالحت) ۴۰۔۴۱ھ سے اور اختتام ۱۳۲ھ (یعنی عہد حکومت اموی کی انتہا اور خلافت بنو عباس کی ابتداء) شمار کر کے اس پورے عہد حکومت بنو امیہ کا حساب لگایا جائے تو یہ کل میعاد قریباً (بانوے) ۹۲ سال بنتی ہے جو راوی کی روایت کے بالکل متعارض اور مخالف ہے۔

کیونکہ روایت کے مقتضی کے مطابق ایک ہزار مہینہ کے ۸۳ سال اور چار ماہ بنتے ہیں جو بنوامیہ کے عہد حکومت کی مدت قریباً ۹۲ سال کے بالکل خلاف ہے اور مطابقت نہیں رکھتی۔

فلہذا اس مدت کے شمار کے اعتبار سے بھی یہ روایت قابل اعتماد نہیں، اس لیے کہ واقعات فی نفس الامر کے خلاف ہیں۔

پس یہ روایت بدیں وجہ منکر ہوئی اور منکر روایت کو قبول کا درجہ حاصل نہیں۔

...... وکل ھذا مما یدل علی نکارہ ھذا الحدیث۔

واللہ اعلم۔

(البدایہ لابن کثیرؒ ص ۲۴۴ ج ۶ تحت ذکر الاخبار عن خلفاء بنی امیہ، الخ)

(۴) کبار علماء نے اس روایت کے ضعف اور منکر ہونے (یعنی معروف روایات کے خلاف ہونے) پر کئی وجوہ سے کلام چلایا ہے۔

ان وجوہ میں یہ بات بھی ذکر کی ہے کہ روایات ہذا کا مقتضی یہ ہے کہ آیت الف شہر سے مراد ایام بنی امیہ ہوں۔

حالانکہ یہ سورہ (القدر) مکی ہے اور سورہ کے مکی ہونے کی صورت میں اس کو دولت بنی امیہ کی طرف کیسے تحویل کیا جا سکتا ہے؟؟

وجہ یہ ہے کہ نہ آیت کے الفاظ اس چیز پر دلالت کرتے ہیں اور نہ ہی آیت کے معانی اس کی تائید کرتے ہیں۔

دیگر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مدینہ طیبہ میں منبر نبوی (علی صاحبہ السلام) ہجرت سے ایک مدت کے بعد تیار کیا گیا تھا۔ فلہذا روایت کے لحاظ سے یہ رویا قبل از ہجرت مکی دور کا ہے۔

مذکورہ بالا اشیاء ذکر کرنے کے بعد حافظ ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ

...... فهذا كله مما يدل على ضعف الحديث ونكارته، والله اعلم۔

(تفسیر ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ ص ۵۳۰، ج ۴ تحت سورۃ القدر)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ

منبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر بنو امیہ کے خطبہ دینے والی مذکورہ روایات جو دولت بنی امیہ کی مذمت و تنقیص کے لیے پیش کی جاتی ہیں وہ عندالمحدثین صحیح نہیں ہیں بلکہ یہ روایات ضعیف اور منکر ہیں اور قابل قبول نہیں۔ ان کے ذریعے اعتراضات قائم کرنا ہرگز درست نہیں اور ان روایات کو آیات قرآنی کا محمل قرار دینا بے جا اور بے محل ہے اور درست نہیں۔

فلہذا استدلال میں پیش کردہ آیات سے مولف رسالہ کا مقصد پورا نہیں ہو سکا۔

روایات

مولف رسالہ نے اموی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے حق میں آیات سے مذمت و تنقیص ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ روایات کا سلسلہ بھی چلایا ہے۔

مولف رسالہ کی طرف سے پیش کردہ آیات کے جوابات تو بقدر ضرورت ذکر کر دیئے ہیں اور واضح کر دیا ہے کہ مخالفین حضرات جو معانی آیات سے مراد لینا

چاہتے ہیں۔ وہ آیات سے ہرگز ثابت نہیں ہوتے۔

اب رسالہ مذکورہ میں درج کردہ روایات کے جواب حسب توفیق پیش کیے جاتے ہیں۔

مولف نے پہلے حضرت ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف روایات کے ذریعے طعن قائم کیے ہیں، پھر اس کے بعد ان کے فرزند حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے مذمت کی روایات چلائی ہیں۔

مولف رسالہ کا مقصود یہ ہے کہ جس شخص کے خلاف ایسے واقعات اور ایسی روایات پائی جاتی ہیں، وہ اسلام کا دشمن ہے، اعدائے اسلام میں اس کا شمار ہے اور وہ قابل صد نفرین و لعنت ہے۔

اس تسلسل کے پیش نظر ہم بھی پہلے حضرت ابوسفیان صخر بن حرب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی متعلقہ روایات پر تبصرہ و تجزیہ ذکر کرنا مناسب خیال کرتے ہیں اور اس کے بعد حضرت امیر معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی متعلقہ اشیاء کا جواب ناظرین کرام کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

دور جاہلیت میں ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی اسلام دشمنی

مولف رسالہ کہتے ہیں کہ

ابوسفیان پہلا شخص ہے جو (دور جاہلیت میں) اسلام کے خلاف علم بردار تھا۔ رئیس المحاربین تھا۔ بدر، احد، خندق وغیرہ غزوات میں اہل اسلام کے دشمنوں کا قائد تھا اور جنگی مراحل میں ان کا سردار تھا... اللہ کی کتاب میں بھی ملعون ہے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان پر بھی متعدد مواضع و مقامات میں اس پر لعنت کی گئی ہے۔ بعد میں اسلام کا غلبہ ہوا تو اوپر سے اسلام لایا مگر دل میں کفر رکھا وغیرہ وغیرہ۔

مولف رسالہ نے پہلی شق میں حضرت ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق

میں جن امور کو موجب لعن و طعن شمار کیا ہے۔ تمام کے تمام ہی قبل از اسلام یعنی دور جاہلیت کے متعلقہ واقعات ہیں۔

دور جاہلیت کے معاندانہ حالات مسلمات میں سے ہیں اور قبول اسلام سے قبل تمام قریش ہی اسلام کے برملا دشمن تھے۔ ایک ابوسفیان رضی اللہ عنہ کیا خود بنی ہاشم حضرات مثلاً حمزہ بن عبدالمطلب اور ابوسفیان بن الحارث بن عبدالمطلب وغیرہ اسلام لانے سے قبل اسلام کے شدید ترین دشمن تھے اور ہر موقعہ پر عداوت کا مظاہرہ کرتے تھے۔

قبل الاسلام کے مخالفانہ واقعات کو موجبات لعن و طعن میں چن چن کر شمار کرنا کسی صورت میں درست نہیں۔ مولف رسالہ نے ان چیزوں کو مدون کر کے اپنے قبائلی تعصب کا اظہار کیا ہے اور قلبی عداوت کو واضح کیا ہے' اس کے سوا کچھ نہیں۔

یہ بات عیاں ہے کہ ابوسفیان صخر بن حرب قبول اسلام سے پہلے اسلام کے برملا دشمن تھے اور معارضہ کے مقامات پر اپنی دشمنی کا خوب اظہار کرتے تھے۔

لیکن جب آنموصوف رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کر لیا تو دین کے تابع فرمان ہو گئے اور پیغمبر اسلام علیہ الصلوۃ والسلام کے غلام اور خادم بن گئے۔ (جیسا کہ آخر بحث میں اس چیز پر شواہد ہم عنقریب ذکر کر رہے ہیں)

اسلام کا ضابطہ یہ ہے کہ:

...ان الاسلام یھدم ما کان قبلہ اور بروایت دیگر (ان الاسلام یجب ما کان قبلہ' الخ۔

یعنی جب انسان مسلمان ہو جاتا ہے تو قبل از اسلام کی سب غلطیاں اور تمام خطائیں معاف کر دی جاتی ہیں۔

چنانچہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی خطائیں بھی اسی ضابطہ کے تحت معاف ہو گئیں اور ان کا اسلام منظور و مقبول ہوا۔

فلہذا دور جاہلیت کی خطاؤں اور لغزشوں کو دور اسلام میں پھر گنوانا اور بار بار

شمار کرنا اسلام کے آئین و ضوابط کے بالکل خلاف اور برعکس ہے اور طریق استدلال کے خلاف ہے۔ پس ان چیزوں کو موجب لعن و طعن قرار نہیں دیا جا سکتا۔

سوار اور سواری ہانکنے وچلانے والے پر لعنت

مرتب رسالہ نے اپنے ایک دیگر استدلال میں روایت ذیل میں ذکر کی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بار ابوسفیان کو دیکھا کہ ایک گدھے پر سوار ہو کر آ رہا ہے۔ ان کا فرزند معاویہ سواری کو آگے سے کھینچے جا رہا ہے اور ابوسفیان کا دوسرا بیٹا یزید بن ابی سفیان سواری کو پیچھے سے ہانک رہا ہے۔

اس منظر کو دیکھ کر رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ لعنت کرے اللہ کھینچنے والے پر سوار پر اور سواری کو پیچھے سے ہانکنے والے پر۔

فلہذا یہ تینوں باپ بیٹے لعنت کے مستحق ہیں۔

اس روایت کے متعلق مندرجہ ذیل امور ذکر کیے جاتے ہیں' ان پر توجہ فرمائیں۔ بطلان استدلال واضح ہو جائے گا۔

○ استدلال کرنے والے نے سید دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے اس روایت کو منسوب کیا ہے۔ یہاں معلوم کرنا ضروری ہے کہ محدثین نے احادیث نبوی ﷺ کے جو ذخائر مرتب کیے ہیں' ان میں سے کون سے ذخیرہ حدیث میں یہ روایت باسند موجود ہے؟؟

اگر کسی محدث نے اسے نقل کیا ہے تو اس کی صحیح سند مطلوب ہے؟؟ اور اگر یہ روایت کسی دروغ گو' جعل ساز' ناقابلِ اعتماد اور عناد رکھنے والے راوی سے منقول ہے تو اس کا قطعاً اعتبار نہیں ہو گا۔

نیز صحت واقعہ کے لیے صحیح سند کا پایا جانا ایک لازمی امر ہوتا ہے۔ اگر بالفرض کسی روایت میں واقعہ مذکورہ بالا پایا جاتا ہے' لیکن اس روایت کی سند مجروح و

مقدوح ہے تو وہ تسلیم نہیں ہوگی۔

○ اگر واقعہ ہذا پر قلیل سا غور و فکر کر لیا جائے تو بھی مسئلہ صاف ہو سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ اس موقعہ پر ان باپ بیٹوں سے کون سی معصیت اور خطا سرزد ہوئی تھی جس کی بنا پر مستوجب لعنت قرار دیئے گئے؟؟ اور بغیر کسی گناہ و خطا کے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے لعنت کیسے فرمائی؟؟ یہ چیز اپنی جگہ پر قابل غور و فکر ہے۔

○ اور بالفرض والتقدیر اس واقعہ کو کسی درجہ میں مان بھی لیا جائے تو بھی یہ واقعہ اس دور کے مسلم واقعات کے متعارض و مخالف پایا جاتا ہے اور مشاہدات کے برعکس ہے۔ (عنقریب ان حضرات کے مسلم واقعات ہم ذکر کر رہے ہیں) اور کسی روایت کا نفس الامر واقعات کے خلاف پایا جانا اور غیر مطابق ہونا اس کے عدم صحت کی دلیل ہوتی ہے۔

مختصر یہ ہے کہ مندرجہ امور کی روشنی میں یہ واقعہ بالا ہرگز درست نہیں اور قابل استدلال نہیں۔

ابوسفیان کا آخرت سے انکار

تیسری چیز "رسالہ" کے مولف نے یہ ذکر کی ہے کہ

روایات کے راوی ابوسفیان بن حرب سے یہ بات روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ابوسفیان نے تمام قبیلہ بنو عبد مناف کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تم لوگ اس (جماعت اہل اسلام) کو ایک حملہ ہی میں جلدی گرفت میں لے لو۔ (یعنی ان کو بڑھنے کی مہلت نہ دو) پس وہاں (یعنی آخرت میں) کوئی جنت و دوزخ نہیں۔

مولف رسالہ کہتے ہیں کہ ابوسفیان کا یہ قول خالص کفریہ ہے۔ اس پر خدا کی لعنت لاحق ہو۔ جیسا کہ بنی اسرائیل کے کفار پر خدا کی لعنت حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے لاحق ہوئی تھی۔ اس وجہ سے کہ وہ لوگ

نافرمان ہوگئے اور دین کی حدود سے بڑھ گئے تھے۔

یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ ابوسفیان کا یہ قول کس محدث نے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے؟؟ کون سی حدیث کی کتاب میں صحیح سند کے ساتھ منقول ہے؟؟

○ پھر اس کے بعد یہ دیکھنا ہوگا کہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے اگر یہ قول ذکر کیا ہے تو کس دور میں کہا ہے؟؟ جاہلیت کے دور کا یہ کلام ہے؟ یا اسلام کے بعد کا یہ واقعہ ہے؟؟

اس تصریح و توضیح کے بغیر اس کو پیش کرنا غلط امر ہے، پہلے اس کی وضاحت درکار ہے۔

مقصد یہ ہے کہ اگر یہ کلام قبل از قبول اسلام کا ہے تو جواب کی حاجت ہی نہیں اور اگر اسلام قبول کرنے کے بعد کا واقعہ ہے تو ابوسفیان کی طرف یہ انتساب بالکل غلط ہے اور ہرگز صحیح نہیں ہے کیونکہ کوئی مسلمان اسلام لانے کے بعد ایسا قول نہیں کر سکتا پھر جنت و دوزخ کی نفی کر دینا نص قرآنی کا انکار ہے اور نص قرآن مجید کا انکار کر کے کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟؟

○ دیگر یہ بات نہایت ہی قابل غور ہے کہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اسلام لانے کے بعد تمام زندگی اور اسلام کے دور کے واقعات اور اسلامی خدمات کے ساتھ واقعہ ہذا کی مطابقت نہیں پائی جاتی۔ ان کے درمیان بون بعید ہے (جیسا کہ ہم آخر بحث میں ان کو پیش کر رہے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ)

فلہذا یہ روایت یقیناً جعلی اور وضعی ہے، اس کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

ابوسفیان کے گستاخانہ کلمات

مولف رسالہ نے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ بن حرب کے حق میں ایک یہ روایت بھی موجبات میں ذکر کی ہے کہ

(ابوسفیان نابینا ہو چکے تھے) تو ایک بار جبل احد کی گھاٹی پر کھڑے ہوئے اور

اپنے قائد ساتھی سے کہنے لگے کہ "یہ وہ مقام ہے جہاں سے ہم نے محمد و اصحاب محمد کو ہٹایا اور دفع کیا تھا۔"

○ اس کے متعلق تحریر کیا جاتا ہے کہ

کون سی صحیح روایت میں مروی ہے؟ پہلے اس کی صحت سند کا معلوم ہونا ضروری ہے۔ کوئی بے سروپا تاریخی روایت ہم پر حجت نہیں ہوسکتی۔ کوئی صحیح روایت طعن کے لیے پیش کرنی چاہیے جس کا جواب دیا جائے۔

دیگر امر یہ ہے کہ جناب ابوسفیان رضی اللہ عنہ، آخر عمر میں بینائی سے محروم ہوگئے تھے۔ اس دور میں اگر یہ واقعہ پیش آیا ہو اور حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ، نے اسلام لانے سے قبل کا بطور گزشتہ واقعہ کے ذکر کیا ہو کہ ہم نے اہل اسلام کو اس مقام میں شکست دی تھی، مگر معبر نے اس کی تعبیر اس طرح کردی ہو جس سے حقارت و تحقیر معلوم ہوتی ہے، یہ صرف ایک احتمال کے درجہ میں توجیہہ کی جاسکتی ہے۔

لیکن یہ بات کہ جناب ابوسفیان رضی اللہ عنہ، نے بعد از اسلام نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات کے خلاف کوئی کلمہ تحقیر یا خفت آمیز کلام کہا ہو، یہ ہرگز ثابت نہیں ہے۔ اگر کسی روایت میں ایسا کلام مروی ہے تو وہ روایت بالکل غلط ہے۔ قلبی عناد رکھنے والے راویوں اور رفض و تشیع کے مریض ناقلین کی چلائی ہوئی وہ روایت ہوگی۔

آخر بحث

گزشتہ سطور میں ہم نے متعدد بار یہ ذکر کیا ہے کہ یہ روایات جو آیات قرآنی کے تحت درج کی ہیں، یا انہیں لعن و طعن ثابت کرنے کے لیے مولف رسالہ نے مستقلاً پیش کیا ہے، یہ تمام مرویات (عہد نبوی) کے واقعات کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتیں اور اس دور مقدس میں جو حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ، کے حالات بعد از اسلام پائے گئے، ان سے ان روایات کی موافقت قطعاً نہیں پائی جاتی۔

وجہ یہ ہے کہ جب سے جناب ابو سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلام لائے ہیں، اس کے بعد انہوں نے دینی خدمات سرانجام دیں اور نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کے ارشادات کے موافق اعلیٰ کارنامے سرانجام دیئے اور اہلِ اسلام کے ساتھ دین کے اہم امور میں شریک و شامل رہے۔ بعض اہم ملی و قومی واقعات میں ان کی ذات پر (کامل) اعتماد کیا گیا۔

چنانچہ ہم ذیل میں حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے بعد کے چند اہم واقعات کو ایک ترتیب سے سطور ذیل میں پیش کرتے ہیں۔ ان پر غور کرنے کے بعد ایک منصف مزاج آدمی حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کی شخصیت کے متعلق خود فیصلہ کر سکے گا کہ جناب ابو سفیان رضی اللہ عنہ کس کردار کے مالک اور کن خصائل کے حامل تھے؟ اور راویوں کی مندرجہ بالا روایات ان کو کس شکل میں پیش کرتی ہیں؟؟ اس طریقہ سے ایک انصاف پسند اور باشعور انسان کے لیے اس معاملہ میں غلط اور صحیح چیز کے درمیان امتیاز کر لینا مشکل نہیں رہے گا۔ درج ذیل واقعات پر بنظر غور توجہ فرمائیں۔

عہدِ نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کے متعلق چند اہم واقعات

(۱) خاندانِ نبوت کے ساتھ حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کی قرابت داری یہ ہے کہ حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کی دختر رملہ بنت ابی سفیان نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اہلیہ تھیں۔ یہ ام المومنین امِ حبیبہ کے نام سے مشہور ہیں اور ازواج مطہرات میں ان کا اہم مقام ہے۔

(الاصابہ لابن حجر عسقلانی (معہ الاستیعاب) ص۲۹۹، ج۴، تحت رملہ بنت ابی سفیان)

(۲) حضرت ابو سفیان فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے۔ ان کا اسلام لانا منظور ہوا

اور ان کی دار (حویلی) کو دارالامن قرار دیا گیا۔

......من دخل دار ابی سفیان فھو آمن۔

(مسلم شریف ص ۱۰۴ ج ۲ باب فتح مکہ، طبع دہلی)

(۳) فتح مکہ کے بعد حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ، جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قیادت میں غزوہ حنین میں اپنے دونوں فرزندوں یزید بن ابی سفیان اور معاویہ بن ابی سفیان سمیت شریک و شامل ہوئے۔

(اسد الغابہ لابن اثیر الجزری ص ۱۲۔۱۳ جلد ثالث صخر بن حرب)

نیز غزوہ حنین میں کفار کے قیدیوں کو کچھ مدت کے لیے زیر حراست رکھنے کی ضرورت پیش آئی تو اس اہم ذمہ داری کے لیے جناب ابوسفیان رضی اللہ عنہ پر اعتماد کرتے ہوئے نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کو نگران مقرر فرمایا اور حضرت ابوسفیان نے اس اہم فریضہ کو بطریق احسن سرانجام دیا۔

(المصنف لعبد الرزاق ص ۳۸۱ ج ۵، تحت واقعہ حنین)

(۴) اسی سال ۸ھ میں غزوہ طائف پیش آیا اس میں حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ، اسلامی افواج کے ساتھ شریک جہاد ہوئے اور اس موقعہ پر ان کی ایک چشم تیر لگنے کی وجہ سے ضائع ہو گئی اور اس طرح آنموصوف رضی اللہ عنہ نے اسلام کی خاطر اپنی ایک چشم کی قربانی پیش کی اور ثواب حاصل کیا۔

(الاصابہ لابن حجر ص ۱۷۲، ۱۷۳ جلد ثانی، تحت صخر بن حرب)

(۵) علاقہ نجران الیمن جب فتح ہو گیا تو اس کے صدقات پر حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ، کو عامل اور امیر بنایا گیا۔

(۱) السنن للدار قطنی ص ۴۹ جلد رابع، تحت کتاب الطلاق روایت نمبر ۱۴۴، طبع مصر۔

(۲) کتاب نسب قریش لمصعب الزبیری ص ۱۲۲ تحت ولد حرب بن امیہ۔

(۶) قبیلہ بنی ثقیف اسلام لائے تو ان کے ہاں ایک بت (لات) نصب تھا۔ اس بت شکنی کے لیے جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ، اور

مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ دونوں کو ارسال فرمایا اور انہوں نے جا کر اس بت کو پاش پاش کر دیا۔

(۱) سیرت ابن ہشام ص ۵۴۰-۵۴۱، جلد ثانی، تحت حالات وفد ثقیف۔

(۲) البدایہ لابن کثیرؒ ص ۳۰-۳۳، جلد خامس، تحت قدوم وفد ثقیف۔

(۷) قبیلہ بنی ثقیف میں دو شخص مسمی "عروۃ" اور "الاسود" مقروض تھے۔ بنی ثقیف کے پاس (الطاغیہ) کے نام سے قوم میں بہت سے اموال موجود تھے۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے ان اموال کو فراہم کیا اور فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق جناب ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے مذکورہ دونوں اشخاص کے قرض کو ان اموال سے ادا کیا۔ (سیرت ابن ہشام ص ۵۴۲، تحت امر وفد ثقیف واسلامہا)

(۸) اہلِ اسلام و اہلِ نجران (اہلِ کتاب) کے درمیان ایک عہد نامہ تحریر کیا گیا تھا۔ یہ سید دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے تحت لکھا گیا اور اس عہد نامہ پر بطور شاہد کے مسلمانوں کی طرف سے جن پانچ حضرات کے دستخط کیے گئے تھے، ان میں سے ایک جناب ابوسفیان بن حرب بھی تھے۔

(۱) البدایہ لابن کثیرؒ ص ۵۵، ج ۵، تحت واقعہ ہذا عہد نامہ اہلِ نجران۔

(۲) کتاب الخراج لامام ابی یوسفؒ ص ۷۳، تحت قصہ نجران۔

(۹) آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ مکہ مکرمہ میں کچھ اموال ارسال فرمائے اور ابوسفیان کی تحویل رضی اللہ عنہ میں دے کر انہیں قریش مکہ میں تقسیم کرنے کا اہم فریضہ تفویض کیا۔ عمرو بن الفغواء نے یہ اموال پہنچانے کی خدمت سرانجام دی تھی۔

(۱) السنن الکبریٰ ص ۱۲۹ جلد عاشر، کتاب آداب القاضی۔

(۲) تہذیب التہذیب لابن حجر ص ۳۴۰ جلد خامس، تحت عبداللہ بن عمرو بن فغواء۔

(۱۰) ایک مرتبہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی طرف سے عجوہ کے خرما ہدیتاً ارسال فرمائے اور فرمان دیا کہ آپ اس کے

عوض میں عمرو بن امیہ ضمری کے ہاتھ چمڑے کی کھال بھیجیں تو حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے اس ہدیہ کو قبول کیا اور کھال ہدیتاً ارسال کی اور فرمانِ نبوی ﷺ کو بجا لائے۔

(۱) الاصابہ لابنِ حجر ص ۱۷۲-۱۷۳ جلد ثانی، تحت صخر بن حرب۔

(۲) کتاب الاموال لابی عبید القاسم بن سلام ص ۲۵۷ روایت نمبر ۶۴۳ طبع مصر۔

تنبیہہ

مندرجہ بالا اہم واقعات کی تفصیل اور مزید حوالہ جات مطلوب ہوں تو ہمارے کتابچہ (حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور ان کی اہلیہ) کی طرف رجوع کریں وہاں بقدر ضرورت زیادہ مواد درج کیا گیا ہے۔ کتابوں کے حوالے بھی ساتھ نقل کر دیئے ہیں۔

خلاصہ کلام

مختصر یہ ہے کہ

عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میں ان پیش آمدہ واقعات پر نظرِ انصاف کرنے اور غور کرنے سے واضح ہو رہا ہے کہ جناب ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلام لانے کے بعد اسلام کے صحیح خادم اور متبع فرمان نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تھے اور اخلاص کے ساتھ اہل اسلام کی معیت میں ملی خدمات سرانجام دیتے اور فرمانِ نبوی ﷺ کو بجالاتے تھے۔

مولف رسالہ نے جن روایات کو موجبات لعن بنا کر پیش کیا ہے، وہ سراسر غلط اور بے سروپا ہیں، تاریخی ملغوبات سے زیادہ ان کا مقام نہیں۔

وجہ یہ ہے کہ کم و بیش دس عدد اہم واقعات جو ہم نے عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں ذکر کیے ہیں۔ ان کے ساتھ مولف رسالہ کی ذکر کردہ روایات کوئی مطابقت اور موافقت نہیں رکھتیں۔

اور قاعدہ بھی یہی ہے کہ جو روایات نفس الامر واقعات کے خلاف پائی جائیں، وہ قابلِ تسلیم نہیں ہوتیں، وہ سراسر جعلی اور وضعی ہوتی ہیں۔ بنابریں ہم اس چیز کے بیان کرنے میں حق بجانب ہیں کہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے باعزت صاحب کردار اور مخلص صحابی ہیں۔ ان کی شان میں نفاق کا قول کرنا یا حقارت و تحقیر کے کلمات کہنا اسلام میں منع ہیں اور ان کی عزت و تکریم کو ملحوظ رکھنا واجب ہے۔ جیسا کہ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے احترام کو ملحوظ رکھنا اہلِ اسلام پر لازم ہے۔

الحکم بن ابی العاص کے متعلق طعن کا ازالہ

ایک اعتراض مولفین "رسالہ" نے یہ تجویز کیا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے چچا حکم بن ابی العاص کو نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بعض شدید خطاؤں کی بنا پر مدینہ شریف سے جلاوطن کردیا تھا (لہٰذا اس شخص کو لوگ طرید النبی کہتے ہیں) اس کو واپس بلا کر فرمانِ نبوی ﷺ کے خلاف کر ڈالا۔

اس اعتراض کے ازالہ کے لیے ہم نے قبل ازیں اپنی تالیف "مسئلہ اقربا نوازی" میں مفصل کلام کر دیا ہے، تاہم یہاں بھی مختصراً جواب پیشِ خدمت ہے۔

اس اعتراض کو "جلاوطنی" کے عنوان سے ذکر کرتے ہیں۔

اولاً یہ واقعہ احادیث صحیحہ کی مشہور کتب میں مفقود ہے اور اس کی صرف تاریخی حیثیت ہے اور تاریخ میں رطب و یابس صحیح و سقیم ہر قسم کی روایات پائی جاتی ہیں، ان کی صحت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

ثانیاً، اگر بالفرض اس واقعہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے متعلق مورخین نے تصریح کر دی ہے کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فرمان سے اگر حکم کو جلاوطن کر دیا گیا تھا تو نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بعد میں اسے معاف فرما دیا اور آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اجازت سے ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے

عہدِ خلافت میں اسے واپس بلوایا گیا تھا۔

تفصیلات و حوالہ جات کے لیے ہماری تالیف "مسئلہ اقربا نوازی" تحت ازالہ شبہات ص ۲۷۲ تا ۲۷۹ کی طرف رجوع فرمائیں۔

حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے متعلق موجبات لعن و طعن

طعن کنندگان نے اس مقام میں قریباً کم و بیش آٹھ عدد واقعات اور روایات فراہم کی ہیں جن کو انہوں نے موجبات لعن و طعن شمار کر کے پیش کیا ہے۔

لا اشبع اللہ کا طعن

(ا) "رسالہ" کے مرتبین نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر طعن قائم کرنے کے لیے ذیل روایت اپنے الفاظ میں اس طرح درج کی ہے کہ

... ومنه رسول الله صلى الله عليه وسلم دعا بمعاويه ليكتب بامره بين يديه، فدافع بامره واعتل بطعامه، فقال النبى "لا اشبع الله بطنه فبقى لا يشبع ويقول والله ما اترك الطعام شبعا ولكن اعياه۔"

مطلب یہ ہے کہ ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے سامنے ایک تحریر لکھوانے کی ضرورت پیش آئی تو آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو بلوایا۔ پس اس نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو ٹالا اور اپنے طعام کھانے کا عذر پیش کیا۔ اس پر جناب پیغمبر علیہ السلام نے بددعا کے کلمات فرمائے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بطن کو سیر نہ کرے۔ پھر معاویہ اس کے بعد طعام سے سیر نہ ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ میں سیر ہو جانے سے طعام کو نہیں چھوڑتا بلکہ میں تھک جاتا ہوں۔

معترض کا مقصد یہ ہے کہ جناب رسول خدا کی بددعا کی وجہ سے وہ طعام سے سیر نہ ہو سکتے تھے۔

درجہ جواب میں ذکر کیا جاتا ہے کہ دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں یہ واقعہ پیش آیا تھا اور آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جناب میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی تحریر خدمت کا بہترین یہ واقعہ ہے جسے روایت کے راویوں کے تصرفات نے لائق طعن اور قابل اعتراض امر بنا دیا۔

روایت ہذا مسندات عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں ہے۔ پھر ابن عباس رضی اللہ عنہ کے دیگر مسندات کے لیے جب دوسری حدیث کی باسند کتابوں سے رجوع کیا گیا تو معاملہ صاف ہو گیا۔

وہ اس طرح کہ مسند امام احمد رحمتہ اللہ علیہ جلد اول طبع مصر قدیم ص ۲۹۱ اور ۳۳۵ تحت مسندات ابن عباس مذکورہ بالا واقعہ درج ہے لیکن ان مقامات میں نہ تو ابن عباس رضی اللہ عنہ کو بار بار حضرت امیر معاویہ کو بلانے کے لیے ارسال کرنا درج ہے اور نہ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کو طعام کھانے کے بہانہ سے ٹالنے کا ذکر ہے۔

اسی طرح ان مقامات میں نہ ہی جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا "لا اشبع اللہ بطنہ" کا کلمہ فرمانا مذکور ہے اور نہ ہی یہ چیز منقول ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کھاتے کھاتے تھک جاتے تھے اور سیر نہیں ہوتے تھے اور یہ بددعا نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا نتیجہ تھا۔

بلکہ وہاں صرف اصل واقعہ اس طرح مذکور ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کو جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جاؤ، معاویہ رضی اللہ عنہ کو میرے لیے بلا لاؤ۔ امیر معاویہ آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منشی اور کاتب تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں دوڑ کر گیا اور معاویہ رضی اللہ عنہ کو جا کر کہا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آپ کی ضرورت ہے اور بلاتے ہیں، آپ حاضر ہوں، چنانچہ

امیر معاویہ حسب فرمان آنجناب ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خدمت سرانجام دی۔

البتہ مورخ البلاذری نے اپنی تصنیف انساب الاشراف جلد رابع کے ص۱۰۶ پر ترجمہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے تحت واقعہ ہذا تحریر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

...قال ابو حمزہ فکان معاویہ بعد ذالک لا یشبع۔

یعنی راوی ابو حمزہ نے اپنی جانب سے یہ بات کہی ہے کہ اس کے بعد معاویہ رضی اللہ عنہ سیر نہیں ہوتے تھے۔

حاصل یہ ہے کہ اصل واقعہ میں طعن و تشنیع کی چیزیں بالکل مفقود ہیں اور نہیں پائی جاتیں۔ راویوں کے تصرفات سے یہ اعتراضات قائم کیے گئے ہیں اور بددعا کے کلمات بھی راوی کی اپنی طرف سے واقعہ میں ایزاد کردہ ہیں اور اس پر نتیجہ کا ترتب بھی اسی کی جانب سے ہے۔

اس چیز پر قرینہ یہ ہے کہ امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی تالیف تاریخ کبیر جلد رابع قسم ثانی کے ص۱۸۰ تحت باب وحشی تحریر کیا ہے کہ

...کان معاویہ ردف النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا معاویہ! ما یلینی منک؟ قال بطنی، قال اللھم املاہ علما وحکما۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک دفعہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جناب نبی کریم ﷺ کے پیچھے ایک سواری پر سوار تھے۔ جناب نبی اقدس ﷺ نے دریافت فرمایا: اے معاویہ! آپ کے جسم کا کون سا حصہ میرے زیادہ قریب ہے؟ تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میرا شکم۔ تو اس پر جناب نبی کریم ﷺ نے دعا دیتے ہوئے فرمایا کہ اللہ! اسے علم اور حلم (بُردباری) سے پُر فرمادے۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ طعن والی روایت میں بددعا کے کلمات راویوں کے

تصرفات میں سے ہیں۔ ورنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بہتر دعائیں حاصل ہیں۔

مزید اس روایت پر تفصیل سے بحث ہم نے اپنی کتاب سیرت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جلد ثانی (جواب المطاعن) کے ص۹۵ تا ۱۰۱ درج کر دی ہے، رجوع فرمائیں۔

غیر ملت پر محشور ہونے کا طعن

(۲) مولف رسالہ نے دیگر روایت برائے موجبات لعن و طعن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یہ نقل کی ہے کہ:

...ومنه ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: يطلع من هذا الفج رجل من امتى يحشر على غير ملتى فطلع معاويه۔

مطلب یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ارشاد فرمایا کہ میری امت میں سے ایک شخص اس راستہ سے رُونما ہوگا اس کا حشر اور انجام میری ملت و دین پر نہیں ہوگا۔ پس ناگہاں معاویہ اس راستہ سے ظاہر ہوئے۔

مولف رسالہ نے اس روایت کی تخریج کسی معروف مصنف کی طرف بالکل نہیں کی اور نہ ہی لکھا ہے کہ فلاں محدث مفسر یا کسی مشہور عالم نے اسے اپنی تصنیف میں نقل کیا ہے۔

کسی روایت کو اس طرح بے سند و بے تخریج پیش کر دینے سے اس کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ پہلے تخریج معلوم کرنا ضروری ہے تاکہ اس کی صحت و سقیم کا تجزیہ کیا جا سکے۔

دیگر یہ چیز قابلِ ذکر ہے کہ شیعہ کی تصانیف میں اس نوع کی شیعی روایات ان کے ہاں پائی جاتی ہیں جو ہم پر حجت نہیں ہو سکتیں۔ شیعوں نے صحابہ کرام رضی

اللہ تعالیٰ عنہم کے خلاف بہت کچھ روایات مدون کر دی ہیں جو جمہور اہلِ اسلام کے نزدیک سب غلط وضعی اور جعلی مرویات ہیں۔

○ بصورت دیگر روایت مندرجہ بالا کو درایت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو بھی بے اصل اور بے سروپا ہے' اس لیے کہ جناب نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم نے ایسے شخص کو جس کا انجام بے دینی اور کفر پر ہوگا' اس کو تمام زندگی میں مصاحب و ہم نشین کیسے بنائے رکھا؟ اور اسے وحی خداوندی اور غیر وحی کی کتابت پر کیسے مامور رکھا؟ اور یہ اہم منصب اس کے سپرد کیسے کر دیا؟ حاضر باش انشاء نویس کا مرتبہ تو بہت ہی قابلِ اعتماد ہوتا ہے' اس کو آزمانے اور جانچنے کے بغیر کیسے قبول کر لیا گیا؟؟

پھر اس کے ساتھ ساتھ دیگر اہم واقعات عہدِ نبوی ﷺ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ کس طرح صحیح ہوئے؟ (جن کی تفصیل ہم عنقریب پیش کر رہے ہیں)

ان واقعات و حالات کے ساتھ مذکورہ روایت کی مطابقت و موافقت قطعاً نہیں پائی جاتی۔

ان تمام اشیاء پر نظر کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ روایت مذکورہ بالا فرضی افسانہ کے درجہ میں ہے اور اس کا کچھ اصل نہیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی فضیحت اور رُسوائی نشر کرنے کے لیے تیار کی گئی ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے قتل کا فرمان

(۳) رسالہ کے مدون نے ایک دیگر روایت اس طرح ذکر کی ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

... منہ ان رسول اللہ ﷺ قال: انا رایتم معاویہ علی منبری فاقتلوہ۔

یعنی جب تم میرے منبر پر معاویہ کو دیکھو تو اسے قتل کر ڈالو۔

روایت ہذا کے بے اصل ہونے کے متعلق مشاہیر علماء کرام نے سخت تنقید اور جرح کر دی ہے۔

چنانچہ امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی تالیف "تاریخ صغیر" میں اس روایت کے متعلق درج ذیل الفاظ تحریر کیے ہیں۔

...هذا مدخول ولم يثبت... وهذا واه۔ (تاریخ الصغیر للبخاری" ص۶۹-۶۸، تحت عصر من بین الستین الی السبعین، طبع اول، قدیم الہ آباد)

یعنی روایت بالا میں یہ الفاظ بزور داخل کیے گئے ہیں اور درجہ ثبوت کو نہیں پہنچے۔ نیز فرمایا کہ یہ روایت بالکل بے اصل ہے۔ (ثابت نہیں)

اور علماء نے لکھا ہے کہ حسن بصریؒ کی طرف عمرو بن عبید المعتزلی نے یہ منسوب کیا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس وقت تم معاویہ رضی اللہ عنہ کو میرے منبر پر دیکھو تو قتل کر دو۔

اس روایت کا حسن بصریؒ سے انتساب بالکل جھوٹ اور کذب ہے۔

خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ بغداد میں عمرو بن عبید المعتزلی مذکور کے ترجمہ کے تحت اس روایت پر خوب جرح اور نقد کر دیا ہے اور عمرو بن عبید المعتزلی کو جعل سازی کو واضح کر دیا ہے۔

(تاریخ بغداد للخطیب ص۱۸۰-۱۸۱ جلد ۱۲ تحت ترجمہ عمرو بن عبید المعتزلی)

تنبیہ: یہ روایت معتزلہ نے چلائی ہے۔ معتزلہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سخت خلاف ہیں۔

کتاب "وقعتہ الصفین" میں "نصر بن مزاحم المنقری" نے بھی یہ روایت ذکر کی ہیں۔ نصر بن مزاحم المنقری بد زبان رافضی ہے اس کی روایات جو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے خلاف پائی جاتی ہیں وہ بلاشک دروغ محض ہیں اور ہم پر حجت نہیں۔

نصر بن مزاحم المنقری کے ترجمہ کی طرف رجوع فرماویں، تسلی ہو جائے گی۔

درایت کے اعتبار سے

یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بفرمان فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ علاقہ شام کے امیر بنائے گئے اور قریباً دس برس امیر شام رہے لیکن صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے کوئی ایک صاحب بھی ان کو منبر پر قتل کرنے کے لیے نہیں اٹھا جو ان کا منبر پر خاتمہ کر دیتا۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو دین کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا کوئی خوف نہیں ہوتا تھا۔

...ولا یخافون لومہ لائم---الخ (قرآن مجید، پارہ ششم)

اس بحث کی مزید تفصیل کے لیے ہماری کتب سیرت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، جلد ثانی (جواب المطاعن) ص ۳۴۰ تا ۳۴۶ ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت معاویہ کے لیے دوزخ میں تابوت

(۴) "رسالہ" تدوین کرنے والوں نے موجبات لعن و طعن شمار کرنے میں مندرجہ ذیل روایت بھی درج کی ہے کہ

...ومنہ الحدیث المرفوع المشھور انہ قال ان معاویہ فی تابوت من نار فی اسفل درک منھا ینادی یا حنان یا منان الان وقد عصیت قبل وکنت من المفسدین۔

مطلب یہ ہے کہ حدیث مرفوع اور مشہور اس طرح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کو معاویہ آگ کے ایک تابوت میں ہوگا جو دوزخ کے نچلے درجہ میں ہے اور آواز دے گا کہ اے حنان! اے منان! اور اعتراف کرتے ہوئے کہے گا: اس سے قبل میں نافرمان تھا اور مفسدین میں سے تھا۔

باعتبار روایت کے "رسالہ" مرتبہ کرنے والوں کی طرف سے اس روایت پر مرفوع اور مشہور کا حکم لگانا بہتان صریح سے کم نہیں۔ اس لیے کہ احادیث کے

مشہور ذخائر صحاحِ ستہ و غیر صحاحِ ستہ میں یہ دستیاب نہیں اور اگر یہ روایت کسی ایسے ذخیرۂ روایت میں پائی جائے، جس کا علمائے فن حدیث کے نزدیک کچھ وزن نہیں تو وہ روایت پایہ اعتبار سے ساقط ہوگی۔ پھر ایسی ساقط الاعتبار روایات کی بنا پر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر طعن و تشنیع کرنا دشمنانِ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا فعل اور روافض کا ہی طریق کار ہو سکتا ہے، کسی کتاب و سُنّت کے پابند مسلمان کا یہ رویہ نہیں ہو سکتا۔

باعتبار درایت کے

○ اگر معاویہ بن ابی سفیان ناری جہنمی اور اسفل السافلین میں سے تھا تو ایسے شخص کا اسلام کیسے قبول فرمالیا گیا؟

○ غزوات اسلامی میں اس کی شرکت کیسے درست رکھی گئی؟ اور غنائم و اموال اس کو کیسے عطا فرما دیئے؟

○ کتابت وحی و غیر وحی جیسی اہم ذمہ داری اس کو کیسے تفویض کی گئی؟

○ حاضر باش خادم کی حیثیت سے اس سے مدۃ العمر خدمت کیوں لی گئی؟

○ ناری اور دوزخی کو ایسی بابرکت مجالس سے دور کیوں نہیں کر دیا گیا؟ تاکہ اس کا محروم القسمت ہونا واضح ہو جاتا اور اس کی شقاوت آشکارا ہو جاتی۔

مذکورہ واقعات تو عہدِ نبوی ﷺ میں پیش آئے۔ یہ چیز نہایت قابل غور ہے، اس بنا پر یہ بات ذکر کرنے میں ہم حق بجانب ہیں کہ

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق اس روایت میں ناری جہنمی ثابت کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے، وہ بالکل غلط اور دروغ محض ہے اور کتاب و سُنّت اور واقعات نفس الامر کے اعتبار سے کسی طرح صحیح نہیں۔

مولفین رسالہ نے روایت ہذا کے ذریعے اپنی قلبی عداوت کا اظہار کیا ہے اور باطنی عناد کو پورا کیا ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے نزاع

(۵) رسالہ تدوین کرنے والوں نے موجبات لعن و طعن کے لیے پانچویں چیز حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے محاربت (قتال) تجویز کی ہے جو فریقین کے درمیان مقام صفین میں ۳۷ھ میں پیش آئی تھی۔

اس باہمی محاربت اور قتال کو بیان کرنے کے لیے مولفین رسالہ نے عجیب خدیعت اور دھوکہ دہی کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ وہ اس طرح کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اسلام لانے میں سابق ہونا اور ان کا شمار "سابقین اولین" میں ہونا۔ ملی خدمات میں ان کا فائق ہونا اور دین کا بہت سے کمالات و فضائل کا حامل ہونا وغیرہ وغیرہ۔ آنموصوف رضی اللہ عنہ کے بے شمار محاسن و فضائل ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف بہت سے معائب و مفاسد گنوائے ہیں۔

اور لکھا ہے کہ ایسے صاحب فضائل و کمالات کے ساتھ جنگ و قتال کیا۔ ان قتال کرنے والوں (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی) نے اسلام کی رسی کو اپنی گردنوں سے نکال ڈالا، حرام خون ریزی کو حلال بنا دیا، فتنہ و فساد کھڑا کر دیا، محارم کو مباح قرار دیا اور اہلِ حق کے حقوق کو منع کر دیا وغیرہ وغیرہ۔

حقیقت حال یہ ہے کہ جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے فضائل و کمالات اور اعلیٰ اوصاف اپنی جگہ پر مسلم ہیں اور اسلام میں جو ان کا عالی مقام و مرتبہ ہے، وہ بھی تسلیم شدہ ہے لیکن بات یہ ہے کہ "جنگ صفین" اسلام و کفر کی جنگ نہیں تھی۔ حلال و حرام کی تمیز رفع کر دینے کی وجہ سے یہ واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ جو مفاسد مولفین رسالہ نے اس مقام میں گنوائے ہیں، یہ موجبات قتال نہیں تھے اور ان کی وجہ سے قتال نہیں ہوا تھا بلکہ قتال کے وقوع کے لیے اسباب و علل دوسرے تھے جیسا کہ ہم عنقریب ان کو ذکر کریں گے۔

ان تمام وجوہ کو یکسر نظر انداز کر کے مولفین رسالہ نے واقعہ ہذا کے پیش آنے کا رنگ ہی بدل دیا ہے اور فضائل مرتضوی رضی اللہ عنہ کی بحث درمیان میں لا کر

واقعہ کا نقشہ ہی دوسرا بنا دیا ہے۔

امر واقع کے طور پر جن حالات میں قتال صفین پیش آیا تھا؎ ان کا بالاختصار ماحصل اس طرح ہے کہ

○ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا موقف یہ تھا کہ صفین میں فریق مقابل ہمارے نزدیک اہل البغی میں سے ہیں کہ انہوں نے ہماری بیعت نہیں کی حالانکہ بیعت کرنا ان پر لازم تھا۔ فلہذا جب تک یہ لوگ حق کی طرف رجوع نہ کریں، ان کے ساتھ قتال لازم ہے۔

(۱) فتح الباری ص۲۲۵، ج۱۴ تحت باب ما یذکر من ذی الرای... الخ۔

(۲) کتاب التمہید لابی الشکور السالمی ص۴۶۶-۴۶۷، تحت القول السابع فی خروج معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، طبع لاہور۔

○ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور آپ کی جماعت کی رائے یہ تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان ظلماً شہید کیے گئے ہیں، ان کے قاتلین جیش علوی میں موجود ہیں، ان سے قصاص دم عثمان رضی اللہ عنہ لینا ضروری ہے۔

○ ہمارا مطالبہ صرف قصاص دم عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے، خلافت کے بارے میں ہمارا نزاع ہرگز نہیں ہے۔ جب تک مسئلہ قصاص تمام نہیں ہوگا، ہم بیعت خلافت نہیں کریں گے۔

مختصر یہ کہ ان دونوں حضرات کے مابین اس وقت خلافت کے بارے میں کوئی نزاع نہیں تھا۔ (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے قتال صفین سے قبل کوئی خلافت کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہی اپنے رفقاء سے بیعت خلافت لی تھی) بلکہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لینے میں اختلاف واقع ہوا تھا۔ اندریں حالات دونوں فریق شدت کے ساتھ اپنے اپنے نظریات اور موقف پر قائم رہے اور مصالحت کیلئے چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مساعی کے باوجود کوئی صورت نتیجہ خیز سامنے نہ آسکی اور انجام کار مقام صفین میں قتال تک نوبت پہنچی۔

(کتاب الیواقیت والجواہر للشعرانی ص۷۷، ج۲، فی بیان وجوب الکف)

نوٹ: اس مسئلہ کی وضاحت معلوم کرنا مقصود ہو تو ہماری کتاب سیرت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، جلد اوّل، ص۲۱۱ تا ۲۱۸ کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

حاصل کلام

یہ ہے کہ مولفین "رسالہ" نے باہم محاربت کے اسباب جن چیزوں کو شمار کیا ہے اور جن مقاصد کے پیش نظر اس قتال کے وقوع کو جائز کیا ہے، یہ سراسر خدیعت اور دھوکہ ہے، ان چیزوں کو اصل واقعات کے ساتھ کچھ رابطہ نہیں ہے۔

قتال صفین کے اسباب و علل دوسرے تھے جن کا ذکر سابقہ سطور میں کبار علماء کے بیانات کی روشنی میں اجمالاً پیش کر دیا ہے۔

○ اس مقام میں دیگر گزارش یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں جو موجبات لعن و طعن شمار کیے جا رہے ہیں، ان میں مولفین نے یہ امر پانچویں درجہ میں ذکر کیا ہے۔ (منہ انبراوہ بالمحاربہ لا فضل المسلمین فی الاسلام مکانا ---الخ)

ناظرین کرام کی خدمت میں ہم یہاں بتلانا چاہتے ہیں کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین صفین والے اہم واقعہ کے بعد ۴۰ھ میں صلح و مصالحت ہوگئی تھی جیسا کہ کبار مورخین نے بالتصریح ذکر کیا ہے۔

تفصیلات کے لیے ہماری تالیف "سیرت حضرت معاویہ" جلد اوّل، تحت عنوان "حضرت سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح" کی طرف رجوع فرمائیں۔

یہاں قابل توجہ امر یہ ہے کہ اگر معاویہ ابی سفیان رضی اللہ عنہ بقول مولفین رسالہ ایسے بُرے خصال اور بدافعال کے حامل تھے اور ایسے ظالمانہ اور فاسقانہ اوصاف رکھتے تھے تو ان کے ساتھ حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ۴۰ھ میں صلح و مصالحت کیسے گوارا فرمائی اور مصالحت پر باہم کیسے رضامند ہوگئے؟

اور فرموداتِ خداوندی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان واتقوا اللہ--- الخ--- یاایها الذین آمنوا لا تتولوا قوما غضب اللہ علیهم--- الخ--- ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار--- الخ وغیرہ وغیرہ کو کیسے فراموش کر دیا؟؟

اور ان کے ساتھ صلح اور آشتی کیسے اختیار فرمائی؟

اگر فریق بالمقابل ایسا ہی تھا جیسا کہ مولفین رسالہ نے تحریر کیا ہے تو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ ایسا سلوک کیوں روا رکھا؟؟؟

اور اللہ تعالیٰ کے مذکورہ بالا فرمودات پر کیوں عمل درآمد نہیں فرمایا؟؟ اور ایسے ظالموں، فاسقوں، محارم کو حلال قرار دینے والوں اور مفسدوں کے ساتھ کس طرح صلح فرمالی؟؟

غور کا مقام ہے!!!

معاہدۂ جنگ بندی

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ قتال صفین کے بعد ۴۰ھ میں دونوں فریقین کے مابین جنگ و جدال کے معاملہ میں باہم صلح ہو گئی تھی اور آپس میں معاہدہ جنگ بندی ہو گیا تھا اور یہ صلح نامہ مندرجہ ذیل تفصیلات پر مبنی تھا:

(۱) ملک عراق اور اس کے ملحقہ علاقہ جات، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے حکم کے تحت ہوں گے۔

(۲) ملک شام اور اس کے ملحقہ علاقہ جات حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے تحت ہوں گے۔

(۳) ہر دو فریق ایک دوسرے کے خلاف قتال و جدال سے گریز کریں گے اور کسی ایک فریق کے علاقہ میں دوسرا فریق اپنی فوج نہیں بھیجے گا۔ تصدیق کے لیے ملاحظہ ہو:

(۱) تاریخ ابن جریر الطبری ص۸۱، ج۶، تحت ۴۰ھ، طبع قدیم۔
(۲) الکامل لابن اثیر الجزری ص ۱۹۳، ج ۳، تحت ۴۰ھ، طبع مصر۔
(۳) البدایہ والنہایہ لابن کثیرؒ ص ۳۲۲، ج ۷، تحت ۴۱ھ، طبع مصر۔
(۴) کتاب التمہید لابی الشکور السالمی، طبع لاہور، ص ۱۲۹، تحت القول الثامن فی قتل الحسین رضی اللہ عنہ)

مزید تفصیل مطلوب ہو تو ہماری کتاب سیرت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، ص ۲۹۸-۲۹۹، جلد اوّل کی طرف رجوع کریں۔

اور مولفین رسالہ نے اس پانچویں امر میں جو طریقہ اختیار کیا ہے، یہ طریق کار سو فی صد باطل ہے اور سراسر جعل سازی کے علاوہ قبائلی عناد پر مبنی ہے۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فضائل و مناقب جو نفس الامر صحیح اور درست ہیں، ان سے ہرگز انکار نہیں اور آنجناب رضی اللہ عنہ اعلیٰ مقام و مرتبہ پر فائز ہیں، لیکن جن صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بعض مسائل میں ان کا اختلاف رائے ہوا اور امور سیاست میں ان کا نزاع پیش آیا، ان کا مقام و مرتبہ بھی اسلام میں (فرق مراتب کے باوجود) اپنی جگہ پر واجب التسلیم اور لائق احترام ہے۔ ان کی وہ حیثیت نہیں ہے جس طرح کہ مولفین رسالہ ان کو گھٹا اور گرا کر ذکر کر کے اپنی قلبی عداوت کا اظہار کر رہے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ چونکہ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ محارب ہوئے اور قتال کیا، فلہذا یہ لعن و طعن کے مستحق ہیں۔ "رسالہ" والوں کی یہ تمام کارروائی اصولاً بھی غلط ہے اور واقعات کے اعتبار سے بھی بالکل بے جا ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر قتل کا الزام

(۶) مولفین "رسالہ" نے اس مقام میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر اعتراضات وارد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

...ثم مما اوجب اللّٰہ لہ بہ اللعنہ قتلہ من قتل خیرا من خیار الصحابہ والتابعین واھل الفضل والدیانہ مثل عمرو بن الحمق وحجر بن عدی فیمن قتل (من) امثالھم... الخ... واللہ عزوجل یقول (ومن یقتل مومنا متعمدا فجزاوہ جھنم خالدا فیھا وغضب اللہ علیہ ولعنہ واعدلہ عذابا عظیما۔)

مفہوم یہ ہے کہ جن امور کی بنا پر اللہ نے ان (معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ) پر لعنت فرمائی ہے، ان میں ایک چیز یہ ہے کہ انہوں (حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے بعض خیار صحابہ تابعین اور اہلِ فضل و دیانت اشخاص کو قتل کیا مثلاً عمر بن الحمق اور حجر بن عدی... الخ... اور اللہ عزوجل کا فرمان ہے کہ جس نے کسی مومن کو بالارادہ قتل کیا تو اس کی جزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا، اس شخص پر اللہ تعالیٰ کا غضب اور لعنت ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو عذاب عظیم دے گا۔

الجواب

طعن مذکورہ بالا کے جواب کے سلسلہ میں حجر بن عدی الکندی عمرو بن الحمق الخزاعی سے متعلق چند اہم حالات جو کبار علماء اور مورخین نے اپنی اپنی تالیفات میں ذکر کیے ہیں، پیش خدمت ہیں، ان کو ملاحظہ کریں۔

الف۔ حجر بن عدی الکندی متوفی ۵۱ھ

عام علماء و مورخین نے انہیں صحابی لکھا ہے اور عابد و زاہد کہا ہے، لیکن دیگر کبار علماء مثلاً بخاری، ابن ابی حاتم الرازی، خلیفہ ابن خیاط اور ابن حبان وغیرہم نے حجر بن عدی کو تابعین میں شمار کیا ہے۔ (واللہ اعلم)

اور ابوبکر احمد العسکری کے قول کے مطابق اکثر محدثین حجر بن عدی کے صحابی

ہونے کو صحیح قرار نہیں دیتے۔

حجر بن عدی، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت میں جمل و صفین میں شامل تھے اور آپ رضی اللہ عنہ کے خاص حامیوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

حجر بن عدی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے نظریاتی طور پر سخت خلاف تھے اور حکومت وقت کے خلاف فتنہ انگیز پارٹی سے بہت متاثر تھے، بلکہ ان کے اثرات سے مغلوب تھے۔

حجر بن عدی مخالفانہ سازشوں میں شریک رہتے تھے اور مخالفین گروپ کے رئیس تھے۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں کوفہ کے امیر مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ تھے۔ حجر بن عدی ان کے خلاف تشدد کرتے اور ہتک آمیز کلام سے پیش آتے تھے۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ درگزر فرماتے لیکن یہ حاکم وقت کے خلاف تشدد اور مخالفت سے باز نہیں آتے تھے۔

بیت المال کے اموال پر حجر بن عدی بعض اوقات تنقید کرتے تھے۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ کی وفات کے بعد امیر کوفہ زیاد بن ابیہ کے ساتھ معارضہ اور تنقید و مخالفت جاری رکھتے تھے اور بعض دفعہ ان پر کنکر بھی پھینکتے تھے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حجر بن عدی اور اس کے ساتھیوں کو شام میں منگوا لیا تو زیاد بن ابیہ نے ان کی سازشوں کے خلاف شہادات مرتب کر کے گواہوں کے ہمراہ خلیفہ وقت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھیج دیں اور لکھا کہ

(الف) حجر بن عدی خلیفہ وقت پر سب و شتم کرتا ہے۔

(ب) امیر وقت کے ساتھ محاربت قائم کیے ہوئے ہے اور اس نے مخالفت کے لیے اپنی جماعت قائم کر لی ہے۔

(ج) حجر بن عدی کا قول ہے کہ آل ابی طالب کے بغیر خلافت و امارت کسی کے لیے درست نہیں ہے، وغیرہ وغیرہ۔

یاد رہے کہ زیاد بن ابیہ نے جب حجر بن عدی اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کیا تو عمرو بن الحمق الخزاعی چھپ کر فرار ہوگئے اور موصل کے علاقہ میں روپوش ہوگئے۔ بقول بعض وہاں کسی غار میں داخل ہوئے اور وہیں سانپ کے ڈس لینے سے فوت ہوگئے تھے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حجر بن عدی اور اس کے ساتھیوں کو ان کے امیر وقت کے خلاف سازشوں کے ثابت ہونے کے بعد اور گواہوں کی شہادت کے بعد ان پر فرد جرم قتل کا عائد کیا اور بمقام عذراء میں قتل کرا دیا اور باقی کو چھوڑ دیا تھا۔

ب۔ عمرو بن الحمق الخزاعی متوفی ۵۰ / ۵۱ھ

عمرو بن الحمق عند البعض صحابی ہیں، معاہدہ حدیبیہ کے بعد یا حجۃ الوداع کے بعد اسلام لائے۔

عند المورخین مخالفین عثمان رضی اللہ عنہ میں سے ہیں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے دستبرداری خلافت چاہتے تھے۔

حجر بن عدی کے ساتھیوں میں سے تھے، مخالفانہ اقدامات میں برابر کے شریک تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش میں شریک تھے اور قتل عثمان رضی اللہ عنہ میں اعانت کی، لیکن قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ میں ان کا شمار نہیں۔

حجر بن عدی و عمرو بن الحمق کے تفصیلی حالات مع حوالہ جات مطلوب ہوں تو ہماری کتاب سیرت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، جلد دوم، ص ۱۶۳ اور ۱۸۴، ج ۲ وغیرہ کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ یہاں اس کا اجمال و اختصار ذکر کیا ہے اور وہاں قتل ہذا کے اسباب و علل کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے دفاع کو صحیح انداز میں تحریر کیا ہے۔

سطور بالا میں ہر دو حضرات حجر بن عدی الکندی اور عمرو بن الحمق الخزاعی کے مندرجہ کوائف پر نظر کرنے سے واضح ہے کہ ان کے نظریات خود حضرت علی

المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور حسنین شریفین رضی اللہ عنہ کے فرمودات کے خلاف و معارض تھے اور یہ لوگ اسلام کی متفقہ قوت کو پارہ پارہ کرنے کے درپے تھے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اہلِ اسلام کی اجتماعی قوت کو برقرار رکھنے اور افتراق و انتشار کے شر و فساد کو ختم کرنے کے لیے یہ اقدامات کیے تھے اور یہ فساد فی الارض سے بچنے کی اسلامی احکامات کی روشنی میں درست اور بہتر صورت تھی۔

مخالفین اس چیز کو ظلم و قہر کا رنگ دے کر موجبات لعن و طعن شمار کرتے ہیں جو سراسر واقعات کے خلاف ہے اور آیت مندرجہ کا مصداق و محمل ہرگز نہیں۔

آیت مندرجہ کا صحیح محمل و مصداق یہ ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو قصداً مسلمان معلوم کرنے کے بعد اس کے قتل کو حلال سمجھے تو ان کے لیے قرآنی وعید ہے۔ یہاں صورت دیگر تھی بلکہ قتل کے اسباب و علل موجود تھے جن کی بنا پر یہ واقعہ پیش آیا۔

استلحاق زیاد کا طعن

(۷) حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر لعن و طعن کی دیگر چیزوں کے علاوہ مولفین رسالہ نے ایک چیز یہ بھی یہاں ذکر کی ہے کہ

... ومما یستحق به اللعنه من الله ورسوله ادعاء زیاد بن سمیه جراه علی الله والله یقول ادعوهم لاباء هم هو اقسط عند الله ورسول الله ﷺ یقول وملعون من ادعی الی غیر ابیه او انتمی الی غیر موالیه ویقول الولد للفراش

مفہوم یہ ہے کہ وہ (حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی لعنت کا اس لیے مستحق ہے کہ اس نے اللہ کے حکم اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے فرمان کی واضح مخالفت کرتے ہوئے زیاد بن سمیہ کے حق میں استلحاق کیا اور اسے اپنا بھائی قرار دیا۔

وللعاهر الحجر مخالف
حكم الله عزوجل و سنته
نبيه ﷺ جهارا-

الجواب

معلوم ہونا چاہیے کہ استلحاق زیاد بن سمیہ کا مسئلہ خالص تاریخی واقعہ ہے۔ اس کو مورخین نے اپنی اپنی معلومات کے پیش نظر بیان کیا ہے اور اس واقعہ میں افراط و تفریط کے پہلو بھی پائے جاتے ہیں۔

بندہ نے اس بحث کو "سیرت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ" جلد دوم میں ص ۲۱۸ تا ۲۲۷ صحیح اور معتدل انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، لہٰذا واقعہ ہذا کے سلسلہ میں وضاحت مطلوب ہو تو مذکورہ بالا مقام کی طرف رجوع فرمائیں۔

بقول اہلِ تاریخ یہ واقعہ ۴۴ھ میں پیش آیا تھا اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے دورِ جاہلیت کے شواہد و بیانات کی بناء پر زیاد بن سمیہ سے نسبی استلحاق کا معاملہ کیا تھا، مگر وہ اس معاملہ میں بطور ایک مجتہد کے رائے رکھتے تھے۔

لیکن بعد میں اس مسئلہ میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنی رائے کے خطا ہونے پر تنبہ ہوا تو پھر آپ نے سابق موقف کو ترک کر دیا اور اپنی مومنانہ شان کے ساتھ مسئلہ ہذا میں رجوع کرتے ہوئے فرمایا:

... قضاء رسول الله صلى الله عليه وسلم خير من قضاء معاويه-

یعنی آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیصلہ معاویہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے فیصلہ سے بہتر اور اولیٰ ہے۔

(۱) مسند ابی یعلیٰ ص ۳۴۷، جلد سادس، تحت مسندات معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ۔
(۲) مجمع الزوائد للہیثمی ص ۱۴، جلد خامس، تحت باب الولد للفراش... الخ۔
(۳) فتح الباری شرح البخاری ص ۳۲، جلد ۱۲، تحت باب الولد للفراش حرہ کانت او امہ۔

کسی مسئلہ میں اپنی سابق رائے سے رجوع کر لینا نہ اخلاقاً قبیح ہے نہ شرعاً غلط ہے اور نہ باعتبار واقعہ کے بُرا ہے۔

کبار صحابہ حضرات میں سے کئی بزرگوں سے مسئلہ شرعی میں اپنے سابق موقف سے رجوع کرنا ثابت ہے مثلاً عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے متعہ کے مسئلہ میں ایک مدت تک جواز کے قائل ہونے کے بعد آخر میں متعہ کے دائماً حرام ہونے کا قول اختیار کیا اور سابق موقف سے رجوع کر لیا۔

(۱) المبسوط للسرخسی ص ۱۵۲ جلد خامس، باب نکاح المتعہ۔

(۲) العینی شرح الہدایہ ص ۷۰، جلد ثانی، تحت نکاح المتعہ۔

اسی طرح حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسی مسئلہ میں اپنی سابق مجتہدانہ رائے سے رجوع کر لیا اور قاعدہ شرعی "الولد للفراش وللعاهر الحجر" کو صحیح تسلیم کیا۔ یہ چیز حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دیانت داری اور اتقاء پر دال ہے نہ کہ یہ فعل لعن و طعن کا مستحق ہے۔

اندریں حالات مولفین رسالہ کا مندرجہ نصوص کا ذکر کر کے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر لعن طعن کا استحقاق پیدا کرنا قطعاً غلط ہے اور کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

استخلاف یزید کا اعتراض

(۸) مولفین "رسالہ" نے اس مقام میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر لعن و طعن کی دیگر چیزیں تحریر کرتے ہوئے آخر میں درج ذیل الفاظ میں ایک اعتراض یہ وارد کیا ہے:

... ومنه ایشاره بدین الله ودعـ ه عباد الله الی ابنه یزید المتکبر الخمیر صاحب

حاصل اعتراض یہ ہے کہ یزید بن معاویہ بد خصال اور فطرتاً بد صفات اور متکبر تھا۔ مرغے، چیتے اور بندر اس نے پال

الدیوک والفھود والقرود- واخذہ البیعہ لہ علی خیار المسلمین بالقھر والسطوہ والتوعید والاخافہ والتھدد والرھبہ- وھو یعلم سفھہ ویطلع خبثہ ورھقہ ولیعاین سکراتہ وفجورہ وکفرا--- الخ-

رکھے تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایسے شخص کو اللہ کے دین کے لیے (خلافت کے لیے) ترجیح دے دی اور لوگوں کو ایسے انسان کی طرف دعوت دی۔ معاویہ نے لوگوں سے قہر، رعب و دبدبہ اور ظلم و زیادتی وغیرہ سے اور ڈرا دھمکا کر یزید کے لیے بیعت حاصل کی حالانکہ وہ اپنے بیٹے کے خبث، فسق و فجور اور کفر سے واقف تھا۔

الجواب

اس طعن میں مولفین "رسالہ" نے جو کچھ ذکر کیا ہے، اس میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے متعلق قابل اعتراض صرف دو چیزیں ہیں: اولاً یہ کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اہلِ فضل اور خیار لوگوں کو چھوڑ کر ایک غیر اہل کو خلیفہ نامزد کیا۔

اور ثانیاً یہ کہ اس استخلاف میں انہوں نے اپنے منصب اور اقتدار کو استعمال کرتے ہوئے قہر و جبر اور ظلم و تعدی سے لوگوں سے بیعت حاصل کی۔

ان ہر دو چیزوں کا مختصراً جواب آئندہ سطور میں پیش خدمت ہے، مگر اس اعتراض کے تحت باقی تمام مواد میں یزید کے معائب و قبائح بیان کیے گئے ہیں اور اس میں بھی حسب معمول بیشتر مواد بے اصل اور بے سروپا ہے جس کا واقعات نفس الامر سے کچھ تعلق نہیں۔ یزید کے حق میں داستان طعن کو بڑھانے کے لیے یہ مواد شامل کیا گیا ہے۔

اس معاملہ میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ صحابی نہیں

ہے، اس لیے اس سے متعلق مطاعن کے جوابات کے ہم ذمہ دار نہیں اور نہ ہی ہم اس کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ اپنے غلط اقوال اور ناجائز افعال کا یزید خود ذمہ دار ہے، اس کا وہ جواب دہ ہوگا۔

یہاں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے متعلق مذکورہ بالا اعتراض کے جواب کے لیے یہ چیز ذکر کر دینا فائدہ سے خالی نہیں کہ استخلاف یزید کے طعن کو بندہ نے قبل ازیں اپنی تالیف سیرت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، حصہ دوم میں بعنوان "مسئلہ استخلاف یزید" مفصلاً بیان کر دیا ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو مذکورہ مقام کی طرف رجوع فرمائیں، تاہم اس مقام میں مختصراً جواب پیش خدمت ہے۔

اولاً: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دور کے حالات کے پیش نظر اپنے فرزند کو خلیفہ بنایا باوجود اس کے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی نظر میں یزید سے افضل لوگ موجود تھے۔ اس چیز کو کبار مورخین نے اپنی اپنی تصانیف میں ذکر کیا ہے، چنانچہ ابنِ خلدون لکھتے ہیں کہ

... وكذالك عهد معاويه الى يزيد خوفا من افتراق الكلمه بما كانت بنو اميه لم يرضوا تسليم الامر من سواهم فلو قد عهد الى غيره اختلفوا عليه مع ان ظنهم كان به صالحا ولا يرتاب احد في ذالك ولا يظن بمعاويه غيره فلم يكن ليعهد اليه- وهو يعتقد ما كان عليه من الفسق حاشالله لمعاويه من ذالك-

(مقدمہ لابنِ خلدون ص ۲۶۵، جلد اوّل، تحت انقلاب الخلافہ الی الملک، طبع بیروت)

اور دیگر مقام پر تحریر کیا ہے کہ

... والذی دعا معاویه لايثار ابنه يزيد بالعهد دون من سواه انما هو مراعاه المصلحت

مندرجہ بالا کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے فرزند یزید کو جو منصب خلافت کا سپرد کیا تھا

فی اجتماع الناس واتفاق اھوائھم باتفاق اھل الحل والعقد علیہ حینئذ من بنی امیہ اذ بنو امیہ یومئذ لا یرضون سواھم وھم عصابہ قریش واھل الملہ اجمع واھل الغلب منھم اثرہ بذالک دون غیرہ ممن یظن انہ اولی بھا۔

وہ کلمہ اہلِ اسلام میں افتراق و انتشار سے بچانے کی بناء پر تھا۔ اس سبب سے کہ قبیلہ بنو امیہ امر خلافت کو اپنے سوا کسی دوسرے کی طرف سپرد کر دینے پر آمادہ نہیں تھے۔ اگر یہ معاملہ ان کے غیر کی طرف سپرد کیا جاتا تو یہ لوگ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ اختلاف کر دیتے اور ایک عظیم انتشار کھڑا ہو جاتا۔

(مقدمہ لابن خلدون الفصل الثلاثون فی ولایۃ العہد ص ۲۱۱، طبع مصر، ص ۲۷۲-۲۷۳، طبع بیروت)

نیز یہ بات بھی ہے کہ یزید کے متعلق ان کو بہتر گمان تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بظاہر کوئی چیز خلاف شرع نہ پائے جانے کی وجہ سے ان کا یہ ظن درست تھا۔ یزید میں فسق و فجور ظاہری طور پر برملا پایا جائے اور پھر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ذمہ داری اس کے سپرد کریں حاشا وکلا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی دیانت داری سے بعید ہے۔

اور جس دور میں یزید کا انتخاب اور نامزدگی کی گئی اس دور میں یزید کے مفاسد اور قبائح علانیہ طور پر موجود نہیں تھے۔

بیعت بالاکراہ کا اعتراض

معترضین کی طرف سے دوسرا اعتراض کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جبر و اکراہ، ظلم و تعدی وغیرہ سے اپنے بیٹے کے لیے بیعت خلافت حاصل کی تو اس سلسلہ میں اتنی گزارش ہے کہ درحقیقت بیعت یزید کا مسئلہ ایک مجتہد فیہ مسئلہ کے درجہ میں تھا جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا اور اس میں معمول کے مطابق اختلاف رائے بھی ہوا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اس

دور کے حالات اور سیاسی و ملی مصالح کے پیش نظر اپنی رائے کو صحیح سمجھتے تھے۔ پھر اس سلسلہ میں لوگوں پر کوئی جبر و اکراہ نہیں کیا گیا حتیٰ کہ شیعہ مورخین جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے سخت مخالف و معاند ہیں، انہوں نے بھی برملا طور پر اپنی تواریخ میں تحریر کیا ہے کہ

... وحج معاویہ تلک السنه فتالف القوم ولم یکرھھم علی البیعت۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس سال حج کیا اور قوم کے ساتھ الفت سے پیش آئے اور بیعت (یزید) پر ہرگز کسی کو مجبور نہیں کیا۔

(تاریخ یعقوبی لاحمد بن یعقوب الکاتب المعروف یعقوبی الشیعی ص۲۲۹، ج۲ تحت واقعات وفات امام حسن رضی اللہ عنہ، (۴۹ھ) طبع بیروت)

فلہذا مورخین "رسالہ" کی طرف سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر یہ اعتراضات جو قائم کیے گئے ہیں، ان میں کچھ صداقت نہیں۔ بالکل بے اصل اور بے سروپا ہیں اور واقعات نفس الامر کے خلاف ہیں اور اس مسئلہ پر ہم نے کبار مورخین سنی و شیعہ کے حوالہ جات پیش کر دیئے ہیں۔

عہدِ نبوی ﷺ میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں اہم واقعات اور ان کی ملی خدمات

سطور ذیل میں ہم عہد نبوت میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے چند ایک اہم واقعات اور ان کی ملی خدمات بالاختصار پیش کرتے ہیں۔

ان امور پر غور کرنے سے آنموصوف رضی اللہ عنہ کے مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد اسلام میں ان کا صحیح مقام و مرتبہ واضح ہو سکے گا اور معترضین جو ان پر اعتراضات وارد کرتے ہیں، ان کا بالواسطہ جواب بھی ان میں موجود ہو گا۔

(۱) حضرت معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہما جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے برادر نسبتی ہیں، کیونکہ جناب ام المومنین ام حبیبہ بنت ابی سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہا آنموصوف کی ہمشیرہ ہیں۔

(۲) حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ عمرۃ القضاء کے موقعہ ۷ھ میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور ان کا اسلام لانا جناب نبوت میں مقبول ہوا اور فتح مکہ ۸ھ میں نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں اپنے قبیلہ کے ہمراہ حاضر ہوئے۔

بروایت دیگر امیر معاویہ کہتے ہیں کہ جب فتح مکہ ہوئی تو میں نے اسلام کو ظاہر کر دیا اور آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو ازراہ کرم نوازی آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے مرحبا فرمایا۔

(۳) اس کے بعد اسلام میں غزوہ "حنین" اور غزوہ "طائف" پیش آیا تو نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قیادت میں مجاہدین اسلام کے ساتھ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ مذکورہ غزوات میں شریک ہوئے۔ ان غزوات میں ان کے والد ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور بڑے بھائی یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ بھی ان کے ہمراہ تھے اور جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات کو اموال غنائم سے وافر حصہ عطا فرمایا۔

(۴) نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جناب میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو دیگر کاتبین وحی کے ساتھ کتابت وحی و غیر وحی کا منصب عطا ہوا اور مزید مراسلات نبوی اور فرمان نویسی کی ذمہ داری بھی ان کو نصیب ہوئی۔

(۵) اسلام میں بعض اوقات اراضی کی تقسیم و تسلیم کا معاملہ پیش آیا تو بفرمان نبوت یہ منصب بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو تفویض کیا گیا۔

(۶) بعض مواقع میں سردار دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے قصر شعر (بال تراشنے) کی ضرورت پیش آتی تو یہ سعادت بھی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوئی۔

(۷) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے کسی امتی کے حق میں دعائے خیر کے کلمات صادر ہونا بہت بڑی فضیلت اور خیر و برکت کی چیز ہے۔

چنانچہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعدد کلمات دعائیہ ثابت ہیں۔

اور آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کی ان دعاؤں ہی کے فیوض و برکات سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اسلام میں دینی و ملی خدمات بجالانے کا موقعہ ملا۔

(۸) حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تبرکات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بھی حاصل تھے جو ایک مومن کے لیے غنیمت باردہ ہیں۔ مثلاً چادر مبارک، موئے مبارک، ناخن مبارک کے تراشے ان کو حاصل تھے، چنانچہ حسب وصیت آخری مراحل میں ان تبرکات کے ساتھ ان کا سفر آخرت شروع ہوا۔

(نوٹ): مندرجہ بالا امور کی تفصیلات اور حوالہ جات کے لیے ہماری تالیف سیرت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جلد اوّل، دور اول اور دور چہارم کی فصل ۱۱ کی طرف رجوع فرمائیں۔

تنبیہ

ناظرین کرام کی خدمت میں یہاں ضروری گزارش ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق مندرجہ بالا ایک ایک چیز پر نظر غائر فرمائیں اور پھر اس کے بعد "رسالہ" مذکورہ مرتب کرنے والے کے مطاعن پر نظر کر کے باہم موازنہ کریں۔

ایسے مقتدر صحابی رضی اللہ عنہ جن کے حق میں یہ امور فضیلت موجود ہیں، ان پر لعن و طعن قائم کرنے کا کیا جواز ہے؟ اور جو روایات اور واقعات حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں موجبات لعن و طعن کے معاندین نے پیش کیے ہیں، وہ نفس الامر میں کس طرح صحیح قرار دیئے جاسکتے ہیں؟

ایک طرف حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ میں مذکورہ امور فضیلت موجود ہوں اور دوسری طرف وہ روایات جو مولفین "رسالہ" نے ذکر کی ہیں، پیش کی جائیں تو اس کی باہم مطابقت اور موافقت کی کوئی صورت ممکن نہیں ہو سکتی اور کوئی دانشمند اور انصاف پسند آدمی لعن و طعن کی ان روایات کو صحیح قرار نہیں دے سکتا، ان میں بون بعید ہے۔

فلہذا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جو امور فضیلت حاصل ہیں، ان تاریخی ملغوبات اور وضعی و جعلی روایات کے ذریعے ان کی تغلیط نہیں کی جا سکتی اور اسلام میں آنموصوف رضی اللہ عنہ جس مقام و مرتبہ فضیلت پر فائز ہیں، اس سے انہیں گرایا نہیں جا سکتا۔

مندرجات "رسالہ" کا تجزیہ

ناظرین باتمکین کی خدمت میں "رسالہ" مذکورہ میں مندرجہ روایات کے متعلق ہم ایک تجزیہ پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس رسالہ کے مندرجات کا کتاب اللہ سے متضاد ہونا اور ارشادات نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعارض ہونا اور اس مواد کا فن روایت کے قواعد و ضوابط اور فرمودات علمائے امت کے برعکس ہونا برملا طور پر ثابت ہو جائے اور ناواقف کار و کم علم قاری، رسالہ مذکور کے مندرجات پر نظر کرنے سے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے خلاف کسی غلط فہمی اور بدگمانی کا شکار ہو کر ان حضرات رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے خلاف سوء ظنی میں مبتلا نہ ہو سکے۔

(وما توفیقی الا باللہ)

پہلے ان مندرجہ روایات کا کتاب اللہ سے متضاد ہونا بیان کیا جاتا ہے۔

(ا) ارشاداتِ خداوندی سے متعارض ہونا

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ سے قبل اسلام لانے والے اور فتح مکہ

کے بعد اسلام لانے والے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم دونوں فریق کے حق میں جنّت کا وعدہ فرمایا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ

......وکلا وعد اللہ الحسنی۔ (الحدید' پ۲۷)

اور دوسرے مقام پر فرمانِ خداوندی ہے کہ

...ان الذین سبقت لھم منا الحسنی اولئک عنھا مبعدون۔ (الانبیاء پ۱۷)

یعنی بلاشبہ وہ لوگ جن کے لیے حسنیٰ (جنّت) کا وعدہ ہماری جانب سے پہلے ہو چکا ہے' وہ (دوزخ سے) دُور رکھے جائیں گے۔

قرآن مجید کی ان ہر دو آیات میں اللہ کریم نے تمام صحابہ کے حق میں اہل جنّت ہونے کا وعدہ فرمایا ہے کہ قبیلہ یا افراد کو مستثنیٰ نہیں فرمایا اور ان میں سے کوئی بھی صحابی دوزخ میں ہرگز داخل نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ ان آیات کریمہ میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے خاص خطاب ہے اور ان کے حق میں ہی یہ فرمودات خداوندی وارد ہیں۔

(۱) الاصابہ لابنِ حجر ص۱۹' جلد اوّل' خطبہ الکتاب' الفصل الثالث فی بیان حال الصحابہ من العدالہ۔

(۲) عقیدۃ السفارینی للشیخ محمد بن احمد السفارینی الحنبلی ص۳۷۲' جلد ثانی' طبع اوّل' مصر۔

نیز اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام مجید میں ارشاد فرمایا ہے کہ

... یوم لا یخزی اللہ النبی والذین آمنوا معہ نورھم یسعی بین ایدیھم وبایمانھم... الخ۔ (التحریم پ۲۸)

یعنی جس دن کہ اللہ تعالیٰ ذلیل نہیں کرے گا اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اور نہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں' ان کے ساتھ ان کا نُور ایمان ان کے سامنے اور دائیں جانب دوڑتا ہو گا۔۔۔ الخ۔

یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لانے والے

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے حق میں فیصلہ صادر فرما دیا ہے کہ قیامت میں یہ لوگ رسوا نہیں ہوں گے اور ان کے سامنے اور دائیں جانب ایمان کی روشنی دوڑتی ہوگی۔

یہاں سے ثابت ہوا کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم آخرت میں کامیاب و کامران ہیں اور مغفور ہیں اور ایمان کی روشنی ان کے سامنے ہوگی۔۔۔ فلہذا اموی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی حسب وعدہ خداوندی ان فضائل میں شامل ہیں اور احکامات مذکورہ میں داخل ہیں، جس طرح کہ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ان فضائل و احکامات میں شامل اور داخل ہیں۔

قابلِ غور

بات یہ ہے کہ ناظرین کرام مندرجہ بالا فرمودات خداوندی کو پیش نظر رکھیں اور پھر "رسالہ" مذکور کے مضامین پر نظر غائر کرتے ہوئے خود موازنہ کریں کہ کون سی بات صحیح ہے؟؟

"صاحب رسالہ" کہتے ہیں کہ اموی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم (معاذ اللہ) منافق تھے، قابل لعن و طعن تھے، ملعون اور جہنمی تھے، دین و ملت اسلامیہ سے دُور تھے، خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نافرمان تھے وغیرہ وغیرہ۔

صاحب انصاف اور دانشمند آدمی اس صورت میں تجزیہ کر سکتا ہے کہ ارشادات خداوندی بالکل صحیح ہیں۔ ان کی صداقت میں کچھ شک و اشتباہ کی گنجائش نہیں۔

قرآنی آیات نے جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے حق میں جنّت و بہشت کے وعدے فرمائے اور ان کی مغفرت کے لیے فیصلہ دے دیا ہے اور ان کے ایمان کی روشنی قیامت کے روز ان کے سامنے اور دائیں جانب پائی جانے کا اعلان فرما دیا اور ان نصوص میں کسی قبیلہ یا

اموی صحابہ کو مستثنیٰ نہیں قرار دیا تو ظاہر ہے کہ ان کا مصداق تمام صحابہ ہیں۔

ایک مومن مسلمان شخص آیات خداوندی کی تکذیب ہرگز نہیں کر سکتا تو واضح بات ہے مولف "رسالہ" کا جمع کردہ مواد قابل رد اور باطل ہی ہو گا اور بلا استثناء تمام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے خلاف سب و شتم اور لعن طعن کرنا اور ان کو بدگوئی سے یاد کرنا ممنوع ہو گا۔

(۲) فرموداتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعارض ہونا

ارشادات باری تعالیٰ کی روشنی میں ایک مختصر تجزیہ پیش کرنے کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے حق میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جو فرمودات ہیں، ان میں سے چند ایک ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔

پھر مندرجات "رسالہ" کے ساتھ ان کا متعارض ہونا اور مخالف ہونا درج کریں گے۔

آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے حق میں بے شمار فضائل و مکارم بیان فرمائے ہیں اور ان کی بلندی مقام اور رفعت منزلت کو واضح فرمایا ہے اور ان کے اکرام و احترام ملحوظ رکھنے کو بیان فرمانے کے ساتھ ساتھ ان کے حق میں سب و شتم و لعن و طعن کرنے سے امت کو برملا منع فرمایا ہے۔ ان تمام مقامات میں کسی قبیلہ یا افراد کو مستثنیٰ نہیں قرار دیا۔ تمام صحابہ کے حق میں یہ فرمودات ایک جیسے ہیں۔

چنانچہ ذیل میں چند ایک ارشادات نبوی علیہ الصلوۃ والتسلیم ہم تحریر کرتے ہیں، ان پر غور فرمائیں:

... قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الناس معادن كمعادن الذهب والفضة،

یعنی آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں کی مثال معادن (کانوں) کی طرح ہے جیسا کہ سونا اور چاندی کی کانیں

خیارھم فی الجاھلیہ خیارھم فی الاسلام اذا فقھوا۔ (رواہ مسلم، مشکوۃ شریف، ص ۳۲، بحوالہ مسلم، کتاب العلم الفصل الاول، طبع دہلی)

ہوں۔ جاہلیت کے دور (قبل اسلام) میں جو لوگ بہترین و پسندیدہ تھے، اسلام میں بھی وہ لوگ پسندیدہ ہیں جبکہ دینی مسائل میں سمجھ پیدا کر کے اسلام پر عمل پیرا ہوں۔

تنبیہ

اس فرمانِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں مردم شناسی کی طرف اشارہ ہے جو قبائل اخلاص کے ساتھ ایمان لائے، ان کی اسلام میں قدر شناسی کی گئی اور اسلامی معاشرہ میں ان کی توقیر کا لحاظ رکھا گیا اور خیار فی الاسلام کے القاب کے ساتھ ان کی عزت افزائی کی گئی۔

یہ امور تمام صحابہ کے حق میں منقول ہیں، کسی قبیلہ یا فرد کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا:

(۲) ایک بار حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے دورِ خلافت میں انتظامی ضروریات کے تحت جابیہ کے مقام میں تشریف لے گئے۔ کبار صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم حاضرین مجلس تھے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک عظیم خطبہ کی صورت میں حاضرین مجلس کو خطاب فرمایا۔ اس میں فرمودات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی تھے:

... فقال ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قام فینا مقامی فیکم فقال اکرموا اصحابی فانھم خیارکم ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم... فمن سرہ بحبوحۃ الجنۃ فعلیہ بالجماعۃ فان

یعنی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس طرح میں تمہارے درمیان کھڑا ہوں اور خطبہ دے رہا ہوں، اسی طرح ایک دفعہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے درمیان خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ میرے اصحاب کا اکرام اور عزت کرو یہ لوگ تم میں سے بہترین اور اخیار افراد

الشیطن مع الفذ...الخ۔

ہیں۔ پھر ان کے بعد وہ لوگ بہتر ہیں جو ان کے ساتھ ملنے والے ہیں اور پھر وہ لوگ جو ان ملنے والوں کے ساتھ ملنے والے ہیں۔ پھر فرمایا کہ جس شخص کو وسط جنت مطلوب ہو، وہ جماعت کے ساتھ رہے اور جماعت کو لازم پکڑے کیونکہ جماعت سے الگ ہونے والے شخص کے ساتھ شیطان لگ جاتا ہے۔

تنبیہہ

ان ارشاداتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں بھی بلا استثناء تمام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے لیے اکرام و توقیر کا حکم فرمایا گیا ہے اور جماعت اسلام کے ساتھ لازم رہنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

(۳) اور ایک دیگر روایت میں ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ فرمانِ نبوت نقل کرتے ہیں:

... قال النبی ﷺ لا تسبوا اصحابی فلو ان احدکم انفق مثل احد ذھبا ما بلغ مد احدھم ولا نصیفہ۔ (متفق علیہ)

یعنی ارشاد فرمایا کہ میرے اصحاب کو برا مت کہو کیونکہ تم میں سے کوئی آدمی اگر احد کے پہاڑ کے برابر زر کثیر صدقہ کرے تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ایک مد (سیر) کے برابر بلکہ اس کے نصف کے برابر بھی نہیں پہنچ سکتا۔

(۱) مشکوٰۃ شریف، ص۵۵۳، الفصل الاول، باب مناقب الصحابہ۔

(۲) الاعتقاد علی مذہب السلف للبیہقی، ص۳۲۰، باب القول فی اصحاب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم، بیروت۔

یہاں بھی تمام اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی فضیلت بیان کرتے ہوئے حکم دیا گیا کہ کسی بھی صحابی کو بُرے کلمات سے یاد مت کرو۔ یہاں کسی فرد، قبیلہ یا جماعت کو مستثنیٰ نہیں فرمایا گیا بلکہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے لیے یکساں حکم ہے۔

(۴) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ

...قال رسول الله ﷺ لا تسبوا اصحابی لعن الله من سب اصحابی۔ (رواہ الطبرانی فی الاوسط ورجالہ رجال الصحیح غیر علی بن سھل وھو ثقہ۔ مجمع الزوائد لنور الدین الہیثمی ص۲۱، جلد ۱۰، تحت باب مناقب وفضائل)

یعنی ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے اصحاب کو سب و شتم مت کرو۔ جو میرے صحابہ کو سب و شتم کرے، اس پر اللہ تعالیٰ لعنت برسائے۔

(۵) ابن بطہ صحیح اسناد کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ

...انہ قال لا تسبوا اصحاب محمد (صلی الله علیه وسلم) فلمقام احدھم ساعه یعنی مع النبی (صلی الله علیه وسلم) خیر من عمل احدکم اربعین سنه وفی روایه وکیع خیر من عباده احدکم عمره ھذا۔

یعنی اپنے مخاطبین کو ہدایت کرتے ہوئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب نبی کریم ﷺ کے اصحاب کو برا بھلا مت کہو، اور سب و شتم نہ کرو کیونکہ ان کا مرتبہ یہ ہے کہ نبی اقدس ﷺ کی خدمت میں ایک گھڑی کا قیام اور حاضر رہنا تمہارے چالیس برس کے عمل سے بہتر ہے بروایت وکیع تمام عمر کی عبادت سے افضل ہے۔

(۱) الاعتقاد علی مذہب السلف للبیہقی، ص۳۲۳، باب القول فی اصحاب رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم، طبع بیروت۔

(۲) شرح الطحاویہ فی عقیدۃ السلفیہ لصدر الدین علی بن ابی العزا لحنفی ص۴۱۷، تحت قولہ ونحب اصحاب رسول اللہ۔

(۳) شرح فقہ اکبر ملا علی القاری ص۸۳، طبع مجتبائی دہلی، تحت تسمیہ اہل السنہ فی تسمیہ)

تنبیہہ

مندرجات بالا سے واضح ہوگیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی بلا استثناء تمام جماعت فضائل و محامد کی حامل ہے اور تمام صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی لعن و طعن اور سب و شتم کرنے سے سردار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

تو بنو امیہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی اسی زمرہ میں آ گئے اور یہ ہدایات نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) سب صحابہ کے لیے عام ہیں۔ ان میں سے کسی ایک روایت میں بھی اموی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو مستثنیٰ نہیں فرمایا گیا۔

فلہذا یہ ارشادات نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) تمام صحابہ کے حق میں یکساں اور برابر ہیں۔

یہاں قابل توجہ یہ بات ہے کہ طبری والے (رسالہ) مذکورہ کے مندرجات ان فرمودات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل متعارض اور خلاف ہیں۔

بنا بریں ارشادات نبوت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رو سے "رسالہ" مذکور کی وہ روایات جن میں سب و شتم کیا گیا ہے اور لعن و طعن کا موجب قرار دی گئی ہیں، وہ بالکل باطل ہیں اور مردود ہیں۔

(۴) فن روایت کے ضوابط کے منافی ہونا

اس کے بعد ہم یہ چیز ذکر کرتے ہیں کہ "رسالہ" مذکورہ کے مندرجات فن روایت کے قواعد و ضوابط کے بھی خلاف ہیں اور جو کچھ علماء امت نے قبول روایت

کے لیے قواعد و ضوابط بیان فرمائے ہیں' اُن سے متعارض و متضاد ہیں۔

چنانچہ اس فن کے علماء نے ایک حدیث مرفوع بطور قاعدہ کے بیان فرمائی ہے اور اس سے قبول روایت کے ضابطے مستنبط کیے ہیں۔ پہلے وہ مرفوع حدیث درج کی جاتی ہے۔ خطیب بغدادی نے اپنی تصنیف "کتاب الکفایہ" میں وہ روایت ذکر کی ہے:

... عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال سیاتی عنی احادیث مختلفہ فما جاء کم موافقا لکتاب اللہ تعالی وسنتی فھو منی وما جاء کم مخالفا لکتاب اللہ تعالی و سنتی فلیس منی۔ (کتاب الکفایہ للخطیب البغدادی، ص ۴۳۰، طبع حیدر آباد دکن)

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری طرف منسوب شدہ مختلف قسم کی روایات عنقریب تمہارے پاس پہنچیں گی--- جو روایات کتاب اللہ اور میری سُنّت کے مطابق ہوں' وہ درست ہوں گی اور جو کتاب اللہ اور میری سُنّت کے معارض اور متضاد ہوں وہ میری طرف سے نہیں ہوں گی۔

پس یہاں سے روایت کے رد و قبول کا ضابطہ متعین ہوگیا۔ بنا بریں کبار علماء امت نے اس کی روشنی میں مندرجہ ذیل ہدایات ذکر کی ہیں:

... اذا کان الحدیث مخالفا لکتاب اللہ تعالی فانہ لا یکون مقبولا ولا حجہ للعمل بہ... الخ۔

(اصول السرخسی ص ۳۶۴، ج اول، تحت بحث روایت، منقطع، طبع اوّل، دکن)

نیز اسی طرح ابوبکر السرخسی تھوڑا سا آگے چل کر پھر لکھتا ہے کہ

... ان کل حدیث ھو مخالف لکتاب اللہ تعالی فھو مردود۔ (اصول السرخسی

یعنی علامہ السرخسی فرماتے ہیں کہ جب روایت کتاب اللہ کے مضمون کے مخالف پائی جائے' وہ ہرگز مقبول نہیں اور نہ ہی وہ

عمل کرنے کے لیے حجت ہے اور ایسی روایت مقبول نہیں بلکہ مردود ہے۔ ص۳۶۵، جلد اوّل، تحت بحث روایت، منقطع، طبع اوّل، دکن)

اسی طرح یہ مضمون مقام ذیل میں بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

... توضیح وتلویح بحث سنت فصل فی الانقطاع۔

(۲) اسی طرح خطیب بغدادی نے بھی اسی قاعدہ کو عبارت ذیل میں ذکر کیا ہے:

... ولا یقبل خبر الواحد فی منافاہ حکم العقل وحکم القرآن الثابت المحکم والسنہ المعلومہ والفعل الجاری مجری السنہ وکل دلیل مقطوع بہ۔

یعنی مطلب یہ ہے کہ جو روایت حکم عقل کے برخلاف قرآن محکم کے حکم کے برخلاف اور سُنّت مشہورہ معلومہ کے برخلاف اور اس فعل کے برخلاف جو قائم مقام سُنّت کے ہے اور ہر یقینی دلیل کے برخلاف پائی جائے وہ قابل قبول نہیں (بلکہ وہ قابل رد ہے)

(۱) کتاب الکفایہ للخطیب البغدادی رحمتہ اللہ علیہ، ص۴۳۲، تحت باب ذکر ما یقبل فیہ خبر الواحد وما لا تقبل فیہ، طبع اوّل دکن۔

(۲) تنزیہہ الشریعہ المرفوعہ لابن عراق الکنانی ص۶، تحت فصل فی حقیقہ الموضوع۔

حاصل کلام یہ ہے کہ طبری والے "رسالہ" میں مندرجہ روایات مذکورہ بالا ان قواعد و ضوابط کے قطعاً خلاف پائی گئی ہیں۔

کیونکہ رسالہ مذکورہ میں مندرجہ روایات میں بنو امیہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر نام لے کر سب و شتم کیا گیا ہے اور ان روایات کے ذریعے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو موجب لعن و طعن ثابت کرنے کی سعی کی گئی ہے، حالانکہ ارشاداتِ خداوندی و فرمودات نبوی ﷺ میں تمام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے حق میں بہتر ثناء و توصیف بیان کی گئی اور فضائل و محامد ان کے بے شمار مقامات میں ذکر کیے گئے ہیں۔

فلہذا وہ روایات کتاب و سُنّت کے مضمون اور قواعد و ضوابط کے برخلاف ہونے کی وجہ سے قبول نہیں کی جاسکتیں اور نہ ہی ایسی روایات قابل حجت قرار دی جاسکتی ہیں۔

علمائے امت کے بیانات

بحث ہذا میں بعض علماء نے خصوصاً حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام ذکر کر کے تصریح کر دی ہے کہ ان کی مذمت میں جو روایات چلائی اور پھیلائی گئی ہیں، وہ جعلی اور وضعی ہیں۔

چنانچہ ابن قیم اور ملا علی القاری نے بحث ہذا کے ضمن میں تحریر کیا ہے کہ

...ومن ذالک الاحادیث فی ذم معاویہ... کل حدیث فی ذمہ فھو کذب۔ (۱) المنار المنیف لابن قیم ص۱۱۷، تحت فصل ۴۷، طبع حلب۔ (۲) الاسرار المرفوعہ فی اخبار الموضوعہ لعلی القاری ص۴۷۷، تحت فصل الفضائل والمثالب، طبع جدید۔

یعنی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی مذمت میں جو روایات پائی جاتی ہیں، وہ وضعی اور جعلی ہیں اور دوسرے مقامات میں تحریر کیا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مذمت میں جو روایت پائی جائے وہ دروغ ہے۔

فلہذا طبری والے "رسالہ" میں جو حضرت امیر معاویہ کی مذمت و تنقیص میں مرویات نقل کی گئی ہیں، وہ علماء کی تصریحات کی روشنی میں بالکل بے سروپا اور جعلی ہیں۔

اختتامی تجزیہ

گزشتہ صفحات میں رسالہ مذکور کے مندرجات کا کتاب و سُنّت، قواعد و ضوابط اور علمائے امت کے فرمودات کے ساتھ متعارض اور متخالف ہونا پیش کیا گیا ہے۔

اب ہم اس بحث کے آخر میں ناظرین کرام کو یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اس مسئلہ میں ہم منفرد نہیں ہیں بلکہ اس فن کے کبار علماء نے صدیوں پہلے "رسالہ" مذکور کے مندرجات کا رد کر دیا ہے اور اس کی روایات کا بطلان خوب واضح کر دیا ہے۔

ذیل میں ان کبار علماء کی عبارات برائے ملاحظہ پیش کرتے ہیں تاکہ ناظرین کرام کو اطمینان ہو جائے۔

------ (۱) ------

چنانچہ علامہ ابن اثیر الجزری نے معتضد باللہ کے اسی "رسالہ" کے متعلق مندرجہ ذیل الفاظ میں نقد و تنقید کی ہے:

... انه قد استدل فیه باحادیث کثیره علی وجوب لعنته عن النبی صلی الله علیه وسلم لاتصح۔

یعنی صاحب رسالہ نے بہت سی احادیث کے ساتھ وجوب لعن معاویہ رضی اللہ عنہ پر استدلال کیا ہے، لیکن وہ روایات صحیح نہیں ہیں۔(اور بے اصل ہیں)

(تاریخ الکامل للابن اثیر الجزری ص۸۵، جلد سادس، تحت سنہ ۲۸۴ھ)

------ (۲) ------

اور علامہ شمس الدین الذہبیؒ نے اپنی مشہور تصنیف "تاریخ الاسلام" میں "رسالہ" ہذا کے متعلق اپنی محققانہ رائے درج ذیل الفاظ میں تحریر کی ہے:

... ثم ذکر احادیث واهیه موضوعه فی ذم ابی سفیان وبنی امیه... الخ۔

یعنی (صاحب "رسالہ" نے) ابوسفیان اور بنو امیہ کی مذمت کی کئی بے اصل اور جعلی روایات ذکر کی ہیں۔

(تاریخ الاسلام للذہبی ص۱۸-۹۹ تحت ۲۸۴ھ، طبع بیروت ۱۴۱۱ھ، ۱۹۹۱ء)

------ (۳) ------

اور حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تصنیف "البدایہ والنہایہ" میں المعتضد باللہ کے اس "رسالہ" کا ذکر کیا ہے جس میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، ابو سفیان رضی اللہ عنہ وغیرہم پر لعن طعن کی متعدد روایات جمع کی گئی ہیں۔

حافظ ابن کثیرؒ نے ان روایات پر تنقید کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ

... واورد فیھا الاحادیث باطلہ فی ذم معاویہ...الخ۔	یعنی (صاحب رسالہ نے) حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی مذمت میں بہت سی باطل احادیث درج کی ہیں۔ (جو بالکل دروغ بے فروغ ہیں)

آخر کلام

یہ چند سطور "رسالہ" مندرجہ کے جواب میں مرتب کی ہیں، مقصد یہ ہے کہ سید دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے دفاع کیا جائے اور ان کے مقام و مرتبہ کا احترام ملحوظ رکھا جائے۔

جن لوگوں نے اس نوع کا رسالہ مرتب کرایا تھا ان کے پیشِ نظر سیاسی و مذہبی تعصبات تھے۔ فلہذا ہمیں ان چیزوں سے ہرگز متاثر نہیں ہونا چاہیے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوہ والسلام علیہ وآلہ واصحابہ وسلم تسلیما کثیرا کثیرا۔



فصل پنجم

(شیعہ) افلح اکیڈمی کراچی کے اشتہار کا جواب

حامداومصلیاومسلما

شیعہ کی طرف سے سرور کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے متعلق بیشتر مطاعن نشر کیے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے اہلِ اسلام کے قلوب پریشان اور مجروح ہوتے ہیں۔ یہی چیز باہمی انتشار کا باعث بنتی ہے اور وحدت اسلامی کو پارہ پارہ کر دیتی ہے۔ یہ ان لوگوں کا دیرینہ شیوہ چلا آ رہا ہے۔

اب حال ہی میں شیعوں نے "افلح اکیڈمی پاکستان یونٹ کراچی" کی طرف سے ایک اشتہار شائع کیا ہے۔

اس میں اکابر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر شدید طعن وارد کر کے مسلمانوں کے دلوں کو دکھایا ہے اور ان کے حق میں بدظنی پھیلائی ہے۔

اس کے جواب کے لیے یہ چند کلمات تحریر کیے گئے ہیں تاکہ اس مفسدہ کا ازالہ ہو اور مسلمانوں سے پریشانی برطرف ہو سکے۔

(دُعاگو: محمد نافع عفا اللہ عنہ)

اعتراض

(۱)

"حضرت ابوبکر میں شرک چیونٹی کی چال چلتا تھا"

الجواب

معترض نے حدیث شریف کی جس روایت کا حوالہ دیا ہے (کتاب "ادب المفرد" کتاب الادعاء ص ۲۳۴) اس روایت میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو شرک خفی سے بچنے کی تلقین فرمائی ہے اور اس مقام میں شرک سے مراد "شرک خفی" ہے۔ شرک جلی تو اپنی جگہ مذموم و متروک ہے لیکن یہاں شرک خفی سے بھی اجتناب کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

یہ چیز یہاں قابلِ ذکر ہے کہ کلام ذکر کرتے وقت بعض اوقات حاضرین کو خطاب کرنا مراد نہیں ہوتا بلکہ وہاں آنے والے لوگ مخاطب ہوتے ہیں اور ان کے حق میں خطاب ہوتا ہے اور ان کے لیے کلام چلایا جاتا ہے۔

جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ

...قال رسول الله صلی الله علیه وسلم یکون فی آخر الزمان دجالون کذابون یاتونکم من الاحادیث مالم تسمعوا انتم ولا آباء کم فایاکم وایاهم لا یضلونکم ولا یفتنونکم۔

پس اس روایت میں مخاطب موجود لوگ نہیں بلکہ آنے والے امت کے لوگ مراد ہیں۔ اسی طرح الشرک فیکم والی روایت میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو خصوصی خطاب مقصود نہیں ہے کہ ان کو شرک میں مبتلا تسلیم کیا جائے بلکہ عام امت کو سمجھانا مطلوب ہے۔

(مسلم شریف ص۹-۱۰ ج اوّل، باب النہی عن الروایہ عن الضعفاء... الخ)

اس چیز کا قرینہ یہ ہے کہ اس روایت میں "فیکم" کے کلمات ہیں جو جمع مذکر مخاطب کے لیے ہوتے ہیں، فلہذا یہ عمومی خطاب ہے۔ خصوصی ایک فرد کے لیے خطاب نہیں۔

دیگر قرینہ یہ ہے کہ روایت ہذا کے دیگر طرق میں یاایها الناس اور فی امتی کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔

ان قرائن کی بناء پر واضح ہوگیا کہ یہ خطاب خصوصی طور پر حضرت ابی بکر رضی اللہ عنہ کے لیے نہیں، بلکہ امت کے عام مسلمانوں کے حق میں ہے۔

الشرک فیکم... الخ والی روایت میں جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا گیا ہے کہ یہاں شرک خفی سے اجتناب کی تلقین افراد امت کو فرمائی گئی ہے۔

شرک خفی کے متعلق صوفیائے کرام اور علمائے کبار نے اپنی جگہ پر تصریحات ذکر کی ہیں۔ بقدر ضرورت جس صاحب کو تشریح مطلوب ہو تو وہ شیخ عبدالرؤف المناوی کی تصنیف فیض القدیر، جلد رابع، ص۱۷۳، ج۴، تحت روایت الشرک فیکم... الخ، ملاحظہ فرمادیں۔

شیخ المناوی رحمتہ اللہ علیہ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ کا حوالہ دے کر ذکر کرتے ہیں کہ "شرک خفی کے مفاسد و مصائب کے وقوف سے بڑے بڑے ماہرین فضلاء

عاجز آ چکے ہیں، چہ جائیکہ عام لوگ اس پر مطلع ہوں۔"

شرک خفی نفس کے آخری مہالک اور انتہائی باطنی مکاید میں سے ہے۔ (اس سے بچنا کوئی سہل کام نہیں)

یاد رہے کہ ریاکاری، سمعت، عجب، تکبر، حرص وغیرہ وغیرہ اشیاء شرک خفی کے زمرہ میں شمار کی جاتی ہیں۔

حتیٰ کہ احادیث میں وارد ہے کہ

... وادناہ (شرک خفی) ان تحب علی شی من الجور- او تبغض علی شیی من العدل... الخ-

(حلیۃ الاولیاء ص۳۶۸ ج۸، تحت معروف کرخی رحمتہ اللہ علیہ)

مزید تفصیلات کے لیے امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ کی کیمیائے سعادت اور احیاء العلوم کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ روایت بالا میں زبان نبوت سے شرک خفی سے اجتناب کرنے کے لیے امت کو ہدایت فرمائی جا رہی ہیں اندریں حالات حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو شرک سے ملوث قرار دینا بالکل واقعات کے برخلاف ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی اوّل سے آخر تک تمام زندگی اخلاص فی العمل کی ہے اور ایمان و یقین سے منور ہے۔

آپؓ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی متبرک مجالس کی حاضر باش جلیس ہیں اور خصوصی مشاورتوں میں شرکت کے اعزاز یافتہ ہیں۔ ان کی طرف شرک کا انتساب کرنا گویا حقائق کا انکار ہے اور قرآنی نصوص کی تکذیب ہے۔

معترضین اس روایت (الشرک فیکم... الخ) میں "کلمہ حق ارید بھا الباطل" والا معاملہ کر کے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر افتراء عظیم باندھ رہے ہیں۔

اعتراض

(۲)

”حضرت عمر کا اقرار کہ خدا کی قسم میں منافقین میں سے ہوں“

(بحوالہ فتح الباری ص ۴۴، جلد ۱۲، عبارت اشتہار از افلح اکیڈمی، کراچی)

الجواب

معترضین کی طرف سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر اقرار نفاق کا اعتراض کیا جاتا ہے اور اب اس کو بصورت اشتہار بھی نشر کیا گیا ہے۔

جس عبارت سے طعن اخذ کیا جاتا ہے، وہ یعقوب بن سفیان البسوی (البسوی کو الفسوی سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے) کی تصنیف ”کتاب المعرفہ والتاریخ“ میں پائی جاتی ہے۔

بعدہ بعض دیگر مؤلفین نے مذکورہ بالا کتاب سے یہ عبارت اپنی اپنی تالیفات میں نقل کی ہے اور بعض جگہ ساتھ ہی روایت پر نقد و جرح بھی موجود ہے۔

اولاً: روایت ہذا کا راوی (زید بن وہب الجھنی) ہے جس کے متعلق خود مولف کتاب المعرفہ والتاریخ کے علاوہ دیگر علماء رجال نے توثیق ذکر کرنے کے باوجود یہ بات تحریر کی ہے کہ اس کی حدیث میں ضعف پایا جاتا ہے۔

اور نیز لکھا ہے کہ... حدیث زید فیہ خلل کثیرا۔

(کتاب المعرفہ والتاریخ البسوی ص۷۶۸-۷۶۹، جلد ثانی)

اسی طرح حافظ ابن حجر نے زید بن وہب الجھنی کی توثیق ذکر کرنے کے بعد درج ذیل عبارت نقل کی ہے:

...انہ کبر وتغیر ضبطہ ومات سنہ ست وتسعین۔ (الاصابہ لابن حجر العسقلانی ص۵٦۷، ج اول، تحت روایت نمبر۳۰۰۱)

مطلب یہ ہے کہ جھنی ہذا کی روایت میں خلل کثیر پایا جاتا ہے اور یہ شخص معمر ہوگیا اور اس کا ضبط متغیر ہوگیا۔ اس کی وفات ۹٦ھ میں ہوئی۔

ثانیاً یہ چیز ہے کہ اگر اس روایت کے ضعف اور مجروح ہونے سے صرف نظر بھی کر لی جائے تو بھی اصل واقعہ کے متعلق محدثین اور علمائے کبار نے جو حضرت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ان کلمات کا مفہوم و محمل ذکر کیا ہے، اس کے معلوم کر لینے کے بعد اعتراض ہذا بالکل ساقط ہو جاتا ہے۔

(۱) چنانچہ ابن ابی شیبہ نے یہی مسئلہ ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ

ایک شخص منافقین میں سے فوت ہوگیا تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ

... امن القوم ھو؟ قال نعم! فقال لہ عمر رضی اللہ تعالی عنہ باللہ عنھم انا؟ قال لا ولا اخبر بہ احدا بعدک۔ (المصنف لابن ابی شیبہ ص۱۰۷، ج۱۵، کتاب الفتن،

مطلب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا کہ کیا یہ شخص منافقین میں سے تھا۔ حضرت حذیفہ نے فرمایا: ہاں! تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا میں منافقوں میں سے

طبع کراچی) ہوں؟؟ تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ
بالکل نہیں (آپ ان میں سے ہرگز نہیں)
نیز یہ بھی فرمایا کہ اس بات کی خبر آپ کے
بعد کسی کو نہیں دوں گا۔

روایت ہذا کے ذریعے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی زبان سے تصدیق پائی گئی کہ حضرت عمر فاروق نفاق سے بری ہیں اور منافقین کے زمرہ سے خارج ہیں۔

(۲) اور حضرت ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ...

حضرت عمر رضی اللہ عنہ آنموصوفہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے اور کہا کہ میں آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ کہیں میں منافقین میں سے تو نہیں ہوں؟ تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ آپ ان میں سے نہیں ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اس کے بعد میں اس بات کی کسی کو خبر نہیں دوں گی۔

... قال فاتاها عمر رضی اللہ عنہ وقال تشدتک باللہ انا منهم؟
قال قالت لا- ولن ابری احدا بعدک ابدا-

(۱) مسند عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، ص ۸۱ تحت حدیث ام سلمہ رضی اللہ عنہا۔
(۲) مسند امام احمدؒ ص ۲۹۸، ج ۶، تحت مسندات ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا۔
(۳) البدایہ والنہایہ لابن کثیرؒ ص ۱۹، ج ۵، تحت حالات تبوک۔

روایت مذکورہ بالا کی روشنی میں ثابت ہوا کہ حضرت ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نفاق کی نفی کر کے ان کی نفاق سے براءت ذکر فرمائی۔ فلهذا نفاق کی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف نسبت کرنا ہرگز درست نہیں۔

مختصر یہ ہے کہ بالفرض روایت طعن کو تسلیم کر لیا جائے تو واقعات کے اعتبار سے مسئلہ حل ہو گیا ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا دونوں حضرات نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں نفاق کی نفی کر

دی ہے اور صحت ایمان کی تصدیق فرما دی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ جو اضطراب اور پریشانی لاحق ہوئی تھی، یہ کمال خشیت الٰہی کے غلبہ کی وجہ سے تھی نہ کہ ضعف ایمان کی علامت تھی۔ مقولہ مشہور ہے کہ

مقربان را بیش بود حیرانی

یہ وہ کیفیات قلبی ہیں جو خاصان خدا پر وارد ہوتی ہیں۔

چنانچہ اس سلسلہ میں ایک مشہور واقعہ حضرت حنظلہ کے متعلق حدیث شریف میں مذکور ہے کہ حضرت حنظلہ بن ربیع کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ملے۔ آپ نے دریافت کیا: اے حنظلہ! کیا حال ہے؟ تو میں نے کہا: نافق حنظلہ (حنظلہ منافق ہوگیا) تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سبحان اللہ! آپ کیا کہہ رہے ہیں!

پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور وہاں بھی کہا نافق حنظلہ اس پر جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

... والذی نفسی بیدہ لو تدومون علی ما تکونون عندی وفی الذکر لصافحتکم الملائکہ علی فروشکم وفی طرقکم ولکن یا حنظلہ ساعہ وساعہ ثلث مرات۔ (رواہ مسلم، مشکوۃ ص۱۹۷-۱۹۸، باب ذکر اللہ والتقریب الیہ، آخر فصل اوّل، طبع نور محمدی، دہلی)

مطلب یہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس ذات کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اس کی قسم! اگر تم اسی حالت پر رہو جو تمہاری حالت میرے پاس ہوتی ہے اس پر دواماً قائم رہو اور ذکر میں لگے رہو تو تمہارے بستروں پر اور تمہارے راستوں پر ملائکہ تمہارے ساتھ مصافحہ کریں گے لیکن اے حنظلہ! یہ کیفیت وقتاً فوقتاً ہوتی ہے اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کلمات تین مرتبہ فرمائے۔

مقصد یہ ہے کہ جس طرح حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ پر خشیت کی کیفیت طاری ہوئی پھر اس وقت ان سے یہ کلمات صادر ہوئے--- ٹھیک اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر بھی خشیت الٰہی کے غلبہ کی وجہ سے یہی کیفیت طاری ہوئی اور غلبہ حال وارد ہوا تو اس بناء پر ان سے ان کلمات کا صدور ہوا۔

مسئلہ ہذا کی تائید منجانب شیعہ

ناظرین کرام کی خدمت میں ذکر کیا جاتا ہے کہ مذکورہ بالا مسئلہ کے موافق شیعہ کے اکابر علماء نے بھی امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے روایت اصول کافی میں ذکر کی ہے جس میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے متعلق یہی خشیت الٰہی اور غلبہ حال کا پایا جانا مذکور ہے۔

چنانچہ سیدنا جعفر صادق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک بار صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہم اپنے اوپر نفاق کا خوف کرتے ہیں۔ تو آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم نفاق کا خوف کیوں کھاتے ہو؟ تو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا: جب ہم جناب کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، آپ ہمیں دین کی نصیحت فرماتے ہیں اور رغبت دلاتے ہیں تو ہم عذاب آخرت سے خوف کھاتے ہیں اور دنیا کو بھلا دیتے ہیں حتیٰ کہ ہم آخرت کا معائنہ کرتے ہیں اور جنت و دوزخ کو دیکھتے ہیں، لیکن جب ہم جناب کی خدمت سے چلے جاتے ہیں اور اپنے گھروں میں داخل ہوتے ہیں، اپنی اولاد سے پیار کرتے ہیں، اپنے اہل و عیال کو دیکھتے ہیں تو وہ حالت جو آپ کی خدمت میں حاصل تھی، وہ تبدیل ہو جاتی ہے حتیٰ کہ ہم ایسی حالت میں ہو جاتے ہیں، گویا پہلے والی حالت ہم پر نہیں رہی۔

یارسول اللہ! کیا آپ ہم پر نفاق کا خوف کرتے ہیں؟ تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہرگز نہیں۔ یہ شیطان کی چالیں ہیں، وہ تمہیں دنیا کی

طرف رغبت دلاتا ہے۔

آنجناب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی قسم! اگر تم اس حالت پر ہمیشہ قائم رہو، جو تم نے اپنے متعلق بیان کی ہے تو ملائکہ تمہارے ساتھ مصافحہ کریں اور تم پانی پر چلنے لگو... الخ...

فقال لهم رسول الله صلى الله عليه وآله كلا ان هذه خطوات الشيطان فيرغبكم في الدنيا- والله لو تدومون على الحال التي وصفتم انفسكم بما لصافحتكم الملائكه ومشيتم على الماء... الخ-

(اصول کافی لمحمد بن یعقوب الکلینی ص۵۷۳-۵۷۴، کتاب الایمان والکفر باب تنقل احوال القلوب، طبع نو لکشور لکھنؤ)

شیعہ کی معتبر کتاب "اصول کافی" کی مندرجہ بالا روایت سے یہ مسئلہ خوب واضح ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر مختلف کیفیات کا ورود ہوتا تھا اور اس کی وجہ سے وہ اپنے اوپر نفاق کا خوف کھاتے تھے۔

لیکن یہ سب ان پر خشیت الٰہی کی وجہ سے کیفیات طاری ہوتی تھیں اور یہ ان کے ایمان و یقین کی ایک خاص حالت ہے۔ اس کو نفاق نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت بالا کی روشنی میں نفاق کی نفی فرمائی ہے۔ فلہذا یہ ان کے کمال ایمان کی علامت ہے۔

بنا بریں روایت میں جو کلمات حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے منقول ہیں، وہ اقرار نفاق پر محمول نہیں بلکہ خاص کیفیات کے حامل ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر یہ طعن وارد کرنا ہرگز درست نہیں۔



اعتراض

(۳)

"حضرت عائشہؓ نے فتویٰ دیا کہ عثمان کافر ہو گیا ہے، اس کو قتل کرو"

(بحوالہ کتاب سیرۃ حلبیہ ص۳۵٦، باب معجزات النبی ﷺ، عبارت اشتہار افلح اکیڈمی کراچی)

الجواب

اعتراض ہذا کے متعلق ذیل میں چند ایک چیزیں پیش کی جاتی ہیں، ان کو بنظر غائر ملاحظہ کرنے سے اعتراض رفع ہو جائے گا۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سردار دو جہاں صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے کبار صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے ہیں۔ خلفائے راشدین میں "خلیفہ ثالث" اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دوہرے داماد ہیں۔ قرآن مجید میں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی جتنی صفات خیر اللہ کریم نے بیان فرمائیں، ان کے بہترین مصداق ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ متمردین اور اشرار اور خارجی لوگوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو ظلماً شہید کرڈالا۔ (جیساکہ یہ مسئلہ اپنے مقام پر مفصل مذکور ہے)

خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وقوع شہادت پر اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نہایت متاسف اور سخت پریشان ہوئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس وقت مکہ میں تھیں۔

شہادت عثمانی رضی اللہ عنہ سے مطلع ہونے پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اظہارِ افسوس اور "کامل برأت" کے مفصل بیانات کتابوں میں پائے جاتے ہیں، جن میں سے چند ایک چیزیں ذیل میں برائے ملاحظہ پیش خدمت ہیں۔ ان سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا اس مسئلہ کے متعلق صحیح نظریہ واضح ہو جائے گا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل پر آمادہ کرنے کا طعن بھی قطعاً زائل ہو جائے گا۔

------ (۱) ------

اولاً یہ چیز ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے شہادت کی پیش گوئی بیان فرماتی ہیں کہ

سید الکونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو پیش گوئی کے طور پر فرمایا: اے عثمان رضی اللہ عنہ! امید ہے کہ اللہ تعالیٰ عنقریب تمہیں ایک قمیص (قمیص خلافت) پہنائیں گے۔ اگر لوگ اس قمیص کو تجھ سے اتارنا چاہیں تو ان کے کہنے پر یہ قمیص نہ اتارنا۔

... عن عائشه ان النبی صلی الله علیه وسلم قال: یا عثمان! انه لعل الله یقمصک قمیصا فان ارادوک علی خلعه فلا تخلعه لهم ثلاثا۔ (رواه الترمذی و ابن ماجه)

(مشکوٰۃ شریف ص ۵۶۲، باب مناقب عثمان رضی اللہ عنہ، الفصل الثانی، طبع نور محمدی، دہلی)

روایت ہذا سے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی زبانی واضح ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت برحق تھی اور قمیص خلافت کو قائم رکھنے کے لیے آنموصوف رضی اللہ عنہ کو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے خاص ہدایت فرمائی گئی تھی۔

فلہذا حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس مسئلہ میں حق پر تھے اور قاتلین کا موقف باطل تھا۔

نیز حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں شہادت کی پیش گوئی درج ذیل الفاظ میں بھی موجود ہے کہ

...عن نعمان بن بشیر عن عائشہ رضی اللہ عنہا قالت: ارسل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی عثمان بن عفان فاقبل علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلما راینا اقبال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی عثمان اقبلت احدانا علی الاخری فکان من آخر کلمہ ان ضرب منکبہ وقال: یاعثمان! ان اللہ عسی ان یلبسک قمیصاً۔ فان ارادک المنافقون علی خلعہ فلا تخلعہ حتی تلقانی ثلاثا۔

یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجا۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب ہم نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف توجہ فرماتے دیکھا تو ہم ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوئیں۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا: اے عثمان! یقیناً اللہ تعالیٰ آپ رضی اللہ عنہ کو عنقریب قمیص پہنائیں گے۔ اگر منافق لوگ اس قمیص کو

(البدایہ لابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ، ص۲۰۷، جلد سابع، تحت حالات عثمانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

اتارنے کا ارادہ کریں تو تم یہ قمیص ہرگز نہ اتارنا حتیٰ کہ تم (آخرت میں) میرے ساتھ ملاقات کرو۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کلمات تین بار فرمائے۔

اور یہ چیز بھی قابل توجہ ہے کہ

(ا) تابعی مسروق ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ظلماً قتل کیے گئے تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اظہار افسوس کرتے ہوئے قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اعتراضات سے بری پایا جیسا کہ میل کچیل سے صاف شدہ کپڑا ہوتا ہے، پھر بھی تم لوگوں نے آنموصوف رضی اللہ عنہ کو مینڈھے کی طرح ذبح کر ڈالا۔ اس کے بعد مسروق نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں عرض کیا:

"لوگ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ آپ کے کہنے پر ہوا ہے اور آپ نے لوگوں کی طرف لکھا اور حکم دیا کہ عثمان کے خلاف خروج کریں۔"

تو حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ

...فقالت لا! والذی آمن بہ المومنون وکفر بہا الکفرون ما کتبت الیہم بسوراء فی بیضاء حتی جلست مجلسی ھذا۔

یعنی یہ بات ہرگز نہیں بلکہ اس ذات کی قسم! جس پر مومن ایمان لائے اور کفار نے اس ذات کے ساتھ کفر کیا۔ میں نے اس مجلس میں بیٹھنے تک اس قسم کا کوئی مکتوب ہرگز نہیں لکھا۔

(طبقات ابن سعد ص۸۷، جلد ثالث، تحت ما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، الخ)

(۲) اعمش کا قول ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے فرمان پر یہ خطوط لکھے گئے تھے۔

اس بہتان کی تردید جس طرح حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے خود فرمائی ہے اسی طرح کبار علماء نے فرمایا ہے کہ اس نوع کے خطوط اور اشرار نے کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف سے خود تحریر کر کے آفاق و اطراف کی طرف ارسال کیے تھے اور انہیں قتال عثمان رضی اللہ عنہ پر برانگیختہ کیا۔ (یہ سب خطوط جعلی تھے)

ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ

... وفی هذا وامثاله دلاله ظاهره علی ان هولاء الخوارج قبحهم الله زوروا کتبا علی لسان الصحابه الی الافاق بحرضونهم علی قتال عثمان۔

(البدایہ لابن کثیرؒ ص۱۹۵، جلد سابع تحت حالات عثمان رضی اللہ عنہ، طبع اوّل)

یاد رہے کہ ان خوارج اور مفسدین نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتال پر برانگیختہ کرنے کے لیے آفاق و اطراف کی طرف جن صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی طرف سے جھوٹے اور جعلی خطوط لکھے تھے، ان میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے بھی جعلی خطوط لکھے گئے تھے، یہ ان مفسدین کی طرف سے خاص سازش تھی۔

اسی چیز کی تردید حوالہ جات بالا میں پیش کی گئی ہے۔

(۳) اسی طرح طبقات ابن سعد میں تذکرہ عثمانی کے تحت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا اس مسئلہ میں ایک بیان اس طرح مذکور ہے کہ

آنموصوفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اولاً اپنے مطالبات تسلیم کرائے اور خوب دھویا اور صاف کیا جیسے کہ برتن کو صاف کیا جاتا ہے، پھر اس کے بعد تم نے انہیں قتل کر ڈالا۔

... قالت عائشه حین قتل عثمان: مصتم الرجل موص

الانـاء ثـم قـتـلـتـمـوه-

(طبقات ابن سعد ص ۵۷، جلد ثالث، تحت تذکرہ عثمان رضی اللہ عنہ، طبع لیدن)

سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس فرمان سے ثابت ہوا کہ آنموصوفہ رضی اللہ عنہا ان ظالموں، قاتلوں کو بطور نفرین کے ان کے ظلم پر تنبیہہ فرما رہی ہیں کہ تم نے مطالبات بھی منوا لیے اور قتل بھی کر ڈالا۔

(۴) ابراہیم یشکری البصری ذکر کرتے ہیں کہ ہماری جدہ ام کلثوم بنت ثمامہ نے ہمیں بیان کیا کہ ایک بار وہ حج ادا کرنے گئیں۔ طواف کے بعد وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ اے ام المومنین! آپ کے بیٹے آپ کی خدمت میں سلام عرض کرتے ہیں اور لوگوں نے دریافت کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق آپ کیا فرماتی ہیں؟ (آپ رضی اللہ عنہا کی کیا رائے ہے)

تو سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ جو شخص حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ پر لعنت کرے اور برا کہے، اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔ آپ رضی اللہ عنہا نے یہ کلمات تین بار فرمائے۔

اور مزید فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ران مبارک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ لگائے ہوئے تھے اور میں جناب نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جبین مبارک سے پسینہ صاف کر رہی تھی اور وحی نازل ہو رہی تھی اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی دو بیٹیاں یکے بعد دیگرے ان کے نکاح میں دے دی تھیں۔ میں نے سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے اے عثمان! لکھو۔ (وحی کی کتابت کرو)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں کریم اور باعزت شخص کے بغیر کسی کو ایسا مقام و مرتبہ عطا نہیں کرتا۔ (یعنی یہ اعزازات عثمان بن عفان کو حاصل ہیں اور وہ مکرم و معزز ہیں)

... قـالـت قـلـت یـا ام الـمـومـنـیـن ان بـعـض بـنـیـک بـعـث

یفرئک السلام وان الناس قد اکثروا فی عثمان- فما تقولین فیه؟ قالت لعن الله من لعنه لا احسبها الا قالت ثالث مرار- لقد رایت رسول الله صلی الله علیه وسلم وھو مسند فخذوه الی عثمان وانی لا مسح العرق عن جبین رسول الله صلی الله علیه وسلم وان الوحی ینزل علیه ولقد زوجه بنتیه احداھما علی اثر الاخری وانه یقول: اکتب عثمان- قالت ما کان الله لینزل عبدا- من نبیه بتلک المنزله الا عبدا علیه کریما-

(۱) مسند امام احمد ص۲۶۱، جلد سادس تحت مسند عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، مسند احمد ج۶ ص۲۵۰، تحت مسندات عائشہ رضی اللہ عنہا-

(۲) مجمع الزوائد للہیثمی ص۸۶، جلد تاسع، تحت کتابت الوحی بحث فضائل عثمان-

(۳) الادب المفرد للبخاری ص۱۲۲، باب من دعی صاحبہ... الخ، طبع مصر-

(۴) البدایہ لابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ ص۲۰۸، جلد سابع، تحت فضائل عثمانی رضی اللہ عنہ بحوالہ احمد رحمتہ اللہ علیہ-

(۵) تاریخ مدینہ المنورہ لابی زید عمرو بن شیبہ ص۱۲۴۲ تا ۱۲۴۴، جلد

(۵) نیز ایک دیگر روایت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے محدثین نے نقل کی ہے کہ اس میں مذکور ہے کہ

ایک شخص (طلق بن خشاف) نے ذکر کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ کی شہادت کے بعد ہم مدینہ طیبہ میں آئے اور آں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آل سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پہنچے- اس کے بعد امہات المومنین کے ہاں بھی حاضر ہوئے- حتیٰ کہ ہم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضری دی-

راوی کہتا ہے کہ میں نے سلام عرض کیا- آنموصوفہ رضی اللہ عنہا نے سلام

کا جواب دیا اور دریافت فرمایا کہ تم کون ہو؟ میں نے عرض کیا: اہل بصرہ سے، بکر بن وائل سے، بنی قیس بن ثعلبہ سے۔ پھر میں نے سوال کیا یا ام المومنین! عثمان بن عفان کس بات پر اور کس بناء پر قتل کیے گئے؟؟ تو حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اللہ کی قسم عثمان رضی اللہ عنہ مظلوماً قتل کیے گئے، جن لوگوں نے ان کو قتل کیا، ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔ پھر آپ نے چند قبائل اور شخصیات کے نام لے کر بددعائیں کیں۔ راوی کہتا ہے کہ... یعنی اللہ کی قسم! ان سب کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی بددعا پہنچی اور وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔

... فقلت لها يا ام المومنين! فيما قتل عثمان اميرالمومنين- قالت قتل والله مظلوما لعن الله من قتله... فوالله ما من القوم رجل الا اصابه دعوتها-

(۱) رواہ الطبرانی رجالہ رجال الصحیح غیر طلق وھو ثقہ۔

(۲) مجمع الزوائد للہیثمی ص۹۷، جلد تاسع، تحت بحث وفات عثمان۔

حاصل یہ ہے کہ مندرجہ بالا روایات کی روشنی میں:

(۱) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قتل عثمانی کے حق میں نظریہ واضح ہوگیا کہ اشرار اور خوارج نے آپ رضی اللہ عنہ کو ظلماً شہید کر دیا تھا۔

(۲) نیز حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے قاتلین عثمان پر نفرین اور لعنت فرمائی اور ان کے اس فعل سے پوری طرح اپنی برأت بیان کی۔

(۳) وہ خطوط جو لوگوں کو قتل عثمانی پر برانگیختہ کرنے کے لیے اطراف و اکناف کی طرف لکھے گئے۔ وہ بالکل جھوٹے اور جعلی تھے۔ ان سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اپنی برأت ذکر کی ہے کہ ان میں حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قطعاً کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ یہ سب مفسدین کی سازش اور شرارت تھی۔

کبار علماء کی طرف سے مسئلہ ہذا کی تائید

اس سلسلہ میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی برأت کے متعلق کبار علماء کے بہت سے بیانات کتابوں میں مذکور ہیں لیکن ہم یہاں علامہ سید محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور تفسیر "روح المعانی" کا ایک حوالہ ذیل میں نقل کرتے ہیں:

علامہ سید محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ آیت: وقرن فی بیوتکن... پ۲۲ کے تحت تحریر فرماتے ہیں کہ

(۴) شیعہ لوگوں نے جو یہ گمان کر رکھا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا قتل عثمان پر لوگوں کو برانگیختہ کرتی تھیں اور کہتی تھیں کہ اس نعثل کو قتل کر دو۔ یہ فاجر ہوگیا ہے اور حضرت عثمان کو نعثل یہودی سے تشبیہ دے کر یہ قول کرتی تھیں... یہ سب جھوٹ اور بہتان ہے، اس روایت کی کوئی اصل نہیں۔

یہ ابن قتیبہ، ابن اعثم الکوفی اور سمساطی وغیرہ جو جھوٹ بولنے اور افتراء باندھنے میں مشہور ہیں، ان کے اکاذیب اور بہتانات ہیں۔

... وما زعمته الشیعه من انها رضی الله عنها کانت هی التی تحرض الناس علی قتل عثمان وتقول اقتلوا نعثلا فقد فجر تشبهه بیهودی --- یدعی نعثلا... کذب لا اصل له وهو من مفتریات ابن قتیبه وابن اعثم الکوفی والسمساطی - وکانوا مشهورین بالکذب والافتراء -

(رُوح المعانی لسید محمود آلوسیؒ ص۱۱ ج ۲۲، تحت الآیہ وقرن فی بیوتکن، پ ۲۲)

درایتاً بحث

روایات کے اعتبار سے مسئلہ ہذا کا جواب پیش کر دیا گیا ہے۔ اب درایت کے اعتبار سے یہ چیز ذکر کی جاتی ہے کہ

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا قصاص دم عثمان کے مطالبہ کرنے والے

فریق میں شامل تھیں، یعنی جو حضرات اس بات کا مطالبہ کر رہے تھے کہ قاتلین عثمان کو جلد گرفتار کیا جائے اور ان سے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کا قصاص جلد دلوایا جائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس کوشش میں برابر کی شریک تھیں۔

چنانچہ اس سلسلہ میں مکہ مکرمہ میں اجتماع ہوا جس میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، اور دیگر حضرات شامل تھے۔ ان حضرات کو سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا پورا پورا تعاون حاصل تھا اور اس مقصد کے لیے آپ رضی اللہ عنہا نے بصرہ کا سفر اختیار کیا اور نتیجتاً جنگ جمل واقع ہوئی۔

یہ تمام واقعات اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ہرگز کوئی عمل دخل نہ تھا ورنہ آپ رضی اللہ عنہا قصاص دم عثمان رضی اللہ عنہ کا مطالبہ کرنے والوں کی ہمنوا اور شریک کار نہ ہوتیں۔ عقلمند آدمی پر یہ بات بالکل آشکارا ہے۔

"اختتام بحث"

مندرجات بالا کے ذریعے یہ بات واضح ہوگئی کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے زبان نبوت سے بہت سے فضائل عثمانی نقل فرمائے ہیں اور ایسے فضائل و مناقب کی حامل شخصیت کو قتل کرنا ہرگز روا نہیں ہوسکتا۔

نیز یہ معلوم ہوا کہ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قتل عثمانی میں کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف لوگوں کو قتل پر ہرگز برانگیختہ نہیں کیا بلکہ اس ظلم عظیم کرنے والوں پر انہوں نے نفرین اور لعنت کی اور اپنی برأت کا اظہار فرمایا:

ان واقعات کے پیش نظر قتل عثمانی کا فتویٰ انہوں نے کس طرح دے دیا؟؟

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر یہ محض افتراء اور بہتان ہے جیسا کہ علامہ سید محمود آلوسی کے بیان سے اس کو ثابت کر دیا گیا ہے۔

پھر آخر یہ واقعہ سیرت کی بعض کتابوں میں مذکور ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ معترض نے جس کتاب کا حوالہ دیا ہے اس کے مقدمہ میں مصنف نے صاف طور پر یہ لکھا ہے کہ

... ولا يخفى ان السير تجمع الصحيح والسقيم الضعيف والبلاغ والمرسل المنقطع والمعضل دون الموضوع ومن ثم قال الزين العراقى رحمه الله- وليعلم الطالب ان السيرا تجمع ما قد صح وما قد انكراء-

یعنی اہل سیرت ہر قسم کی صحیح سقیم ضعیف بلاغیات مرسل منقطع معضل وغیرہ روایات جمع کر دیتے ہیں' اس میں درست روایات بھی ہوتی ہیں اور منکر بھی-
(مقدمہ سیرۃ الحلبی ص ۲' ج ۱' طبع ثالث' مصر)

مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ ہر قسم کا مواد بغیر جرح و قدح کے جمع کر دیتے ہیں' لیکن پھر صحیح اور درست چیزوں کو اخذ کیا جاتا ہے اور کمزور اور ضعیف اور بے اصل اشیاء کو ترک کر دیا جاتا ہے-

مصنف کتاب کی اس تصریح کے بعد ظاہر ہے کہ درست اور صحیح چیز قابل قبول ہوگی اور باقی بے سروپا اور بے اصل مواد کو نظر انداز کر دیا جائے گا- حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب کردہ بالا روایات بھی اسی زمرہ میں سے ہیں-

معترض نے آنکھیں بند کر کے خواہ مخواہ اعتراض قائم کر دیا ہے ورنہ اس کا جواب خود کتاب ہذا کے ابتداء میں موجود ہے- سچ ہے کہ السائل کالاعمیٰ ہوتا ہے- اللہ تعالیٰ ان کو چشم بصیرت عطا فرمائے-



اعتراض

(۴)

طلحہ اور زبیر، عثمان کے قاتل ہیں اور اس کا خون بہایا ہے

(بحوالہ کتاب الاستیعاب ص ۲۱۳، قرۃ العینین ص ۲۸۵، عبارت اشتہار از افلح اکیڈمی، پاکستان یونٹ کراچی)

الجواب

معترض لوگوں نے اپنے اشتہار میں حضرت طلحہ بن عبید اللہ اور حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ تعالیٰ عنہما پر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قاتل ہونے اور ان کے خون بہانے کا طعن ابن عبدالبر کی تصنیف الاستیعاب اور قرۃ العینین سے ایک روایت کے حوالے سے قائم کیا ہے۔

معترضین کی طرف سے جو روایت پیش کی گئی ہے، پہلے اس کا تحقیقی جائزہ پیش خدمت ہے اور بعدہ واقعات نفس الامری کے اعتبار سے درایتاً اس پر بحث ہوگی۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)

جائزہ

کتاب الاستیعاب صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے تذکرہ میں ایک مفصل کتاب ہے، اس میں بہترین فوائد جمع کیے ہیں، لیکن مصنف نے اسی کتاب کے مقدمہ میں اس کے مآخذ بیان کیے ہیں، وہاں کئی ایک ایسے مآخذ بھی ذکر کیے ہیں (مثلاً طبری، واقدی، مدائنی، ابن اسحاق کی مرویات وغیرہ وغیرہ) جن میں رطب و یابس، صحیح و سقیم، ضعیف و قوی مواد پایا جاتا ہے۔ ان روایات کی صحت کا کوئی التزام نہیں ہوتا۔ تاریخی روایات سے بہت سا مواد مصنف نے الاستیعاب میں درج کر دیا ہے اور تاریخوں میں ہر قسم کا مواد ہوتا ہے۔

اسی بناء پر اس فن کے کبار علماء نے اس کتاب کی توثیق و توصیف کے باوجود مندرجہ ذیل نقد کر دیا ہے۔

مثلاً علامہ ابن صلاح رحمتہ اللہ علیہ اپنی کتاب علوم الحدیث میں امام النواوی رحمتہ اللہ علیہ تقریب النواوی میں اور سیوطی رحمتہ اللہ علیہ اپنی تصنیف تقریب کی شرح تدریب الراوی میں فرماتے ہیں کہ

...لولا ما شانه بذكر ما شجر بين الصحابه وحكايته عن الاخبار بين والغالب على الاخباريين الاكثار والتخلبط فيما يردونه۔ (۱) کتاب علوم الحدیث لابن صلاح ص ۲۶۲۔۲۶۳، طبع جدید مدینہ منورہ تحت النوع التاسع والثلاثون۔ (۲) تدریب الراوی فی شرح تقریب النواوی ص ۳۹۵، تحت النوع التاسع والثلاثین مکتبہ العلمیہ، المدینہ المنورہ۔

یعنی الاستیعاب بہتر کتاب تھی اگر ابن عبدالبر اس کو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مشاجرات ذکر کر دینے اور اخباری لوگوں کی روایات و حکایات نقل کر دینے سے اسے عیب دار نہ بنا دیتے۔ اخباری لوگوں پر یہ بات غالب ہوتی ہے کہ وہ اپنی روایات میں کثرت سے اور تخلیط سے کام لیتے ہیں۔ (صحت واقعہ کا کچھ خیال نہیں کرتے)

بنا بریں الاستیعاب میں بے اصل اور تاریخی مواد بھی پایا جاتا ہے اور اسی مواد میں سے یہ پیش کردہ روایت بھی ہے۔

اور صاحب قرۃ العینین نے یہ روایت الاستیعاب سے نقل کی ہے اور اس کا حوالہ دے کر خود بری الذمہ ہوگئے ہیں۔

فلہذا قرۃ العینین کے جواب کے لیے الگ کلام کرنے کی ضرورت نہیں۔

درایتاً بحث

اس بحث کے آغاز میں حضرت طلحہ بن عبید اللہ اور حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مقام و مرتبہ کا اجمالی تذکرہ پیش کرنا ہم مناسب سمجھتے ہیں۔

یہ دونوں حضرات رضی اللہ تعالیٰ عنہما:

(۱) عشرہ مبشرہ کبار صحابہٴ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے ہیں۔

(۲) ان کا شمار بدری صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں ہوتا ہے۔

(۳) قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کے متعلق جو بے شمار اعلیٰ فضائل و عمدہ مناقب بیان فرمائے ہیں، یہ دونوں حضرات بھی ان کے صحیح مصداق و محمل ہیں۔

(۴) احادیث صحیحہ میں ان حضرات کے بیشتر فضائل و کمالات مذکور ہیں جو ہر اہلِ علم پر واضح ہیں، یہاں ان کے اعادہ کی چنداں حاجت نہیں۔

فلہذا ایسی مقتدر شخصیات کو جو مندرجہ بالا قدر و منزلت کی حامل ہوں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قاتل قرار دینا گویا ان فضائل و مناقب کی نفی کرنے اور تغلیط کے مترادف ہے۔

علاوہ ازیں ذیل میں چند ایک واقعات پیش کیے جاتے ہیں جو اس بات کے قرائن میں سے ہیں کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قتل میں کوئی عمل دخل نہیں تھا اور وہ ان کے قتل میں ہرگز شامل نہیں تھے بلکہ وہ حضرات، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے معاونین اور حامیوں میں سے تھے۔

(۱) چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ جس وقت حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دار کا باغیوں اور مفسدین نے محاصرہ کر رکھا تھا اس وقت جس طرح حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادوں حسنین شریفین رضی اللہ عنہم کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حفاظت کی خاطر بھیجا تھا اور حکم دیا تھا کہ باب دار عثمان رضی اللہ عنہ پر جا کر پہرہ داری کریں، بالکل اسی طرح حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے فرزند عبداللہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے محمد رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حفاظت کی خاطر روانہ کیا تھا تاکہ اشرار اور باغیوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر داخل ہونے سے یہ مانع ہوں۔

... وبعث الزبير ابنه عبدالله وبعث طلحه ابنه...
وبعث عده من اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم ابناء
هم ليمنعوا الناس الدخول على عثمان-

(کتاب الانساب الاشراف للبلاذری ص۶۸-۶۹، جلد خامس تحت باب مسیر اہل الامصار الی عثمان رضی اللہ عنہ، طبع جدید)

(۲) ان حفاظتی تدابیر کے باوجود باغیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ظلما شہید کر دیا۔

جب یہ وحشت ناک خبر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ وغیرہم کو پہنچی تو یہ سب حضرات حیرانی اور پریشانی کے عالم میں اپنے گھروں سے نکلے۔ ان کے ہوش اُڑ چکے تھے، حتیٰ کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر داخل ہوئے اور ان کو مقتول پا کر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔

نیز بلاذری نے لکھا ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ جب اس واقعہ فاجعہ پر پہنچے تو انہوں نے پریشانی کے عالم میں اپنے دونوں صاحبزادوں اور محمد بن طلحہ رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو زجر و توبیخ کی اور سخت سست کہا۔

... وبلغ الخبر عليا وطلحه والزبير وسعدا ومن كان

بالمدینہ فخرجوا وقد ذھب عقولھم للخبر الذی اتاھم التی دخلوا علی عثمان فوجدوہ مقتولا فاسترجعوا وقال علی لابنیہ کیف قتل امیر المومنین وانتما علی الباب؟ ورفع یدہ فلطم الحسن وضرب صدر الحسین وشتم محمد بن طلحہ وعبداللہ بن الزبیر... الخ۔

(۱) انساب الاشراف للبلاذری ص۶۹-۷۰، جلد خامس۔

(۲) تاریخ الاسلام للذہبی ص۱۳۹، ج۲، تحت محاصرۂ عثمانی ۳۵ھ۔

(۳) ان پریشان کن حالات کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جنازہ کا موقع آیا تو متعدد صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم جو اس وقت مدینہ طیبہ میں موجود تھے، جنازۂ عثمانی رضی اللہ عنہ میں شامل ہوئے، مثلاً حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ، جبیر بن مطعم، زید بن ثابت، کعب بن مالک، طلحہ بن عبید اللہ، زبیر بن العوام وغیرہم رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ (البدایہ لابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ ص۱۹۱، ج۷، تحت واقعات ہذا)

نیز دیگر روایت میں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آخری اوقات میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو اپنے جنازہ کی وصیت فرمائی تھی، چنانچہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے حسب وصیت ان پر نماز جنازہ پڑھی اور دفن کیا۔

... قال صلی الزبیر علی عثمان رضی اللہ عنہ ودفنہ وکان اوصی الیہ۔

(۱) مسند امام احمدؒ ص۷۴، ج اوّل، تحت من اخبار عثمان رضی اللہ عنہ۔

(۲) کتاب التمہید والبیان فی مقتل الشہید عثمان رضی اللہ عنہ، ص۱۴۲، طبع بیروت۔

(۳) عقیدۃ السفارینی ص۳۱۷، جلد ثانی، تحت سیرۃ و فضائل عثمانی رضی اللہ عنہ۔

نوٹ: اس مسئلہ کی تفصیلات "رحماء بینھم" حصہ عثمانی کے صفحات ۱۹۱ تا ۱۹۳ پر درج ہیں۔

(تاریخ الخلفاء للسیوطی ص۱۱۵، تحت سنہ ۳۵ھ فصل فی خلافت، طبع دہلی)

حاصل کلام یہ ہے کہ

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قتل اشرار مفسدین اور خوارج نے کیا تھا۔
اس میں ان دونوں حضرات رضی اللہ عنہما کی طرف سے ان کی کوئی حمایت نہیں پائی گئی اور نہ ہی ان حضرات رضی اللہ عنہما نے مفسدین کا تعاون کیا۔ نیز اس واقعہ ہائلہ کے بعد جب حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے دست مبارک پر بیعت ہوئی تو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، وغیرہما کی طرف سے ساتھ ہی ساتھ اوّل نمبر پر یہ مطالبہ پیش کیا گیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، کا قصاص ان ظالموں سے بلا تاخیر لیا جائے اور ان مجرموں کو شریعت کے قواعد کے مطابق سزا دے کر کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔

چنانچہ اس مسئلہ میں تاخیر کی وجہ سے بیشتر مشکلات رُونما ہوئیں اور اہلِ اسلام میں متعدد اختلافات پیدا ہوگئے، آخرکار جنگ وجدال کی نوبت پہنچی۔ (جیسا کہ اپنے مقام پر ان واقعات کی تفصیلات درج ہیں)

یہ تمام حالات اس چیز پر گواہ ہیں کہ ان حضرات کا قتل عثمان رضی اللہ عنہ، میں کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ ہی یہ دونوں حضرات رضی اللہ عنہما قاتلین کے ہم نوا تھے۔

اگر معترض کا اعتراض صحیح تسلیم کر لیا جائے تو محاصرہ دار عثمان سے لے کر جنگ جمل تک کے تمام واقعات کا آخر کیا جواز ہے؟؟

یہ حضرات قاتل بھی خود ہوں، دار عثمان رضی اللہ عنہ، کے حفاظتی انتظامات بھی خود کرائیں، بعد از شہادت جنازہ میں خود شامل ہوں، کفن دفن میں شرکت کریں اور قصاص دم عثمان رضی اللہ عنہ، کا مطالبہ بھی خود اٹھائیں۔

یہ چیز عقل و درایت کے برخلاف ہے اور اس موقعہ کے پیش آمدہ واقعات کے بھی برعکس ہے۔



اعتراض

(۵)

”عبداللہ بن مسعود قرآن کی بعض سورتوں کا منکر تھا“

(بحوالہ کتاب تفسیر اتقان ص۹۶، عبارت اشتہار از افلح اکیڈمی، کراچی یونٹ)

الجواب

معترض نے جس کتاب (تفسیر اتقان) سے یہ اعتراض نقل کیا ہے، اسی کتاب میں اسی بحث میں اس روایت کے متعدد جوابات بھی مذکور ہیں۔

یہ معترض کی خیانت ہے کہ قابل اعتراض چیز کو تو نقل کر دیا اور اس کے جواب، جو اسی بحث میں موجود ہیں، اسے ترک کر دیا۔

چنانچہ وہاں امام فخرالدین الرازی رحمتہ اللہ علیہ کے حوالے سے تحریر ہے کہ

...ان نقل هذا المذهب عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ نقل باطل۔

یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے (سورۃ الفاتحہ اور معوذتین کے قرآن سے ہونے کا

(تفسیر اتقان ص۷۹، جلد اوّل، طبع ثانی، مصر)

انکار کا) قول جس نے نقل کیا ہے وہ نقل باطل ہے۔

(۲) نیز اسی مقام میں مذکور ہے کہ امام النواوی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف "شرح المذہب" میں فرمایا ہے کہ:

... اجمع المسلمون علی ان المعوذتین والفاتحه من القرآن۔ ان من جحد منها شیا کفر وما نقل عن ابن مسعود باطل لیس بصحیح۔ (تفسیر اتقان ص۷۹، ج اوّل، تحت بحث ہذا، طبع ثانی، مصر)

مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ معوذتین اور سورہ فاتحہ قرآن میں سے ہیں اور جس شخص نے اس میں سے کسی چیز کا انکار کیا، اس نے کفر کیا اور جو چیز ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کی گئی ہے، وہ نقل باطل ہے اور جھوٹ ہے۔

(۳) ابن حزم نے اپنی کتاب "القدح المعلٰی تقسیم المحلٰی" میں ذکر کیا ہے کہ

... ھذا کذب علی ابن مسعود رضی اللہ عنہ، وموضوع انما سمح عنه قراته عاصم عن زر عنه وفیها المعوذتان والفاتحه۔ (تفسیر اتقان ص۷۹، ج اول تحت بحث ہذا، طبع ثانی، مصر)

یعنی یہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ پر جھوٹ لگایا ہے۔ یہ نقل موضوع اور جعلی ہے اور عاصم نے زر سے اور زر نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے جو قراۃ نقل کی ہے، وہ صحیح ہے اور اس میں معوذتان اور الفاتحہ دونوں شامل ہیں۔

اور اگر بالفرض ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ قول منقول ہوا ہے تو علماء کرام نے اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے اس قول سے رجوع کر لیا تھا اور اس مسئلہ میں باقی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے متفق ہو گئے تھے۔

چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ

...ثم قد رجع عن قولہ ذالک الی قول الجماعہ...الخ۔

(تفسیر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ ص۵۷۱، ج۴، تحت سورۃ معوذتین، پ۳۰)

فلہذا معترض لوگوں کا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے حق میں بعض سورتوں کے قرآن مجید میں سے انکار کرنے کا قول بالکل غلط ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے متعلق بدگمانی نشر کرنے کی سازش ہے۔ اہلِ اسلام اس سے باخبر رہیں اور اس فریب میں نہ آئیں۔

صلی اللہ تعالی علی خیر خلقہ محمد وعلی آلہ واصحابہ وسلم۔



مختصر سوانح مؤلف

اسم: (مولانا) محمد نافع عفا اللہ عنہ ولد حضرت مولانا عبدالغفور صاحبؒ

وجہ تسمیہ: حضرت مولانا محمد نافع کے والد گرامی حضرت مولانا عبدالغفور صاحبؒ ۱۳۳۲ھ بمطابق ۱۹۱۴ء حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔

ان ایام میں حاجیوں کی سواری کے لئے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان سفر کے لئے اونٹ استعمال ہوتے تھے۔ چنانچہ آپ نے بھی مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ جانے کے لئے اونٹوں کی سواری اختیار کی اور مدینہ طیبہ کے ''نافع'' نامی ایک شخص سے ایک اونٹ کرایہ پر لیا۔ آپ کو اپنے اس شتربان کا نام بہت پسند آیا۔

مولانا عبدالغفور صاحبؒ جب حج سے واپس تشریف لائے تو قریباً ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۵ء میں آپ کے ہاں فرزند متولد ہوا۔ چنانچہ آپ نے اس کا نام ''نافع'' تجویز کیا اور اسم ''محمد'' تبرکاً شامل کر کے ''محمد نافع'' رکھا۔

پیدائش

ایک اندازہ کے مطابق ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۵ء قریہ محمدی شریف ضلع جھنگ (پنجاب)
(یہ تاریخ اندازاً ذکر کی گئی ہے ورنہ صحیح تاریخ پیدائش کہیں تحریراً نہیں پائی گئی)

تعلیم و تربیت

آں موصوف نے اپنے والد گرامی سے ۱۳۵۲ھ بمطابق ۱۹۳۳ء میں قرآن مجید حفظ کیا۔ اس کے بعد ابتدائی دینی کتب کی تعلیم استاذ مولانا اللہ جوایا شاہ صاحب (المتوفی ۱۳۶۲ھ) اور اپنے برادر بزرگ حضرت مولانا محمد ذاکرؒ سے حاصل کی۔

اور پھر اس کے بعد مدرسہ اشاعت العلوم جامع مسجد کچہری بازار لائل پور (فیصل آباد)

میں داخل ہوئے جہاں مولانا محمد مسلم صاحب عثمانیؒ اور مولانا حکیم عبدالمجید صاحبؒ سے فصول اکبری علم الصیغہ اور نحو میر صغریٰ و کبریٰ وغیرہ کتب پڑھیں۔

اسی دوران قریہ محمدی شریف ضلع جھنگ میں آپ کے برادر بزرگ حضرت مولانا محمد ذاکرؒ نے دارالعلوم جامع محمدی شریف کی بنیاد رکھی۔

سب سے پہلے حضرت مولانا احمد شاہ صاحبؒ بخاری فاضل دیوبند بطور صدر مدرس تشریف لائے۔

چنانچہ مولانا محمد نافع صاحب واپس گھر تشریف لائے اور مقامی دارالعلوم ''جامعہ محمدی شریف'' میں اپنی تعلیم جاری رکھی اور

علم نحو میں ہدایۃ النحو۔ کافیہ الفیہ اور شرح جامی

علم فقہ میں قدوری۔ ہدایہ (اولین) وغیرہ

معقولات میں ایساغوجی۔ مرقاۃ۔ شرح تہذیب۔ اور قطبی کا کچھ حصہ پڑھا۔

اس دوران جب جامعہ ہذا میں حضرت مولانا قطب الدین صاحب اچھالوی مدظلہ تشریف لائے تو آپ نے ان سے قطبی کا باقی حصہ اور میبذی پڑھیں۔ اور علم فقہ میں شرح وقایہ (اخیرین) اور علم بلاغت میں مختصر معانی وغیرہ کتب پڑھیں۔

مولانا شیر محمد صاحب سے نورالانوار اور شرح وقایہ (اولین) وغیرہ کتب پڑھیں۔

بعدازاں ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء میں جامعہ محمدی شریف میں مولانا غلام احمد صاحب لاہوری کے مشہور شاگرد مولانا احمد بخش صاحب از موضع گدائی (ڈیرہ غازی خان) تشریف لائے تو ان سے آپ نے جلالین۔ شرح نخبۃ الفکر۔ ھدایہ (اخیرین) اور دیوان متنبی وغیرہ کتب کی تعلیم حاصل کی۔

مزید حصول علم کے لئے آپ واں بھچراں (ضلع میانوالی) تشریف لے گئے اور قریباً سات ماہ میں حضرت مولانا غلام یٰسین صاحب سے مشکوٰۃ شریف حمداللہ عبدالغفور (حاشیہ شرح جامی) وغیرہ کتب پڑھیں۔

اس کے بعد ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء میں آپ نے موضع انی ضلع گجرات میں مشہور استاذ مولانا ولی اللہ صاحبؒ گجراتی (المتوفی شوال ۱۳۹۳ھ/ نومبر ۱۹۷۳ء) کا شرف تلمذ حاصل کیا

اور مختلف فنون اصول فقہ میں توضیح تلویح، مسلم الثبوت میر زاہد ملا جلال، میر زاہد رسالہ قطبیہ میر زاہد امور عامہ اور قاضی مبارک اور شرح عقاید نسفی و مطول وغیرہ کتب کی تعلیم حاصل کی۔

اور آخر ۱۳۶۲ھ میں دارالعلوم دیوبند (بھارت) میں داخلہ لیا اور دورۂ حدیث شریف معروف طریقہ سے مکمل کیا۔ یہ وہ دور تھا جب اس مشہور دارالعلوم میں شیخ الادب و الفقہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب امروہیؒ، حضرت مولانا ابراہیم صاحب بلیاویؒ، حضرت مفتی ریاض الدین صاحب اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سینکڑوں طلباء کو علوم دینیہ کا درس دیتے تھے اور مولانا حسین احمد مدنی صاحبؒ جیل فرنگ میں قید تھے۔

مولانا محمد نافع نے مذکورہ بالا حضرات سے دورۂ حدیث پڑھا۔

چنانچہ جب آپ ۱۳۶۲ھ میں دارالعلوم دیوبند (بھارت) سے فارغ التحصیل ہوئے تو آپ کو سند فراغ ۱۳۰۵۴ سے نوازا گیا۔ یہ سند ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۳ء میں حاصل ہوئی۔

آپ جب واپس وطن ہوئے تو اسی سال ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء میں اپنے مقامی دارالعلوم جامعہ محمدی میں سلسلہ تدریس شروع کیا۔

قیام پاکستان ۱۹۴۷ء کے بعد تنظیم اہل سنت والجماعت سے تعلق قائم رہا اور رد رافضیت کے خلاف کام کیا۔ پھر اس کے ساتھ تحقیقی اور تصنیفی کام کی طرف متوجہ ہوئے اور تنظیم اہل سنت کے ہفت روزہ جریدہ ''الدعوۃ'' میں تحقیقات نافعہ کے عنوان سے مختلف موضوعات پر مضامین تحریر کئے۔

اسی دوران آپ نے اپنے استاد محترم حضرت مولانا احمد شاہ صاحبؒ بخاری کے ماہنامہ ''الفاروق'' کے لئے بھی کئی مضامین مختلف موضوعات پر تحریر کئے۔

جب ۱۹۵۳ء/۱۳۷۳ھ میں تحریک ختم نبوت مرزائیت کے خلاف شروع ہوئی تو اس میں بھر پور عملی حصہ لیا اور گرفتاری پیش کی اور تین ماہ پہلے جھنگ میں پھر بورسٹل جیل لاہور میں گزارے۔ وہاں سے رہائی کے بعد اپنے استاذ مکرم حضرت مولانا احمد شاہ صاحبؒ بخاری کے مشورہ اور ہدایات کے موافق کتاب ''رحماء بینھم'' کے موضوع پر تحقیقی کام کرنے کے لئے مواد فراہم کرنا شروع کیا۔

تالیفات

ا۔ مسئلہ ختم نبوت اور سلف صالحین

۱۹۳۵ء/۱۳۷۱ھ میں قادیانیوں کے ایک مشہور مجلہ "الفضل" لاہور نے ایک مستقل نمبر "اجرائے نبوت" پر شائع کیا تو اس کے جواب میں آپ نے "مسئلہ ختم نبوت اور سلف صالحین" کے نام سے کتابچہ شائع کیا جس میں مرزائیوں کے اعتراضات کا مسکت جواب دیا گیا۔

۲۔ حدیثِ ثقلین

مشہور حدیث شریف...... ترکت فیکم الثقلین...... الخ پر بحث کی ہے اور "کتاب اللہ و سنتی" کے الفاظ والی روایت کی اسانید کو جمع کیا ہے اور دونوں روایات پر عمدہ مواد جمع کر کے تحقیق ذکر کی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶۳ء/۱۳۸۳ھ میں تالیف کی گئی۔

۳۔ رحماء بینھم

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین خصوصاً خلفاء اربعہؓ کے باہم ربط و اتفاق کے سلسلہ میں "رحماء بینھم" کے نام سے پہلی کتاب حصہ صدیقی ۱۹۷۱ء/۱۳۹۱ھ میں تالیف کی گئی۔ دوسری کتاب حصہ فاروقی ۱۹۷۶ء/۱۳۹۶ھ اور تیسری کتاب حصہ عثمانی ۱۹۷۸ء/ ۱۳۹۸ھ میں تالیف کی گئی۔

اور ان ہر سہ جلد میں خلفاء اربعہؓ کے باہمی تعلقات نسبی کے علاوہ محبت و اخوت کے باہمی روابط کو واضح کیا گیا ہے۔ کتاب "رحماء بینھم" ایک مشہور علمی تحقیقی تالیف ہے۔ اس کتاب سے مؤلف کے کئی ہم عصر جید علماء نے استفادہ کیا۔ مثلاً مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے اپنی کتاب "تکملہ فتح الملھم فی شرح المسلم جلد سوم میں اس کتاب کے اقتباسات نقل کئے ہیں اور حوالہ جات دیئے ہیں جس سے اس تالیف کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ مسئلہ اقربا پروری

یہ کتاب ۱۹۸۰ء/۱۴۰۰ھ میں حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ پر معاندین کے اقربانوازی کے طعن کے جواب میں تالیف کی گئی۔

یہ کتاب رحماء بینھم حصہ عثمانی کا ایک تکملہ ہے۔

۵۔ حضرت ابوسفیانؓ اور ان کی اہلیہ

یہ کتابچہ ۱۹۸۳ء/۱۴۰۳ھ میں تالیف کیا گیا اور اس میں حضرت ابوسفیانؓ بن حرب اور ان کی اہلیہؓ کے مختصر کوائف کے علاوہ ان کی اسلام میں خدمات کا ذکر کیا گیا ہے۔

بعدازاں دوسرے ایڈیشن میں یزید بن ابی سفیانؓ اور حضرت ام حبیبہؓ کے تذکرہ کا اضافہ کیا گیا۔

۶۔ بنات اربعہؓ

اس تالیف میں کتاب وسنت اور جمہور علماء اہلسنت وشیعہ کی مستند کتب سے ثابت کیا گیا ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ کے چار صاحبزادیاں تھیں۔

یہ تالیف ۱۹۸۴ء/۱۴۰۴ھ میں مکمل ہوئی۔ کتاب میں چاروں صاحبزادیوں کے متعلقہ حالات وسوانح کو جمع کردیا گیا ہے۔

۷۔ سیرۃ سیدنا علی المرتضیٰ

اس تالیف میں سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے حسب ونسب کے علاوہ آں جنابؓ کی غلوعقیدت اور تقصیر شان سے بالاتر ہوکر صحیح سوانح حیات لکھنے کی سعی کی گئی ہے اور مختلف شبہات کا ازالہ بھی کردیا گیا ہے۔

یہ تالیف ۱۹۸۸ء/۱۴۰۹ھ میں مکمل ہوئی۔

۸۔ سیرت سیدنا امیر معاویہؓ

صفر ۱۴۱۱ھ/۱۹۹۰ء میں یہ کتاب دو جلدوں میں تالیف کی گئی ہے۔

ایک جلد میں سیدنا امیر معاویہ بن ابی سفیانؓ کی سوانح حیات اور اسلام میں ملی خدمات

کا ذکر ہے۔

جبکہ دوسری جلد میں معاندین کی طرف سے آپ پر وارد کردہ تقریباً اکتالیس مطاعن کا مسکت جواب تحریر کیا گیا ہے۔

۹۔فوائد نافعہ

رجب ۱۴۲۰ھ/اکتوبر ۱۹۹۹ء میں یہ کتاب دو جلدوں میں تالیف کی گئی۔

پہلی جلد میں عام طور پر ''دفاع عن الصحابہؓ'' کا مضمون مفصل ذکر کیا گیا ہے۔ جبکہ دوسری جلد میں حضرات حسنین شریفینؓ کی سوانح حیات کو مرتب کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ان حضرات کی شہادتوں کو صحیح طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رائے گرامی حضرت مولانا عبدالستار تونسوی دامت برکاتھم عالیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ العالَمِیْن، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلامُ عَلٰی خَاتِمِ الْاَنْبِیَاء وَالْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْن اَمَّا بَعْد

اس پُر آشوب دور میں جہاں شعائر اسلام کا استخفاف و استحقار اور امور دین سے اعراض و انکار روزمرہ کے مشاغل بن گئے ہوں اور دینِ متین داخلی و خارجی فتنوں سے ہمکنار ہو، آئے دن فتنوں کا ایک سیلاب اُمنڈتا چلا آرہا ہو اور اہلِ باطل کی ریشہ دوانیاں اور کارستانیاں "مِنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْن" کی صورت نمودار ہو رہی ہوں، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی تحریف و انکار کے نشے میں دنیا میں روز افزوں ہوں اور حب اہل بیت کے نام پر صحابہؓ سے نفرت و بیزاری کا بیج بویا جا رہا ہو، حتیٰ کہ اسلام کے نام پر پورا کفر مسلط کیا جا رہا ہو۔ ایسی سنگین صورتحال میں معاندین کی یہ روش کتنی دلسوز ہے کہ تربیت یافتگانِ رسولؐ کو ہدفِ طعن و تشنیع بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے اور خلفائے ثلاثہؓ حضرات صدیق و فاروق و غنی رضی اللہ عنہم کی تکفیر و سب و شتم میں طبع آزمائی کر کے دل کی آگ بجھائی جائے۔ گویا نام نہاد محبان، شجرِ اسلام کی جڑ کاٹنے کو تیار بیٹھے ہیں۔ (نعوذ باللہ من ذلک)

ع چوں کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمان

اس کربناک داستان کا آغاز اس تحریک و تخریب سے ہوا جس کے پرچار کنندگان شیعہ اثنا عشری اور روافض کے نام سے مشہور ہیں۔ مگر شیعی نظریات کے اولین موجد عبداللہ بن سبأ یہودی اور اس کے رفقاء تھے۔ جنہوں نے یہودیت کی شہ پر اسلامی فتوحات و ترقی کو روکنے اور امت مسلمہ کی وحدانیت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے خطرناک چالیں چلیں۔ ابنِ سبأ نے سب سے پہلے نظریۂ امامت ایجاد کر کے اس کا خوب پرچار کیا اور پھر ساتھ ہی اصحاب ثلاثہؓ کی تکفیر اور ان پر واشگاف الفاظ میں سبّ و تبرا کرنے کا آغاز کیا جس کا اقرار شیعہ مجتہدین مثلاً ابوعمرو کشی، مامقانی اور باقر مجلسی جیسے لوگ بھی اپنی کتب معتبرہ میں کر چکے ہیں۔ بلکہ شیعہ

مجتہدین نے لکھا کہ ''فَمِنْ هٰهُنَا قَالَ مَنْ خَالَفَ الشيعة اَصْلَ التَشِيُّعُ وَالرِّفْضَ مَا خُوذ مِنْ اليهـو دية (فرق الشیعہ ،ص ۳۰، رجال کش ص ۱۰۸، تنقیح القال ص ۸۷، بحارالانوار ص ۲۸۷ ج ۲۵، تفسیر مرأة الانوار ص ٦٢) یعنی یہیں سے وہ لوگ جو شیعہ کے مخالف ہیں یہ کہتے ہیں کہ شیعیت ورافضیت، یہودیت سے ماخوذ ہے''... نیز مرزا غلام احمد قادیانی دجال بھی اپنی کتاب میں ایک موقعہ پر لکھتا ہے کہ

''میرے استاد ایک بزرگ شیعہ تھے اُن کا مقولہ تھا کہ وبأ کا علاج فقط تولاّ اور تبرأ ہے یعنی آئمہ اہل بیتؓ کی محبت کو پرستش کی حد تک پہنچا دینا اور صحابہؓ رضی اللہ عنہم کو گالیاں دیتے رہنا، اس سے بہتر کوئی علاج نہیں۔'' (دافع البلاء ص ۷) اس سے واضح ہوا کہ قادیانیت، شیعیت کی پیداوار ہے۔ جبکہ شیعیت، یہودیت کا چربہ ہے.........ع

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

بہرحال شیعہ مجتہدین کی صراحت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابن سبأ نے عقیدۂ امامت کے ذریعے حب آلِ رسولؐ کا لبادہ اوڑھ کر نفاق اور تقیہ کے سیاہ دبیز پردے میں شیعیت کی بنیاد رکھی۔ اس اسلام دشمن تحریک میں ظاہراً صحابہؓ کو موردِ طعن بنایا گیا۔ مگر اہلِ علم سے مخفی نہیں کہ شیعہ امامیہ کو اصالتہً جو کچھ عداوت تھی وہ اسلام، قرآن اور صاحبِ قرآنؐ سے تھی۔ صحابہ کو موردِ طعن محض اس لئے بنایا گیا کہ قرآن حکیم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے چشم دید گواہ صحابہؓ ہی ہیں، جب عینی گواہ مجروح ہو جائیں گے تو سارے دین سے اعتماد اٹھ جائے گا۔ اسی لئے امام ابوزرعہؒ نے فرمایا: ''اِذَا رَاَیْتَ الرَّجُلَ یَنْتَقِصُ اَحَدًا مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ زِنْدِیْق (ابوزرعہ الرزای ص ۱۹۹، ص ۲۳۱) جب تم ایسے شخص کو دیکھو کہ جو صحابہؓ کی تنقیص و تردید کرتا ہے تو جان لو کہ وہ زندیق ہے'' پس اسی سبب سے ہم سمجھتے ہیں کہ فتنۂ رفض کئی وجوہ کی بناء پر عام کھلے کفر و زندقہ سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔ لیکن عوام الناس حُبِ اہل بیتؓ کے خوشنما نعرے سے دھوکہ کھا گئے اور اہل تشیع کو مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ تصور کرنے لگے۔ یہ غلط فہمی اس وجہ سے ہوئی کہ شیعوں کی کتب اصلیہ نایاب تھیں اور اُن کے عقائد و نظریات کا کَمَـا یَـنْبَغِیْ کسی کو علم نہ ہو۔ کا اور ساتھ ہی شیعیت پر کتمان و تقیہ کی سیاہ چادر تنی رہی، ورنہ شیعہ اثنا عشریہ مذہب نہ صرف بے شمار

ضروریات دین کا منکر و مکذب ہے بلکہ اس کا کلمہ سے لے کر قرآن تک مسلمانوں سے جدا ہے۔ انہیں مسلمان کہنا خود اسلام کی نفی ہے۔ علماء امت ہمیشہ مسلمانوں کو ان کی شقاوت و ضلالت اور کفر و نفاق سے آگاہ کرتے رہے۔ مثلاً علامہ محمد بن ابی بکر العربیؒ، شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ وغیرھم۔ آج سے تقریباً پون صدی قبل استاذی المکرم امام اہلسنت حضرت علامہ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی نے اثناعشریہ کے کفریہ عقائد مثل تحریف قرآن، عقیدۂ بداٗ، عقیدۂ امامت، تکفیر صحابہؓ اور قذف عائشہؓ کی بنیاد پر ان کی تکفیر کا فتویٰ جاری کیا۔ جس پر مشائخ دیوبند شیخ الاسلام حضرت اقدس مولانا و مرشدنا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ، حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ جیسے اساطین علم کے تصدیقی دستخط ثبت ہیں۔............ دیکھئے۔

(ماہنامہ بینات ص ۹۳، ص ۹۴، ص ۱۷۰ تا ص ۱۷۵ کراچی۔ خمینی اور اثنا عشرہ کے بارے میں علماء کرام کا متفقہ فیصلہ)

احقر بھی شیعہ عقائد کی تفصیل اپنی عربی تالیف ''کشف الوَاعض فی عقیدۂ الروافض'' میں تحریر کر چکا ہے۔ اہل ذوق مراجعت فرمائیں۔ مگر اس کے علاوہ شیعہ سنی کے مابین نزاعی مسائل پر میں خود ایک جامع کتاب کی ضرورت عرصے سے محسوس کر رہا تھا مگر تبلیغی معروفیت کے ساتھ فرق باطلہ سے مناظروں کی مشغولیت، تدریسی امور اور دیگر وقتی مشاغل نے اس قابل نہ چھوڑا کہ اس حوالے سے کوئی ضخیم کتاب مرتب کر سکوں مگر اس سلسلے میں عالم شہیر، محقق کبیر حضرت مولانا محمد نافع صاحب ادام اللہ تعالیٰ بقاء بالخیر، نے ہر عنوان سے الگ الگ ایک جامع کتاب تالیف فرمائی ہے۔ بندہ نے ان کی اکثر کتب مثلاً رحماءُ بینھم (مکمل)، حدیث ثقلین، بناتِؓ اربعہ، سیرۃ حضرت علی المرتضیٰؓ، سیرۃ امیر معاویہؓ وغیرہ دیکھیں اور ابھی ان کی نئی تالیف فوائد نافعہ ہر دو جلدوں کو تقریباً اکثر مقامات سے دیکھا ہے۔ ماشاء اللہ موصوف نے اہل سنت والجماعت کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا ہے۔ بحمداللہ میری دیرینہ آرزو پوری ہوگئی ہے۔ بلا مبالغہ عرض ہے کہ عدیم الفرصت ہونے کی وجہ سے میں خود ایسی جامع کتب نہ لکھ سکتا۔ مولانا موصوف کی مذکورہ کتب میں درج شدہ دلائل ٹھوس، حوالے صحیح اور

مطابق ہیں۔ ان کی تحقیق انیق سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ریت کے ذرات سے سونا الگ کرنا جانتے ہیں۔ فاضل محقق نے مقامِ صحابہؓ اور مقام اہل بیتؓ کی وضاحت کر کے نہ صرف مسلک حقہ کو واضح کیا ہے بلکہ روافض کے اعتراضات اور شکوک وشبہات کا خواب استیصال کیا ہے۔ مولانا کی تالیفات روافض خودساختہ نظریات پر ضرب کاری ہیں۔ ردِمطاعن میں اُن کا اندازِ تحریر عالمانہ، محققانہ مگر مصلحانہ ہے۔ یہ کتب عقل سلیم وفہم مستقیم رکھنے والے حضرات کے لئے باعثِ ہدایت اور اہلِ باطل پر اتمام حجت ہیں...... **لیھلکَ من ھلک عَنْ بینة و یحییٰ مَنْ حییّ عن بینة ....**

احقر اپنے حلقہ کے علماء کرام وطلباء کو مشورہ دیتا ہے کہ مذکورہ کتب سے ضرور استفادہ کریں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مصنف کی یہ عظیم کاوش قبول فرمائے اور اسے مسلمانوں کے لئے مثمر ونافع بنائے۔

آمین یا رب العالمین

محمد عبدالستار تونسوی عفا اللہ عنہ
رئیس تنظیم اہل السنۃ پاکستان)
یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ



﴿مراجع برائے کتاب "فوائد نافعہ"﴾

......(حصہ اول)......

نمبر شمار	نام کتاب	سن تالیف التوفی
۱	مسند عمر بن عبدالعزیزؒ	التوفی ۱۰۱ھ
۲	الموطاء لامام مالکؒ	۱۷۹ھ
۳	المدونۃ الکبریٰ لامام مالکؒ	۱۷۹ھ
۴	کتاب الخراج لامام ابی یوسف الانصاری	۱۸۲
۵	کتاب لاثار لامام ابی یوسف الانصاری	۱۸۲ھ
۶	کتاب الاثار لامام محمدؒ (ابی عبداللہ محمد بن الحسن الشیبانی)	۱۸۹ھ
۷	الموطا لامام محمدؒ (ابی عبداللہ محمد بن الحسن الشیبانی)	۱۸۹ھ
۸	کتاب اختلاف الحدیث لابی عبداللہ محمد بن ادریس الشافعی	۲۰۴ھ
۹	المصنف لعبدالرزاق (ابی بکر عبدالرزاق بن ہمام بن نافع الحمیری)	۲۱۱ھ
۱۰	سیرت لابن ہشام (ابو محمد عبدالملک بن ہشام)	۲۱۳/۲۱۸ھ
۱۱	المسند للحمیدی (امام ابو بکر عبداللہ بن الزبیر الحمیدی)	۲۱۹ھ
۱۲	کتاب الاموال لابی عبید القاسم بن سلام الھروی	۲۲۴ھ
۱۳	غریب الحدیث لابی عبید القاسم بن سلام الھروی	۲۲۴ھ
۱۴	السنن السعید بن منصور (مجلس علمی)	۲۲۷ھ
۱۵	الطبقات الکبیر لمحمد بن سعد (لیدن)	۲۳۰/۲۳۵ھ
۱۶	التاریخ یحییٰ بن معین	۲۳۳ھ
۱۷	المصنف لابن ابی شیبہ (ابو بکر عبداللہ بن محمد بن ابراہیم بن عثمان بن ابی شیبہ)	۲۳۵ھ
۱۸	نسب قریش لمصعب الزبیری	۲۳۶ھ
۱۹	مسند اسحاق بن راھویہ (اسحاق بن ابراہیم بن مخلد الحنظلی المروزی)	۲۳۸ھ
۲۰	تاریخ خلیفہ ابن خیاط (ابو عمرو)	۲۴۰ھ
۲۱	المسند لامام احمد بن حنبل الشیبانی	۲۴۱ھ
۲۲	کتاب المحبر لابی جعفر بغدادی (محمد بن حبیب بغدادی)	۲۴۵ھ
۲۳	المنتخب مسند عبد بن حمید	۲۴۹ھ
۲۴	المسند للدارمی (ابی عبداللہ بن عبدالرحمن بن الفضل التمیمی سمرقندی الدارمی)	

نمبر شمار	نام کتاب	سن تالیف التوفی
۲۵	الصحیح البخاری (لامام محمد بن اسماعیل البخاری)	۲۵۶ھ
۲۶	الادب المفرد للبخاری (لامام محمد بن اسماعیل البخاری)	۲۵۶ھ
۲۷	التاریخ الکبیر للبخاری (لامام محمد بن اسماعیل البخاری)	۲۵۶ھ
۲۸	التاریخ الصغیر للبخاری (لامام محمد بن اسماعیل البخاری)	۲۵۶ھ
۲۹	جزو الحسن بن عرفۃ العبدی	۲۵۷ھ
۳۰	الصحیح المسلم (امام مسلم بن حجاج القشیری)	۲۶۰ھ
۳۱	تاریخ المدینہ المنورۃ لابی زید عمرو بن شبہ النمیری البصری	۲۶۲ھ
۳۲	السنن لابن ماجہ (ابو عبداللہ محمد بن یزید ماجہ)	۲۷۳/۲۷۵ھ
۳۳	السنن لابی داؤد سلیمان بن اشعث السجستانی	۲۷۵ھ
۳۴	ترمذی شریف (ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی)	۲۷۵/۲۷۹ھ
۳۵	شمائل ترمذی۔ لابی عیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی)	ایضاً
۳۶	انساب الاشراف للبلاذری (احمد بن یحییٰ البلاذری)	۲۷۷/۲۷۹ھ
۳۷	کتاب المعرفۃ والتاریخ لابی یوسف یعقوب بن سفیان الفسوی	۲۷۷ھ
۳۸	کتاب السنہ لابی عبداللہ محمد بن نصر المروزی	۲۹۴ھ
۳۹	قیام اللیل وقیام رمضان للمروزی	۲۹۴ھ
۴۰	السنن الکبریٰ (ابو عبدالرحمان احمد بن شعیب النسائی)	۳۰۳ھ
۴۱	المسند لابی یعلی الموصلی (احمد بن علی الموصلی)	۳۰۷ھ
۴۲	التاریخ لمحمد بن جریر ابی جعفر الطبری	۳۱۰ھ
۴۳	التفسیر لابی جعفر الطبری	۳۱۰ھ
۴۴	الصحیح لابن خزیمہ (لابی بکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ)	۳۱۱ھ
۴۵	کتاب المصاحف لابی بکر عبداللہ بن ابی داؤد سلیمان بن الاشعث السجستانی	
۴۶	الاجماع لابی بکر محمد بن ابراہیم بن المنذر النیشاپوری	۳۱۸ھ
۴۷	شرح معانی الآثار لابی جعفر الطحاوی (احمد بن محمد بن سلامۃ الازدی المصری)	
۴۸	کتاب الضعفاء للعقیلی (ابو جعفر محمد بن عمرو بن موسیٰ بن حماد العقیلی المکی)	۳۲۲ھ

نمبر	کتاب	سن وفات
۴۹	علل الحدیث لابن ابی حاتم الرازی	۳۲۷ھ
۵۰	الناسخ والمنسوخ لابی جعفر محمد بن احمد النحاس	۳۳۸ھ
۵۱	الاحسان بترتیب صحیح لابن حبان	۳۵۴ھ
۵۲	کتاب الثقات لابن حبان	۳۵۴ھ
۵۳	السنن لابی الحسن علی بن عمر و دار قطنی	۳۵۸ھ
۵۴	احکام القرآن لابی بکر احمد بن علی الرازی الجصاص الحنفی	۳۷۰ھ
۵۵	المستدرک للحاکم (ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ الحاکم نیشاپوری)	۴۰۵ھ
۵۶	معرفۃ علوم الحدیث (ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ الحاکم نیشاپوری)	۴۰۵ھ
۵۷	حلیۃ الاولیاء لابی نعیم احمد بن عبداللہ الاصبہانی	۴۳۰ھ
۵۸	المسند لابی عوانۃ	۴۴۶ھ
۵۹	الفصل فی الملل والاھواء والنحل لابن حزم الاندلسی	۴۵۶ھ
۶۰	المحلی لابن حزم (ابو محمد علی بن احمد بن سعید المعروف بابن حزم الاندلسی)	۴۵۶ھ
۱،	جوامع السیرۃ لابن حزم الاندلسی	۴۵۶ھ
۶۲	السنن الکبری للبیہقی (لابی بکر احمد بن الحسین البیہقی)	۴۵۸ھ
۶۳	الاعتقاد علی مذہب السلف (ایضاً)	۴۵۸ھ
۶۴	دلائل النبوۃ للبیہقی (ایضاً)	۴۵۸ھ
۶۵	الاستیعاب لابن عبدالبر (مع الاصابہ)	۴۶۳ھ
۶۶	کتاب التمہید لابن عبدالبر طبع جدید	۴۶۳ھ
۶۷	جامع بیان العلم وفضلہ لابن عبدالبر	۴۶۳ھ
۶۸	تاریخ بغداد للخطیب بغدادی	۴۶۳ھ
۶۹	کتاب الکفایہ للخطیب بغدادی	۴۶۳ھ
۷۰	کتاب التمہید لابی الشکور السالمی	۴۶۵ھ
۷۱	اصول السرخسی (شمس الائمہ ابی بکر محمد بن احمد بن ابی سہل السرخسی)	۴۸۳/۴۹۰ھ
۷۲	المبسوط لشمس الائمہ السرخسی	ایضاً
۷۳	شرح السنۃ للامام البغوی (ابو محمد حسین بن مسعود الفراء البغوی)	۵۱۶ھ
۷۴	کتاب الفائق للزمخشری	۵۳۸ھ
۷۵	العواصم من القواصم للقاضی ابی بکر ابن العربی المالکی	۵۴۳ھ
۷۶	حواشی العواصم من القواصم از محب الدین الخطیب	
۷۷	احکام القرآن للقاضی ابی بکر ابن العربی المالکی	۵۴۳ھ
۷۸	الاعتبار للحازمی	۵۸۴ھ
۷۹	البدائع والصنائع للکاشانی	۵۸۷ھ
۸۰	بدایۃ المجتہد لابن رشد (محمد بن احمد بن محمد بن احمد بن رشد القرطبی)	۵۹۵ھ
۸۱	التفسیر الکبیر للرازی (فخر الدین بن ضیاء الدین محمد بن عمر الرازی)	۶۰۶ھ
۸۲	جامع الاصول لابن اثیر الجزری (محمد بن محمد المعروف بابن اثیر الجزری)	
۸۳	اسد الغابہ لابن اثیر الجزری (ایضاً)	۶۰۶ھ
۸۴	النہایہ فی غریب الحدیث والاثر (ایضاً)	۶۰۶ھ
۸۵	المغنی لابن قدامہ (لابی محمد عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ)	۶۲۰ھ
۸۶	الکامل لابن اثیر (ابوالحسن علی بن ابی الکرم)	۶۳۰ھ
۸۷	علوم الحدیث لابن صلاح (ابو عمرو عثمان بن عبدالرحمن الشہر زوری ابن صلاح)	
۸۸	جامع مسانید الامام الاعظمؒ لابی المؤید محمد بن محمود بن محمد الخوارزمی	۶۶۵ھ
۸۹	المسند للامام ابی حنیفہؒ المتوفی	۱۵۰ھ
۹۰	مسند عمر بن خطاب لابی یوسف یعقوب بن شیبہ بن الصلت	۹۱ھ
۹۱	تفسیر الجامع لاحکام القرآن (لابی عبداللہ محمد بن احمد القرطبی المالکی الاندلسی)	
۹۲	تہذیب الاسماء لمحی الدین یحییٰ بن شرف النواوی	۶۷۶ھ
۹۳	شرح مسلم شریف للنواوی	۶۷۶ھ
۹۴	تفسیر مدارک التنزیل لابی البرکات عبداللہ بن احمد بن محمود النسفی	۷۰۱ھ
۹۵	تفسیر خازن (علاء الدین علی بن محمد البغدادی المعروف خازن)	۷۲۵ھ
۹۶	منہاج السنہ لاحمد بن عبدالحلیم الحرانی الدمشقی الحنبلی ابن تیمیہ	۷۲۸/۷۲۸ھ
۹۷	اقتضاء الصراط المستقیم لابن تیمیہ	ایضاً
۹۸	مشکوٰۃ المصابیح لولی الدین خطیب تبریزی تالیف	۷۳۷ھ
۹۹	کتاب التمہید والبیان فی مقتل الشہید عثمان لمحمد بن یحییٰ بن ابی بکر الاندلسی	۷۴۱ھ
۱۰۰	الطیبی شرح مشکوٰۃ شریف لشرف الدین حسین بن عبداللہ الطیبی	۷۴۲ھ
۱۰۱	سیر اعلام النبلاء للذہبیؒ (شمس الدین ابی عبداللہ الذہبی)	۷۴۷ھ
۱۰۲	تذکرۃ الحفاظ للذہبی	۷۴۸ھ

نمبر	کتاب	سن
۱۰۳	میزان الاعتدال للذہبی	۷۴۸ھ
۱۰۴	المنتقی للذہبی	۷۴۸ھ
۱۰۵	تاریخ الاسلام للذہبی	۷۴۸ھ
۱۰۶	المنار المنیف لابن قیم	۷۵۱ھ
۱۰۷	زاد المعاد لابن قیم	۷۵۱/۷۵۶ھ
۱۰۸	نصب الرایہ للزیلعی (جمال الدین ابو محمد عبداللہ بن یوسف الزیلعی الحنفی)	
۱۰۹	البدایہ والنہایہ لابن کثیرؒ (عماد الدین الدمشقی)	۷۷۴/۷۷۵ھ
۱۱۰	تفسیر القرآن لابن کثیر	ایضاً
۱۱۱	التاریخ لابن خلدون (عبدالرحمن بن محمد بن خلدون المصری المالکی)	۷۷۹ھ
۱۱۲	الکرمانی شرح بخاری شریف لعلامہ شمس الدین محمد بن علی	۷۸۶ھ
۱۱۳	توضیح وتلویح سعد الدین مسعود بن عمر بن عبداللہ تفتازانی	۷۹۱ھ
۱۱۴	شرح الطحاویہ فی عقیدۃ السلفیہ للقاضی صدر الدین علی بن علی الحنفی ابن ابی العز الحنفی	۷۹۲ھ
۱۱۵	تفسیر البرہان فی علوم القرآن للامام بدر الدین محمد بن عبداللہ زرکشی	۷۹۴ھ
۱۱۶	مجمع الزوائد للہیثمی (نور الدین الہیثمی)	۸۰۷ھ
۱۱۷	موارد الظمآن للہیثمی	۸۰۷ھ
۱۱۸	الاصابہ لابن حجر العسقلانی	۸۵۲ھ
۱۱۹	فتح الباری فی شرح البخاری لابن حجر العسقلانی	۸۵۲ھ
۱۲۰	تلخیص الحبیر لابن حجر العسقلانی	۸۵۲ھ
۱۲۱	الدرایہ فی تخریج احادیث الھدایہ لابن حجر العسقلانی	۸۵۲ھ
۱۲۲	عمدۃ القاری فی شرح بخاری شریف لبدر الدین العینی	۸۵۵ھ
۱۲۳	البنایہ فی شرح الھدایہ للعینی	۸۵۵ھ
۱۲۴	فتح القدیر لابن ہمام شرح ہدایہ مع العنایہ	۸۶۱ھ
۱۲۵	سیرۃ الحلبیہ لعلی بن برہان الدین الحلبی	۹۰۰ھ
۱۲۶	فتح المغیث شرح الفیہ الحدیث للسخاوی (شمس الدین سخاوی)	۹۰۲ھ
۱۲۷	الحاوی للفتاوی لجلال الدین السیوطی	۹۱۱ھ
۱۲۸	تدریب الراوی فی شرح تقریب النواوی للسیوطی	۹۱۱ھ
۱۲۹	تاریخ الخلفاء للسیوطی	۹۱۱ھ
۱۳۰	تفسیر اتقان للسیوطی	۹۱۱ھ
۱۳۱	تفسیر جلالین للسیوطی	۹۱۱ھ
۱۳۲	تاریخ الخمیس للدیار البکری (الشیخ حسین بن محمد بن الحسن)	۹۶۰ھ
۱۳۳	تنزیہ الشریعہ المرفوعہ لابن عراق الکنانی	۹۶۳ھ
۱۳۴	البحر الرائق لابن نجیم (الشیخ زین الدین بن ابراہیم بن نجیم)	۹۷۰ھ
۱۳۵	الصواعق المحرقہ مع تطہیر الجنان لابن حجر المکی	۹۷۳/۹۷۴ھ
۱۳۶	کنز العمال لعلی متقی الہندی	۹۷۵ھ
۱۳۷	مرقاۃ شرح مشکوٰۃ لملا علی بن سلطان القاری	۱۰۱۴ھ
۱۳۸	شرح فقہ اکبر لعلی القاری	۱۰۱۴ھ
۱۳۹	جمع الوسائل شرح شمائل لعلی القاری	۱۰۱۴ھ
۱۴۰	الاسرار المرفوعہ فی اخبار الموضوعہ لعلی القاری	۱۰۱۴ھ
۱۴۱	عقیدۃ السفارینی (محمد بن احمد السفارینی)	۱۱۷۳ھ
۱۴۲	ازالۃ الخفاء للشیخ احمد بن عبدالرحیم المعروف شاہ ولی اللہ محدث دہلوی	
۱۴۳	قرۃ العینین لشاہ ولی اللہ محدث دہلوی	۱۱۷۶ھ
۱۴۴	تفسیر مظہری لقاضی ثناء اللہ پانی پتی	۱۲۲۵ھ
۱۴۵	تحفہ اثنا عشریہ لشاہ عبدالعزیز بن احمد بن عبدالرحیم دہلوی	۱۲۳۹ھ
۱۴۶	فتاویٰ لشاہ عبدالعزیز دہلوی	۱۲۳۹ھ
۱۴۷	عجالہ نافعہ لشاہ عبدالعزیز دہلوی	۱۲۳۹ھ
۱۴۸	تفسیر روح المعانی للسید محمود آلوسی بغدادی	۱۲۷۰ھ
۱۴۹	فیض الباری حواشی صحیح البخاری حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ	۱۳۵۲ھ
۱۵۰	آثار السنن للشیخ النیموی (محمد بن نیموی)	
۱۵۱	کشف الاسرار (شرح اصول علی البزدوی) لشیخ عبدالعزیز بن احمد البخاری	۷۱۰ھ
۱۵۲	فیض القدیر شرح جامع الصغیر لعبدالرؤف المناویؒ	۷۱۰ھ
۱۵۳	دیوان حسان بن ثابت	۹۲۳ھ
۱۵۴	الزرقانی شرح مواہب اللدنیہ طبع مصر از محمد بن عبدالباقی الزرقانی	
۱۵۵	مجمع البحار للطاہر الفتنی از الشیخ محمد طاہر	
۱۵۶	رسائل الارکان از مولانا عبدالعلی بحر العلوم محمد بن نظام الدین	۱۲۲۵ھ

۱۵۷ عقود الجواہر المنیفہ از علامہ مرتضیٰ الزبیری
۱۵۸ فتاویٰ قاضی خان۔ الحسن بن منصور المتوفی ۵۹۲ھ
۱۵۹ ردالمحتار (حاشیہ درالمختار لابن عابدین الشامی (محمد امین عابدین) ۱۲۵۲ھ
۱۶۰ تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس لابی طاہر محمد بن یعقوب الفیروزآبادی
۱۶۱ تکملہ فتح الملہم حضرت مولانا تقی عثمانی مدظلہم
۱۶۲ الاشفاق علی احکام الطلاق لزاہد الکوثری
۱۶۳ فتح الملہم شرح مسلم شریف (حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی)
۱۶۴ رحماء بینہم حصہ اول صدیقی تالیف مولانا محمد نافع
۱۶۵ رحماء بینہم حصہ دوم فاروقی (ایضاً)
۱۶۶ رحماء بینہم حصہ سوم عثمانی (ایضاً)
۱۶۷ مسئلہ اقربا نوازی (ایضاً)
۱۶۸ کتاب بنات اربعہؓ (ایضاً)
۱۶۹ سیرۃ علی المرتضیٰ (ایضاً)
۱۷۰ سیرت امیر معاویہؓ ہر دو جلد (ایضاً)

﴿مراجع برائے کتاب ''فوائد نافعہ''﴾

......(از شیعہ کتب)......

کتاب سلیم بن قیس الہلالی الکوفی الشیعی ۹۰ھ
تاریخ الیعقوبی (احمد بن ابی یعقوب بن جعفر الکاتب العباسی) ۲۵۶/۲۵۸ھ
جعفریات الملقبہ قرب الاسناد لابی محمد بن محمد بن الاشعث الکوفی قرن ثالث
قرب الاسناد لعبداللہ بن جعفر الحمیری من اصحاب حسن العسکری قرن ثالث
تفسیر القمی (لعلی بن ابراہیم القمی۔ کان فی عصر الامام العسکری ۳۱۷ھ
اصول کافی محمد بن یعقوب الکلینی الرازی ۳۲۹ھ
فروع کافی لمحمد بن یعقوب الکلینی الرازی ۳۲۹ھ
کتاب الروضۃ من الکافی الکلینی الرازی ۳۲۹ھ
من لا یحضرہ الفقیہ الشیخ صدوق ۳۸۱ھ
نہج البلاغۃ السید الشریف الرضی ابی الحسن محمد بن ابی احمد الحسین ۴۱۴ھ
الاستبصار الشیخ ابی جعفر الطوسی (محمد بن حسن) ۴۶۰ھ
تہذیب الاحکام الشیخ الطوسی ۴۶۰ھ
تفسیر مجمع البیان الشیخ ابی منصور احمد بن علی الطبرسی ۵۴۸ھ
الاحتجاج الطبرسی ۵۴۸ھ
شرح نہج البلاغۃ لابن ابی الحدید عز الدین عبدالحمید بن ہبۃ اللہ المدائنی ۶۵۶ھ
صحیفہ کاملہ سجادیہ (نسخہ خورد) لعلامہ محمد تقی المجلسی ۱۰۷۰ھ
تحفۃ العوام از حاجی حسن علی الشیعی
حیات القلوب لملا محمد باقر بن محمد تقی المجلسی ۱۱۱۱ھ
مرآۃ العقول (شرح الاصول) لملا باقر المجلسی ۱۱۱۰/۱۱۱۱ھ
جلاء العیون لملا باقر المجلسی ۱۱۱۰/۱۱۱۱ھ
الانوار النعمانیہ الشیخ نعمت اللہ الجزائری ۱۱۱۲ھ
تفسیر الصافی لمحمد بن المرتضیٰ المحسن فیض کاشانی ۱۲۹۱ھ
الدرۃ النجفیہ شرح نہج البلاغۃ الشیخ ابراہیم بن حاجی حسین الدنبلی ۱۲۹۱ھ
ناسخ التواریخ لسان الملک میرزا محمد تقی وزیر اعظم سلطان ناصر الدین قاچار ایران ۱۲۹۷ھ
جامع رضوی السید عبدالغنی بن ابی طالب (طبع چہارم) ۱۳۳۳ھ
ضمیمہ ترجمہ مولوی مقبول احمد صاحب الشیعی دہلوی
شرائع الاسلام [illegible] جعفر بن سعید المعروف بالمحقق الحلی ۶۷۶ھ
فلک النجاۃ فی الامامۃ والصلوٰۃ [illegible] جھنگوی قرن
تفسیر منہج الصادقین الملا فتح اللہ الکاشانی ۹۸۸ھ
منہاج الکرامۃ لابن مطہر الحلی ۷۲۶ھ

رابعہ عشر

جواز متعہ از مولوی خادم حسین الشیعی وزیر آبادی قرن رابعہ عشر
آئینہ مذہب سنی از ڈاکٹر نور حسین الشیعی جھنگوی قرن رابعہ عشر